دیباچہ تفسیر القرآن

دیباچہ تفسیر القرآن

تصنیف لطیف

حضرت امیر المؤمنین مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

النّاشر

الشّرکۃ الاسلامیّۃ لمیٹڈ ربوہ

کتاب نفیس پرنٹرز لاہور میں اور ٹائیٹل نصرت آرٹ پریس ربوہ میں چھپا

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

دیباچہ تفسیر القرآن

تصنیفِ لطیف

حضرت امیر المومنین مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

باجازت

ناظر صاحب اشاعت لٹریچر و تصنیف

شائع کردہ

الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انٹروڈکشن

یہ دیباچہ حضرت امام جماعت احمدیہ نے اُردو زبان میں نہایت قلیل وقت میں ڈکٹیٹ کروایا تھا۔ اور حضور کا ارادہ تھا کہ اس کی طباعت سے پہلے اس پر نظر ثانی فرمائیں۔ لیکن حضور کی گوناگوں مصروفیات اور لوگوں کے بڑھتے ہوئے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ اسے بغیر نظر ثانی کرائے جلد شائع کر دیا جائے۔

یہ خدا اور اس کے رسول کے ایک عاشق صادق کے قلب صافی سے نکلے ہوئے کلمات طیّبات ہیں، جو قارئین کرام کے افادہ کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس میں یورپ کے نقادین اسلام کے مشہور اعتراضات کے دندان شکن جوابات دیئے گئے ہیں۔ اور ضرورت قرآن کے مضمون پر نہایت لطیف رنگ میں بحث کی گئی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت کے واقعات از ولادت تا وفات ایسے عمدہ اور دلکش پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں جو اپنی نظیر آپ ہیں۔ اس کے مضامین عالیہ اور براہین نیّرہ مندرجہ ذیل شعر کے مصداق ہیں:۔

اَحَادِیْثُ قَدْ صِیْغَتْ فَتُلْهِیْ بِحُسْنِهَا
عَنِ الْوَشْیِ اَوْ شُمَّتْ لَاَغْنَتْ عَنِ الْمِسْكِ

یعنی اس کے مضامین اور عبارتیں ایسے رنگ میں ڈھالی گئی ہیں جو اپنی ذاتی زیبائش اور حُسن کی وجہ سے بناؤ سنگار اور نقش ونگار سے مستغنی کر دیتی ہیں اور اگر انہیں سونگھی جانیوالی چیز سے تشبیہ دی جائے تو اسکی خوشبو کستوری سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنے بندے کے محبّت بھرے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے کلمات کو لوگوں کی ہدایت کا باعث بنائے اور اپنی پاک کتاب قرآن کریم کی عظمت اور اپنے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے ظہور کا موجب بنائے۔ آمین!

خاکسار

جلال الدین شمس

قائمقام ناظر تالیف وتصنیف

مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۸ء

فہرست مضامین

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ——— نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

هُوَ النَّاصِرُ

دیباچہ

تفسیر القرآن (انگریزی)

اِس نئے ترجمہ اور تفسیری نوٹوں کو پیش کرتے ہوئے ہم یہ بتا دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کی غرض تجارتی نہیں ہے اور نہ صرف ایک جدید چیز کا پیش کرنا اصل مقصود ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اِس وقت تک وہ اقوام جو عربی زبان سے ناواقف ہیں، ایک نئے ترجمہ کی محتاج ہیں اور ساری دنیا عربی دانوں کو بھی شامل کرتے ہوئے ایک نئے انداز کے تفسیری نوٹوں کی محتاج ہے اور اسکی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:-

انگریزی نئے ترجمہ اور نئی تفسیر کے لکھنے کی وجوہات

(۱) اس وقت تک قرآن کریم کے جس قدر انگریزی تراجم غیر مسلموں نے کیے ہیں وہ سب کے سب ایسے لوگوں نے کیے ہیں جو عربی زبان سے یا تو بالکل ناواقف تھے یا بہت ہی کم علم عربی زبان کا رکھتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن کریم کا ترجمہ کرنا تو الگ رہا وہ اِس کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھنے کی اہلیّت نہیں رکھتے تھے۔ اور بعض نے تو کسی اور زبان کے ترجمہ سے اپنی زبان میں ترجمہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے مفہوم اَور بھی حقیقت سے دُور جا پڑا تھا۔

(۲) مزید خرابی اُن تراجم میں یہ تھی کہ اُن تراجم کی بنیاد عربی لُغت پر نہیں تھی بلکہ تفسیروں پر تھی۔ اور تفسیر ایک شخص کی رائے ہوتی ہے جس کا کوئی حصّہ کسی کے نزدیک قابلِ قبول ہوتا ہے اور کوئی حصّہ کسی کے نزدیک۔ اور کوئی حصّہ مصنّف کے سوا کسی کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ اِس قسم کا ترجمہ ایک رائے کا اظہار تو کہلا سکتا ہے حقیقت کا آئینہ دار نہیں کہلا سکتا۔

اِن نقائص کو مدّنظر رکھتے ہوئے یہ ضرورت شدید طور پر محسوس ہوتی تھی کہ ایک ایسا ترجمہ قرآن کریم کا غیر عربی دان لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے جو (الف) عربی دان افراد کی کوشش اور محنت کا نتیجہ ہو۔ اور (ب) جو لغتِ عربی پر مبنی ہو چنانچہ یہ انگریزی ترجمہ جس کے بعد دوسری زبانوں کے تراجم انشاء اللہ جلد شائع کیے جائیں گے انہی دو اصول کے ماتحت شائع کیا جا رہا ہے۔

عربی زبان سے دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے میں ایک دقّت

اِس میں کوئی شک نہیں کہ چونکہ عربی زبان ایک فلسفیانہ زبان ہے اور اِس کے تمام الفاظ معین حکمتوں کے ماتحت وضع کیے گئے ہیں اور بوجہ اِس کے کہ اُن کے مادّے ابتدائی جذبات و مشاہداتِ انسانی کے اظہار کے لیے بنائے گئے ہیں اس لیے استعمال میں اُن کے معانی بعض دفعہ نہایت وسیع ہی نہیں ہو جاتے بلکہ نہایت گہرے بھی ہو جاتے ہیں دوسری زبانوں میں اُن کا پورا ترجمہ کرنا قریباً ناممکن ہے اور جب تک تفسیری نوٹوں میں اُن معانی کی وسعت کو بیان نہ کیا جائے صرف ترجمہ سب مضمون کو بیان نہیں کر سکتا۔ اس لیے جو ترجمہ ہم پیش کر رہے ہیں اِن معنوں میں مکمل ترجمہ نہیں کہلا سکتا کہ انگریزی ترجمہ نے عربی عبارت کا سب مفہوم یا قریباً سب مفہوم بیان کر دیا ہے۔ بلکہ وہ ترجمہ عربی عبارت کے مختلف مفہوموں میں سے صرف ایک مفہوم کا بیان کرنے والا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہم نے (۱) مختصر نوٹ ترجمہ کے نیچے دئے ہیں یہ بوجہ اس کے کہ ایک مکمل تفسیر نہیں ہیں اِن مختلف معانی کو جو ہمارے نزدیک کسی آیت کے ہیں مکمل طور پر تو ظاہر نہیں کرتے مگر کم سے کم ترجمہ کی محدودیت کا کسی قدر ازالہ کر دیتے ہیں (۲) دوسرے پڑھنے والے کو ترجمہ میں بصیرت بخشنے کے لیے اُس کے دل کو اِس بات پر مطمئن کرنے کے لیے کہ جو ترجمہ ہم نے کیا ہے وہ آزاد نہیں ہے۔ بلکہ لُغت اور وضع کلام کے مطابق ہے ہم نے تمام ضروری الفاظ کے معانی ایسی کتبِ لُغت سے جو نہ صرف مسلمانوں کے نزدیک بلکہ عربی بولنے والے غیر مذاہب کے لوگوں کے نزدیک بھی مسلّمہ ہیں حاشیہ میں دیئے ہیں۔ تاکہ ایک عربی سے ناواقف آدمی بھی یہ معلوم کر سکے کہ جو ترجمہ ہم نے کیا ہے وہ خواہ کسی دوسرے شخص کے نزدیک قابلِ قبول نہ ہو، مگر ہے عربی لُغت کے عین مطابق۔ اور بغیر کسی قرآنی دلیل کے جس سے معلوم ہو کہ اِس جگہ اِس لفظ کو اِن معنوں میں قرآن کریم نے استعمال نہیں کیا۔ یا عربی لُغت کے شواہد سے اُسے ردّ کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

تفسیری نوٹ لکھنے کی وجوہات

ترجمہ کے متعلق اِس قدر تشریح کے بعد اب ہم تشریحی نوٹوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ درجنوں تفسیریں قرآن کریم کی اِس وقت تک لکھی جا چکی ہیں اور شاید اُن کی موجودگی میں کسی نئی تفسیر کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ لیکن ان تفسیروں کی موجودگی کے باوجود ہم نے یہ تفسیری نوٹ لکھے ہیں اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے عربی زبان کے الفاظ وسیع معانی رکھتے ہیں، لیکن ترجمہ میں صرف ایک ہی معنے کا خیال رکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ نیچے نوٹ دیئے جاتے تاکہ بعض اور اہم معانی پر بھی روشنی پڑ جاتی۔

(۲) قرآن کریم کی تمام تفسیریں جو اس وقت تک لکھی گئی ہیں عربی زبان میں ہیں اور ظاہر ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کی عبارت

کو نہیں سمجھ سکتے وہ اس کی تفاسیر سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔

(۳) جو نوٹ تفسیری رنگ میں قرآن کریم کے تراجم کے حواشی میں غیر مسلم مترجموں نے لکھے ہیں وہ (الف) مخالفین اسلام کی کتب سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں (ب) اُن لوگوں کو عربی زبان کا یا تو بالکل علم نہ تھا یا بہت ہی کم علم تھا اِس وجہ سے معتبر اور مفصّل تفسیروں سے وہ فائدہ نہیں اُٹھا سکے چنانچہ مغربی زبانوں میں جس قدر تراجم ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک کے حواشی میں بھی قرآن کریم کی معتبر اور مفصل تفاسیر میں سے کسی کا حوالہ بھی نہیں آتا، صرف ادنیٰ اور عوام الناس کی دلچسپی کیلئے لکھی ہوئی تفاسیر کا حوالہ آتا ہے اور اگر کسی بڑی تفسیر کا حوالہ ہوتا ہے تو کسی دوسری تفسیر سے نقل کیا گیا ہوتا ہے، خود اُس کتاب کو پڑھکر استفادہ نہیں کیا ہُوا ہوتا۔

(۴) کسی علمی کتاب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ نہ صرف اُس زبان کا علم ہو جس میں وہ کتاب لکھی ہوئی ہے، نہ صرف اُن تفاسیر پر عبور ہو جو اُس زبان یا علم کے ماہروں نے لکھی ہیں۔ بلکہ خود اُس کتاب کا بھی اِس قدر گہرا مطالعہ ہو کہ اُس کتاب کی اپنی اصطلاحات اور اُس کے محاورات اور اُن اصول کا علم حاصل ہو جائے جن کے گرد اُس کی تعلیم کی فروع چکّر کھاتی ہیں۔ اگر یہ علم نہ ہو تو تفسیروں کی مدد سے بھی کوئی شخص صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا۔ چونکہ یہ درجہ کسی مغربی مترجم یا شارح قرآن کو حاصل نہ تھا، اِس لیے اُن کے نوٹ بعض دفعہ مضحکہ خیز حد تک جا پہنچتے ہیں۔

(۵) ہر زمانہ اپنے ساتھ نئے علوم لاتا ہے۔ اُن علوم کی ہر علمی کتاب کی تعلیم ایک نئی تنقید کا شکار ہوتی ہے اور اُس کے مطالب یا زیادہ واضح ہو جاتے ہیں یا زیادہ مشکوک ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم بھی اِس کُلیہ سے مستثنٰی نہیں ہو سکتا پس موجودہ زمانہ کے علوم کو مدّنظر رکھتے ہوئے اُس کی تفسیر ضروری تھی۔ تا معلوم ہو سکے کہ وہ موجودہ علوم کی روشنی میں اپنی ہادیانہ شان کس حد تک قائم رکھ سکا ہے۔ یا اُس کی شان کس حد تک آگے سے بھی زیادہ روشن ہو گئی ہے۔

جب پہلی تفاسیر قرآن کریم کی لکھی گئیں اس وقت عربی زبان میں مکمل بائبل موجود نہ تھی بلکہ جن ٹکڑوں کے تراجم عربی زبان میں تھے وہ بھی مفسرین کی دسترس سے باہر تھے اِس وجہ سے پُرانے مفسرین نے قرآن کریم کے اُن مضامین کی طرف جن میں موسوی سلسلہ کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے صرف اپنے علم کے مطابق روشنی ڈالی ہے، جو بعض دفعہ نہایت مایوس کُن اور بعض دفعہ مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ مغربی مصنّفین اُن کی غلطیوں کو قرآن کریم کی طرف منسوب کر کے ہنسی اُڑاتے ہیں۔ حالانکہ اُن مفسروں نے جو کچھ لکھا بائبل کو پڑھ کر نہیں لکھا۔ بلکہ یہودی اور مسیحی علماء کو پُوچھ کر لکھا۔ بعض دفعہ اُن علماء نے بائبل کی بجائے اپنی روایات کی کتب سے اُنہیں مضمون بتا دئے اور بعض دفعہ اُن کی ناواقفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُن سے تمسخر کیا۔ بیشک اُن پر اعتبار کر کے اُن مفسّرین نے سادگی اور بے احتیاطی کا اظہار کیا، اِس بات سے اُس زمانہ کے یہودی اور مسیحی علماء کی دیانت اور اُن کے تقوٰی پر جو زد پڑتی ہے وہ بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ پس موجودہ مغربی مصنّفین کو بجائے قرآن کریم کے مفسرین پر ہنسی اُڑانے کے خود اپنے آباء کی دیانت پر ماتم کرنا چاہیئے۔ اب جبکہ بائبل کے علوم ہر کس و ناکس کے لیے ظاہر ہو گئے ہیں اور عبرانی، لاطینی اور یُونانی کتب بھی مسلم علماء کی دسترس میں ہیں موقعہ پیدا ہو گیا ہے کہ نئے رنگ میں اُن مضامین پر روشنی ڈالی جائے

جو قرآن کریم میں موسوی سلسلہ اور بائبل کے متعلق بیان ہوئے ہیں۔

(۶) پُرانے زمانہ میں مختلف مذاہب کے درمیان اعمال کے متعلق تعلیمی برتری کا مقابلہ بہت کم تھا، بلکہ رسم و رواج اور عقائد کی بحث تک علماء کی گفتگو محدود رہتی تھی۔ اس وجہ سے قرآن کریم کی وہ تعلیم اخلاقی، تعلیمی، اقتصادی، سیاسی، تعامل باہمی کے امور کے متعلق تھی زیر بحث نہ آتی تھی۔ آج دنیا کی توجہ اِن امور کی طرف زیادہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ اِس کمی کو پُورا کرنے کے لیے قرآن کریم کی ایسی تفسیر پیش کی جائے جس میں اِن اُمور کے متعلق جو اُس کی تعلیم ہے اس پر زیادہ روشنی ڈالی جائے۔

(۷) قرآن کریم چونکہ الہامی کتاب ہے اِس میں آئندہ زمانہ کی پیشگوئیاں بھی ہیں۔ اُن پیشگوئیوں کے متعلق صحیح روشنی اُسی وقت ڈالی جا سکتی ہے جبکہ وہ پوری ہو چکی ہوں۔ اِس لیے بھی ضروری تھا کہ اِس زمانہ میں نئی تفسیر پیش کی جائے جو اس وقت پوری ہو چکنے والی پیشگوئیوں کو ظاہر کرے۔

(۸) قرآن کریم کی تعلیم سب مذاہب اور فلسفوں پر حاوی ہے اور وہ سب مذاہب کی اچھی تعلیموں پر مشتمل ہونے کے علاوہ ناقص کا نقص بھی ظاہر کرتی ہے اور نامکمل کو مکمل بھی کرتی ہے۔ ابتدائی زمانۂ اسلام کے مفسّرین کو چونکہ اُن مذاہب اور اُن فلسفوں کا علم نہ تھا وہ اُن کے متعلق قرآنی تعلیم کو صحیح طور پر اخذ نہیں کر سکے۔ اب وہ سب پوشیدہ علوم ظاہر ہو چکے ہیں اور قرآن کریم کے وہ حصّے جو اُن کے متعلق ہیں اُس کے عارفوں پر روشن ہو گئے ہیں پس اِس زمانہ میں پُرانی تفسیروں کی اُس کمی کو پُورا کرنا بھی ایک اہم ضرورت ہے۔

وجوہات مندرجہ بالا کی موجودگی میں ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اور تفسیر جو ہم پیش کر رہے ہیں صرف قابلِ اعتراض ہی نہیں، بلکہ ایک اہم ضرورت کو پُورا کر رہا ہے۔ ہم اُسے پُورا کر کے اپنا حق ادا کر رہے ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے پیش کردہ ترجمہ اور تفسیر کو غور سے پڑھیں گے اور تعصّب سے آزاد ہو کر اس کا مطالعہ کریں گے وہ اسلام کو ایک نئے زاویہ سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے اور اُن پر ثابت ہو جائے گا کہ اسلام نقائص سے پُر مذہب نہیں جیسے مغربی مصنّفوں نے پیش کیا ہے، بلکہ وہ رُوحانی علم کا ایک خوبصورت باغ ہے جس میں سیر کرنے والا ہر قسم کے حُسن کے نظّارہ سے مستفیض ہوتا ہے، بلکہ وہ اُس آسمانی جنّت کا ایک مکمّل ارضی نقشہ ہے جس کا وعدہ وہ سب مذاہب کے بانی دیتے چلے آئے ہیں ✧

قرآن کریم کی ضرورت

آج سے قریباً سوا تیرہ سو سال پہلے جب قرآن کریم نازل ہوا۔ دنیا میں اور بھی بہت سے مذاہب اور بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ عرب کے اِردگرد عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید دونوں کے ماننے والے پائے جاتے تھے۔ خود بعض عرب بھی عیسائی ہو چکے تھے، یا عیسائیت کی طرف رغبت رکھتے تھے۔ اِسی طرح بعض عرب یہودیوں کے مذہب میں بھی شامل ہوتے رہتے تھے، چنانچہ مدینہ کا کعب بن اشرف یہودِ مدینہ کا سردار اور مشہور دشمنِ اسلام اور اُس کا باپ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے کعب کا باپ طیّ قبیلہ سے تھا۔ یہود سے اُسے ایسی عقیدت ہوئی کہ ابورافع ابن ابی حقیق یہودی نے اُس سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی اور اِس یہودی لڑکی کے بطن سے کعب پیدا ہوا۔ (تاریخ الخمیس جلد اوّل)

مکّہ مکرمہ میں علاوہ عیسائی غلاموں کے خود مکّہ کے بعض باشندے بھی عیسائیت کی طرف رغبت رکھتے تھے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ کے بھائی ورقہ بن نوفل نہ صرف یہ کہ عیسائی عقائد رکھتے تھے، بلکہ اُنھوں نے کچھ عبرانی بھی سیکھی تھی اور وہ عبرانی اناجیل سے عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔ چنانچہ بخاری میں لکھا ہے:۔

كَانَ امرأً قَدْ تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ كتاب العبرانيّ فيكتبُ مِنَ الْاِنْجِيْلِ بِالعِبْرانيّةِ مَاشَآءَ اللهُ ان يكتبَ (بخاری جلد اول کیف کان بدا الوحی الیٰ رسول اللہ صلعم)

یعنی ورقہ بن نوفل نے جاہلیت میں عیسائیت اختیار کرلی تھی اور وہ عبرانی سے عربی میں اناجیل کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔

عرب کے دوسرے کنارے پر ایرانی آباد تھے اور وہ بھی ایک نبی اور ایک کتاب کے ماننے والے تھے۔ زردشت نبی کی کتاب ژند اوستا گو انسانی دستبرد کا شکار ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی لاکھوں انسانوں کا مرجع عقیدت بنی ہوئی تھی اور ایک زبردست حکومت اُس کے قانون کی اتباع کی مدّعی تھی۔ ہندوستان میں وید ہزاروں سالوں سے لوگوں کی عقیدت کا مرجع بنے ہوئے تھے اور کرشن جی کی گیتا اور بُدھ کی تعلیم مزید برآں تھیں۔ چین میں کنفیوشس ازم کا زور تھا اور بُدھ مذہب بھی اپنے پاؤں پھیلا رہا تھا اِن کتابوں اور اِن تعلیموں کے ہوتے ہوئے کیا کسی نئی کتاب کی ضرورت تھی؟ یہ ایک سوال ہے جو قرآن کریم کے دیکھتے ہی ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے یا پیدا ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا جواب کئی رنگ سے دیا جا سکتا ہے۔

اوّل: کیا یہ اختلافِ مذاہب خود اس بات کی دلیل نہ تھا کہ اِن سب مذاہب کو متحد کرنے کے لیے کوئی اور مذہب آنا چاہیئے؟

دوم: کیا انسانی دماغ اسی طرح ارتقاء کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے نہیں جا رہا تھا جس طرح انسانی جسم نے کسی زمانہ میں ارتقاء کی منزلیں طے کی تھیں۔ پھر کیا جس طرح جسم کی ارتقائی منزلیں ایک مقام پر پہنچ کر ایک

مستقل صورت اختیار کر گئیں۔ اسی طرح کیا روح اور دماغ کے لیے بھی ضروری نہ تھا کہ وہ ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے ایک ایسی منزل پر پہنچتا جو انسانی پیدائش کا مقصود تھی؟

سوم: کیا پہلی کتب میں کوئی ایسا نقص تو نہیں آگیا تھا جس کی وجہ سے ایک نئی کتاب کی ضرورت شدید طور پر دنیا کو محسوس ہو رہی تھی اور قرآن کریم اس ضرورت کو پورا کرنے والا تھا؟

چہارم: کیا سابق مذاہب اپنی تعلیم کو حتمی اور آخری قرار دے رہے تھے یا وہ خود بھی ایک ارتقاء کے قائل تھے اور روحانیت کی ترقی کے لیے ایک ایسے نقطہ کی خبر دے رہے تھے جس پر بنی نوع انسان نے جمع ہو کر انسانی پیدائش کے مقصد کو حاصل کرنا تھا؟

میرے نزدیک ان چاروں سوالوں کا جواب ہی اس سوال کو حل کر دیگا کہ قرآن کریم سے پہلے مختلف کتب اور مختلف مذاہب کی موجودگی میں قرآن کریم کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ پس میں ان چاروں سوالوں کو باری باری لے کر جواب دیتا ہوں۔

پہلا سوال اور اُس کا جواب

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا یہ اختلافِ مذاہب خود اس بات کی دلیل نہ تھا کہ ان سب مذاہب کو متحد کرنے کے لیے کوئی نیا مذہب آنا چاہیئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذہب اوّل انسان کو خدا تعالیٰ سے ملانے کے لیے آتا ہے اور دوسری غرض اُس کی شفقت علی خلق اللہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

اسلام کے سوا باقی سب مذاہب قومی مذہب تھے یونیورسل نہ تھے

اسلام سے پہلے جتنے بھی مذاہب دنیا میں موجود تھے وہ سب ایک دوسرے سے مختلف، بلکہ ایک دوسرے کو رد کرنے والے تھے۔ بائبل خدا کو نہیں بلکہ بنی اسرائیل کے خدا کو پیش کرتی تھی، چنانچہ اس میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ

"خداوند بنی اسرائیل کا خدا مبارک ہے جس نے تجھے بھیجا ہے کہ تو آج کے دن میرا استقبال کرے"۔ (۱۔سموئیل ۲۵/۳۲)

"خداوند بنی اسرائیل کا خدا مبارک ہے جس نے آج کے دن ایک آدمی ٹھہرایا کہ وہ میری آنکھوں کے دیکھتے ہوئے تخت پر بیٹھے"۔ (۱۔سلاطین ۱/۴۸)

"خداوند اسرائیل کا خدا ابد الاباد مبارک ہو"۔ (۱۔تواریخ ۱۶/۳۶)

"خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے ہاتھ سے وہ کلام کہ جس کو اپنے مُنہ سے میرے باپ داؤد سے کہا تھا پورا کیا"۔ (۲۔تواریخ ۶/۴)

"خداوند خدا اسرائیل کا خدا جو اکیلا ہے عجائب کام کرتا ہے"۔ (زبور ۷۲/۱۸)

حضرت مسیح بھی اپنے آپ کو صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مبعوث قرار دیتے تھے اور دوسری قوموں کے افراد کو دھتکار دیتے تھے۔ چنانچہ انجیل میں لکھا ہے:-

"تب یسوع وہاں سے روانہ ہو کے صور اور صیدا کی اطراف میں گیا۔ اور دیکھو ایک کنعانی عورت وہاں کی سرزمین سے نکل کر اُسے پکارتی ہوئی چلی آئی کہ اے خداوند داؤد کے بیٹے مجھ پر رحم کر کہ میری بیٹی ایک دیو

کے غلبہ سے بے حال ہے۔ اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ تب اُس کے شاگردوں نے پاس آکر اُس کی منّت کی کہ اُسے رخصت کر، کیونکہ وہ ہمارے پیچھے چلّاتی ہے۔ اُس نے جواب میں کہا "میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔ پھر وہ آئی اور سجدہ کرکے کہا۔ اے خداوند میری مدد کر۔ اس نے جواب دیا کہ "مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لیکر کتّوں کو پھینک دیویں"۔ (متی ۱۵ / ۲۱ تا ۲۵)

اسی طرح حضرت مسیح نے اپنے حواریوں کو یہ تعلیم دی کہ

"وہ چیز جو پاک ہے کتّوں کو مت دو۔ اور اپنے موتی سُوروں کے آگے نہ پھینکو۔ ایسا نہ ہو کہ وے اُنہیں پامال کریں اور پھر کر تمہیں پھاڑیں"۔ (متی ۷/۶)

ویدوں کے ماننے والوں میں ویدوں کو اِس حد تک ہندوستان کی اُونچی ذاتوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا تھا کہ مَنُو جو تمام ہندو قوم۔ آریہ اور سناتن دھرم کا تسلیم شدہ شارح قانون ہے لکھتا ہے کہ :۔

"شودر اگر وید کو سُن لے تو راجہ سیسے اور لاکھ سے اُس کے کان بھر دے۔ وید منتروں کا اچّارن (تلاوت) کرنے پر اُس کی زبان کٹوا دے اور اگر وید کو پڑھ لے تو اُس کا جسم ہی کاٹ دے"۔ (گوتم سمرتی ادھیائے ۱۲ ص)

اسی طرح خود وید میں غیر قوموں کے لیے جو تعلیم موجود ہے، وہ نہایت ہی شدید اور سخت ہے۔ رگوید میں ویدک دھرم کے مخالفین کو کتا قرار دیتے ہوئے یہ بد دعا کی گئی ہے کہ اے آگ دیوتا تو ان بُرے کتّوں (مخالفین) کو دُور لے جا کر باندھ دے"۔ اتھروید میں بھی یہ تعلیم دی گئی ہے کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کو جکڑ کر اُن کے گھروں کو لُوٹ لینا چاہیئے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "اے ویدک دھرمی لوگو تم چیتے جیسے بنکر اپنے مخالفین کو باندھ لو اور پھر اُن کے کھانے تک کی چیزیں زبردستی اُٹھا لاؤ"۔ (اتھروید کانڈ ۴ سوکت ۲۲ منتر ۷)

اسی طرح ویدوں میں چاند، سورج، آگ، پانی اور اِندر سے یہاں تک کہ گھاس سے بھی یہ دعائیں کی گئی ہیں کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ :۔

"اے آگ تو ہمارے مخالفوں کو جلا کر راکھ کر دے"۔ (یجروید)

"اے اِندر! تو ہمارے مخالفوں کو چیر پھاڑ ڈال اور جو ہم سے نفرت رکھتے ہیں انہیں تتر بتر کر دے"۔

(سام وید پارٹ دوم کانڈ ۹ سوکت ۳ منتر ۹)

"اے مخالفو! تم سر کٹے ہوئے سانپوں کی طرح بے سر اور اندھے ہو جاؤ اس کے بعد پھر اندر دیوتا تمہارے چیدہ چیدہ لوگوں کو تباہ کر دے"۔ (سام وید پارٹ دوم کانڈ ۹ سوکت ۳ منتر ۸)

"اے وبھ گھاس! تو ہمارے مخالفوں کو جلا دے اور تباہ کر۔ اور جس طرح تو پیدا ہوتے وقت زمین کو چیر کر باہر نکل آتا ہے ویسے ہی تو ہمارے مخالفوں کے سروں کو چیرتا ہوا اُوپر کو نکل کر اُن کو تباہ کر کے زمین پر گرا دے"۔ (اتھروید کانڈ ۱۹ سوکت ۲۸ منتر ۴)

پھر ہندو دھرم میں یہ بھی تعلیم موجود ہے کہ غیر ویدک دھرمی لوگوں کے ساتھ بات چیت بھی نہ کرو (گوتم دھرم سوتر ادھیائے ۵)

اگر کوئی ویدوں پر اعتراض کرے تو اُسے ملک سے باہر نکال دو یعنی حبس دوام کی سزا دو۔ (منو دھرم شاستر)
کنفیوشس ازم اور زردشت مذہب بھی قومی مذہب تھے۔ انہوں نے کبھی بھی دنیا کو اپنا مخاطب نہ سمجھا نہ دنیا کو تبلیغ کرنے کی کوشش کی جس طرح ہندو مذہب کے مطابق ہندوستان خدا تعالیٰ کے خاص بندوں کا ملک تھا۔ اسی طرح کنفیوشس ازم کے مطابق چین آسمانی بادشاہت کا مظہر تھا اور زرتشتیوں کے نزدیک ایران آسمانی بادشاہت کا مظہر تھا۔ اس اختلاف کے ہوتے ہوئے یا تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ دنیا کے پیدا کرنیوالے کئی خدا ہیں اور یا یہ ماننا پڑیگا کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے لیے اِس اختلاف کو مٹا دینا ضروری تھا۔

خدا ایک ہے

اب زمانہ اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ شاید مجھے اس بات کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اِس دنیا کو پیدا کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہ ایک ہی ہے۔ اسرائیلیوں، ہندوؤں، چینیوں اور ایرانیوں کا خدا عربوں، افغانوں، یورپینوں، منگولیوں اور سامی نسل کے لوگوں کے خدا سے کوئی مختلف خدا نہیں۔ اس دنیا میں ایک قانون جاری ہے۔ آسمان سے پاتال تک ایک ہی نظام کی کڑیاں ہمیں نظر آتی ہیں۔ درحقیقت سائنس کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ تمام طبیعاتی اور مکینیکل تغیرات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور یا تو بقول مادی علماء کے یہ ساری کائنات ایک قسم کی حرکت کا نتیجہ ہے اور پھر اس ساری کائنات کو بنانے والا ایک ہی ہاتھ ہے۔ اس حقیقت کو مدِنظر رکھنے کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسرائیلیوں کا خدا کون ہے اور عربوں کا خدا کون ہے اور ہندوؤں کا خدا کون ہے؟ اور اگر خدا ایک ہے تو پھر یہ مختلف مذاہب کیوں پیدا ہوئے ؟ کیا وہ مذاہب صرف بنی نوع انسان کی دماغی اختراع سے تھے اس لیے ہر قوم نے اپنا اپنا خدا تجویز کر لیا ؟ اگر نہیں تو پھر اس اختلاف کی وجہ کیا تھی ؟ تو کیا پھر اس اختلاف کا ہمیشہ کے لیے جاری رہنا دنیا کے لیے مفید ہو سکتا تھا ؟

مختلف ادیان کے انسانی دماغ کی اختراع نہ ہونے کے وجوہات

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا یہ مذاہب بنی نوع انسان کی دماغی اختراع کا نتیجہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں ہرگز نہیں اور اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں :۔

جو مذاہب دنیا میں قائم ہو گئے ہیں اُن کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو مندرجہ امور ہمیں نظر آتے ہیں :۔

۱ ۔ تمام مذاہب کے بانی دنیوی طور پر نہایت ادنیٰ قسم کے آدمی تھے اور کوئی طاقت ان کو حاصل نہ تھی مگر باوجود اس کے انہوں نے دنیا کے چھوٹے بڑوں کو مخاطب کیا اور وہ اور اُن کے اتباع نہایت ادنیٰ حالت سے نکل کر اعلیٰ حالت تک پہنچ گئے۔ یہ اِس امر کا ثبوت ہے کہ کوئی طاقتور ہستی اُن کے پیچھے کام کر رہی تھی۔

پاکیزہ زندگی

۲ ۔ تمام کے تمام بانیانِ مذاہب ایسے ہیں کہ اُن کی دعوٰی سے پہلے کی زندگی اُن کے دشمنوں کے نزدیک بھی پاک تھی اب یہ کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسے پاکیزہ لوگوں نے جو انسان پر جھوٹ نہیں بولتے تھے خدا تعالیٰ پر جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔

یقیناً اُن کے دعویٰ سے پہلے کی پاکیزہ زندگی اِس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دعویٰ میں سچے تھے۔ قرآن کریم نے خاص طور پر اِس دلیل کو لیا ہے اور فرماتا ہے :-

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (سورۂ یونس ع)

یعنی مَیں نے اپنی عمر تمہارے اندر گذاری ہے اور تم نے میری زندگی کو دیکھا ہے اور گواہی دی ہے کہ مَیں جھوٹ بولنے والا نہیں ہوں۔ پھر تم کس طرح سمجھتے ہو کہ آج مَیں خدا تعالیٰ کی ذات پر افتراء کرنے لگ گیا ہوں۔ اسی طرح فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران ع)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ بہت بڑا فضل اور انعام اور احسان کیا ہے کہ اُس نے انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا ہے یہی مضمون اِس آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ :-

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ ع)

تمہاری طرف تمہیں میں سے ایک رسول آیا ہے یعنی کوئی ایسا شخص تمہارے سامنے رسالت کا دعویٰ نہیں کر رہا جس کے حالاتِ زندگی سے تم ناآشنا ہو بلکہ ایسا شخص مدّعیٔ ماموریت ہے جس کے حالات کو تم خوب جانتے ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ اُس کی زندگی کیسی پاکیزہ گذری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اور انبیاء کے متعلق بھی یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ وہ اپنی قوم ہی میں سے مبعوث کیے گئے تھے۔ یہ لوگ یہ عذر نہیں کر سکتے کہ ہم اُن کے حالات سے واقف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب دوزخی دوزخ میں گرائے جائیں گے تو انہیں کہا جائے گا کہ :-

اَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (الزمر ع)

کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے وہ رسول نہیں آئے جو تم پر ہماری آیات پڑھا کرتے تھے اور تمہیں اِس دن کے عذاب سے ڈرایا کرتے تھے۔ اسی طرح فرماتا ہے :-

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا۔ (الانعام ع)

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ تمہارے پاس تمہیں میں سے ایسے رسول نہیں آئے جو تمہیں ہمارے نشانات سے آگاہ کیا کرتے تھے اور اِس دن کے عذاب سے ڈرایا کرتے تھے۔ ایک اور جگہ فرماتا ہے :-

فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (مومنون ع)

ہم نے اُن لوگوں میں اُنہیں میں سے ایک رسول بھیجا جس کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں پھر فرماتا ہے :-

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (النحل ع)

یعنی قیامت کے دن ہم ہر قوم کے خلاف خود اُنہی میں سے ایک رسول کھڑا کریں گے۔ اسجگہ شہید سے مراد ہر وہ نبی ہے جو کسی قوم کی طرف مبعوث ہُوا یعنی قیامت کے دن وہ انبیاء اپنے نمونہ کو پیش کرینگے کہ کلام الٰہی نے اُن پر کیا اثر کیا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کفار کو شرمندہ کریگا کہ ہمارا یہ نبی تو اِس کمال کو پہنچ گیا اور تم انکار کرکے تمام ترقیات سے محروم رہ گئے۔ اس جگہ تمام انبیاء کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مِنْ اَنْفُسِهِمْ تھے یعنی ہر وہ قوم جس کی طرف وہ مبعوث کیے گئے اُن میں سے ہر ایک کو جانتی تھی اور وہ ان لوگوں کی پاکیزگی اور طہارت کی شاہد تھی۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ بھی کئی مقامات پر فرمایا ہے کہ:

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (ہود ع) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا (ہود ع) وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا (اعراف ع)

یعنی عاد کی طرف ہم نے اُن کے بھائی ہودؑ کو مبعوث کیا اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو مبعوث کیا اور مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو مبعوث کیا۔ گویا ہود، صالح اور شعیب سب کے سب اپنی قوم کی نظروں میں ایسا مقام رکھتے تھے کہ وہ ان کے حالاتِ زندگی سے پوری طرح واقف تھے۔ اسی طرح حضرت صالح کے متعلق آتا ہے کہ جب انہوں نے خدا تعالیٰ کے احکام بیان فرمائے تو اُن کی قوم نے کہا:۔

یٰصٰلِحُ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (ہود ع)

اے صالح تو تو اِس دعویٰ سے پہلے ہماری امیدوں کا مرکز تھا۔ تو نے یہ کیا کیا کہ تُو نے ہمیں اُس عبادت سے روک دیا جو ہمارے باپ دادا ایک مدت سے کرتے چلے آرہے تھے۔ اسی طرح حضرت شعیبؑ کے متعلق اُن کی قوم نے کہا:۔

یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ (ہود ع)

اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں کو ترک کردیں۔ یا ہم اپنے اموال کی تقسیم میں تیری ہدایات کی تقلید کریں تو تو بڑا حلیم اور رشید تھا تجھے کیا ہُوا ہے کہ تُو ایسی غلط تعلیم دینے لگا۔

اِن آیات سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ اور اسی طرح باقی تمام انبیاء کے متعلق قرآن کریم میں اِس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ وہ کوئی گمنام آدمی نہ تھے۔ اُن کی اقوام اُن کی زندگیوں پر شاہد تھیں اور ان کی نیکی، تقویٰ اور عبادت پر گواہ تھیں اور یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ کسی پوشیدہ حالات والے یا بدکار شخص نے قوم کو لوٹنے کی تجویز کی ہے۔

بانیانِ مذاہب اور دُنیوی تعلیم

۳۔ تمام کے تمام بانیانِ مذاہب دنیوی تعلیم کے لحاظ سے قریباً کورے تھے۔ لیکن جو تعلیم انہوں نے لوگوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے دی ہے وہ نہایت ہی اعلیٰ، مناسب حال اور مناسب زمانہ ہے اور اس پر چل کر اُن کی قوم نے صدیوں تک تہذیب اور شائستگی میں دنیا کی رہنمائی کی ہے۔ یہ کس طرح خیال کیا جاسکتا ہے کہ جو شخص دُنیوی علوم سے بے بہرہ ہے۔ خدا تعالیٰ پر افتراء کرکے یکدم ایسی قدرت حاصل کرلیتا ہے کہ اُس کی بتائی ہوئی تعلیم اُس زمانہ کی تعلیمات پر فائق اور غالب آجاتی رہی ہے۔ یہ کام تو صرف ایک بالا ہستی کی تائید ہی سے ہوسکتا ہے۔

بانیانِ مذاہب زمانہ کی رَو کے خلاف تعلیم دیتے تھے

۴ - جس قدر بانیانِ مذاہب گذرے ہیں۔اُن کی تعلیم پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ ہی وہ زمانہ کی رَو کے خلاف رہی ہے اگر اُن کی تعلیمیں زمانہ کی رَو کے مطابق ہوتیں تو کہا جاسکتا تھا کہ وہ اپنی جماعت کے ذہنی ارتقاء کے نمائندے تھے۔ لیکن وہ لوگ تو اپنے زمانہ کی تعلیم کو نہ صرف ردّ کرتے تھے بلکہ اُس کے بالکل ضد تعلیم بھی پیش کرتے تھے جس کی وجہ سے ملک میں ایک آگ لگ جاتی تھی لیکن باوجود اس کے اُن کے مخاطب اُن کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یہ چیز بھی بتاتی ہے کہ وہ نمائندہ انسان نہیں تھے بلکہ حقیقی مصلح اور خدا تعالےٰ کے نبی تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک خدائی تعلیم کتنی عجیب چیز تھی۔حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں جبکہ مادیّت،کچھ یہود کی دنیا پرستی کی وجہ سے اور کچھ رومی حکومت کے غلبہ کی وجہ سے فلسطین پر غالب آرہی تھی، روحانیت پر زور دینا اور دنیا طلبی کے خلاف وعظ کرنا اور اُس وقت جبکہ یہود رومی کوڑوں کے نیچے سانپوں کی طرح تلملا رہے تھے اور انتقام کے جذبات اُن کے دل میں پیدا ہو رہے تھے، اُنہیں عفو اور رحم کی تعلیم دینا کتنی عجیب بات تھی۔ہندوستان میں ایک طرف کرشنؑ کا لڑائی کی تعلیم دینا اور دوسری طرف مادیّت سے دل ہٹا کر خدا تعالیٰ کے ساتھ لَو لگانے کی تعلیم دینا اُس زمانہ کے حالات کے بالکل خلاف تھا۔ زرتشتی تعلیم بھی جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھی۔ایران جیسے آزاد خیال لوگوں کے لیے کتنی ناقابلِ قبول تھی۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عرب میں پیدا ہو کر یہودیوں اور عیسائیوں کو دعوت دینا جبکہ مسیحیوں اور یہودیوں کے نزدیک اُن کے مذہب کے سوا کہیں اور ہدایت نہیں پائی جاتی تھی اور مکّہ والوں کو جو کہ شرک میں ڈوبے ہوئے تھے توحید کی تعلیم دینا اور جو اپنی نسلی برتری کے خیالات میں مگن تھے اُنہیں سب بنی نوع کے برابر ہونے کا پیغام پہنچانا۔شراب میں مست اور جوئے میں غرق لوگوں کو حرمتِ شراب اور جوئے کی شناعت کی تعلیم دینا۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق رائج الوقت خیالات اور اعمال کی مخالفت کرنا اور اس کی جگہ ایک نئی تعلیم پیش کرنا اور پھر اس میں کامیاب ہو جانا بتاتا ہے کہ آپ پہاڑ کی چوٹی سے پوری شدّت کے ساتھ گرنے والے دریا کی مخالف سمت میں تیر کر منزل مقصود پر پہنچ گئے اور یہ کام انسانی طاقت سے باہر ہے۔

بانیانِ مذاہب کے ذریعہ نشانات و معجزات کا ظہور

۵ - جسقدر بانیانِ مذاہب گذرے ہیں سب کے ہاتھوں سے ایسے نشانات اور معجزات ظاہر ہوئے ہیں کہ اُن کا ظہور کسی انسان کے ہاتھوں سے نہیں ہو سکتا۔سب سے پہلے تو اُن میں سے ہر ایک نے اپنے دعوٰی کے ساتھ ہی یہ خبر دیدی کہ میری تعلیم پھیل کر رہے گی اور اُس کے ساتھ ٹکرانیوالا خود پاش پاش ہو جائیگا اور باوجود اِس کے کہ دُنیوی لحاظ سے وہ بے حیثیت تھے، دنیوی علوم کے لحاظ سے صفر تھے اور زمانہ کی رَو کے خلاف تعلیم دینے والے تھے۔ اور باوجود اس کے کہ اُن کی شدید ترین مخالفت کی گئی پھر بھی وہ غالب آئے اور ان کی بتائی ہوئی خبر پوری ہوئی۔ کون انسان قبل از وقت ایسی خبر دے سکتا ہے اور پھر کونسی انسانی طاقت اُسے پورا کرواسکتی ہے۔

انبیاء کی ترقی اور دنیاوی لیڈروں کی ترقی میں فرق:- اِس میں کوئی شک نہیں کہ بعض دوسرے انسانوں نے

بھی غیر معمولی ترقیاں کیں، مگر یہاں سوال غیر معمولی ترقی کا نہیں، بلکہ سوال اِس بات کا ہے کہ اُن لوگوں نے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے اپنی ترقی کا اعلان کیا اور اپنی اخلاقی زندگی اور موت کو اِس پیشگوئی کے ساتھ وابستہ کردیا اور پھر زمانہ کی رَو کے خلاف چلے بیشک نپولین، ہٹلر اور چنگیز خاں نے بھی ادنیٰ حالت سے ترقی کی لیکن وہ زمانہ کی رَو کے خلاف نہ چلے تھے۔ اُنہوں نے کبھی یہ اعلان نہیں کیا کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ باوجود مخالفت کے تم جیت جاؤ گے۔ پھر اُن کی کبھی شدید مخالفت نہیں ہوئی۔ کیونکہ جس بات کا وہ اعلان کر رہے تھے ملک کے اکثر افراد خود اس کے خواہشمند تھے۔ ذرائع میں اختلاف ہو تو ہو مگر مقصود میں اختلاف نہیں تھا۔ اگر وہ ہار جاتے یا ہار گئے تو اُن کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ باوجود اس کے وہ قوم کے لیڈر بنے رہے اور یہی امید کرتے تھے کہ ہم یہی بنے رہیں۔ مگر ذرا خیال تو کرو کہ اگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور کرشنؑ اور زرتشتؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن نعوذ باللہ من ذالک ناکام رہتے تو کیا وہ آئندہ نسلوں میں قوم کے ہیرو کے طور پر یاد کیے جاتے؟ اُن کی اپنی قوم دھوکہ باز اور دغا باز کہتی۔ تاریخیں اُن کے ذکر کو نظر انداز کر دیتیں اور وہ ہمیشہ کے لیے بدنامی کے گڑھے میں گر جاتے۔ پس اُن کے دعویٰ میں اور نپولین اور ہٹلر وغیرہ کے دعویٰ میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اُن کی کامیابیوں اور ان کی کامیابیوں میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پھر ذرا ان لوگوں کے انجام کو بھی دیکھو۔ نپولین، ہٹلر اور چنگیز خاں کو کتنے لوگ عقیدت اور محبت سے یاد کرتے ہیں۔ ہیرو تو وُہ ہیں کہ ان کا قبضہ قوم کے ایک حصّہ کے دماغوں پر بھی ہو۔ لیکن کیا اُن کے ہاتھوں اور پاؤں اور دلوں پر بھی اُن کا قبضہ ہے؟ لاکھوں آدمی ہر زمانہ میں ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اِس طرف آنکھ اُٹھائی ہے جس طرف اُٹھانے کے لیے ان لوگوں نے کہا تھا۔ اور اُس بات کو سُنا ہے جس کے سننے کی اُن لوگوں نے اجازت دی تھی اور وہی فقرات زبان پر لائے ہیں جن فقرات کے بولنے کی اُن کی طرف سے ہدایت تھی اور اُن کے ہاتھ اور پاؤں انہیں کاموں کے لیے چلے ہیں جن کاموں میں حصّہ لینے کی انہوں نے ترغیب دی تھی۔ کیا دوسرے قومی لیڈروں کے متعلق اس مثال کا لاکھواں یا کروڑواں حصّہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے؟ پس یہ لوگ یقیناً خدا تعالیٰ کی طرف سے تھے اور اُن کے لائے ہوئے مذہب یقیناً خدا تعالیٰ کی طرف سے تھے۔

بانیانِ مذاہب کی تعلیم میں اختلاف کی وجہ

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب خدا تعالیٰ کی طرف سے تھے تو اُن کی تعلیمات میں اختلاف کیوں تھا؟ کیا خدا تعالیٰ مختلف تعلیمیں دے سکتا ہے جبکہ کوئی عقلمند انسان بھی مختلف تعلیمیں نہیں دیا کرتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی قسم کے حالات میں مختلف قسم کی تعلیمیں نہیں دی جاتیں بلکہ مختلف حالات میں مختلف تعلیمیں دینا ہی حکیم ہستیوں کا کام ہوتا ہے۔ آدمؑ کے زمانہ میں تمام بنی نوع ایک ہی جگہ رہتے تھے اِس لیے اُن کے لیے ایک ہی قسم کی تعلیم کافی تھی۔ شاید نوحؑ تک بھی یہی حالت تھی مگر مَیں اس کے متعلق قطعی رائے نہیں رکھتا۔ بائبل کہتی ہے کہ بابل کے زمانہ تک تمام قومیں ایک ہی جگہ پر رہتی تھیں۔ گو بائبل تاریخ کی کتاب نہیں لیکن ایک بات بائبل کے اِس دعویٰ کی تائید میں مجھے تاریخ سے نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ دُنیا کی تمام اقوام میں یہاں تک کہ بعض جزائر کے وحشی قبائل میں

بھی طوفانِ نوحؑ کی خبر ملتی ہے۔ چونکہ ایسا طوفان جو ساری دنیا پر آیا ہو اور پھر ساری دنیا کو اُس کے عالمگیر ہونے کا علم بھی ہو۔ یہ ایک غیر طبعی سا دعویٰ ہوگا۔ اِس لیے یہی بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کے کسی ایک مقام پر یہ طوفان آیا اور اِس کے بعد لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ پس گو بابل کے زمانہ تک دنیا کا ایک ہونا ثابت نہ ہو مگر نوحؑ کے زمانہ تک دنیا کا ایک ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اختلاف مذاہب کی بنیاد نوحؑ کے زمانہ کے بعد کسی وقت جب بنی نوع انسان متفرق ملکوں میں پھیل گئے۔ اور وہ تعلیم جو نوحؑ نے دی تھی آہستہ آہستہ خراب ہونے لگی تو بوجہ اس کے کہ آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے اور ایک ملک کے نبی کی آواز دوسری جگہ نہیں پہنچتی تھی۔ خدا تعالیٰ نے مختلف ملکوں میں اپنے نبی بھیجے تاکہ کوئی قوم اُس کی ہدایت سے محروم نہ رہ جائے۔ اور اس سے اختلاف مذاہب کی بنیاد پڑی۔ چونکہ بنی نوع انسان کی دماغی حالت ابھی تکمیل کو نہ پہنچی تھی اور علم اور عقل اپنے نقطہ مرکزی کو نہ پہنچے تھے اِس لیے ہر ملک اور اس ملک کی دماغی حالت کے مطابق تعلیمات نازل ہوئیں۔ جب نسلیں ترقی کر گئیں اور غیر ممالک آباد ہونے شروع ہوئے اور آبادیوں کے فاصلے کم ہوتے چلے گئے اور ذرائع آمد و رفت میں ترقی ہوتی چلی گئی۔ کشتیوں نے جہازوں کی صورت، اور جہازوں نے بادبانی جہازوں کی صورت اختیار کر لی۔ پاؤں پر چلنے والوں نے بیلوں پر چڑھنا شروع کر دیا پھر اونٹوں، گدھوں، گھوڑوں پر چڑھنا شروع کیا اور پھر آرام اور سہولت سے سفر کرنے کے لیے بیلوں، گھوڑوں اور گدھوں کو گاڑیوں میں جوتنا شروع کیا۔ اور پھر اِن گاڑیوں اور جہازوں نے سڑکوں اور سمندروں کے ذریعہ سے دُور دُور تک آمد و رفت کے سلسلہ کو جاری کیا۔

تمام بنی نوع کے لیے ایک کامل دین کا ظہور اور توحید پر زور

جب انسانی دماغ اِس حد تک پہنچ گیا کہ مختلف حالات کے متوازی تعلیمات کو سمجھ سکے اور موقع مناسب پر اُن کا استعمال کر سکے۔ جب انسان باہمی میل جول کے بعد اِس نتیجہ پر پہنچنے کے قابل ہوا کہ سب بنی نوع انسان ایک ہی ہیں اور سب کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے اور سب کو ہدایت دینے والا ایک ہادی ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ریگستان عرب کی بستی مکّہ میں اپنا وہ آخری پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا جس کی پہلی آیت میں یہ ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وہ خدا تعالیٰ تمام تعریفوں کا مستحق ہے جو ہر قوم اور ہر ملک کی یکساں ربوبیت کرنے والا ہے اور اُس کی ربوبیّت کا پہلو کسی ایک قوم یا ایک ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جس کے کلام کا خاتمہ بھی ان آیات پر ہوتا ہے کہ تو کہہ مَیں اُس خدا کی پناہ طلب کرتا ہوں جو تمام بنی نوع انسان کا ربّ ہے۔ جو تمام بنی نوع کا بادشاہ ہے۔ جو تمام بنی نوع انسان کا معبود ہے۔ یہ شخص یقیناً آدم ثانی تھا جس طرح آدم اوّل کے زمانہ میں ایک ہی کلام اور ایک ہی اُمّت تھی اِسی طرح اِس کے زمانہ میں بھی ایک ہی کلام اور ایک ہی اُمت ہوگئی۔ پس اگر اس دنیا کا پیدا کرنے والا خدا ایک ہی ہے اور اگر وہ تمام اقوام اور تمام ممالک کے ساتھ یکساں تعلق رکھتا ہے۔ تو ضروری تھا کہ کسی وقت تمام قومیں اور تمام افراد ایک نقطۂ مرکزی کی طرف جھکتے یا ایک نقطہ پر جمع ہونے کا سامان اُن کے لیے پیدا کیا جاتا۔ اور اس غرض کو قرآن کریم پورا کرتا ہے۔ قرآن کریم کے بغیر دنیا کی رُوحانی پیدائش بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دنیا اگر روحانی طور پر ایک نقطہ پر جمع نہیں ہوتی تو خدائے واحد کی وحدانیت کس طرح ثابت ہو سکتی ہے۔ شروع شروع میں دریاؤں

کے کئی نالے ہوتے ہیں مگر دریا آخر ایک بڑے وسیع رستہ میں اکٹھا ہو کر چل پڑتا ہے تبھی اس کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ موسیٰؑ عیسیٰؑ، زرتشتؑ، کرشنؑ اور دوسرے انبیاء کی تعلیمات پہاڑی نالے تھے۔ اپنی اپنی جگہ وہ بھی مفید کام کر رہے تھے مگر ان نالوں کا ایک دریا میں مل جانا خدا تعالےٰ کی وحدانیت اور بنی نوع انسان کی انتہائی ترقی پر پہنچنے کے لیے نہایت ضروری تھا۔

قرآن مجید کے سوا کسی نبی کی تعلیم سب قوموں کیلئے نہ تھی

اگر قرآن اِس غرض کو پورا نہیں کرتا تو کس نبی کی کتاب اِس غرض کو پورا کرتی ہے؟ کیا بائبل اِس غرض کو پورا کرتی ہے جو خدا کو بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص کر دیتی ہے؟ کیا زرتشت اِس ضرورت کو پورا کرتا ہے جو خدا کے نُور کو ایرانیوں کے ساتھ والبتہ کر دیتا ہے؟ کیا ویدؔ اس ضرورت کو پُورا کرتے ہیں جو ویدوں کے سننے والے شودر کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالنے کا ارشاد کرتے ہیں؟ کیا بُدھ اِس ضرورت کو پُورا کرتے ہیں جن کا ذہن ہندوستان کی چار دیواری سے باہر کبھی گیا ہی نہیں؟ ہاں کیا مسیحؑ کی تعلیم اِس غرض کو پورا کرنے والی ہے۔ جو خود کہتا ہے کہ:-

"یہ مت خیال کرو کہ مَیں تورات یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے آیا ہوں۔ مَیں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پوری کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو۔" (متی ۵/۱۷و۱۸)

اور موسیٰؑ اور گذشتہ نبیوں نے عالمگیر مذہب کے متعلق جو کچھ خیالات ظاہر کئے ہیں وہ مَیں اوپر لکھ ہی چکا ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیت نے ساری دنیا کو تبلیغ کی ہے۔ مگر یہ تبلیغ مسیح کے ذہن میں تو نہ تھی۔ سوال اس کا نہیں کہ دنیا کیا کرتی ہے۔ سوال اس بات کا ہے کہ بھیجنے والے خدا کا منشاء کیا تھا اور اُس منشاء کو مسیح کے سوا کون ظاہر کر سکتا ہے۔ مسیح خود کہتا ہے

"مَیں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا"۔ (متی ۱۵/۲۴) اور کہ

"ابن آدم آیا ہے کہ کھوئے ہوئے کو ڈھونڈ کے بچاوے۔" (متی ۱۸/۱۱)

پس مسیح کی تعلیم سوائے بنی اسرائیل کے اور کسی کیلئے نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مسیح نے دوسری اقوام کی طرف جانے کی بھی ہدایت کی تھی جیسے کہ اُس نے کہا

"تم جا کر سب قوموں کو شاگرد کرو اور اُنہیں باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔" (متی ۲۸/۱۹)

مگر اس حوالہ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسیح نے بنی اسرائیل کے سوا اور قوموں کی طرف بھی جانے کی ہدایت کی تھی درست نہیں کیونکہ مسیح خود کہتا ہے کہ:-

"تم جو میرے پیچھے ہو لیے۔ جب نئی خلقت میں ابن آدم جلال کے تخت پر بیٹھے گا۔ تم بھی بارہ تختوں پر بیٹھو گے اور اسرائیل کے بارہ گروہوں کی عدالت ہو گی۔" (متی ۱۹/۲۸)

اِس آیت سے ظاہر ہے کہ مسیح کی حکومت تا ابد بنی اسرائیل کے بارہ گروہوں پر ہے نہ کہ دوسری قوموں پر۔ اسی طرح مسیح کہتا ہے۔ "میں بنی اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔" (متی ۱۵/۲۴)

پھر اُس نے ہدایت کی طالب عورت کو جو کہ اسرائیلی نہ تھی بلکہ کنعان کی رہنے والی تھی کہا کہ :-

"مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کُتوں کے آگے پھینک دیویں۔" (متی ۱۵/۲۶)

پھر وہ کہتا ہے۔"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ پہلے بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ۔" (متی ۱۰/۵-۶)

یہ خیال نہ کیا جائے کہ اس جگہ "پہلے" کا لفظ ہے اور مطلب یہ ہے کہ پہلے اسرائیلی شہروں میں جاؤ اور پھر غیر اسرائیلی شہروں میں جانا۔ کیونکہ اِس جگہ خالی اسرائیلیوں کے شہروں میں پھرنا مراد نہیں بلکہ اسرائیلیوں کو مسیحی بنانا مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب تک اسرائیلی مسیحی نہ ہو جائیں کسی کی طرف توجہ نہ کرنا۔ اور خود مسیح نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ کام مسیح ثانی کی آمد تک پورا نہ ہوگا۔ چنانچہ اس باب کی آیت ۲۳ میں لکھا ہے

"جب وے تمہیں ایک شہر میں ستاویں تو دوسرے میں بھاگ جاؤ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے جب تک کہ ابن آدم نہ آئے گا۔"

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں بنی اسرائیل کے شہروں میں پھر جانا مراد نہیں۔ کیونکہ یہ کام تو چند مہینوں میں ہو سکتا تھا۔ بلکہ اِس سے مراد بنی اسرائیل کا مسیحیت میں داخل ہونا ہے۔ اور مسیح فرماتے ہیں کہ اُن کی آمدِ ثانی تک یہ کام پُورا نہیں ہوگا۔ پس مسیح کی آمد ثانی تک غیر قوموں کو مخاطب کرنے میں مسیحی لوگ حق بجانب نہیں بلکہ مسیح کی تعلیم کے خلاف چلنے والے ہیں۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری بھی غیر اقوام میں اناجیل کی منادی کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ چند رسولوں کے متعلق لکھا ہے :-

"وے جو اس جور و جفا سے جو کہ استیفن کے سبب برپا ہوئی تتر بتر ہو گئے تھے پھرتے پھرتے فینیکے و کپرس اور انطاکیہ میں پہنچے مگر یہودیوں کے سوا کسی کو کلام نہ سُناتے تھے۔" (اعمال ۱۱/۱۹)

اِسی طرح جب حواریوں نے سنا کہ پطرس نے ایک جگہ غیر قوموں میں انجیل کی منادی کی ہے تو وہ سخت ناراض ہوئے اور جب پطرس یروشلم میں آیا تو مختون اُس سے یہ کہہ کر بحث کرنے لگے کہ تو نامختونوں کے پاس گیا! اور اُن کے ساتھ کھایا (اعمال ۱۱/۲-۳)

پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی شخص بھی نہیں تھا جس نے ساری دنیا کو خطاب کیا ہو۔ اور قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہ تھی جس نے ساری دنیا کو مخاطب کرنے کا دعویٰ کیا ہو۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے ساری دنیا کو مخاطب کر کے کہا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (اعراف ع ۲۰)

اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں پس قرآن کریم کا آنا اُن اختلافات کے مٹانے کے لیے جو وقتی اور قومی تعلیموں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ضروری تھا اگر قرآن نہ آتا تو دنیا پر یہ بھی ثابت نہ ہوتا کہ دنیا کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے اور نہ یہ ثابت ہوتا کہ دنیا ایک خاص مقصود کو مدنظر رکھ کر پیدا کی گئی ہے پس گذشتہ مذاہب کا اختلاف اِس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ دنیا کو متحد کرنے والی

آخری تعلیم کے رستہ میں روک نہیں بلکہ اُن کا وجود ہی ایک ایسی تعلیم کا متقاضی ہے۔

دُوسرا سوال اور اُس کا جواب

دوسرا سوال یہ ہے کہ انسانی دماغ اسی طرح ارتقاء کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے نہیں جا رہا تھا جس طرح انسانی جسم نے کسی زمانہ میں ارتقاء کی منزلیں طے کی تھیں۔ پھر کیا جس طرح جسم کی ارتقائی منزلیں ایک مقام پر پہنچکر ایک مستقل صورت اختیار کر گئیں۔ اسی طرح کیا رُوح اور دماغ کے لیے بھی یہ ضروری نہ تھا کہ وہ ارتقائی منزلوں کو طے کرتے ہوئے ایک ایسی منزل پر پہنچتا جو انسانی پیدائش کا مقصود تھی۔

تمدّن و تہذیب اور کلچر سے کیا مراد ہے؟

اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ مختلف ممالک کی تہذیب اور تمدّن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا پر تہذیب و تمدّن کے کئی دَور آئے ہیں۔ اور بعض دَور تمدّن اور تہذیب کے اتنے شاندار گذرے ہیں کہ بادی النظر میں وہ دَور ہمارے موجودہ دَور کے بالکل مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر مکینیکل ترقی کو الگ کر دیا جائے تو پُرانا دَورِ تمدّن موجودہ دَورِ تمدّن کے بالکل مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح پُرانا دَورِ تہذیب بھی موجودہ زمانہ کے دَورِ تہذیب کے بہت حد تک مشابہ نظر آتا ہے۔ مگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو دو فرق ہمیں نمایاں نظر آتے ہیں لیکن بیشتر اس کے کہ مَیں ان امتیازوں کا ذکر کروں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمدّن یعنی سویلیزیشن اور تہذیب یعنی کلچر سے میری کیا مراد ہے۔ میرے نزدیک تمدّن ایک خالص مادی نقطۂ نگاہ ہے مادی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی اعمال میں جو یکسانیت اور سہولت پیدا ہو جاتی ہے وہ میرے نزدیک تمدّن کہلاتی ہے۔ انسانی اعمال کے نتیجہ میں جس قسم کی اور جس قدر پیداوار دنیا میں ہو۔ اُس کو ایک دوسری جگہ پہنچانے کے لیے نقل و حرکت کے جتنے ذرائع موجود ہوں۔ مال کو سہولت کے ساتھ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی طرف منتقل کرنے کے لیے جتنی تدبیریں کی گئی ہوں۔ تعلیم جتنی رائج ہو۔ صنعت و حرفت کو جتنا منظم کر لیا گیا ہو۔ سائنس کی طرف قوم میں جتنا میلان پایا جاتا ہو۔ اور ملک میں امن کے قیام کے لیے جس حد تک فوجی تنظیم کی گئی ہو۔ یہ چیزیں لازمی طور پر انسان کے اعمال پر اثر ڈالتی ہیں۔ اور ان چیزوں میں جو ملک ترقی یافتہ ہو اُس کے افراد کی زندگی دوسری اقوام کے افراد کی زندگی سے نمایاں طور پر الگ نظر آتی ہے۔ اور میرے نزدیک اسی کو تمدّن یا سویلیزیشن کہتے ہیں۔ ایک زراعتی طور پر غیر تعلیم یافتہ ملک کے لوگوں کی غذا یقیناً زراعتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ملک کی نسبت مختلف ہوگی۔ زراعتی طور پر ترقی یافتہ ملک طبّی طور پر تجویز کردہ اور زبان کے ذائقہ کے مطابق خوراک استعمال کرے گا۔ اور اُس کی خوراک میں بہتات ہوگی۔ مگر زراعت میں غیر ترقی یافتہ ملک کے لوگوں کی خوراک میں نہ طبی اصول مدّنظر رکھے جا سکیں گے۔ نہ ذائقہ کا سوال مدّنظر ہوگا۔ قدرت نے جو غذا اُن کے ملک میں پیدا کر دی ہے وہ اسی کے کھانے پر مجبور ہوں گے۔ اور اس سے آگے ان کی نگاہ جا ہی نہیں سکے گی۔ اسی طرح ایک صنعت و حرفت میں پیچھے رہ جانے والا ملک صنعت و حرفت میں ترقی کر جانے والے ملک کا مقابلہ لباس اور مکان اور مکان کے فرنیچر میں بھی نہیں کر سکتا۔ مکانوں کی حفاظت اور نگہداشت میں بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اُس ملک کے پاس اتنے کپڑے نہیں ہوں گے کہ اُس کے ماہر اس فکر میں لگ جائیں کہ اِن

کپڑوں کو کس کس شکل میں استعمال کیا جائے۔ مختلف کوٹوں کی ساخت اور اُن کے استعمال کے مواقع تو الگ رہے ان لوگوں کو تو کپڑے کی کمی کی وجہ سے خود کوٹ کا بھی خیال نہیں آسکتا۔ بلکہ وہ لوگ تو کرتے کو بھی ایک عیاشی سمجھیں گے۔ بکروٹے کے چمڑے کے بُوٹ تو الگ رہے، اُن کے لیے تو بھینس کے صاف شدہ چمڑے کے بوٹوں پر اصرار کرنا بھی ناممکن ہوگا۔ بلکہ ان کے لیے تو جُوتی بھی ایک عیاشی کا خیال ہوگی۔ اور وہ یا تو ننگے پاؤں پھرنے کو زندگی کا ایک معمول سمجھیں گے یا بالوں والے چمڑے تسموں کے ساتھ پَیر کو باندھ کر یہ خیال کریں گے کہ ہم ایک نعمتِ عظمیٰ کے مالک ہوگئے ہیں۔ چونکہ میں یہ مضمون ضمناً لکھ رہا ہوں اس کی تفصیلات میں بیان نہیں کرتا لیکن ایک ادنیٰ تدبر سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ زندگیوں کا یہ فرق محض زراعت، صنعت وحرفت، سائنس اور تعلیم کے فرق کا نتیجہ ہے۔ مگر فرق اتنا بڑا ہے کہ ایک قسم کی زندگی کے عادی لوگ دوسری قسم کی زندگی کے عادی لوگوں کے ساتھ مل کر بیٹھنا بھی برداشت نہیں کرسکیں گے۔ یہی چیز میرے نزدیک تمدّن یعنی سویلیزیشن کہلاتی ہے اور اس کے اختلافات پر دنیا کی صلح اور دنیا کی جنگ کا بہت کچھ انحصار ہے۔ یہی تمدّن آخر امپیریل ازم اور خواہشِ عالمگیر انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے۔

دُوسری چیز تہذیب یعنی کلچر ہے۔ اِس کو تمدن سے وہی نسبت ہے جو رُوح کو جسم سے ہے۔ تمدّن مادی ترقی کا نتیجہ ہے اور تہذیب دماغی ترقی کا نتیجہ ہے۔ تہذیب یعنی کلچر اُن افکار اور ان خیالات کا نتیجہ ہے جو کسی قوم میں مذہب یا اخلاق کے اثر کے نیچے پیدا ہوتے ہیں۔ مذہب ایک بنیاد قائم کرتا ہے اور مذہب کے پَیرو اس بنیاد پر ایک عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ خواہ وہ بنیاد رکھنے والے کے خیالات سے کتنے بھی دُور چلے جائیں وہ بنیاد کو چھوڑ نہیں سکتے۔ جس شخص نے عمارت کی بنیاد رکھی ہو اُس کے نقشہ سے عمارت بنوانیوالے کے نقشہ کو کتنا بھی اختلاف ہو پھر وہ بنیاد کے کونوں اور زاویوں سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اِسی طرح دنیا میں مختلف مذاہب اور مختلف فلسفوں نے انسانی دماغ کو خاص خاص رستوں پر چلایا ہے اور اُس کے نتیجہ میں افکار نے جو صورت اختیار کی ہے وہ اخلاق اور آرٹ کی نقل میں ایسی مخصوص نوعیتیں اختیار کر گئی ہے کہ دیکھنے والا مختلف مذاہب کے سچے پیروؤں کے اصولِ اخلاق اور آرٹ کے ظہور کو جُدا جدا صورتوں میں دیکھتا ہے اور یہی چیز کلچر ہے۔

مختلف کلچر بھی قوموں میں اختلاف کا موجب ہیں

یہ چیز بھی قوموں میں اختلاف کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ آج دنیا میں دہریت غالب ہے۔ آج دنیا میں وسعت خیالی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ مگر باوجود اس کے ایک عیسائی کہلانے والے دہریہ اور ایک متعصب عیسائی میں جس سہولت کے ساتھ اس کا جوڑ اور اتفاق ہوجاتا ہے۔ اِس سہولت کے ساتھ اس کا اتفاق مسلمان کہلانے والے دہریہ یا ایک متعصب مسلمان سے نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ زمانہ کے اختلاف میں پولیٹیکل خیالات کا بھی جو کہ تمدّن یعنی سویلیزیشن کا نتیجہ ہیں بہت کچھ دخل ہے مگر کلچر کے اختلاف کا بھی اس سے کم دخل نہیں۔ مسلمان خواہ یورپ کا رہنے والا ہو جب اُسے ایشیائی مسلمان ملتا ہے تو جس طرح اُس کے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ اُس طرح یورپ کے عیسائی کے ساتھ ملنے سے اس کے دل کی کلی نہیں کھلتی۔ جس طرح یورپ کے ایک متعصب عیسائی کے دل کی کلی امریکہ کے ایک دہریہ عیسائی کے ساتھ مل کر کھل جاتی ہے۔ اُس طرح یورپ کے

ایک مسلمان کے ساتھ مل کر نہیں کھلتی۔

کیا اِس کی وجہ تعصّبِ مذہب ہے؟ یقیناً نہیں۔ کیونکہ اگر تعصّب مذہب اِس کا باعث ہوتا تو چاہیئے تھا کہ یہ تعصّب ایک عیسائی کو ایک دہریہ کا مسلمان کی نسبت زیادہ مخالف بناتا۔ اصل وجہ یہی ہے کہ ایک عیسائی خواہ وہ دہریہ ہوگیا ہو مگر اُس کی تہذیب یا کلچر عیسائی ہے۔ اُس کا فکر تو عیسائیت سے آزاد ہوگیا ہے مگر اُس کی طبیعت اور افعال عیسائیت کی تہذیب سے آزاد نہیں ہوئے۔ کیونکہ نسلوں کے اثر کو یکدم مٹایا نہیں جاسکتا۔ ایک آرٹسٹ خواہ دہریہ ہو اُس کی تصویریں اس کی میوزک اور اُس کی تعمیر عیسائی کلچر سے جدا نہیں ہوسکتی اور اگر وہ جدا ہوگی تو وہ ایک بھونڈی سی چیز نظر آئیگی جیسے گلاب کے باغ میں کیکر کا درخت لگا دیا جائے۔

اِس تشریح کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمدّن اور تہذیب کے دَور کبھی تو الگ الگ آتے ہیں اور کبھی ایک ہی وقت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی کبھی کسی ملک میں تمدّنی دَور آیا ہے لیکن تہذیبی دَور نہیں آیا اور کبھی تہذیبی دَور آیا ہے اور تمدّنی دَور نہیں آیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے روم اپنے اقتدار کی حالت میں ایک اچھے تمدّن کا نمونہ پیش کرنے والا تھا لیکن اُس کی کوئی تہذیب یا کلچر نہیں تھی۔ اُن کا آرٹ اور اُن کا فلسفہ مقررہ ابتدائی اصول کے تابع نہ تھا۔ بلکہ ہر شخص کا ذہن آزادانہ طور پر کام کر رہا تھا۔ مسیح کے زمانہ میں پہلی چند صدیوں میں عیسائیت نے کوئی تمدّن تو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا لیکن ایک اعلیٰ درجہ کی تہذیب اور کلچر پیش کیا۔ وہ بھی ایک اصول اور ایک خاص دائرہ کے اندر کام کرنے والے لوگ تھے لیکن ان کے اصول اور اُن کے دائرے مذہب کے تعیین کردہ تھے لیکن روم کے اصول اور دائرے مادّیات کے مقرر کردہ تھے پس ابتدائی روم تمدّن کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا اور ابتدائی عیسائیت کلچر کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ روم کے دوسرے دَورِ ترقی میں تمدن اور کلچر مل گئے۔ روم نے جب عیسائیت قبول کی تو اُس میں تمدّن بھی تھا اور تہذیب بھی تھی لیکن اُس کا تمدّن تہذیب کے تابع تھا جیسا کہ آج کل یورپ میں تمدّن بھی ہے اور تہذیب بھی ہے مگر بوجہ مادّیت کے غلبہ کے اُس کی تہذیب اُس کے تمدن کے تابع ہے۔

تہذیب و تمدّن کے مختلف اَدوار

ہم تاریخ عالم کے ابتدائی دَوروں میں دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں مذہب نے اچھا فلسفہ، اخلاق اور اچھی تہذیب پیدا کی ہے وہ ہمارے زمانہ کے بہت قریب آگئی ہے اور جہاں جہاں مادّیت نے عمدہ تمدن پیدا کیا ہے وہ تمدّن ہمارے تمدّن کے بہت قریب آگیا ہے لیکن دو فرق نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسلام سے پہلے کا تمدّن اور تہذیب ہم کو عالمگیر نظر نہیں آتے اور کوئی تہذیب اور تمدّن ایک شاخ سے نکلی ہوئی نظر نہیں آتی یعنی مادّیت اور مذہب ایک ہی جڑ کی دو نوں شاخیں نظر نہیں آتیں۔ یا اگر آتی ہیں تو نامکمل صورت میں یہودی مذہب میں بیشک تمدن کو تہذیب کے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی ہے اور تورات نے بہت حد تک سوسائٹی کے نظم و نسق کو اور اُس کی مادی ترقی کو بھی مذہب کے دائرہ میں لانے کی کوشش کی ہے مگر بائبل کی یہ کوشش ابتدائی کوشش تو کہلا سکتی ہے، کامیاب اور آخری کوشش نہیں کہلا سکتی۔ یہی حال ہندو مذہب اور زرتشتی مذہب کا ہے۔

ایک لچکدار تعلیم کی ضرورت

زندگی کی ہزاروں ضرورتوں کے متعلق قانونِ اخلاق کا وہ لچکدار فلسفہ جو ہر موقع اور ہر ضرورت پر کام آسکے، ان

مذاہب میں مفقود ہے۔ ایک ٹھوس غیر لچکدار تعلیم نامکمل صورت میں تمدن کے متعلق بھی پائی جاتی ہے لیکن وسیع انسانی دنیا کی غیر لچکدار تعلیم رہنمائی نہیں کر سکتی۔ انسان کو دوسرے حیوانات سے یہی تو امتیاز حاصل ہے کہ سب کے سب انسان بظاہر ایک بھی ہیں اور سب کے سب ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں۔ دنیا کی تمام بھینسیں اور تمام شیر او تمام چیتے اور تمام باز اور تمام مچھلیاں غرض نباتات خواہ حیوانات ہوں یا جمادات۔ خواہ حیوانات سمندری ہوں یا ہوائی ہوں یا خشکی کے ہوں، اُن کی شکلیں بھی ایک ہیں اور اُن کے دماغ بھی ایک ہیں۔ اُن کی شکلیں بھی ایک قسم کا قانون چاہتی ہیں اور اُن کے دماغ بھی ایک قسم کا قانون چاہتے ہیں، لیکن انسان اِس بات میں منفرد ہے۔ تمام انسان ایک قسم کی شکل اور ایک قسم کے اعضاء لیکر پیدا ہوتے ہیں، لیکن اُن کے دماغی افکار ایک دوسرے سے اتنے جدا ہوتے ہیں کہ بسا اوقات بیوی مشرق میں ہوتی ہے تو خاوند مغرب میں۔ یا باپ مغرب میں ہوتا ہے تو بیٹا مشرق میں۔ ایسی ہستیوں کو جمع کرنے کے لیے یقیناً ایک لچکدار تعلیم کی ضرورت ہے جو اپنی لچک کے ساتھ اپنے قانون کی شدت کا ازالہ کر دے اور ہر نوعیت کے خیالات کو ایک رسّی میں باندھ دے۔

یہودی اور عیسائی کلچروں کے بعد ایک نئے کلچر کی ضرورت

دنیا میں جوں جوں ترقی ہوتی چلی گئی ہے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اِس طرف آنے کی کوشش کرتی رہی ہے موسیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک مذہب بھی دیا اور ایک تمدن بھی دیا مگر غیر لچکدار تمدن انسانی فطرت کو تسلّی نہ دے سکا۔ جونہی بنی اسرائیل کے دماغوں میں نئے افکار اور نئے خیالات اور نئی اُمنگیں پیدا ہوئیں اور اُنہوں نے ایک نئے آسمان میں اُڑنا شروع کر دیا۔ موسیٰ کا تمدن اُن سے بہت پیچھے رہ گیا۔ اس تمدن نے نئے زمانہ کے اسرائیلیوں کو اچھا شہری نہیں بنایا۔ بلکہ یا تو باغی بنا دیا۔ یا منافق شہری بنا دیا۔ مسیح نے اس حالت کو دیکھا تو پکار اُٹھا کہ شریعت لعنت ہے۔ کیونکہ اُس نے دیکھ لیا کہ موسوی شریعت نے غیر لچکدار ہونے کی وجہ سے انسانوں کو یا تو باغی بنا دیا یا منافق بنا دیا۔ مگر یہ اُس وقت نہیں ہُوا جب موسیٰ دنیا میں آئے تھے بلکہ اُس کے صدیوں بعد ایسا ہوا۔ موسوی تعلیم ایک بچے کا کوٹ تھا جو جوان ہو جانے کی صورت میں بنی اسرائیل کے جسم پر درست نہیں آسکتا تھا۔ مسیح نے ان مضحکہ خیز شکلوں کو دیکھا جو تنومند جوانوں کی شکل میں بچوں کے چھوٹے چھوٹے فراک پہنے پھر رہے تھے اور مسیح کی فطرت نے اِس سے بغاوت کی۔ نہیں بلکہ مسیح کے دل میں خدا کی آواز بولی۔ دیکھو یہ لوگ اُس حالت سے آگے نکل چکے ہیں جس حالت میں موسوی تعلیم کا وہ نقشہ اُن کے لیے کافی ہو سکتا تھا جو بنی اسرائیل کے علماء نے موسیٰ کے زمانہ میں کھینچا تھا۔ اب اُن کے لیے ایک نئے کوٹ کی ضرورت ہے۔ مگر اُس نے جو علاج اُن کے لیے تجویز کیا زیادہ درست یہ ہے کہ جو علاج صدیوں بعد کے عیسائیوں نے مسیح کے مُنہ سے بیان کیا۔ یہ تھا کہ شریعت لعنت ہے۔ وہ کھانا جو انسان معدہ کی طاقت کو نظر انداز کر کے کھاتا ہے یقیناً ایک لعنت ہوتا ہے۔ مگر اِس قول سے بھی زیادہ اور کوئی احمقانہ قول نہیں کہ کھانا لعنت ہے۔ بچے کا کوٹ بڑے آدمی کے جسم پر یقیناً مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔ مگر بڑے کا کوٹ بچے کے جسم پر بھی تو مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ بچے کا کوٹ بڑے انسان کے جسم پر مضحکہ انگیز

ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بڑے آدمی کا کوٹ بچے کے جسم پر مضحکہ انگیز ہے۔ مگر کوٹ کو مضحکہ انگیز تو کوئی بیوقوف ہی کہیگا پس میرے نزدیک تو مسیح کی طرف اِس قول کو منسوب کرنا ظلم ہے۔ یقیناً مسیح نے یوں کہا ہوگا کہ موسوی تعلیم کی موجودہ تشریح آج کل کے زمانہ کے لوگوں کے لیے لعنت ہے۔ اگر اُس نے ایسا کہا تو بالکل سچ کہا۔ مگر مسیح کے اتباع نے اس فاضلانہ قول کو ایک احمقانہ شکل دے دی۔ مگر بہر حال خواہ مسیح نے وہ کہا جو مَیں سمجھتا ہوں کہ اُس نے کہا تھا۔ اور خواہ وہ کہا جو عیسائیوں کے علماء سابق نے غلطی سے سمجھا کہ اُس نے یہ کہا تھا۔ بہر حال یہ تو ثابت ہے کہ انسانی دماغ موسٰی کے زمانہ سے ترقی کر کے آگے نکل چکا تھا۔ اس کے لیے ایک نئی تعلیم کی ضرورت تھی۔ ایک نئے اصولِ اخلاق کی ضرورت تھی۔ ایک نئے تمدّن کی ضرورت بھی اور ایک نئی تہذیب کی ضرورت تھی۔ لیکن جہاں موسوی علماء نے انسان کی گردن میں رسّہ لپیٹ کر اس کو ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ وہاں عیسوی تعلیم نے انسان کو تمام اخلاقی اور مذہبی قیود اور پابندیوں سے آزاد کر کے حیوان بنا دیا۔ موسوی قانون نے یہودی دماغ کو اپنے زمانہ سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ سوائے اس کے کہ وہ باغی ہو یا منافق ہو اور عیسائی قانون نے انسان کو تمام اخلاقی ذمہ واریوں سے آزاد کر دیا۔ اور اس کے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ خدا کا قانون تیری اصلاح نہیں کر سکتا۔ تب انسان نے خدا کے کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انسان نے اپنی نجات کیلئے اپنا رستہ آپ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اور دنیا نے یہ عجیب نظارہ دیکھا کہ وہی مذہب جو نجات کے لیے خدا کی رہنمائی کو ضروری قرار دیتا تھا اُس نے اپنی ترقی کے لیے خدا کی رہنمائی کو غیر ضروری قرار دے دیا۔ چونکہ ہمارے سامنے مختلف مذاہب میں سے مکمل کڑی صرف بنی اسرائیل کے مذہب کی ہے اِس لیے میں نے اس کی مثال پیش کی ہے کیونکہ مسلسل کڑیوں سے ہی ارتقاء کا مسئلہ نکالا جا سکتا ہے اور اسرائیلی مذہب کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسانی دماغ پُرانے زمانہ میں ارتقاء کی منزلیں طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ اسی طرح دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسانی دماغ تمدن کے مختلف اَدوار میں سے گذرتا چلا آیا ہے۔ مگر پھر بھی اخوّت انسانی کے نقطہ مرکزی تک وہ کبھی نہیں پہنچ سکا۔ پس یہ دونوں شہادتیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں۔ کہ جس طرح انسانی جسم نے پیدائش عالم کے ابتدائی دَور میں ارتقاء کی منزلیں طے کی تھیں اسی طرح انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں ارتقاء کی منزلیں طے کرتا چلا آیا تھا لیکن اسلام سے پہلے وہ کبھی بھی ارتقاء کی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔ اپنی تمدّنی ترقیوں کے ادوار میں وہ کبھی بھی قومی اور نسلی امتیازوں سے بالا نہیں ہُوا۔ اور انسانی اخوّت کا مسئلہ اُس کے ذہن میں نہیں آیا۔ نہ اپنی تہذیبی ترقی کے اَدوار میں اُس نے شریعت اور قانون کے آخری نقطہ کو پایا۔ موسوی تعلیم نے تمدّن اور تہذیب کو جمع کرنے کی کوشش کی مگر ایک عرصہ کے بعد وہ ناکام ہو گئی۔ کیونکہ اُس کا فیصلہ اس بارہ میں آخری فیصلہ نہ تھا۔ مسیح نے تبدیلی کرنی چاہی۔ مگر وہ تبدیلی اُس بغاوت کے طوفان کے آگے خس و خاشاک کی طرح اُڑ گئی جو اُس وقت انسانوں کے دماغ میں پیدا ہو رہا تھا۔ مسیح کی تعلیم کا صرف یہی حصّہ باقی رہ گیا جو انجیل نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ شریعت ایک لعنت ہے۔ حالانکہ ہر سمجھ دار انسان سمجھ سکتا ہے کہ یہ فقرہ اپنی موجودہ شکل میں خود ایک بہت بڑی لعنت ہے۔

جس نے انسان کو خدا تعالیٰ سے برگشتہ اور اس کی رہنمائی سے آزاد کر دیا۔ پس ابھی مقام ارتقاء باقی تھا۔ انسانی تہذیب اور تمدن کے سابق تغیرات اِس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ تہذیب و تمدن بھی اسی طرح مسئلہ ارتقاء کے ماتحت ہیں جس طرح انسانی جسم۔ اور ضرور ہے کہ دنیا ایک دن اسی طرح تمدن اور تہذیب کا آخری ارتقائی مقام دیکھے جس طرح انسانی جسم کی پیدائش نے ارتقاء کا آخری مقام دیکھا۔ اور یہ حقیقت اسلام سے پہلے تمام مذاہب کی موجودگی میں بھی ایک اور مذہب کی ضرورت کو تسلیم کرواتی ہے اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کا قرآن کریم مدعی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب

تیسرا سوال جس کا مثبت میں جواب ملنے سے قرآن کریم کی ضرورت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ کیا پہلی کتب میں کوئی ایسا نقص تو نہیں آگیا تھا جس کی وجہ سے ایک نئی کتاب کی ضرورت شدید طور پر دنیا کو محسوس ہو رہی تھی۔ اور قرآن کریم اِس ضرورت کو پورا کرنے والا تھا؟

سب سے پہلی چیز جو کسی کتاب کو صحیح معنوں میں مفید بنا سکتی ہے اور جسکی بناء پر اس سے اچھے نتائج کی امید کی جا سکتی ہے وہ اُس کا بیرونی دست بُرد سے محفوظ ہونا ہے۔ الٰہی کتابوں کو انسانی کتابوں پر یہی فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ اگر ہم کسی کتاب کو الٰہی کتاب تسلیم کر لیتے ہیں تو ہمیں اِس بات کی بھی تسلّی ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ سے ہم کسی قسم کی غلطی میں نہیں پڑینگے کیونکہ خدا تعالیٰ کے وجود پر ایمان اسی بات پر مشتمل ہے کہ وہ ایسی ہستی جو نور ہی نور ہے اور اس میں ظلمت بالکل نہیں، ہدایت ہی ہدایت ہے اور اس میں گمراہی بالکل نہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ پر ایمان اس یقین پر مشتمل نہ ہو تو پھر اس کی کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر الٰہی کلام بھی غلطیوں سے پُر ہو سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان اپنی رہنمائی کو چھوڑ کر خدا تعالیٰ کی رہنمائی کو قبول کرے پس الٰہی کتاب پر ایمان کی بنیاد اس یقین پر ہے کہ وہ غلطیوں سے پاک ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک کتاب الٰہی تو ہو لیکن بعد میں انسانی دست بُرد نے اسکو خراب کر دیا ہو۔ اگر کسی الٰہی کتاب کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اُسکے اندر انسانوں نے بھی کچھ اپنی طرف سے ملا دیا ہے تو پھر وہ کتاب انسانی ہدایت کے لیے بیکار ہو جائیگی اور اس کو پڑھنے والوں کے دلوں میں اُس پر عمل کرنے کے لیے کبھی بھی وہ جوش پیدا نہ ہوگا جو جوش ایسے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے جو اُس کتاب کو کلّی طور پر شروع سے آخر تک خدا تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

بائبل انسانی دست بُرد سے محفوظ نہیں ہے

جب اس نقطۂ نگاہ سے ہم پہلی کتب کو دیکھتے ہیں تو وہ قطعی طور پر ہمارے لیے تسلّی کا موجب ثابت نہیں ہوتیں۔ عہد نامۂ قدیم کے ماننے والے اُسکو خدا تعالیٰ کی کتاب کہتے ہیں۔ مسیحی بھی اسے خدائی کتاب قرار دیتے ہیں اور مسلمان بھی اسے خدا ہی کی طرف سے نازل شدہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن خدا کی طرف سے نازل ہونا اور اسی صورت میں آج تک موجود ہونا۔ ان دونوں باتوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔ بیشک مذکورہ بالا تینوں قومیں اس بات پر متفق ہیں کہ عہد نامہ قدیم کے انبیاء سے خدا بولتا تھا لیکن عقیدۃً یہ تینوں قومیں اس بات پر متفق نہیں

کہ موجودہ عہد نامۂ قدیم وہی کلام ہے جو اُن انبیاء پر نازل ہُوا تھا۔ اور نہ بیرونی اور نہ اندرونی شہادت اِس بات پر دلالت کرتی ہے کہ موجودہ عہد نامۂ قدیم وہی کلام ہے، جو بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہُوا تھا۔ اسرائیلی تاریخ اس بات پر متفق ہے کہ بنوکدنضر کے زمانہ میں اسرائیلی صحف جلا دئے گئے تھے۔ اور برباد کر دیئے گئے تھے۔ اور دوبارہ اُنہیں عزؔرا نبی نے لکھا۔ چنانچہ عزرا کی نسبت یہودی کتب میں لکھا ہے:۔

"شریعت بُھلادی گئی تھی مگر عزرا نے پھر اُسے دوبارہ قائم کیا۔"

"It was forgotton but Eazra restored it". (Sak. 20 a)

پھر لکھا ہے۔ عزرا نے تورات کو دوبارہ زندہ کیا اور اس میں اشورین حروف داخل کیے۔

"Ezra established the text of Pentateuch, introducing therein the Assyrian of square characters". (Sank. 21 b)

اِسی طرح لکھا ہے"۔ اس نے تورات کو دوبارہ لکھنے کے وقت مسودے کے بعض لفظوں کی صحت کے متعلق شبہ ظاہر کیا۔ اور اُن پر نشان لگا دیئے اور کہا کہ اگر ایلیاؔ نبی اس عبارت کی تصدیق کرے تو یہ نشان غلط قرار دیئے جائیں۔ اور اگر وہ اِن مشکوک سمجھی ہوئی عبارتوں کو مشکوک قرار دے تو جن الفاظ پر نشان لگا دئے گئے ہیں۔ انہیں آئندہ بائبل سے نکال دیا جائے۔

He showed his doubts concerning the correctness of some words of the text by placing points over them. Should Elijah, said he, approve the text, the points will be disregarded; should he disapprove, the doubtful words will be removed from the text. (Ab. PN. XXIV).

اِن عبارات سے ظاہر ہے کہ توریت جس شکل میں بھی اُس وقت موجود تھی خواہ عزرا کی لکھی ہوئی تھی خواہ پہلے سے کوئی نسخے موجود تھے وہ مشکوک تھے۔ اور اُس کی عبارتوں اور الفاظ کی نسبت قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح نازل ہوئے تھے۔ عزرا کی لکھی ہوئی کتاب جس کو موجودہ بائبلوں میں سے خارج کر دیا گیا ہے، لیکن درحقیقت وہ موجودہ بائبلوں سے کم قابلِ اعتبار نہیں ہے اور جسے یونانی کی کتاب عزرا کہا جاتا ہے پہلے زمانے میں عزؔرا اور نحمیاؔہ کی کتابوں سے بھی پہلے بائبل میں درج کی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں جیرومؔ (جو عیسائیوں کا ایک بہت بڑا پادری تھا) سے اس وقت کے پوپ نے بائبل کی تدوین کرائی تھی۔ اس نے اس بنا پر اس کو بائبل سے نکالنے کا فیصلہ کر دیا کہ اس کا عبرانی نسخہ محفوظ نہیں۔ اس کتاب کو بعض مصنّف عزرا کی کتاب ثالث قرار دیتے ہیں اور بعض ثانی قرار دیتے ہیں۔ بہرحال گو اُسے بائبل سے نکال دیا گیا ہے لیکن پھر بھی اکثر حصّہ یہودیوں اور مسیحیوں کا

اس کو عزرا کی کتاب قرار دیتا ہے اور اس کتاب کے چودھویں باب میں لکھا ہے:-
"دیکھو اے خدا میں جاؤں گا جیسا کہ تُو نے مجھے حکم دیا تھا اور جو لوگ موجود ہیں مَیں اُن کو فہمائش کرونگا، لیکن جو لوگ بعد کو پیدا ہوں گے اُن کو کون فہمائش کرے گا۔ اس طرح دنیا تاریکی میں ہے اور جو لوگ اس میں رہتے ہیں بغیر روشنی کے ہیں کیونکہ تیرا قانون جل گیا۔ پس کوئی نہیں جانتا اُن چیزوں کو جو تُو کرتا ہے اور اُن کاموں کو جو شروع ہونے والے ہیں لیکن اگر مجھ پر تیری مہربانی ہے تو روح القدس کو مجھ میں بھیج اور میں لکھوں جو کچھ کہ دنیا میں ابتداء سے ہُوا ہے اور جو کچھ تیرے قانون میں لکھا تھا تاکہ تیری راہ کو پاویں اور وہ لوگ جو اخیر زمانہ میں ہونگے زندہ رہیں۔ اُس نے مجھ کو یہ جواب دیا کہ جا اپنے راستہ سے لوگوں کو اکٹھا کر اور اُن سے کہہ کہ وہ چالیس دن تک تجھ کو نہ ڈھونڈیں۔ لیکن دیکھ تو بہت سے صندوق کے تختے تیار کر اور زآریا۔ ڈبریا۔ سلیمیا۔ ایکانس اور عازیل پانچوں کو جو بہت تیزی سے لکھنے والے ہیں۔ اپنے ساتھ لے اور یہاں آ۔ اور مَیں تیرے دل میں سمجھ کی شمع روشن کروں گا جو نہ بجھے گی۔ تاوقتیکہ وہ چیزیں پوری نہ ہوں جو تو لکھنی شروع کرے گا"

اس باب کی آیت ۲۰ تا ۲۵ کے اصل الفاظ انگریزی زبان میں مندرجہ ذیل ہیں:-

20. Behold Lord, I will go, as Thou hast commanded me, and reprove the people whcih are present but they that shall be born afterward, who shall admonish them? Thus the world is set in darkness, and they that dwell therein are without light.

21. For thy law is burnt, therefore no man knoweth the things that are done of the works that shall begin.

22. But if I have found grace before thee. Send the Holy Ghost unto me. And I shall write all that hath been done in the world since the beginning, which were written in thy law that men may find thy path, and that they which will live in the latter days may live.

23. And he answered me, saying, Go thy way, gather the people together, and say unto them, that they seek thee not for forty days.

24. But look thou prepare thee many box trees and take with thee, Sarea, Dabria, Selemia, Ecanus, and Asiel these five which are ready to write swiftly.

25. And come hither, and I shall light a candle of understanding in thine heart which shall not be put out, till the things be performed which thou shalt begin to write." ·(Apocrypha 11. ESDRAS. 14)

غرض حضرت عزرا اور پانچ زُود نویس چالیس روز تک دوسروں سے الگ تھلگ جا بیٹھے اور الہامی تائید سے انہوں نے چالیس دن میں دو سو چار کتابیں لکھیں۔ چنانچہ اس باب کی چوالیسویں آیت میں لکھا ہے :-

44. In forty days they wrote two hundred and four books". (Apocrypha 11 ESDRAS. 14)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ :-

(ا) عزرا نبی کے وقت جو قریباً چار سو سال قبل مسیح تھا تورات اور دیگر انبیاء کی کتابیں جل گئی تھیں۔

(ب) اُن کا نسخہ اُس وقت موجود نہ تھا۔

(ج) عزرا نے دوبارہ ان کتابوں کو لکھا۔

گویا یہ بتایا گیا ہے کہ وہ الہامی تھیں، مگر مراد الہامی تائید ہے۔ یہ مراد نہیں کہ اُن کا ایک ایک نقطہ الہام تھا۔ کیونکہ یہودی تاریخ بتاتی ہے کہ خود عزرا نے بعض حصّوں کے مشکوک ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ اور ان کا فیصلہ ایلیا پر اُٹھا رکھا تھا پس موجودہ تورات وہ تورات نہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ بلکہ وہ تورات ہے جو عزرا نے اپنے حافظہ سے لکھی تھی اور جس کے بعض حصوں کے متعلق خود عزرا کو بھی شبہ تھا بلکہ میں تو کہتا ہوں یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ وہ تورات بھی نہیں ہے جو عزرا نے لکھی تھی۔ کیونکہ عزرا نے ۲۰۴ کتابیں لکھی تھیں مگر ۲۰۴ کتابیں موجودہ بائبل میں ہمیں نہیں ملتیں۔

عزرا کے حافظہ کے متعلق خود مسیحی مصنفوں کو بھی شبہات ہیں۔ چنانچہ ریورنڈ آدم کلارک بائبل کے مشہور مسیحی مفسّر اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۹۱ء کے صفحہ ۱۶۸۱ پر استواریخ باب ۴ آیت ۷ کے ماتحت لکھتے ہیں :-

" اس جگہ غلطی سے عزرا نے بیٹے کی جگہ پوتا لکھ دیا ہے۔ ایسے اختلافوں میں تطبیق بے فائدہ ہے":-

علماءِ یہود کہتے ہیں کہ عزرا کو معلوم نہ تھا کہ بعض بعض کے بیٹے ہیں یا پوتے۔ جب یہودی اور عیسائی علماءٗ کا عزرا کے حافظہ کے متعلق یہ خیال تھا، تو یہودیوں اور عیسائیوں کے عوام الناس اور دوسری اقوام کے لوگ اس پر کیا تسلّی پا سکتے ہیں اور جس کتاب کی سند ایسی ہو وہ روحانی معاملات میں کیوں کر لوگوں کی تشفی کا موجب ہو سکتی ہے۔

اندرونی شہادت کہ موجودہ تورات اصلی تورات نہیں

اب میں بائبل کی اندرونی شہادت کو لیتا ہوں کہ وہ بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ موجودہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب نہیں۔ اس بارہ میں سب سے اہم اور واضح وہ دلیل ہے جو استثناء باب ۳۴ میں حضرت موسیٰ کی وفات کو بیان کرتی ہے۔ اس آیت میں لکھا ہے :۔

"سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مرگیا اور اُس نے اُسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔ پر آج کے دن تک کوئی اُس کی قبر کو نہیں جانتا۔" (آیت ۵ و ۶)

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ اِس کا مضمون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں سال بعد استثناء میں بڑھایا گیا ہے بھلا کون عقلمند یہ تسلیم کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو الہام میں فرمایا ہو کہ آج تک تمہاری قبر کوئی نہیں جانتا۔ کیا کسی زندہ انسان سے ایسا کلام کیا جاسکتا ہے اور پھر کیا "آج تک" کا لفظ اس بارہ میں خود اُس کو مخاطب کرکے کہا جاسکتا ہے؟ پھر آیت ۸ میں لکھا ہے :۔

"سو بنی اسرائیل موسیٰ کے لیے موآب کے میدانوں میں تیس دن تک رویا کیے اور ان کے رونے پیٹنے کے دن موسیٰ کیلئے آخر ہوئے"

یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ یہ موسیٰ کا کلام نہیں۔ موسیٰ کی کتاب میں بعد میں داخل کیا گیا ہے۔ پھر آیت ۱۰ میں لکھا ہے :۔

"اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں آیا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا"

یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کا الہام نہیں۔ بلکہ اُن کی وفات کے کئی سو سال بعد کسی نے یہ آیت حضرت موسیٰ کی کتاب میں داخل کی ہے۔ ممکن ہے وہ عزرا ہی ہوں اور ممکن ہے کوئی اور ہی شخص ہوں۔

دوسری اندرونی دلیل اس بات کی کہ موجودہ تورات حضرت موسیٰ کے بعد لکھی گئی اور اُس میں دوسرے لوگوں کی تحریریں بھی شامل ہیں یہ ہے کہ پیدائش باب ۱۴ آیت ۱۴ میں لکھا ہے :۔

"جب ابرام نے سُنا کہ میرا بھائی گرفتار ہُوا تو اُس نے اپنے ساتھ سیکھے ہوئے تین سو اٹھارہ خانہ زادوں کو لیکر دان تک اُن کا تعاقب کیا"

لیکن قاضیون باب ۱۸ آیت ۲۷-۲۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر جس کا نام پیدائش میں "دان" آیا ہے پہلے لیس کہلاتا تھا لیکن موسیٰ کے کوئی اسّی سال بعد اس شہر کو فتح کرکے اُس کا نام "دان" رکھا۔ چنانچہ لکھا ہے :۔

"وہ میکاہ کی بنوائی ہوئی چیزوں کو اور اُس کاہن کو جو اُس کے ہاں تھا، لیکر لیس میں ایسے لوگوں کے پاس پہنچے جو امن اور چین سے رہتے تھے اور اُن کو تہ تیغ کیا اور شہر جلا دیا اور بچانے والا کوئی نہ تھا۔ کیونکہ وہ صیدا سے دور تھا اور یہ لوگ کسی آدمی سے سروکار نہیں رکھتے تھے اور وہ شہر بیت رحوب کے پاس کی وادی میں تھا۔ پھر انہوں نے وہ شہر بنایا اور اس میں رہنے لگے اور اس شہر کا نام اپنے باپ "دان" کے نام پر جو اسرائیل کی اولاد تھا دان رکھا لیکن پہلے اس شہر کا نام لیس تھا۔"

پس جو نام حضرت موسیٰ کے اسّی سال بعد رکھا گیا تھا وہ موسیٰ کی کتاب میں کس طرح آسکتا تھا؟ اس حوالہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ کی کتاب میں اُن کی وفات کے بعد دخل اندازی ہوتی رہی اور بعض لوگوں نے اپنے زمانہ

کے خیالات اور افکار اُس میں داخل کر دئے۔ یہ تغیّر و تبدّل صرف موسیٰ کی کتابوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دوسری کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ یشوع کی کتاب کے باب ۲۴ آیت ۲۹ میں لکھا ہے۔ "اور ایسا ہُوا کہ بعد ان باتوں کے نون کا بیٹا یشوع خداوند کا بندہ جو ایک سو دس برس کا بوڑھا تھا رحلت کر گیا"۔ اِسی طرح ایوب کی کتاب باب ۴۲ آیت ۱۷ میں لکھا ہے، "اور ایوب بوڑھا اور عمر دراز ہو کے مرگیا۔ اِن حوالوں سے صاف ظاہر ہے کہ یشوع کی کتاب کو یشوع نے نہیں لکھا اور ایوب کی کتاب کو ایوب نے نہیں لکھا۔ بلکہ بعد کے لوگوں نے سُنی سُنائی باتوں کی بناء پر لکھ دی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے انبیاء نے تو الٰہی کلام ایک جگہ جمع کر دیا تھا مگر بعد میں مٹ گیا۔ اور لوگوں نے اپنی یاد سے وہ کلام دوبارہ لکھا اور بہت سی باتیں اپنی طرف سے اُس میں داخل کر دیں۔

اِس قسم کی کتابیں جو نہ صرف تاریخی شواہد کی بنا پر بلکہ اپنی اندرونی شہادت کی بناء پر بھی مجروح اور غیر یقینی ہیں اور ان میں غلط واقعات بھی بیان ہو گئے ہیں۔ کیا یہ ثابت نہیں کرتیں کہ دنیا کو موسیٰؑ اور اُن کے بعد آنے والے نبیوں کی کتابیں تسلی نہیں دے سکتی تھیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور ایک ایسی کتاب کی امید دنیا کو دلا دی جو ہر قسم کی انسانی دستبرد سے پاک اور محفوظ ہو گی۔ اگر موسیٰؑ اور اُس کے بعد کے آنے والے نبیوں کی کتابوں کے بگاڑ کے بعد بھی خدا تعالیٰ کسی ایسے کلام کی بنیاد نہ رکھتا جو یقینی اور محفوظ ہوتا، تو ہمیں ماننا پڑتا کہ خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کا کوئی فکر نہیں اور وہ ایمان کے بیج کو یقین اور اطمینان کی زمین میں بونے کی بجائے شک و شبہ اور بے اطمینانی کی زمین میں بونا چاہتا ہے۔ اور اُسے اِتنا اعتبار بھی بخشنا نہیں چاہتا جتنا کفر کو حاصل ہے۔ لیکن کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ کیا یہ امر خدا تعالیٰ کی شان کے شایاں ہے؟ اگر نہیں تو ہمیں یقیناً اُس کتاب کی تلاش کرنی پڑے گی جس نے منسوخ، محرّف اور مبدّل بائبل کی جگہ لی۔

بائبل کی متضاد باتیں

بائبل سے اور بھی ایسی اندرونی شہادتوں کا پتہ لگتا ہے، جو اس بات پر روشنی ڈالتی ہیں کہ بائبل اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں ہے۔ مثلاً

۱۔ تورات کی پہلی کتاب پیدائش میں لکھا ہے۔ "تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بناویں"۔ (باب ۱ آیت ۲۷) آگے چل کر لکھا ہے۔ "لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا" (پیدائش ۲ آیت ۱۷)

اب ان دونوں حوالوں میں تطابق کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ نیک و بد کی پہچان خدا کو بھی نہیں۔ کیونکہ آدم خدا کی مانند تھا اور خدا تعالیٰ کی صفات آدم میں پائی جاتی تھیں اور سب سے بڑی صفت نیک و بد کی پہچان ہی ہے کیونکہ سب صفتیں اُس کے ماتحت ہی آتی ہیں۔ اگر آدم کو نیک و بد کی پہچان نہ تھی تو کوئی اچھی صفت بھی بطور خلق کے اس کے اندر نہیں پائی جاتی تھی۔ کیونکہ نیک کام وہی ہوتا ہے جو ارادے اور علم کے ساتھ کیا جاتا ہے جس کام کے ساتھ ارادہ اور علم نہ ہو وہ نیک نہیں کہلا سکتا۔ جب آدم کو نیک و بد کی پہچان ہی نہ تھی، تو

آدم اصولِ اخلاق کے ماتحت نہ کسی بدی سے بچنے والا تھا اور نہ کسی نیکی کو بجالانے والا تھا۔ اسی طرح عملی طور پر اُسے اچھی اور بُری باتوں کی کوئی تمیز نہ تھی۔ کیا خدا تعالیٰ کا وجود بھی یہودی اور مسیحی مذہب کے مطابق ایسا ہی ہے؟ کیا خدا کو اس بات کا کوئی علم نہیں کہ نیکی کیا چیز ہے اور بدی کیا چیز ہے؟ اگر بدی اور نیکی کا اُس کو علم نہیں تو وہ نبیوں کو کیوں بھیجتا ہے اور کیا خدا کی صفات نیکیوں کو قائم کرنے والی اور بدیوں کو مٹانے والی نہیں ہیں۔ اگر اس سوال کو ہم نظر انداز بھی کر دیں کہ انسان کی پیدائش کی غرض ہی نیک و بد کی پہچان ہے اور اگر یہ پہچان اُسے حاصل نہ ہو تو اُس کے وجود کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ بغیر نیک و بد کی پہچان کے آدم خدا کی مانند ہو کس طرح گیا۔ اِس پہچان کے بغیر وہ خدا کی مانند ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ خدا کی مانند تھا تو یہ غلط ہے کہ اُسے کہا گیا کہ تُو نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا۔ اور اگر یہ درست ہے کہ اُسے کہا گیا تھا کہ نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا۔ تو یہ غلط ہے کہ خدا نے اُسے اپنی مانند بنایا۔

۲۔ پیدائش باب ۲ آیت ۱۷ میں لکھا ہے "جس دن تُو اس نیک و بد کی پہچان کے درخت سے کھائیگا تو ضرور مریگا"۔ اسی طرح پیدائش باب ۲ آیت ۹ میں لکھا ہے"۔ اور باغ کے بیچوں بیچ حیات کے درخت اور نیک و بد کی پہچان کے درخت کو زمین سے لگایا"۔ اِس آیت کے دو ہی معنے ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ ایک ہی درخت میں دائمی حیات بخشنے اور نیک و بد کی پہچان دینے کی خاصیت تھی اور یا یہ کہ یہ دو درخت تھے۔ ایک میں حیات بخشنے کی طاقت تھی اور دوسرے میں نیک و بد کی پہچان دینے کی طاقت تھی۔ اگر اس کے معنے یہ لیے جائیں کہ یہ دو درخت نہیں تھے بلکہ ایک ہی درخت تھا۔ تو پیدائش ب۲ آیت ۱۷ کا حوالہ جو اُوپر لکھا جا چکا ہے کہ "جس دن تُو اُس سے کھائے گا ضرور مرے گا"۔ غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آیت ۹ تو اُسے حیات کا درخت قرار دیتی ہے موت کا نہیں۔ اور اگر یہ دو الگ الگ درخت تھے تو پھر بھی یہ دونوں آیتیں متضاد ہیں۔ کیونکہ نیک و بد کی پہچان کے درخت سے کھانے سے موت کا آنا لازمی نہ تھا۔ کیونکہ اگر آدم حیات کے درخت سے کھا لیتے جیسا کہ بائبل سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے کھایا تو نیک و بد کی پہچان کے درخت سے کھانے کے باوجود اُن پر موت کیوں کر آئی۔ اگر ایک درخت کے کھانے سے موت لازماً آنی تھی، تو دوسرے درخت کا پھل کھانے سے حیات جاودانی مل جانی تھی۔ ایسے شخص کا معاملہ تو کوئی عقل حل ہی نہیں کر سکتی کہ ایک درخت اُسے ہمیشہ کے لیے زندہ رکھنا چاہتا ہے اور دوسرا درخت اُسے مار دینا چاہتا ہے۔

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور اُن کی بیوی نے حیات کے درخت کا پھل کھایا ہے کیونکہ پیدائش ب۳ آیت ۲ و ۳ میں لکھا ہے "عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل ہم تو کھاتے ہیں مگر اُس درخت کے پھل کو جو باغ کے بیچوں بیچ ہے خدا نے کہا کہ تم اُسے نہ کھانا اور نہ اُسے چھونا ایسا نہ ہو کہ مر جاؤ"۔ اِن آیات سے ظاہر ہے کہ سوائے نیک و بد کی پہچان کے درخت کے باقی سب درختوں کا پھل آدم اور اُس کی بیوی کھاتے تھے۔ اگر بائبل کی یہ بات درست ہے تو آدم اور اس کی بیوی حیات کے درخت کا پھل بھی کھاتے تھے اور جب وہ حیات کے درخت کا پھل بھی کھاتے تھے تو اُن پر موت کس طرح آئی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ باب ۳ کی آیت ۲۲ میں لکھا ہے کہ خدا نے فرشتوں سے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ آدم اپنا ہاتھ بڑھائے اور

حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔"

یہ آیت بتاتی ہے کہ آدم نے حیات کے درخت سے کچھ نہ کھایا تھا۔ اب ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس آیت کا مضمون درست ہے جو بتاتی ہے کہ آدم نے حیات کے درخت سے کچھ نہ کھایا تھا یا اس باب کی آیت ۲ درست ہے جس میں آدم کی بیوی کا قول درج ہے کہ سوائے نیک و بد کی پہچان کے درخت کے باقی سب درختوں کا پھل آدم اور حوّا کھاتے تھے اور آیا یہ بات درست ہے کہ نیک بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے انسان ضرور مرتا ہے یا یہ بات درست ہے کہ حیات کے درخت کا پھل کھانے سے انسان کبھی نہیں مرتا۔

یہ سب متضاد باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں ایسی باتیں نہیں آسکتیں۔ یقیناً یہ باتیں مختلف مصنّفین نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق تورات میں درج کر دیں۔ اور چونکہ اُن مصنّفین کے خیالات متضاد تھے اِس لیے اُن کے پیش کردہ نظریے بھی متضاد تھے اور جس کتاب میں متضاد باتیں آجائیں جو ایک ہی وقت میں اور ایک ہی انسان میں کسی صورت میں جمع نہ ہو سکیں۔ اور وہ کتاب اُن کو ایک ہی وقت اور ایک ہی انسان میں جمع کرتی ہو تو یقیناً وہ خدا کی کتاب تو الگ رہی ایک عقلمند انسان کی کتاب بھی کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی مگر موسیٰ علیہ السلام خدا کے نبی تھے اور تورات یقیناً خدا کی نازل کردہ کتاب تھی پس یہ اختلاف بعد میں پیدا ہوا نہ اس اختلاف سے خدا تعالیٰ پر کوئی الزام آتا ہے اور نہ موسیٰ پر۔ ہاں یہ ہم ضرور کہیں گے کہ خدا نے جب بائبل کی جگہ ایک و کتاب نازل کرنے کا فیصلہ کر لیا تو بائبل کی حفاظت سے اُس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور وہ ایک محفوظ کتاب نہ رہی۔

۳۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۴ میں لکھا ہے "اور ابراہام نے اس مقام کا نام "یہوواہ یری" رکھا۔ چنانچہ یہ آج تک کہا جاتا ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر دیکھا جائے گا۔" لیکن خروج باب ۶ آیت ۲ و ۳ میں لکھا ہے "پھر خدا نے موسیٰ کو فرمایا اور کہا میں خداوند ہوں "یہوواہ" اور مَیں نے ابراہام اور اضحاق اور یعقوب پر خدائے قادر کے نام سے اپنے تئیں ظاہر کیا اور یہوواہ کے نام سے اُن پر ظاہر نہ ہُوا۔

اِن دونوں آیتوں کا تضاد ظاہر ہے۔ کتاب خروج کہتی ہے کہ یہوواہ کے نام سے پہلی بار موسیٰ کو روشناس کیا گیا۔ اس سے پہلے کسی نبی خصوصاً ابراہیم۔ اسحاق اور یعقوب پر خدا تعالےٰ کا یہوواہ نام ظاہر نہیں کیا گیا لیکن کتاب پیدائش کہتی ہے کہ ابراہیم پر بھی اس نام کو ظاہر کیا گیا تھا اور اُس نے ایک پہاڑی کا نام "یہوواہ یری" رکھ دیا تھا۔

۴۔ گنتی باب ۳۳ آیت ۳۸ میں حضرت ہارونؑ کے متعلق لکھا ہے "ہارون کاہن خداوند کے حکم کے مطابق کوہ طور پر گیا اور اُس نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے کے پیچھے چالیسویں برس کے پانچویں مہینے کی پہلی تاریخ وفات پائی۔ لیکن استثناء باب ۱۰ آیت ۶ میں لکھا ہے "تب بنی اسرائیل نے بیراث بنی یعقان سے موسیرہ کو کوچ کیا۔ وہاں ہارون کا انتقال ہُوا اور وہیں گاڑا گیا۔"

ایک ہی شخص دو جگہ وفات نہیں پا سکتا۔ یقیناً یہ دو الگ الگ مؤرخوں کا کام ہے کہ انہوں نے بائبل میں اپنی اپنی تحقیق کو خدا تعالےٰ کا الہام قرار دیکر شامل کر دیا۔

۵۔ ۱-سموئیل باب ۱۶ آیت ۱۰ تا ۱۳ سے ظاہر ہے کہ داؤد یسّی کا آٹھواں بیٹا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے "یسّی نے اپنے سات بیٹوں کو سموئیل کے سامنے نکالا اور سموئیل نے یسّی سے کہا کہ خدا نے اِن کو نہیں چنا ہے پھر سموئیل نے یسّی سے پوچھا کہ تیرے سب لڑکے یہی ہیں۔ اس نے کہا سب سے چھوٹا ابھی رہ گیا ہے وہ بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔ سموئیل نے یسّی سے کہا کہ اُسے بُلا بھیج کیونکہ جب تک وہ یہاں نہ آجائے ہم نہیں بیٹھیں گے۔ سو وہ اُسے بُلوا کر اندر لایا۔ وہ سُرخ رنگ اور خوبصورت اور حسین تھا۔ اور خداوند نے فرمایا اُٹھ اور اُسے مسح کر کیونکہ وہ یہی ہے۔ تب سموئیل نے تیل کا سینگ لیا اور اُسے اُس کے بھائیوں کے درمیان مسح کیا اور خداوند کی رُوح اس دن سے آگے داؤد پر زور سے نازل ہوتی رہی۔ پھر سموئیل اُٹھ کر رامہ کو چلا گیا۔

مگر ۱-تواریخ باب ۲ آیت ۱۳ تا ۱۵ میں لکھا ہے کہ داؤد یسّی کا ساتواں بیٹا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے "اور یسّی سے اس کا پلوٹھا الیاب پیدا ہُوا۔ اور ابیندآب دوسرا اور سمعَ تیسرا اینتنئیل چوتھا ردّی پانچواں۔ عوضم چھٹا داؤد ساتواں"۔ یہ اختلاف بتاتا ہے کہ بائبل میں مختلف مؤرخوں نے اپنے اپنے خیالات داخل کر دیئے ہیں اور یہ موجودہ حالت میں محفوظ آسمانی کتاب نہیں کہلا سکتی۔

۶۔ ۲-سموئیل باب ۶ آیت ۲۳ میں لکھا ہے "سو ساؤل کی بیٹی میکل مرتے دم تک بے اولاد رہی"۔ مگر ۲-سموئیل باب ۲۱ آیت ۸ میں لکھا ہے "اور ساؤل کی بیٹی میکل کے پانچوں بیٹوں کو جو برزلّی محولاتی کے بیٹے عدری ایل سے ہوئے تھے لے کر اُن کو جبعونیوں کے حوالے کیا"۔ ایک ہی کتاب میں ایک جگہ اُسے بانجھ قرار دیا گیا ہے اور اُسی کتاب میں دوسری جگہ اُس کے پانچ بیٹے قرار دیئے گئے ہیں۔

۷۔ ۲-تواریخ باب ۲۱ آیت ۱۹ و ۲۰ میں لکھا ہے کہ یہورام بادشاہ ۳۲ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا اور آٹھ برس اُس نے بادشاہت کی اور پھر دو سال بادشاہت سے معزول ہو کر ایک سخت بیماری کے اثر سے وفات پا گیا۔ گویا اس کی عمر ۴۲ سال کی تھی۔ لیکن اسی کتاب کے باب ۲۲ آیت ۱ و ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ یروشلم کے باشندوں نے اِس یہورام کے چھوٹے بیٹے اخزیاہ کو اُس کی جگہ بادشاہ بنایا۔ کیونکہ اس انبوہ نے جو عربوں کے ساتھ چھاؤنی میں آیا تھا سب بڑے بیٹوں کو قتل کیا تھا سو اخزیاہ بن یہورام یہوداہ کا بادشاہ ہُوا۔ اخزیاہ بیالیس برس کی عمر میں بادشاہ ہُوا"۔ چونکہ اُوپر کے حوالہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہورام کی عمر اُس کی وفات کے وقت ۴۲ سال کی تھی اس لیے اِس دوسرے حوالے کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہورام بادشاہ کا سب سے چھوٹا بیٹا اخزیاہ جب اپنے باپ کی وفات پر تخت پر بیٹھا تو اُس کی عمر بھی ۴۲ سال کی تھی۔ گویا وہ اپنے باپ کا ہم عمر تھا اور اس کے بڑے بھائی جن کو عربوں نے یہورام کے خلاف لڑائی میں مار دیا تھا وہ سب اپنے باپ سے بڑے تھے۔ کیا کوئی معقول انسان اِس قسم کی لغو باتوں کو تسلیم کر سکتا ہے۔ بیالیس سال کی عمر میں باپ مارا جاتا ہے اور اس کا سب سے چھوٹا بیٹا اُسی عمر کا اس کے بعد بادشاہ بن جاتا ہے یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ کسی کمزور سے کمزور عقل والے انسان کی کتاب میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ کجا یہ کہ خدا کی نازل کردہ کتاب میں پائی جائیں۔ صاف ظاہر ہے کہ خدا کے الہام میں یہ باتیں نہ تھیں۔ نبیوں کے کلام میں یہ باتیں نہ تھیں۔ کسی ایک آدمی نے بھی یہ باتیں نہیں لکھیں۔ بلکہ کئی آدمیوں نے اپنے اپنے خیالات

لکھ دیئے ہیں۔ کسی یہودی مؤرخ کا یہ خیال تھا کہ یہورام بیالیس سال کی عمر میں فوت ہُوا۔ اور اُس نے یہ بات لکھ دی کسی دوسرے یہودی مؤرخ کا یہ خیال تھا کہ یہورام جب مرا اُس کی عمر سو سال تھی اور اُس وقت اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا بیالیس سال کا تھا اُس نے یہ بات درج کردی کہ جب یہورام کا بیٹا تخت پر بیٹھا تو بیالیس سال کا تھا۔ اب یہ باتیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ جس نے یہورام کو ۴۲ سال میں مارا ہے اُس کے خیال میں اخزیاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت بیالیس نہیں تھی بلکہ شاید ۱۴-۱۵ سال ہو۔ اور جس شخص نے یہ لکھ دیا کہ اخزیاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت ۴۲ سال کی تھی اس کی تحقیق میں یہورام کی عمر اُس کی وفات کے وقت ۴۲ سال یقیناً نہیں تھی لیکن سوال تو یہ ہے کہ ایسی کتاب انسان کی روحانیت کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے اور وہ کس طرح یقین اور ایمان کے ساتھ اس کے مطالب پر غور کر سکتا ہے۔ اگر تو یہ کہا جاتا کہ تورات مجموعہ ہے لاکھوں یہودیوں کی تحقیقاتوں کا، تو پھر بھی اس کتاب کی کچھ قیمت باقی رہ جاتی۔ لیکن ایک طرف تو اُس کو خدا تعالےٰ کی طرف سے نازل ہونے والا کلام کہا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ ہزاروں ہزار افراد کی تحقیقاتوں کا مجموعہ نظر آتا ہے اور اس طرح ایک غلط نام دیدینے کی وجہ سے تھوڑی سی بہت عظمت جو اُسے حاصل ہو سکتی تھی وہ بھی جاتی رہی ہے۔ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی کتاب دنیا کی رہنمائی کا موجب ہو سکتی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کے بعد کسی اور کتاب کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بائبل کے ظالمانہ احکام

پھر صرف متضاد باتیں ہی نہیں ہمیں بائبل میں ظالمانہ احکام بھی نظر آتے ہیں جو ہرگز خدائے رحیم و کریم کی طرف منسوب نہیں کیے جا سکتے۔ مثلاً

۱۔ خروج باب ۲۱ آیت ۲۰ و ۲۱ میں لکھا ہے "اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو لاٹھیاں مارے اور وہ مار کھاتی ہوئی مرجائے تو اُسے سزا دی جائے لیکن اگر وہ ایک دن یا دو دن جئے تو اُسے سزا نہ دی جائے۔ اس لیے کہ وہ اُس کا مال ہے۔"

اس تعلیم میں غلاموں کے لیے کتنی سختی ہے۔ ایک ظالم اپنے غلام اور اپنی لونڈی کو لاٹھیوں سے مارتا ہے اور اتنا مارتا ہے کہ وہ غلام یا لونڈی ایک دو دن کے بعد مرجائے۔ لیکن بائبل کہتی ہے اب وہ سزا کا مستحق نہیں کیونکہ غلام اور لونڈی اُس کا مال ہیں۔ کیا یہ تعلیم اس قابل تھی کہ ہمیشہ کے لیے اُسے قائم رکھا جاتا۔ کیا یہ تعلیم ایسی نہ تھی کہ اس کی جگہ پر وہ تعلیم لائی جاتی جو غلام اور لونڈیوں کے دستور مٹانے والی اور مالک کے ہاتھوں کو روکنے والی ہوتی۔ یہ تعلیم اسلام ہی کے ذریعہ دنیا کو حاصل ہوئی چنانچہ اسلام نے جہاں غلامی کو مٹانے کے لیے قانون پاس کیے وہاں یہ اصول بھی مقرر کردیا کہ جو غلام یا لونڈی لوگوں کے ہاتھ میں کسی وجہ سے باقی رہ گئے ہوں اُن کو ہرگز مارا پیٹا نہ جائے۔ احادیث میں آتا ہے ایک دفعہ ابو مسعود انصاری اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ اُنہیں پیچھے سے آواز آئی۔ اے مسعود! جس قدر تجھ کو غلام پر مقدرت حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ

خدا کو تجھ پر مقدرت حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے مُڑ کر دیکھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے۔ اس ڈر کے مارے میرے ہاتھ سے کوڑا گر پڑا۔ اور میں نے کہا یا رسول اللہؐ یہ غلام خدا کے لیے آزاد ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تو اسے آزاد نہ کرتا تو آگ تیرا مُنہ جھلستی۔ (مسلم کتاب الایمان)

اسی طرح ایک اور صحابی فرماتے ہیں۔ ہم سات بھائی تھے اور ہمارے پاس ایک لونڈی تھی۔ ہم میں سے چھوٹے بھائی نے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اِس لونڈی کو فوراً آزاد کر دیا جائے۔ کیونکہ جو شخص اپنے غلام یا لونڈی کو مارتا ہے وہ اُس کو رکھنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔

خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنا یہ حال تھا کہ جب آپ کی شادی کے موقعہ پر آپ کی بیوی نے اپنا سب مال اور غلام آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے، تو آپ نے فرمایا میں کسی انسان کو اپنا غلام رکھنے کے لیئے تیار نہیں ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے سب غلام آزاد کر دیئے اور ساری عمر آپ نے کوئی غلام نہیں رکھا۔

۲۔ احبار باب ۲۰ آیت ۲۷ میں لکھا ہے کہ "مرد یا عورت جس کا یار دیو ہے یا جادوگر ہے تو دونوں قتل کیے جاویں، چاہیئے کہ تم اُن پر پتھراؤ کرو اور اُن کا خون اُنھی پر ہووے۔"

اسی طرح خروج باب ۲۲ آیت ۱۸ میں لکھا ہے "تو جادوگروں کو جینے مت دے"۔ یہ کیسی خلاف عقل تعلیم ہے اور پھر ظالمانہ بھی۔ اگر جادوگر سے مراد یہاں ہتھکنڈے دکھانے والے لوگ ہیں، تو وہ ایک معصوم پیشہ لوگ ہیں۔ انسان کی مشوش زندگی میں کبھی کبھی ہنسی اور مذاق کا وقت بھی آجاتا ہے۔ اُس وقت یہ لوگ اپنی دیرینہ مشقوں کے ذریعہ سے لوگوں کی توجہات کو زیادہ سنجیدہ مسائل سے اپنے ہتھکنڈوں کی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اِس بے ضرر پیشہ کو قتل کا موجب قرار دینا انصاف کی تعلیم نہیں کہہ سکتے اور اگر جادوگر سے مراد وہ روایتی جادوگر ہیں جو مرد کو بیل اور عورت کو چڑیا بنا دیتے ہیں، تو یہ تعلیم نہ صرف احمقانہ ہے بلکہ ظالمانہ بھی۔ کیونکہ ایسے جادوگر نہ کبھی ہوئے اور نہ کبھی ہونگے اور کسی کی طرف ایسے جادو منسوب کر کے قتل کر دینا ظالمانہ فعل ہے۔

استثناء باب ۷ آیت ۲ میں لکھا ہے "جبکہ خداوند تیرا خدا اُنہیں تیرے حوالہ کرے تو تُو اُنہیں ماریو اور حرم کیجیو نہ تو اُن سے کوئی عہد کیجیو اور نہ اُن پر رحم کیجیو"۔ ایک مغلوب دشمن کے متعلق یہ کیسی ظالمانہ تعلیم ہے۔ تمام دشمنوں کو قتل کر دینا۔ اُن کے ساتھ کسی قسم کا عہد نہ کرنا اور ہر قسم کے رحم سے اُنہیں محروم کر دینا یہ ظلم بادشاہوں کا فعل تو ہو سکتا ہے خدائے رحیم و کریم کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ یقیناً یہ تعلیم موسیٰ کے بعد آنیوالے سفّاک یہودیوں کے دماغوں کی اختراع ہے اور موسیٰ کی کتاب میں داخل کر کے اُس کو بھی گندہ کر دیا ہے۔

بائبل کی خلاف عقل باتیں

بائبل میں بعض ایسی باتیں ہیں جو بالکل خلاف عقل ہیں۔ مثلاً

۱ ۔ احبار باب ۱۱ آیت میں لکھا ہے خرگوش جگالی کرتا ہے۔

۲۔ اسی طرح گنتی باب ۲۲ آیت ۲۸ میں بلعام کی گدھی کے متعلق لکھا ہے کہ اُس نے بلعام سے باتیں کیں۔

۳۔ پیدائش باب ۴۶ آیت ۲۸ میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں آئے تھے تو ستر تھے، لیکن ۲۱۵ سال کے بعد یعنی موسیٰ کے زمانہ میں اُن کی تعداد اِس قدر بڑھ گئی کہ عورتوں اور بچوں کو نکال کر چھ لاکھ کے قریب پہنچ گئے۔ چنانچہ خروج باب ۱۲ آیت ۳۷ میں لکھا ہے" اور بنی اسرائیل نے رعمسیس سے "سکات" تک پیادے سفر کیا۔ اُن کے مرد سوا لڑکوں کے چھ لاکھ کے قریب تھے"۔ اگر مردوں کی تعداد کو ملحوظ رکھ کر عورتوں اور بچوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل تعداد ۲۵ لاکھ کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ مگر یہ سخت مبالغہ اور عقل کے خلاف بات ہے۔ ۲۱۵ سال میں ۷۰ آدمیوں کا ۲۵ لاکھ ہو جانا بالکل عقل کے خلاف بات ہے اور واقعہ کے بھی خلاف ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب مصر سے کنعان کی طرف ہجرت کی اور چالیس سال تک وہ جنگلوں میں پھرے تو کیا ۲۵ لاکھ آدمیوں کا روٹی کا انتظام چالیس پچاس سال تک اُن جنگلوں میں ہو سکتا تھا؟ بیشک بعض زمانوں کے متعلق بائبل میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اُن کے لیے آسمان سے بٹیر اُتارے اور زمین میں ترنجبین پیدا کر دی۔ لیکن بائبل کے بیان کے مطابق یہ خوراک سارے عرصہ کے لیے مہیّا نہیں ہوئی تھی۔ پھر دوسرے عرصہ میں اِتنے آدمیوں کے لیے خوراک کہاں سے لاتے تھے؟ پھر بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک چشمہ سے پانی بھی پی لیتے تھے۔ کیا کوئی عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک ایک چشمہ سے ۲۵ لاکھ آدمی پانی سے سیراب ہو سکتا ہے جن علاقوں سے وہ گذرے اُن میں ندیاں نہیں ہیں۔ کسی کسی جگہ پر چشمے ملتے ہیں اور چشمہ عام طور پر چند محدود فٹ پانی ہوتا ہے۔ اس سے ۲۵ لاکھ آدمی سیراب ہو سکتے ہیں؟ ایسی خلاف عقل بیان والی بائبل کس طرح بنی نوع انسان کے لیے تسلّی کا موجب ہو سکتی ہے۔ بیشک وہ خدا کی طرف سے تھی، بیشک خدا کے نبیوں نے اُسے لکھا تھا، لیکن وہ رَٹ چکی تھی۔ وہ مسخ ہو چکی تھی۔ وہ انسانی دست بُرد کا شکار ہو چکی تھی۔ ایسی کتاب کو اُس کے بگڑ جانے کے بعد بھی خدا تعالیٰ کا کلام کہنا دشمنوں کو خدا تعالیٰ پر اعتراض کرنے کا موقعہ دینا ہے۔ ضروری تھا کہ اِس کے بعد ایک اور کتاب آتی جو انسانی دست بُرد سے پاک ہوتی اور ایسی خلاف عقل باتوں سے محفوظ ہوتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں قرآن کریم نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ (البقرہ ع ۳۲) بنی اسرائیل جو فرعون کے ظلم سے ڈر کر بھاگے تھے ان کی تعداد صرف چند ہزار تھی۔ اور یہی بات صحیح اور درست ہے ورنہ ۲۵ لاکھ یہودی فلسطین کے چھوٹے چھوٹے قبائل سے ڈر کس طرح سکتے تھے۔ فلسطین کی آبادی تو اپنی شان و شوکت کے زمانہ میں بھی ۲۵۔۳۰ لاکھ سے نہیں بڑھی۔ آج کل بھی اُس کی آبادی ۱۳۔۱۴ لاکھ ہے اور اس میں اور زیادتی کرنے کے خلاف عرب سختی سے احتجاج کر رہے ہیں۔ پرانے زمانہ میں جبکہ خوراک اِدھر اُدھر پہنچانے کے سامان مفقود تھے غیر زرعی علاقوں میں بڑی آبادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ موسیٰؑ کے وقت میں یقیناً سارے فلسطین کی آبادی چند ہزار افراد پر مشتمل ہوگی۔ چنانچہ بنی اسرائیل اور ان کے دشمنوں کی لڑائیوں میں ہمیشہ سینکڑوں اور ہزاروں افراد کا ہی پتہ لگتا ہے۔ اگر موسیٰ کے ساتھ ۲۵ لاکھ آدمی فلسطین میں سے آئے تھے۔ تو سفر کا زمانہ تو الگ رہا حکومت کے زمانہ میں بھی خوراک کا انتظام نہ ہو سکتا تھا اور لڑائی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ یہ لوگ تو اپنے کندھوں کے دھکّوں سے ہی ان چند ہزار افراد سے فلسطین کو خالی کر سکتے تھے، جو اُن سے پہلے وہاں بس رہے تھے۔

۴۔ اِسی طرح تورات میں لکھا ہے "جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ سے اُترنے میں دیری کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اُسے کہا اُٹھ ہمارے لیے معبود بنا جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا ہے ہم نہیں جانتے کہ اُسے کیا ہُوا۔ ہارون نے اُنہیں کہا کہ زیور سونے کے جو تمہاری جوروؤں اور تمہارے بیٹوں اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں میں ہیں۔ توڑ توڑ کے مجھ پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ زیور جو اُن کے پاس تھے توڑ توڑ کر ہارون کے پاس لائے اور اُس نے اُن کے ہاتھوں سے لیا۔ اور ایک بچھڑا ڈھال کر اُس کی صورت چھینی سے درست کی۔ اور اُنہوں نے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ اور جب ہارون نے یہ دیکھا تو اُس کے آگے ایک قربانگاہ بنائی۔ اور ہارون نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کے لیے عید ہے اور وے صبح کو اُٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گذاریں اور لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اُٹھے۔" (خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۶) لیکن یہ بات کسی انسان کی عقل میں نہیں آسکتی۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ جس سے خدا کلام کرے وہ شرک کرنے لگ جائے۔ ایک ہاتھی کو دیکھنے والا اُسے چوہا نہیں قرار دے سکتا۔ ایک سورج کو دیکھنے والا اُسے موم کی شمع نہیں قرار دے سکتا۔ ایک انسان کو دیکھنے والا اُسے مچھر نہیں قرار دے سکتا۔ پھر یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ خدا کو دیکھنے والا اور اس سے باتیں کرنیوالا نبی ایک سونے کے بنے ہوئے بُت کو خدا قرار دیدے۔ ہم ایک پاگل سے بھی تو اس قسم کی امید نہیں کرسکتے۔ پھر خدا کے ایک نبی سے اس قسم کی امید کس طرح کرسکتے ہیں دوسرے یہودی تو معذور تھے۔ نہ انہوں نے خدا کو دیکھا تھا نہ اُس سے باتیں کی تھیں اُنہوں نے موسیٰ اور ہارون کی باتیں سُنی تھیں اور اُس پر ایمان لے آئے۔ اِسی طرح اُن سے سامری نے جو کچھ کہا انہوں نے مان لیا۔ مگر ہارون کو کیا ہوگیا تھا؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ جس نے خدا کو دیکھا ہو اور اُس سے باتیں کی ہوں وہ سامری کے دھوکے میں آجائے اور خود اپنے ہاتھ سے ایک سونے کا بچھڑا بنا کر اُسے خدا قرار دینے لگے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ دلوں کے بھید جاننے والے خدا نے اُس شخص کو بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے چُنا ہو جو موقع پر اتنا بُزدل اور کمزور ثابت ہُوا ہو۔ ایک عام بادشاہ کی تعریف کرنیوالے مورخین لکھا کرتے ہیں کہ اُس نے اچھے جرنیل چُنے اور یہ اُس کے کمال کی علامت ہے۔ حالانکہ کوئی بادشاہ اپنے جرنیلوں کے دلوں کو نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن بائبل کہتی ہے کہ خدا خدا بھی ہے اور غیب دان بھی ہے اور سب انسانوں سے خواہ وہ بادشاہ ہوں یا غیر بادشاہ زیادہ عالم اور جاننے والا بھی ہے مگر ساتھ ہی وہ ہم سے یہ منوانا چاہتی ہے کہ ہارون کو خدا نے ایک نبی کے مقام پر کھڑا کیا اور دنیا کی اصلاح کے لیے مبعوث کیا اور اُس سے باتیں کیں اور اپنا وجود اُس پر ظاہر کیا مگر جب سامری نے اُس کے آگے شرک کی تعلیم پیش کی تو اُس کے ساتھیوں کے کہنے پر اُس نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور کہا یہ تمہارا خدا ہے۔ وہ قوم کے ڈر کے مارے خدا کو بھول گیا۔ اپنے دین کو بھول گیا، اپنی ذمہ داری کو بھول گیا۔ اپنے علم کو بھول گیا اور جاہلوں اور نادانوں کی طرح ایک بیجان کھلونے کے سامنے اپنے ماتھے کو رگڑنے لگا۔ بائبل میں دست اندازی کرنے والے مصنّف خود بیوقوف ہوں گے۔ لیکن یہ اُن کی انتہائی جسارت تھی کہ وہ بعد میں آنے والے لوگوں کو بھی اپنے جیسا بے وقوف سمجھتے تھے۔ یقیناً اُن کی دست بُرد کے بعد

ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو تورات کی اِن لغویات کا پول کھول دے اور دنیا کو بتا دے کہ ہارون شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کتاب قرآن کریم کی صورت میں نازل ہوئی اور اُس نے یہ اعلان کیا کہ ہارون نے ہرگز شرک نہ کیا تھا بلکہ اُس نے اپنی قوم کو شرک سے روکا تھا چنانچہ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِن قَبْلُ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي (طٰہٰ ع ۱۴) یقیناً ہارون نے موسیٰ کے پہاڑ سے واپس آنے سے بھی پہلے بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا کہ اِس بچھڑے کے ذریعہ سے تم کو گمراہی میں مبتلا کر دیا گیا ہے اور تمہارا رب وہ ہے جس نے تمہاری پیدائش سے بھی پہلے تمہاری زندگی کی راحت کے سامان مہیا کر دیئے ہیں (اور یہ بچھڑا تمہاری آنکھوں کے سامنے بنایا گیا ہے) پس میری اتباع کرو اور میرا حکم مانو (اور شرک میں مبتلا نہ ہو) کیا کوئی عقلمند دنیا میں یہ کہہ سکتا ہے کہ موسیٰ پر نازل ہونے والی کتاب جب صداقتوں اور سچائیوں کو جھٹلانے لگے اور خلاف عقل باتیں بیان کرنے لگے تو اس وقت کسی ایسی کامل کتاب کی ضرورت نہ تھی جو آئے تو موسیٰ کے دو ہزار سال بعد لیکن سچائیاں اِس طرح بیان کرے کہ گویا موسیٰ کے وقت میں اور اس کے ساتھ موجود تھی۔

۵۔ پیدائش باب ۱۹ آیت ۲۶ میں لکھا ہے کہ لوط کی بیوی نے لوط کے ساتھ شہر سے بھاگتے ہوئے پیچھے پھر کر دیکھا اور وہ نمک کا کھمبا بن گئی۔ تورات کی یہ بات جنوں اور پریوں کے کسی افسانہ میں مذکور ہوتی تو یہ اس کا ٹھیک مقالہ ہوتا۔ مگر خدا کے کلام میں ایسی باتوں کا کیا دخل۔ قرآن کریم نے کس صفائی کے ساتھ حقیقت کو بیان کر دیا ہے۔ فرماتا ہے كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ (اعراف ع ۱۵) لوط کی بیوی کھمبا سمبا کوئی نہیں بنی۔ اس نے لوط کے ساتھ جانا پسند نہ کیا کیونکہ وہ خدا کی محبت پر اپنے رشتہ داروں کی محبت کو ترجیح دیتی تھی۔ غرض ایسی بیسیوں باتیں ہیں جو ہیں تو موسیٰ کے زمانہ کی لیکن تورات اِن کو غلط بیان کرتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے دو ہزار سال کے بعد آکر اُن کی اصلاح کی ہے۔ اور ایسی اصلاح کی ہے کہ عقلِ سلیم اُن کی سچائی تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

بائبل کی خلاف اخلاق باتیں

پھر بائبل میں بعض ایسی خلاف اخلاق باتیں بھی درج ہیں جن کی نسبت کوئی یہ یقین نہیں کر سکتا کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہوں یا خدا کے نبیوں نے ایسا کام کیا ہوگا۔

۱۔ پیدائش باب ۹ میں لکھا ہے کہ نوح نے انگور کا ایک باغ لگایا اُس کی مَے پی کر نشہ میں آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر اپنے آپ کو ننگا کیا اور اس کے بیٹے حام نے اُس کی عریانی کا تماشہ دیکھا۔ اور پھر جا کے اپنے بھائیوں کو خبر دی۔ کیا کوئی عقل مند آدمی اِس بات کو باور کر سکتا ہے۔ کہ وہ نوح جس کی نسبت آتا ہے۔ "نوح اپنے قرنوں میں صادق اور کامل تھا اور نوح خدا کے ساتھ چلتا تھا" (پیدائش باب ۶ آیت ۹) وہ ننگا ہو کر اپنے بچوں کے سامنے آجائے گا۔ اور کیا یہ بات کوئی عقل مند انسان مان سکتا ہے کہ نوح ننگا ہو اور بُرا بھلا حام کو کہا جائے۔

ایک ننگے پر نظر ڈالنے والا انسان آخر اُس کو ننگا نہیں تو اور کیا دیکھے گا۔ پس حام کا اس میں کیا قصور تھا کہ اُس نے نشہ سے چُور اپنے باپ کو دیکھ لیا۔ مگر بائبل کہتی ہے نوح نے کہا "کنعان ملعون ہو" (آیت ۲۵) حالانکہ کنعان کا کوئی بھی قصور نہ تھا۔ دیکھنے والا کنعان کا باپ حام تھا۔ حام کے خلاف تو نوح نے ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر لعنت کنعان پر کر دی جس کا کوئی قصور نہ تھا۔ کیا اِس لیے کہ حام اُس کا بیٹا تھا اور کنعان اُس کا پوتا تھا پس اِس قسم کے اعمال نہایت ہی اخلاق سوز ہیں اور خدا تعالیٰ کے ایک نبی کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا نہایت ہی شرمناک امر ہے۔ ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ یہ باتیں یقیناً موسیٰ سے خدا تعالیٰ نے نہیں کہیں۔ نہ موسیٰ نے اپنی کتاب میں لکھی ہیں۔ نبیوں کو چور اور بٹ مار کہنے والے یہودی علماء نے یہ باتیں اپنے گناہوں کو چھپانے کے لیے موسیٰ کے کلام میں داخل کر دیں اور اس بات کو ضروری بنا دیا کہ پھر خدا تعالیٰ ایک کامل کتاب دنیا میں اُتارے جو اس قسم کی بیہودہ اور لغو اور مفتریانہ باتوں سے پاک ہو اور وہ قرآن کریم ہے۔

۲۔ پیدائش ب۱۹ آیت ۳۰ تا ۳۵ میں لکھا ہے کہ "لوط اپنی دونوں بیٹیوں سمیت اپنے شہر سے نکل کر ایک غار میں رہنے لگا۔ تب پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں ہے، جو تمام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس اندر آوے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلاویں اور اس سے ہمبستر ہوویں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں سو اُنہوں نے اُسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہمبستر ہوئی پر اُس نے لیٹتے اور اُٹھتے وقت اُسے نہ پہچانا۔ اور دوسرے روز ایسا ہوا کہ پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات میں اپنے باپ سے ہمبستر ہوئی آؤ آج رات بھی اُس کو مے پلاویں اور تو بھی جا کے اُس سے ہمبستر ہو کہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اِس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی اُٹھ کے اس سے ہمبستر ہوئی اور اُس نے اُس کے اُٹھتے اور بیٹھتے وقت اُسے نہ پہچانا۔"

کیا یہ تعلیم واقعہ کے لحاظ سے ممکن اور اخلاق کے لحاظ سے قابلِ برداشت ہے؟ مگر تورات خدا تعالےٰ کے ایک نبی کی نسبت ایسی کہانی بیان کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔ لیکن تورات سے مراد اس جگہ وہ تورات نہیں جو خدا نے موسیٰ پر نازل کی تھی بلکہ یہ وہ تورات ہے جو بنی اسرائیل کے علماء نے اُس وقت لکھی، جب اُنہیں حضرت لوط کی حقیقی یا نام نہاد اولاد موآب یا بنی عمون سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل کا ایمان اتنا کمزور ہو چکا تھا اور دل اتنے سخت ہو چکے تھے کہ اُنہوں نے موآب اور بنو عمون کو ملعون کرنے کے لیے خدا کے نبی حضرت لوط پر حملہ کیا اور خدا کی کتاب میں ایسی گندی باتیں لکھیں جن کو خدا تعالےٰ کے نبیوں کی نسبت کوئی شخص سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ کیا عیسائی اور یہودی دنیا خدا کے نبیوں کی نسبت ایسی باتیں سُن سکتی ہے؟ اگر سُن سکتی ہے تو یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ ایک ایسی پاک اور منزہ کتاب خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی جو اس قسم کے ذہنوں کا علاج کرتی۔

۳۔ تورات میں لکھا ہے۔ اگر کئی بھائی ایک جا رہتے ہوں اور ایک اُن میں سے بے اولاد مر جائے، تو اُس مرحوم کی جورو کا بیاہ کسی اجنبی سے نہ کیا جاوے۔ بلکہ اُس کے شوہر کا بھائی اُس سے خلوت کرے اور اُسے اپنی

جورو کرے اور بھاوج کا حق اُسے ادا کرے۔ اور یوں ہو گا کہ اُس کا پلوٹھا جو اُس سے پیدا ہو تو اُس کے مرحوم بھائی کے نام پر قائم ہو گا تاکہ اُس کا نام اسرائیل میں سے مٹ نہ جائے۔ (استثناء باب ۲۵ آیت ۵ و ۶)

اگر کسی اور شخص کی اولاد کے ذریعہ سے کسی شخص کا نام قائم رہ سکتا ہے تو بھائیوں کی اولاد کے ہونے کی صورت میں کیا ضرورت ہے کہ اُس کے بھائیوں کے نطفہ سے اُس کی بیوی کے ہاں بھی کوئی بیٹا پیدا ہو۔ اگر بھائیوں کا بیٹا اُس کا بیٹا ہو سکتا ہے تو پھر اُس کی بیوی سے بدکاری کروانے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ بائبل یہی کہہ دیتی کہ بھائیوں کے بیٹوں میں سے ایک بیٹا مرنے والے کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ میں تو سمجھتا ہوں چونکہ یہودی علماء نے حضرت لوط پر ایک گندہ الزام لگایا تھا خدا نے ایسی تعلیم اُن کے ہاتھوں سے تورات میں لکھوا دی تاکہ لوط پر جھوٹا الزام لگانے والے یہودی سارے کے سارے خود اِس گند میں مبتلا ہو جائیں۔ جو کام انہوں نے حضرت لوط کی طرف منسوب کیا تھا۔ یقیناً عہد نامہ قدیم کی یہ خرابیاں اس بات کی بیّن دلیل تھیں کہ دنیا کو ایک اور کامل کتاب کی ضرورت تھی جو عیبوں اور نقصوں سے پاک ہو۔ اور وہ کتاب قرآن کریم ہے۔

موجودہ اناجیل کی حالت

مَیں اُوپر بتا چکا ہوں کہ عہد نامۂ قدیم ظاہری اور باطنی دونوں طور پر محرّف و مبدّل ہو چکا ہے اور اُس کی تعلیم اور اُس کی روشنی سے کسی انسان کا ہدایت پانا ناممکن ہے۔ اب مَیں عہد نامہ جدید کو لیتا ہوں۔

(۱) عہد نامہ جدید کا کوئی وجود ہی نہیں ہے

جو کتابیں عہد نامہ جدید کے نام سے ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ وہ ہرگز نہ مسیح کے اقوال پر مشتمل ہیں اور نہ اُن کے حواریوں کے اصل اقوال پر۔ مسیح یہودی النسل انسان تھے اور اُن کے حواری بھی یہودی النسل تھے۔ اس لیے اگر مسیح کا کوئی قول اپنی اصل شکل میں محفوظ ہو سکتا ہے تو عبرانی زبان میں۔ اور اگر اُن کے حواریوں کا کوئی قول اپنی شکل میں محفوظ ہو سکتا ہے تو وہ بھی عبرانی زبان میں ہی محفوظ ہو سکتا ہے۔ لیکن انجیل کا کوئی نسخہ پُرانی عبرانی زبان میں محفوظ نہیں ہے۔ بلکہ اناجیل تمام کی تمام یونانی زبان میں ہیں۔ عیسائی پادری اِس عظیم الشان نقص کو چھپانے کے لیے کہہ دیا کرتے ہیں کہ اُس زمانہ میں لوگوں کی زبان یونانی ہو گئی تھی۔ لیکن کیا ایسا ہونا ممکن ہے۔ قومیں اپنی زبان آسانی سے نہیں چھوڑا کرتیں۔ بلکہ وہ اپنی زبان کو ایسا ہی قیمتی ورثہ سمجھتی ہیں جیسا کہ جائیداد و املاک کو۔ مشرقی یورپ کی درجنوں قومیں روس کے ماتحت تین تین چار چار سو سال سے چلی آتی ہیں لیکن اب تک اُن کی زبانیں موجود ہیں۔ الجزائر اور مراکش پر فرانس اور سپین کا قبضہ ایک لمبے عرصہ سے چلا آیا ہے، مگر باوجود اس کے وہاں کے لوگوں کی زبان عربی ہے۔ اِن قوموں کو بھی نظر انداز کر دو، خود یہودیوں کو ہی لے لو۔ حضرت مسیح کے زمانہ پر ساڑھے اُنیس سو سال گذر جانے کے بعد بھی اُنہوں نے اپنی زبان پوری طرح نہیں چھوڑی۔ اب بھی یورپ اور امریکہ کے مختلف ممالک کے رہنے والے یہودی یدِش (YIDDISH) زبان

بولتے ہیں۔ جو مختلف ممالک کی بگڑی ہوئی زبان ہے۔ اگر اُنیس سو سال کی رہائش جو کلّی طور پر دوسری اقوام کے ماحول میں گذری ہے وہ بھی یہودیوں کی زبان نہیں مٹا سکی، تو ایک قلیل عرصہ کی اطالوی صحبت یہود کی زبان کو کس طرح بدل سکتی ہے؟ یاد رکھنا چاہیئے کہ اطالوی حکومت فلسطین میں حضرت مسیح سے صرف چالیس سال پیشتر شروع ہوئی تھی اور یہ اتنا لمبا عرصہ نہیں جس میں کوئی قوم اپنی زبان کو چھوڑ دے۔ لیکن اس کے علاوہ یہ باتیں بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ

ا- تاریخی قومیں اپنی زبان کو کبھی نہیں چھوڑا کرتیں۔ اور یہودی ایک تاریخی قوم ہے۔

ب- یہودیوں کا مذہب عبرانی زبان میں تھا۔ اِس لیے اس زبان کو چھوڑنا اُن کے لیے بالکل ناممکن تھا۔

ج- یہودی لوگ تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے اپنے آپ کو اطالوی قوم سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ بالا سمجھتے تھے۔ اس لیے بھی یہودی اپنی زبان کے چھوڑنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

د- یہودی قوم آئندہ کی حکومت کی امیدوار تھی، جو قومیں آئندہ کے متعلق امیدیں کھو بیٹھتی ہیں اُن کا دل بھی کمزور ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ وہ اپنی زبان کی حفاظت سے بے پروا ہو جاتی ہے۔ لیکن حضرت مسیح کے زمانہ میں تو یہودی یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ جلد یہودیوں کا بادشاہ ظاہر ہوگا اور وہ پھر دوبارہ یہودی حکومت کو قائم کرے گا پس یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ اُس زمانہ میں وہ اپنی زبان کو ترک کر دیتے۔

ہ- اُس زمانہ کے یہودی مصنفوں کی کتابیں اصل یا بگڑی ہوئی یہودی زبان میں ہیں۔ اگر اُن لوگوں کی زبان بدل چکی تھی تو چاہیئے تھا کہ اُس صدی یا اُس کے قریب کی لکھی ہوئی کتابیں اصل عبرانی یا بگڑی ہوئی عبرانی زبان کی بجائے کسی اور زبان میں ہوتیں۔

و- پُرانی اناجیل کے نسخے یونانی زبان میں ملتے ہیں۔ لیکن حضرت مسیح کے وقت میں ابھی تک اطالوی شہنشاہیت دو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ اُس کا مرکز ابھی روم میں ہی تھا۔ اور رومی زبان اور یونانی زبان میں بہت کچھ فرق ہے اگر اطالوی حکومت کا کوئی اثر یہودیوں کی قوم پر پڑا بھی تھا تو اُس کے نتیجہ میں اطالوی الفاظ عبرانی میں داخل ہونے چاہیئے تھے نہ کہ یونانی۔ لیکن اناجیل کے پُرانے نسخے یونانی زبان میں پائے جاتے ہیں اور یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اناجیل اُس وقت لکھی گئیں جبکہ روم ایمپائر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی اور اُس کے مشرقی مقبوضات یونانی ایمپائر کے حصّہ میں آگئے تھے اور یونانی زبان نے بھی عیسائیت اور اس کے لٹریچر پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔

ز- جتنے فقرے اناجیل میں اپنی اصل شکل میں محفوظ ہیں وہ سب کے سب عبرانی زبان میں ہیں۔ مثلاً ھوشعنا (متی باب ۲۱ آیت ۹) ایلی ایلی لما سبقتانی (متی باب ۲۷ آیت ۴۶) ربّی (یوحنا باب ۳ آیت ۲ و ۲۶ آیت ۳۱) تلیتھا قومی (مرقس باب ۵ آیت ۴۱)

ح- اعمال باب ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے صلیب پر لٹکائے جانے کے بعد تک یہودی لوگ عبرانی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے:-

"تب وے سب روح مقدس سے بھر گئے اور غیر زبانیں جیسے روح نے اُنہیں بولنے کی قدرت بخشی

بولنے لگے۔ اور خداترس یہودی ہر ایک قوم میں سے جو آسمان کے تلے ہے۔ یروشلم میں آرہے ہیں۔ سو جب یہ آواز آئی تو بھیڑ لگ گئی اور سب دنگ ہوگئے۔ کیونکہ ہر ایک نے اُنہیں اپنی اپنی بولی بولتے سُنا! اور سب حیران ہوئے اور تعجب کرکے آپس میں کہنے لگے۔ دیکھو کیا یہ سب جو بولتے ہیں جلیلی نہیں۔ پس کیونکر ہم میں سے اپنے اپنے وطن کی بولی سُنتا ہے۔ ہم پارتھی اور میدی اور عیلامی اور رہنے والے مسوپوتامیہ، یہودیہ اور کپدکیہ۔ پنطس اور آسیہ کے فروگیہ اور پمفولیہ مصر اور لیبیا کے اُس حصہ کے جو قرینی کے علاقہ میں ہے۔ اور رومی مسافر یہودی اور یہودی مرید۔ کریتی اور عرب کے ہوکے ہم اپنی اپنی زبانوں میں اُنہیں خدا کی بڑی باتیں بولتے سنتے ہیں! اور سب حیران ہوئے اور گھبرا کے ایک دوسرے سے کہنے لگا کہ یہ کیا ہوا چاہتا ہے۔ اوروں نے ٹھٹھے سے کہا کہ یہ نئی مے کے نشہ میں ہیں۔" (آیت ۴ تا ۱۳)

اِس حوالہ سے ثابت ہے کہ اُس وقت تک فلسطین کے لوگوں کی زبان عبرانی تھی اور غیر زبانوں کی بولیاں بولنا اُن کے لیے ایک غیر معمولی بات تھی۔ جو نام اُوپر گنائے گئے ہیں۔ اِن میں صاف طور پر رومیوں کا ذکر آتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اُس زمانہ میں رومی زبان فلسطین کی زبان نہیں تھی اور اس میں باتیں کرنا لوگوں کے لیے ایک اچنبھے کی بات تھی۔ اس بات سے قطع نظر کرکے کہ یہ واقعہ کس حد تک صحیح ہے اِس حوالہ سے اِس بات کا تو یقینی طور پر ثبوت مل جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب کے واقعہ کے بعد بھی یہودیوں کی زبان عبرانی ہی تھی۔ غیر زبانیں جاننے والے اُن میں بہت ہی کم پائے جاتے تھے حتیٰ کہ جب مسیح کے حواریوں نے بعض غیر زبانوں میں باتیں کیں جن میں رومی زبان بھی شامل تھی۔ تو لوگوں نے اُن پر الزام لگا دیا کہ وہ مے کے نشہ میں بکواس کر رہے ہیں۔ اگر سارے ملک کی زبان رومی یا یونانی ہوتی، تو کس طرح ہو سکتا تھا کہ عوام الناس اِن زبانوں کو نہ سمجھ سکتے اور اُن کی تقریروں کو بے معنی قرار دے کر اُنہیں شراب کے نشہ میں مخمور سمجھ لیتے۔

مندرجہ بالا تمام دلائل سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کی زبان عبرانی تھی لاطینی یا یونانی نہیں تھی۔ پس جو اناجیل یونانی یا لاطینی میں ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں وہ یقیناً حضرت مسیح کے بہت عرصہ بعد لکھی گئی ہیں اور اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جبکہ عیسائیت رومیوں میں پھیل گئی تھی بلکہ رومن شہنشاہیت دو ٹکڑے ہوکر اٹلی اور یونان کی حکومتوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ اِس قسم کی کتابیں جو سو یا دو سو سال بعد غیر معلوم مصنفوں نے لکھی تھیں اور زبردستی حضرت مسیح اور اُن کے حواریوں کی طرف منسوب کر دی گئی تھیں۔ اُن سے انسان کی روحانیت کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ ضرور تھا کہ اُن کے ہوتے بھی نیا آسمانی صحیفہ نازل ہو، جو اِس قسم کی خرابیوں سے پاک ہو اور انسان اِس یقین سے اس پر غور کر سکے کہ یہ پاک اور صاف کلام میرے پیدا کرنے والے کا تھا۔

دُوسری دلیل:۔ انجیل میں حضرت مسیح ناصری صاف طور پر بیان فرماتے ہیں کہ مَیں پُرانی کتابوں کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ قائم کرنے آیا ہوں۔ چنانچہ متی میں لکھا ہے:۔

"یہ خیال مت کرو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا، مَیں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں۔ کیونکہ مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ

تورات کا ہر گز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو۔ (متی باب ۵ آیت ۱۷-۱۸)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح ناصری کا اصل کام یہودیوں کو دوبارہ موسوی مذہب پر قائم کرنا تھا، مگر انجیل کی موجودہ شکل ہمیں بتاتی ہے کہ موسوی شریعت کو اس کے ذریعہ سے بالکل منسوخ کر دیا گیا ہے یہ امر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اناجیل درحقیقت وہ نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کی تھیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم یقیناً وہی ہوگی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام دنیا میں لائے تھے صرف ایسے امور فقیہوں اور فریسیوں نے موسوی شریعت میں اپنی طرف سے داخل کر کے اُسے بگاڑ دیا تھا، اُن کو مٹایا گیا ہوگا لیکن انجیل فقیہوں اور فریسیوں کے احکام کو نہیں مٹاتی۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے بعد آنیوالے نبیوں کے احکام کو بھی مٹاتی ہے۔ اس طرح اس کا ایک حصّہ اُس کے دوسرے حصّہ کو باطل قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کتاب کا ایک حصّہ دوسرے حصّہ کو باطل قرار دے، وہ کتاب کسی ایک مصنّف کی لکھی ہوئی نہیں ہو سکتی۔ یا کسی معقول مصنف کی لکھی ہوئی نہیں ہو سکتی۔ چونکہ کہا جاتا ہے کہ یہ کتابیں حضرت مسیح کے حواریوں کی لکھوائی ہوئی ہیں۔ اس لیے یہ تو کہنا مشکل ہے کہ ان کتابوں کے مصنف معقول آدمی نہیں تھے۔ خدا تعالیٰ کے نبیوں کے خاص حواری معقول ہُوا کرتے ہیں۔ پس ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وُہ یہ کہ حواریوں نے اصل میں کوئی انجیل نہیں لکھوائی تھی۔ وہ زبانی باتیں کہتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے شاگردوں کے شاگردوں نے اُن کی زبانی باتوں میں اپنے خیالات ملا دئیے اور اس طرح وہ اناجیل متضاد باتوں کا مجموعہ بن کر رہ گئیں۔

اناجیل کی تحریف و تبدّل کے متعلق عیسائی عُلماء کے خیالات

اندرونی شہادت پیش کرنے کے بعد اب ہم انجیل کے متعلق بعض عیسائی علماء کے خیالات درج کرتے ہیں :-

(الف) تفسیر ہارون جلد ۴ حصّہ دوم باب ۴ مطبوعہ ۱۸۸۲ء میں لکھا ہے :-

" کلیسیاء کے قدماء مورخین سے اناجیل کی تالیف کے زمانہ کے متعلق جو حالات ہم تک پہنچے ہیں ایسے غیر معیّن اور ابتر ہیں کہ کسی ایک امر معیّن کی طرف نہیں پہنچاتے اور پُرانے سے پُرانے قدماء نے اپنے وقت کی گپّوں کو سچ سمجھ کر لکھ دیا اور اُن لوگوں نے جو اُن کے بعد ہوئے ادب کر کے ان لوگوں کے لکھے ہوئے کو قبول کر لیا۔ اور یہ روایات سچی اور جھوٹی ایک لکھنے والے سے دوسرے لکھنے والے کو پہنچیں اور مدّت دراز کے گذر جانیکے بعد اُنکی تنقید متعذر ہو گئی "۔

(ب) پھر اس جلد میں لکھا ہے کہ :-

" پہلی انجیل ۳۷ء یا ۳۸ء یا ۴۱ء یا ۴۳ء یا ۴۸ء یا ۶۱ء و ۶۲ء یا ۶۴ء عیسوی میں۔ اور دوسری انجیل ۵۶ء سے ۶۵ء تک اور غالباً ۶۰ء یا ۶۳ء میں اور تیسری انجیل ۵۳ء یا ۶۳ء میں یا ۶۴ء میں اور چوتھی انجیل ۶۸ء یا ۶۹ء یا ۷۰ء یا ۹۷ء یا ۹۸ء عیسوی میں تالیف ہوئیں۔ اور نامۂ عبرانیہ اور نامۂ روم پطرس اور نامۂ دوم سوم یوحنا اور نامۂ یعقوب اور نامۂ یہودا اور مشاہدات یوحنا اور نامۂ اوّل یوحنا کے بعض درس (یعنی آیات)

کا حال تو ایسا ابتر ہے کہ کہنے کے لائق نہیں ان کو تو محض زبردستی سے بلا سند حواریوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور بہت علمائے فرقہ پروٹسٹنٹ نے ان کتب کا انکار کیا تھا۔"

(ج) کاتھلک ہیرلڈ جلد ۷ مطبوعہ ۱۸۴۴ء صفحہ ۲۰۵ پر لکھا ہے:۔

"اسٹاڈسن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ یوحنا کی انجیل یقیناً بلا ریب مدرسہ اسکندریہ کے کسی طالب علم نے لکھی ہے۔ اور ہارن اپنی تفسیر میں لکھتا ہے کہ فرقہ ایلوجین جو دوسری صدی میں تھا اس انجیل (یوحنا) اور اسی طرح یوحنا کی سب تصنیفات سے انکار کرتا ہے۔"

(د) یوسیبس اپنی تاریخ کلیسیاء کی کتاب ۳ کے باب ۳ میں لکھتا ہے کہ پطرس کا پہلا خط سچا ہے مگر دوسرا خط پطرس کبھی پاک کتاب میں شامل نہیں کیا گیا لیکن پڑھا جاتا تھا۔"

(ہ) پھر اس کتاب کے پچیسویں باب میں لکھتا ہے کہ "نامۂ یعقوب اور نامۂ یہودا اور نامۂ دوم پطرس اور نامہ دوم سوم یوحنا پر کلام کیا گیا ہے کہ آیا یہ سب انجیل نویسوں نے لکھے ہیں یا دوسرے لوگوں نے جن کے یہی نام تھے۔"

(و) تفسیر بائبل ہارن صاحب جلد ۴ میں لکھا ہے کہ پہلے اناجیل عبرانی میں تھیں۔ پھر کسی غیر معلوم شخص نے یونانی میں ترجمہ کیا۔

(ز) انسائیکلو پیڈیا ببلیکا میں لکھا ہے:۔

"The NT was written by Christians for Christians; it was moreover written in Greek for Greek speaking Communities, and the style of writing (with the exception possibly, of the Apocalypce) was that of current literary composition. There has been no real break in the continuity of the Greek-speaking church and we find accordingly that few real blunders of writing are met with in the leading types of the extent texts. This state of things has not prevented pariations; but they are not for the most part accidental. And over whelming majority of the various readings of the MSS of the NT were from the very first intentional alterations. The NT in very early times had no canonical authority, and alterations, and additions were actually made where they seemed improvements.

(Encyclopaedia Biblica page 4980 Vol. IV)

یعنی عہد نامہ قدیم عیسائیوں نے عیسائیوں کی خاطر لکھا تھا۔ علاوہ ازیں یہ یونانی میں یونانی بولنے والوں کے لیے لکھا گیا تھا۔ اور طرز تحریر اس وقت کے رائج طرز تحریر کے مطابق تھا۔ یونانی بولنے والے گرجا کے تاریخی تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس لیے ہمیں تحریر کی کوئی حقیقی غلطی موجودہ نسخوں میں نہیں ملتی۔ گو ہم یہ نہیں کہہ سکتے

کہ اختلافات پائے نہیں جاتے۔ لیکن وہ اختلافات اتفاقی نہیں ہیں۔ بلکہ دیدہ دانستہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور شروع سے ہی بعض مصنّفوں نے بالارادہ تغیّرات عہدنامہ میں پیدا کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ عہدنامہ قدیم اپنے ابتدائی زمانہ میں کوئی مذہبی تقدّس نہیں رکھتا تھا یعنی اُسے خدائی کتاب نہیں کہا جاتا تھا۔ اِس لیے جہاں کہیں تبدیلیوں اور زیادتیوں سے مضمون میں اصلاح کی امید کی جاتی تھی وہاں تبدیلیاں اور زیادتیاں دلیری سے کردی جاتی تھیں۔

(ح) پھر لکھا ہے:۔

What is certain is that by the middle of fourth century. Latin biblical MSS exhibited a most confusing variety of text caused at least in part by revision from later Greek MSS as well as by modifications of the Latin phraseology. This confusion lasted until all the old Latin texts were supplanted by the revised version of Jerome (383-400 A.D.) which was undertaken at the request of Pope Damasus ultimately became the vulgate of the western church.

(Encyclopaedia Biblica Page 4993
Vol. IV)

یعنی جو بات یقینی ہے، وہ یہ ہے کہ چوتھی صدی کے درمیان میں بائبل کا لاطینی نسخہ نہایت ہی پراگندہ حالت میں تھا۔ اور یہ مضامین کی پراگندگی یونانی نسخہ سے مقابلہ کی وجہ سے اور لاطینی اصطلاحوں میں تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ اور یہ اختلافات قائم رہے یہاں تک کہ پُرانے لاطینی نسخہ کی جگہ جیروم کا اصلاح شدہ نسخہ جو ۳۸۳ء سے ۴۰۰ء کے درمیان زمانہ کے پوپ ڈیمیس کے حکم سے تیار کیا گیا تھا، عیسائیوں میں رائج کیا گیا۔

(ط) اِسی طرح لکھا ہے:۔

"More important than these external matters are the variations which in course of time crept in the text itself. Many of these variat'ons are mere slips of the eye, ear, memory, or judgment on the part of a copyist, who had no intention to do otherwise tha follow what lay before him. But transcribers, and especially early transcribers, by no means aimed at that minute accuracy which is expected of modern critical editor. Corrections were made in the interests of Grammar or of style. Slight changes were adopted in order to remove difficulties. Additions came in especially from parallel narratives in the gospels, citations from the old testament were made more exact or more complete. That all this was done

in perfect good faith and simply because no strict conception of the duty of a copyist existed, is especially clear from the almost entire absence of deliberate falsification of the text in the interest of doctrinal controversy. It may suffice to mention, in addition to what has been already said that glosses or notes originally written on the margin very often ended by being taken into the text, and that the custom of reading thus scriptured in public worship naturally brought in liturgical additions, such as the doxology of the Lord's Prayer while the commencement of an ecclesiastical lesson torn from its proper context had often to be supplemented by a few explanatory words, which soon came to be regarded as part of the original.

(Encyclopaedia Brit. Page 646
Vol.II. Ed. 12th)

(ی) اور پھر لکھا ہے:-

It appears from what we have already seen, that a considerable portion of the NT is made up of writings not directly apostolic.

(Encyclopaedia Brit. Page 643
Vol. III, Ed. 12th)

(ك)

Yet as a matter of fact, every book in the NT, with the exception of the four great epistles of St. Paul is at present more or less the subject of controversy, and interpolations are asserted even in these.

(Encyclopaedia Brit. Page 643
Vol. III, Ed. 12th)

پھر پُرانے زمانہ کی تحریف و تبدّل کو تو جانے دو لطف یہ ہے کہ انجیل میں آجتک بھی تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ

۱۔ یوحنا باب ۵ آیت ۲ تا ۵ لکھا تھا (۱) یروشلم میں بھیڑ دروازہ کے پاس ایک حوض ہے جو عبرانی میں بیت حسدا کہلاتا ہے۔ اُس کے پانچ اُسارے ہیں۔ اِن میں ناتوانوں اور اندھوں اور لنگڑوں اور پژمردوں کی ایک بڑی بھیڑ پڑی تھی جو پانی کے ہلنے کے منتظر تھے۔ کیونکہ ایک لبعضے وقت اُس حوض میں اُتر کے پانی کو ہلاتا تھا اور پانی کے ہلنے کے بعد جو کوئی کہ پہلے اُس میں اُترتا کیسی ہی بیماری میں گرفتار ہو اُس سے چنگا ہو جاتا تھا۔

یہ واقعہ سینکڑوں سال سے انجیل میں لکھا جا رہا تھا۔ اور کسی مسیحی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ یہ واقعہ کسی اور نے انجیل میں داخل کر دیا ہے۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانی سلسلہ احمدیہ نے جب

عیسائیت پر یہ اعتراض کیا۔ کہ اگر فلسطین میں ایک ایسا حوض موجود تھا جس میں گرنے سے لوگوں کو شفا ہو جاتی تھی، تو گو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اِس میں کسی خاص تاریخ میں گرنے سے شفا ہوتی ہے مگر مسیح نے سمجھ لیا کہ یہ وہم ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اِس پانی میں نہانے سے شفا ہوتی ہے۔ پس مسیح نے اُس کا پانی مریضوں کو استعمال کرانا شروع کر دیا جس سے اُن کو شفا ہونی شروع ہو گئی۔ اور لوگ اُن کے معجزات کے قائل ہو گئے۔

چنانچہ یوحنا باب ۹ آیت ۱ تا ۷ میں لکھا ہے:۔

"پھر اُس نے جاتے ہوئے ایک شخص کو جو جنم سے اندھا تھا، دیکھا۔ اور اُس کے شاگردوں نے اُس سے پوچھا کہ اے ربّی گناہ کس نے کیا۔ اس شخص نے یا اس کے ماں باپ نے۔ کہ یہ اندھا پیدا ہُوا یسوع نے جواب دیا۔ نہ تو اس شخص نے گناہ کیا نہ اس کے ماں باپ نے۔ لیکن یُوں ہُوا کہ خدا کے کام اُس میں ظاہر ہو ویں۔ ضرور ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے مَیں اُس کے کاموں کو جب تک کہ دن ہے۔ کروں۔ رات آتی ہے اور کوئی اس وقت کام نہیں کر سکتا۔ جب تک مَیں جہان میں ہوں مَیں جہان کا نُور ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے زمین پر تھوکا اور تُھوک سے مٹی گوندھی اور وہ مٹی اس اندھے کی آنکھ پر لیپ کی اور اُس سے کہا جا اور سلوآم کے حوض میں نہا۔ تب وہ جا کے نہایا اور بینا ہو کے آیا۔"

چونکہ اس سے مسیح کے معجزات پر زد پڑتی تھی۔ اِس لیے تازہ اُردو بائبل میں سے یہ تالاب کا واقعہ اُڑا دیا گیا ہے جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے اعتراض سے بچنے کے لیے انجیل کو بدل دیا گیا ہے۔ اگر یہ واقعہ انجیل میں نہیں تھا، تو انیس سو سال سے کس طرح اُس میں شامل ہوتا چلا آیا۔ اور اگر یہ واقعہ انجیل میں تھا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے اعتراض سے ڈر کر عیسائی دنیا نے اس کو انجیل میں سے کیوں نکال دیا؟

۲۔ متی باب ۱۹ آیت ۱۶۔۱۷ میں لکھا تھا۔ "اور دیکھو ایک نے آ کے اُس سے کہا اے نیک اُستاد مَیں کونسا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔ اُس نے اُسے کہا۔ تُو کیوں مجھے نیک کہتا ہے۔ نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔"

یہ حوالہ اس بات کا ایک بیّن ثبوت تھا کہ حضرت مسیح کے متعلق عیسائیوں کا یہ ادعا کہ وہ معصوم عن الخطاء اور ہر قسم کے گناہوں اور عیوب سے منزّہ تھے بالکل باطل اور بے بنیاد ہے۔ اگر وہ گناہوں سے منزّہ ہوتے تو محض ایک کے نیک اُستاد کہنے پر وہ جواب میں یہ کیوں کہتے کہ تُو کیوں مجھے نیک کہتا ہے نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے عیسائیوں کے سامنے اس حوالہ کو پیش کیا اور اُنہیں بتایا کہ تم مسیح کی معصومیت کا دعویٰ کس طرح کر سکتے ہو جبکہ مسیح خود اپنی معصومیت کا اعتراف نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اتنی سی بات پر کہ ایک شخص نے اُسے نیک اُستاد کہہ کر پکارا وہ کہہ اُٹھا کہ تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔ یہ اعتراض ایسا زبردست تھا کہ عیسائیوں سے اس کا جواب بن نہ پڑا۔ اور وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ اس آیت کے الفاظ اور اُس کے مفہوم کو بالکل بدل ڈالیں چنانچہ موجودہ اناجیل میں مذکورہ بالا الفاظ کو بدل کر یہ الفاظ درج کر دئے گئے ہیں۔

" اور دیکھو ایک شخص نے پاس آکر کہا۔ اے اُستاد مَیں کونسی نیکی کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔ اُس نے اُس سے کہا کہ تُو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے"۔

"تُو کیوں مجھے نیک کہتا ہے" اور "تُو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پُوچھتا ہے"۔ ان دونوں فقرات میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ ایک حوالہ میں اپنے نیک ہونے سے انکار کیا گیا ہے اور دوسرے حوالہ میں صرف اِس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں سوال کرتا ہے۔ حالانکہ حضرت مسیح دنیا میں آئے ہی اِس لیے تھے کہ وہ لوگوں کو نیکی اور ہدایت کی راہ بتائیں۔ اگر وہ نیکی اور ہدایت کی راہ بتانے کے لیے نہیں آئے تھے تو اُن کی بعثت کی غرض کیا تھی۔ اُن کو ہمارے عقیدہ کے مطابق خدا تعالیٰ کا نبی کہو یا عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کا بیٹا سمجھو۔ دونوں صورتوں میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ دنیا کو ہدایت اور نیکی کی راہ بتانے کے لیے آئے تھے پس جب وہ آئے ہی اِس غرض کے لیے تھے کہ لوگوں کو نیکی اور ہدایت کی راہ بتائیں۔ تو وہ یہ کس طرح کہہ سکتے تھے۔ کہ تُو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے۔ پھر اگر اُن سے نیکی کی بابت کچھ پوچھنا جرم تھا یا وہ دوسروں کو بتا نہیں سکتے تھے کہ نیکی کی راہ کونسی ہے۔ تو انجیل کے مختلف مقامات پر انہوں نے نیکی کی تعلیم کیوں دی ہے؟ ایک طرف اُن کا لوگوں کو نیکی کی راہ بتانا اور دوسری طرف اُن کا اس منصب پر کھڑا ہونا کہ لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کا موجب بنیں' بتا رہا ہے کہ اُن سے یہ سوال نہیں کیا گیا تھا کہ اے اُستاد میں کونسی نیکی کروں اور نہ انہوں نے یہ جواب دیا کہ تُو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے۔ بلکہ درحقیقت اُن سے وہی سوال کیا گیا تھا جس کا پہلی اناجیل میں ذکر کیا گیا تھا۔ اور جس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ "تُو کیوں مجھے نیک کہتا ہے نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔ مگر عیسائیوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے اعتراضات سے ڈر کر اس آیت کو بدل ڈالا جو ثبوت ہے اِس بات کا کہ موجودہ اناجیل میں اب بھی تحریف و تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

۳۔ ۱۔ یوحنا باب ۵ آیت ۸ میں لکھا تھا۔ "اور گواہی دینے والے تین ہیں۔ رُوح اور پانی اور خون۔ اور یہ تینوں ایک ہی بات پر متفق ہیں"۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس حوالہ کی بناء پر عیسائیوں پر اعتراض کیا کہ تم تو مسیح کو خدا کہتے ہو مگر انجیل یہ بتاتی ہے کہ وہ رِحم مادر میں نو ۹ ماہ تک خون کھاتا رہا۔ اور یوحنا حواری کے قول کے مطابق وہ خود خون تھا۔ جو شخص نو ۹ ماہ تک رحم مادر میں خون کھاتا رہا اور جسے خود خون قرار دیا گیا ہے۔ اُس کو خدا قرار دینا کتنی غیر معقول اور عقل و فہم سے بعید بات ہے۔ یہ حملہ بھی ایسا زبردست تھا کہ عیسائی اس کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے اِس آیت کی بجائے موجودہ اناجیل میں یہ الفاظ لکھ دیئے کہ:۔

"تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں۔ باپ اور کلام اور رُوح قدس۔ اور یہ تینوں ایک ہیں"۔

۴۔ مرقس باب ۹ آیت ۱۴ تا ۲۹ میں لکھا ہے۔ "اور جب وہ اپنے شاگردوں کے پاس آیا۔ اُن کے چاروں طرف بڑی بھیڑ ہے اور فقیہوں کو اُن سے بحث کرتے دیکھا۔ اور فی الفور ساری بھیڑ اُسے دیکھ کر نہایت حیران ہوئی۔ اُس کے پاس دوڑ کے اُسے سلام کیا۔ تب اُس نے فقیہوں سے پوچھا، تم اِن سے کیا بحث کرتے ہو۔ ایک نے اس بھیڑ میں سے جواب دیا اور کہا اے اُستاد میں اپنے بیٹے کو جس میں گونگی رُوح ہے، تیرے پاس

لایا ہوں وہ جہاں کہیں اُسے پکڑتی ہے پٹک دیتی ہے اور وہ کف بھر لاتا ہے اور اپنے دانت پیستا ہے اور وہ سُوکھ جاتا ہے۔ مَیں نے شاگردوں سے کہا تھا کہ وہ اُسے باہر کردیں، پر وہ نہ کرسکے۔ اُس نے اس کے جواب میں کہا۔ اے بے ایمان قوم مَیں کب تک تمہارے ساتھ رہوں، مَیں کب تک تمہاری برداشت کروں اُسے میرے پاس لاؤ۔ وہ اُسے اُس کے پاس لائے اور جب اُس نے اُسے دیکھا فی الفور رُوح نے اُسے اینٹھایا اور وہ زمین پر گرا اور کف بھر کے لوٹنے لگا تب اُس نے اس کے باپ سے پوچھا کتنی مدت سے یہ اس کو ہُوا۔ وہ بولا بچپن سے۔ اور بہت بار اُسے آگ میں اور پانی میں ڈالتی تھی تاکہ اُسے جان سے مار دے۔ پر اگر تو کچھ کرسکتا ہے تو ہم پر رحم کرکے ہماری مدد کر یسوع نے اُسے کہا اگر تُو ایمان لاسکے تو ایماندار کے لیے سب کچھ ہوسکتا ہے۔ تب فی الفور اُس لڑکے کا باپ چلایا اور آنسو بہا کے کہا۔ اے خداوند میں ایمان لاتا ہوں۔ تو میری بے ایمانی کا چارہ کر۔ جب یسوع نے دیکھا کہ لوگ دُور سے جمع ہوتے ہیں تو اس ناپاک رُوح کو ملامت کرکے اُسے کہا اے گونگی بہری رُوح مَیں تجھے حکم کرتا ہوں اس سے باہر نکل اور اس میں پھر کبھی مت داخل ہو۔ وُہ چلا کر اور اُسے بہت اینٹھا کر اُس سے نکل گئی اور وہ مُردہ سا ہوگیا ایسا کہ بہتوں نے کہا کہ وہ مرگیا۔ تب یسوع نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اٹھایا اور وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور جب وہ گھر میں آیا اُس کے شاگردوں نے خلوت میں اُس سے پوچھا کہ ہم اُسے کیوں نہ نکال سکے۔ اُس نے اُنہیں کہا کہ یہ جنس سوا دعا اور روزہ کے کسی اور طرح سے نکل نہیں سکتی۔"

عیسائی اِس بات کے قائل ہیں کہ حضرت مسیح پر ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کی محبت کے حصول کے لیے کسی عمل صالح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن اُوپر کے حوالہ کی یہ آیت کہ "یہ جنس سوا دعا اور روزہ کے کسی اور طرح سے نکل نہیں سکتی۔" بتاتی تھی کہ دعا اور روزہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کو جذب کرنے کے ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ ہیں۔ چونکہ حضرت مسیح کے حواریوں نے اِن ذرائع سے کام نہ لیا اس لیے باوجود اس بات کے کہ وہ حضرت مسیح پر ایمان لاچکے تھے۔ انجیل کے بیان کے مطابق وہ ایک بدروح کو نہ نکال سکے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ نے اِس آیت کو پیش کرتے ہوئے عیسائیوں پر اعتراض کیا کہ تمہارا محض اِسی بات پر انحصار رکھنا کہ تم حضرت مسیح پر ایمان لے آئے ہو اور ہر قسم کے عمل صالح کو باطل قرار دینا درست نہیں۔ حضرت مسیح تو خود تسلیم کرتے ہیں کہ دعا اور روزہ بھی ضروری چیزیں ہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ دعا اور روزہ سے کام لیتے تھے۔ تو جب دعا اور روزہ کی ضرورت ہے تو معلوم ہوا کہ محض حضرت مسیح پر ایمان انسان کو ہر قسم کی نیکی سے مستفیض اور نجات کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ یہ اعتراض ایسا زبردست تھا کہ عیسائی اس کا کوئی جواب نہ دے سکے اور انہوں نے اپنی خیر اسی میں سمجھی کہ اِس آیت کو اناجیل میں سے نکال دیں۔ چنانچہ موجودہ اناجیل میں یہ آیت کہیں نظر نہیں آتی۔ گویا ایک آیت کو کتاب میں سے خارج کردیا گیا اور اس طرح ثابت کردیا گیا کہ انجیل اب تک انسانی دست بُرد کا شکار ہو رہی ہے۔

۵۔ متی باب ۱۲ آیت ۳۹۔۴۰ میں لکھا تھا کہ ایک موقعہ پر جب بعض فقیہوں اور فریسیوں نے حضرت مسیح سے کہا کہ "اے اُستاد ہم تجھ سے ایک نشان چاہتے ہیں۔" تو حضرت مسیح نے اُن کو یہ جواب دیا کہ

"اِس زمانہ کے بد اور حرامکار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان انہیں دکھایا نہ جائیگا کیونکہ جیسا یونس تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ ویسا ہی انسان کا بیٹا تین دن اور تین رات زمین کے دل میں ہوگا"

مذکورہ بالا آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح کی اصل پیشگوئی یہ تھی کہ جس طرح یونس نبی تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہے، اُسی طرح میں بھی تین دن اور تین رات قبر کے اندر رہوں گا۔ اور یونس نبی سے میری مماثلت ثابت ہو جائے گی۔ مگر اناجیل بتاتی ہیں کہ حضرت مسیح جمعہ کی شام کو قبر میں رکھے گئے (مرقس باب ۱۵ آیت ۴۲ تا ۴۶) اور جب اتوار کی صبح کو اُنہیں قبر میں دیکھا گیا تو وہ اس جگہ سے غائب تھے۔ (مرقس باب ۱۶ آیت ۱ تا ۶) اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ صرف ایک دن اور دو رات قبر میں رہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے عیسائی دنیا سے مطالبہ کیا کہ جب حضرت مسیح کی پیشگوئی یہ تھی کہ لوگوں کو ویسا ہی نشان دکھایا جائیگا جیسے یونس نبی کے ذریعہ نشان ظاہر ہُوا یعنی جیسے یونس نبی تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین دن اور تین رات قبر میں رہے گا۔ تو وہ تین دن اور تین رات زمین کے اندر کس طرح رہے۔ وہ واقعات جو اناجیل میں بیان کیے گئے ہیں وہ تو اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ اُن کے لیے اس اعتراض سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تو اُنہوں نے اِس آیت میں تحریف سے کام لیا اور موجودہ اناجیل میں بجائے تین دن اور تین رات کے "تین رات دن" کر دیا۔ اِس طرح انہوں نے گو اپنے آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے اعتراض سے بچانے کی کوشش کی ہے لیکن درحقیقت انہوں نے اپنے عمل سے ایک دفعہ پھر اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اناجیل میں تحریف و تبدیل ہوتی چلی آئی ہے اور اب بھی عیسائی ضرورت محسوس ہونے پر اس میں تحریف و تبدیل کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ جب حالات یہ ہیں۔ تو ایسی کتاب کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ بنی نوع انسان کی رہنمائی کا فرض سرانجام دے سکتی ہے۔ یا کوئی شخص کس طرح اس کی آیات کے متعلق یہ یقین سے کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ہیں۔ جب عیسائی آج بھی اس کی آیات میں تبدیلی کرنے سے احتراز نہیں کرتے تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ پہلے جو کچھ انہوں نے لکھا تھا وہ خدا تعالےٰ کا کلام تھا پس اناجیل میں تحریف و تبدیل کا متواتر ہوتے چلے آنا ثبوت ہے اِس بات کا کہ موجودہ اناجیل خدا تعالےٰ کی طرف سے نہیں اور وہ روحانی نقطۂ نگاہ سے بنی نوع انسان کے لیے کسی صحیح رہنمائی کا باعث نہیں ہو سکتیں۔

اناجیل میں اختلافات

اناجیل کے اندر جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کی کتاب نہیں۔ یا یہ کہ بعد میں انسانی دست بُرد نے اس کو بالکل بدل ڈالا۔ کیونکہ ایک معقول انسان اپنی لکھی ہوئی کتاب میں اختلافات کو روا نہیں رکھتا۔ تو پھر خدا کی کتاب میں اختلافات کیوں کر پائے جا سکتے ہیں۔ ہم ذیل میں مثال کے طور پر

نئے عہد نامہ کے چند اختلافات بیان کرتے ہیں۔

۱۔ مسیح کی پیدائش کی نسبت متی باب آیت ۲۱ تا ۲۲۔ اور لوقا باب آیت ۳۲ تا ۳۳ میں لکھا ہے کہ مسیح عام انسانوں میں سے ہوگا۔ ہاں وہ خدا کا بیٹا کہلائے گا۔ لیکن یوحنا کی انجیل میں لکھا ہے کہ مسیح کلمہ ہے جو ہمیشہ سے خدا کے ساتھ تھا اور خود خدا تھا۔ سب چیزیں اسی سے پیدا ہوئیں۔ (یوحنا باب آیت ۱)

۲۔ متی باب ۳ آیت ۳ تا ۱۷، مرقس باب آیت ۹ تا ۱۲ لوقا باب ۳ آیت ۲۱۔ ۲۲ اور باب آیت ۱ میں بتایا گیا ہے کہ مسیح نے یوحنا سے بپتسمہ پایا، اور بپتسمہ پاتے ہی وہ اُسی وقت یا اُسی دن اُس کے پاس سے چلا گیا۔ لیکن انجیل یوحنا میں بپتسمہ پانے کا ذکر نہیں اور مسیح کی ملاقات یوحنا سے دو دن تک بتائی گئی ہے۔

۳۔ یوحنا باب آیت ۱۹ تا ۴۴ سے پتہ لگتا ہے کہ مسیح یوحنا اور اُن کے ساتھیوں سے کچھ دن ملاقات کرنے کے بعد سیدھا جلیل چلا گیا۔ لیکن متی باب ۴ آیت ۱ مرقس باب ۱ آیت ۱۲ اور لوقا باب ۴ آیت ۱ میں لکھا ہے کہ مسیح یوحنا سے بپتسمہ پانے کے فوراً بعد شیطان کے ساتھ امتحان دینے کی خاطر جنگل کو گیا اور چالیس دن وہاں رہا۔

۴۔ یوحنا باب آیت ۳۵ تا ۵۱ میں لکھا ہوا ہے کہ یوحنا کی ملاقات کے معاً بعد یوحنا کے شاگرد اندریاس اور ایک اور غیر معلوم شاگرد مسیح نے اپنے حواری بنائے اور جلیل کو جاتے ہوئے شمعون پطرس نتنائیل کو اُس نے اپنا مرید بنایا۔ لیکن متی باب آیت ۱۲ تا ۲۲ مرقس باب آیت ۱۲ تا ۲۰۔ لوقا باب آیت ۱۴ تا ۱۵ اور لوقا باب ۵ آیت ۱ تا ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوحنا کی ملاقات کے بعد چالیس دن جنگل میں رہ کر مسیح نے روزہ رکھا پھر یوحنا کے قید ہونے کی خبر سنکر جلیل گیا۔ وہاں کئی جگہ اور کئی دن اُس نے وعظ کیئے۔ پھر جلیل کی جھیل کے کنارہ پر جا کر اُس نے شمعون اور پطرس اور اندریاس اور یوحنا اور یعقوب کے اپنا شاگرد بنایا۔ گویا یوحنا نے اِن لوگوں کے ایمان لانے کی جو جگہ بتائی ہے دوسری اناجیل اُسکے خلاف بتاتی ہیں اور یوحنا نے جو وقت بتایا ہے دوسری اناجیل اُس وقت کے قریباً دو ماہ بعد کا وقت بتاتی ہیں۔

۵۔ یوحنا باب آیت ۳ و آیت ۴۳ تا ۴۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کا وطن یہودیہ تھا اور مسیح اِس خیال سے کہ پیغمبر کی عزت اپنے وطن میں نہیں ہوتی اُسے چھوڑ کر جلیل چلے گئے جہاں کے لوگوں نے اُن کی بہت قدر کی۔

لیکن اِس کے خلاف متی باب ۱۳ آیت ۵۴ تا ۵۸ لوقا باب ۴ آیت ۲۴ اور مرقس باب ۶ آیت ۴ میں لکھا ہے کہ مسیح کا وطن یہودیہ نہیں بلکہ جلیل تھا جب جلیل میں ان کی قدر نہ ہوئی۔ تو انہوں نے کہا کہ کسی نبی کی قدر اُس کے وطن میں نہیں ہوتی۔

۶۔ یوحنا باب ۳ آیت ۲۲ تا ۲۶ اور یوحنا باب آیت ۱ تا ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے یوحنا کی قید سے پہلے ہی اپنی تعلیم بیان کرنی شروع کر دی تھی اور بپتسمہ دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن متی باب ۴ آیت ۱۲ تا ۱۷، مرقس باب آیت ۱۴۔ ۱۵، متی باب ۲۸ آیت ۱۹۔ اور مرقس باب ۱۶ آیت ۱۵۔ ۱۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے اپنی تعلیم کی تبلیغ تو یوحنا کے قید ہونے کے بعد شروع کی اور بپتسمہ کا حکم اپنے مرنے سے جی اٹھنے کے بعد دیا۔ جیسا کہ لکھا ہے۔ "پھر وے گیارہ شاگرد جلیل کے اُس پہاڑ کو جہاں یسوع نے اُنہیں فرمایا تھا گئے اور اُسے دیکھ کر اُنہوں نے اُس کو سجدہ کیا۔ پھر بعضے دُبدہ میں رہے اور یسوع نے پاس آ کر اُن سے کہا کہ

آسمان اور زمین کا سارا اختیار مجھے دیا گیا۔ اس لیے تم جا کر سب قوموں کو شاگرد کرو۔ اور اُنہیں باپ اور بیٹے اور روح قدس کے نام سے بپتسمہ دو۔" (متی باب ۲۸ آیت ۱۶ تا ۱۹)

۷۔ یوحنا باب ۱۳ سے ظاہر ہے کہ مسیح نے آخری کھانا عید سے ایک روز پہلے کھایا اور عید کے روز وفات پائی۔ لیکن متی باب ۲۶ آیت ۱۷، مرقس باب ۱۴ آیت ۱۲ تا ۱۶۔ لوقا باب ۲۲ آیت ۷ تا ۱۳۔ متی باب ۲۷ آیت ۵ تا ۳۱۔ مرقس باب ۱۵ آیت ۶ تا ۲۰ اور لوقا باب ۲۳ آیت ۳ تا ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے آخری کھانا عید کی شام کو کھایا تھا اور عید سے دوسرے دن صلیب پائی۔

۸۔ یوحنا باب ۱۴ آیت ۵ تا ۳۱ اور باب ۱۶ آیت ۱ تا ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے بعد فارقلیط یا روح القدس آئیں گے۔ اس کے دوبارہ زندہ ہو کر واپس آنے کا کہیں صاف طور پر ذکر نہیں۔ لیکن متی باب ۱۷ آیت ۲۳ اور مرقس باب ۹ آیت ۳۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح تو دوبارہ زندہ ہو کر آئے گا لیکن فارقلیط کے دوبارہ آنے کا کوئی ذکر نہیں۔

۹۔ یوحنا کی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے حواریوں میں سے یوحنّا اُس کا سب سے بڑا اور پیارا حواری تھا۔ اِس لیے اُس کا نام مسیح کا پیارا ہو گیا تھا۔ دیکھو یوحنا باب ۱۳ آیت ۲۳۔ باب ۱۸ آیت ۱۵۔ باب ۱۹ آیت ۲۶-۲۷۔ باب ۲۵ آیت ۲ تا ۴ باب ۲۰ آیت ۷ تا ۲۰۔ لیکن دوسری انجیلوں سے پتہ لگتا ہے کہ مسیح کا سب سے پیارا حواری پطرس تھا اور تین شاگرد خاص تھے۔ پطرس۔ یوحنا یعقوب۔ تعجب ہے کہ یوحنا کی انجیل میں یعقوب کا تو ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ اور پطرس اور یوحنا میں سے یوحنا کو زیادہ مقرب قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ دوسری اناجیل پطرس کو زیادہ مقرب قرار دیتی ہیں۔ دیکھو متی باب ۱۶ آیت ۲۴۔ باب ۱۷ آیت ۱۔ باب ۲۶ آیت ۳۷۔ مرقس باب ۵ آیت ۳۷۔ باب ۹ آیت ۲۔ باب ۱۳ آیت ۳۔ باب ۱۴ آیت ۳۳۔ لوقا باب ۹ آیت ۲۸۔ باب ۲۲ آیت ۳۲۔

۱۰۔ لوقا نے یوسف کو ہیلی کا بیٹا بتایا ہے اور متی نے یوسف کو یعقوب کا بیٹا بتایا ہے۔

۱۱۔ لوقا نے مسیح کو داؤد کی اولاد ناتھن سے لکھا ہے اور متی نے ناتھن کے بھائی سلیمان بادشاہ کی نسل سے اُسے قرار دیا ہے۔

۱۲۔ متی کے نسب نامہ میں یوسف سے ابراہیم تک ۴۱ اشخاص کے نام ہیں اور لوقا کے نسب نامہ میں ۵۶۔ اور پھر ہر دو شجرۂ نسب کے ناموں میں کئی جگہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۳۔ لوقا کا خود اپنا کلام بھی مختلف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی انجیل کے باب ۲۴ آیت ۵۰-۵۱ میں لکھتے ہیں کہ "مسیح اپنے شاگردوں کے سامنے بیت عنیاہ میں آسمان پر چلے گئے"۔ لیکن یہی لوقا اپنی تصنیف اعمال میں لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ زیتون کے پہاڑ پر ہوا تھا (اعمال باب ۱ آیت ۱۲)

۱۴۔ لوقا اپنی انجیل کے باب ۲۴ آیت ۲۱-۲۹-۳۶ اور ۵۱ میں لکھتے ہیں کہ جس روز مسیح جی اُٹھے تھے اُسی دن یا پہلی رات جو آئی تھی۔ اُس میں آسمان پر چلے گئے۔ لیکن یہی لوقا اعمال باب ۱ آیت ۳ میں لکھتے ہیں کہ وہ جی اُٹھنے کے چالیس دن بعد آسمان پر چلے گئے تھے۔

۱۵- متی باب ۱۰ آیت ۱۰ میں لکھا ہے کہ مسیح نے اپنے حواریوں سے کہا کہ راستہ کے لیے نہ جھولی نہ دو کُرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی لو۔
لیکن مرقس باب ۶ آیت ۸ و ۹ میں لکھا ہے کہ مسیح نے اپنے حواریوں کو حکم دیا کہ سفر کیلئے سوائے لاٹھی کے کچھ نہ لو۔ پھر لکھا ہے کہ جوتیاں پہنو۔
گویا متی کی رِوایت کے مطابق تو جوتی سے بھی منع کیا گیا تھا اور لاٹھی سے بھی لیکن مرقس کی رِوایت کے مطابق لاٹھیاں لینے اور جوتیاں پہننے کا حکم تھا۔

انجیل میں بعض توہمات کا ذکر

انجیل کی تعلیم کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ توہمات سے بھی خالی نہیں۔

ا۔ چنانچہ مرقس باب ا آیت ۱۲-۱۳ میں لکھا ہے:-

"اور روح اُسے فی الفور بیابان میں لے گئی۔ اور وہ وہاں بیابان میں چالیس دن تک رہ کے شیطان سے آزمایا گیا اور جنگل کے جانوروں کے ساتھ رہتا تھا۔ اور فرشتے اُس کی خدمت کرتے تھے۔"

یہ واقعات بالکل وہم ہیں۔ اور الٰہی سنّت اِن امور کے بالکل خلاف ہے۔ اِس دنیا میں انسان انسانوں کے ساتھ ہی رہتا ہے نہ کہ جانوروں اور شیطانوں یا فرشتوں کے ساتھ۔ کیا کوئی عقلمند یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا قانون پہلے اِس دنیا کے لیے کچھ اور تھا اور اب کچھ اَور ہو گیا ہے۔ نہ تو اِس دنیا میں شیطان کسی کے ساتھ ظاہری طور پر رہتے ہیں نہ فرشتے ظاہری طور پر خدمت کرتے ہیں۔ کشفی طور پر اِن نظاروں کا نظر آنا اور بات ہے۔ ایسے کشفی نظّارے نہ صرف پہلے ہوتے تھے بلکہ اب بھی ہوتے ہیں اور مَیں خود اس معاملہ میں تجربہ رکھتا ہوں لیکن یہ بات نہ پہلے ہوتی تھی نہ اب ہوتی ہے کہ انسان جانوروں میں رہ رہا ہو۔ بھیڑیے اور شیر اُس کے اردگرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ شیطان آتا ہے اور اُس کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور خدا کا وہ بندہ اُس کے پیچھے پیچھے پھرتا اور بلاوجہ اُس کے احکام کو مانتا چلا جاتا ہے اور کبھی کبھی اُس سے بغاوت بھی کر دیتا ہے۔ اِسی طرح فرشتے آتے ہیں اُس کے لیے روٹی پکاتے ہیں۔ اس کے لیے ہنڈیا تیار کرتے ہیں۔ اس کے لیے پانی مہیّا کرتے ہیں۔ کہانیوں کی کتابوں میں تو ایسی باتیں آ سکتی ہیں لیکن مذہبی کتابوں کا ایسی باتوں سے کیا تعلق۔ اگر تو نیا عہد نامہ کپلنگ کی "جنگل بک" کی طرح ہوتا یا الف لیلہ کی مانند ہوتا تو اِس قسم کی باتیں قابلِ اعتراض نہ ہوتیں۔ لیکن نیا عہد نامہ تو لوگوں کی مذہبی اور روحانی رہنمائی کے لیے ہے اِس میں اِس قسم کی کہانیوں کا کیا مطلب؟ ہم مسیح ناصری جیسے نیک اور پاک آدمی کی نسبت کسی صورت میں بھی یہ نہیں مان سکتے کہ اُس نے ایسی باتیں کہی ہوں۔ وہ خدا تعالیٰ کا ایک برگزیدہ رسول تھا اور دنیا کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے آیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا پاکیزہ انسان دنیا کو ایسی باتیں بتاتا جو اُس کو جادۂ اعتدال سے پھرا دیں اور وہم میں مبتلا کر دیں پس یہ باتیں یقیناً بعد میں داخل کی گئی ہیں۔ اور ان کی ذمہ واری مسیح پر نہیں اور نہ اُس کے حواریوں پر ہے۔ بلکہ بعد میں آنے والے ایسے عیسائیوں پر ہے جن کی روحانیت مر چکی تھی اور جو لوگوں کی واہ واہ کو صداقت اور راستی پر ترجیح دیتے تھے۔

ب۔ مرقس باب ۵ آیت ۱ تا ۱۴ میں لکھا ہے۔ "اور وُے دریا کے پار گدرینیوں کے ملک میں پہنچے۔ اور جونہی وہ کشتی سے اُترے وہیں ایک آدمی جس میں ایک ناپاک رُوح تھی قبروں سے نکلتے ہوئے اُسے ملا۔

اور وہ قبروں کے درمیان رہا کرتا تھا اور کوئی اُسے زنجیروں سے بھی جکڑ نہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بار بار بیڑیوں اور زنجیروں سے جکڑا گیا تھا لیکن اُس نے زنجیروں کو توڑا اور بیڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور کوئی اُسے قابو میں نہ لا سکا۔ وہ ہمیشہ رات دن پہاڑوں اور قبروں کے بیچ چلایا کرتا اور اپنے تئیں پتھروں سے کاٹتا تھا۔ پر جونہی اُس نے یسوع کو دُور سے دیکھا دوڑا اور اُسے سجدہ کیا اور بڑی آواز سے چلاّ کے کہا۔ اے خدا تعالیٰ کے بیٹے یسوع مجھے تجھ سے کیا کام! تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں مجھے نہ ستا۔ کیونکہ اُس نے اُسے کہا تھا کہ اے ناپاک روح اِس آدمی سے نکل آ۔ پھر اُس سے پوچھا تیرا کیا نام ہے۔ تب اُس نے جواب دیا کہ میرا نام تمن ہے اس لیے کہ ہم بہت ہیں۔ پھر اُس نے اُس کی بہت منّت کی کہ ہمیں اِس سرزمین سے مت نکال۔ اور وہاں پہاڑوں کے نزدیک ایک سُوروں کا غول چرتا تھا۔ سو سب دیووں نے اُس کی منّت کر کے کہا کہ ہم کو اِن سُوروں کے درمیان بھیج تاکہ ہم اُن میں بیٹھیں۔ یسوع نے انہیں فی الفور اجازت دی اور وے ناپاک رُوحیں نکل کر سُوروں میں پیٹھ گئیں۔ اور وہ غول کراڑے پر سے دریا میں کودا۔ اور وے قریب دو ہزار کے تھے جو دریا میں ڈوب کر مر گئے اور وے جو سُوروں کو چراتے تھے بھاگے اور شہر اور دیہات میں خبر پہنچائی۔ تب وے اِس ماجرے کو دیکھنے نکلے۔

اِن آیات میں اِس قدر وہم کی باتیں جمع کر دی گئیں ہیں کہ انسان حیران ہو جاتا ہے۔ اوّل یہ کہ ایک شخص اتنا پاگل تھا کہ کسی قسم کی زنجیریں اس کو جکڑ نہیں سکتی تھیں۔ وہ ہر قسم کی زنجیریں توڑ دیتا تھا۔ کیا کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے جو ہر قسم کی زنجیریں توڑ دے؟ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُس زمانہ میں لوگوں کو زنجیریں بنانی نہ آتی ہوں اور وہ گھڑیوں کی زنجیروں جیسی کمزور زنجیروں سے لوگوں کو باندھتے ہوں۔

پھر لکھا ہے۔ وہ دیوانہ اپنے تئیں پتھروں سے کاٹتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص متواتر سالہا سال سے اپنے آپ کو پتھروں سے کاٹتا تھا اور پھر بھی وہ مرتا نہیں تھا۔

پھر لکھا ہے۔ مسیح نے اُس شخص کو کہا کہ اے ناپاک روح اِس آدمی میں سے نکل آ۔ یہ تو پہاڑی اور جاہل علاقوں کے خیالات ہیں نہ کہ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ رسول کے خیالات۔ اگر اِس قسم کی بد روحیں لوگوں میں آیا کرتی تھیں، تو اب کیوں نہیں آتیں اور کون سے ایسے ذرائع ہیں جن سے ایسی بد روحوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ جس چیز کو آج ڈاکٹروں نے "نیورس تھینیا" یا ہسٹیریا یا جنون قرار دیا ہے۔ اس کو پُرانے زمانے کے ناواقف لوگ بد روحیں قرار دیتے تھے۔ مگر انجیل یہ بتاتی ہے کہ حضرت مسیح جیسا سنجیدہ اور راستباز اور عقلمند انسان بھی اِن جاہلوں کی طرح یہ کہتا تھا کہ مجنونوں کے اندر کوئی بد روح داخل ہو جاتی ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک خدا تعالیٰ کے ایک راستباز پر یہ کتنا بڑا الزام ہے۔ اپنی توہم پرستی کو دنیا کے ایک عظیم الشان رہنما کی طرف منسوب کر دینا یقیناً ایک بہت بڑا ظلم ہے مسیح خود ایسی بات نہیں کر سکتا تھا اور نہ اُس کے حواری ایسی بات کر سکتے تھے۔ یقیناً یہ بعد کے جہاّل کی داخل کی ہوئی بات ہے جنہوں نے انجیل کو اُس کے حقیقی معیار سے نیچے گرا دیا۔

پھر آگے چل کر اس وہم کو اور بھی پکا کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسیح نے بد روح سے اُس کا نام پوچھا، تو اُس نے کہا۔ "میرا نام تمن ہے اِس لیے کہ ہم بہت ہیں۔" گویا ایک روح اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہو گئی تھی، بلکہ ایک بڑا جتھا روحوں کا اُس وقت پایا جاتا تھا۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ روح نے مسیح کی منّتیں کیں کہ اِس سرزمین سے

اُس کو نہ نکالیں۔ لیکن جب مسیح نے نہ مانا تو سب دیووں نے اُس کی منت کر کے کہا کہ ہم کو اِن سُوروں کے درمیان بھیج تاکہ ہم اُن پر بیٹھیں۔ اِس پر یسوع نے فی الفور اُنہیں اجازت دی اور وے ناپاک روحیں نکل کے سُوروں میں بیٹھ گئیں۔ اور وہ غول (یعنی سُوروں کا غول) کڑاڑے پر سے دریا میں کُودا۔ اور وے قریب دو ہزار کے تھے جو دریا میں ڈوب کر مر گئے۔

اِن چند فقروں میں کتنا بڑا وہم اور کتنا ظلم موجود ہے۔ وہم تو یہ ہے کہ بدروحوں نے انسان میں سے نکل کر سُوروں میں جانے کی مسیح سے اجازت مانگی۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ روحیں مسیح سے پوچھے بغیر آدمی کے جسم میں داخل ہو گئی تھیں تو سوروں میں داخل ہونے کے لیے اُنہیں کسی اجازت کی کیا ضرورت تھی؟ دوسرے یہ کہ سُوروں کا گلہ کسی کی ملکیت تھا۔ جنگلی سؤر تو اِس طرح دو ہزار کے گلے کی صورت میں شہر کے پاس آکر نہیں پھرا کرتے۔ اتنی تعداد میں شہر کے قریب پھرنے والے سؤر تو کسی کی ملکیت ہُوا کرتے ہیں۔ اِس پر سوال ہوتا ہے کہ کسی کی ملکیت کو تباہ کرنے کا مسیح کو کیا حق پہنچتا تھا؟ اگر کوئی کہے کہ خدا کے بیٹے کو سب چیزوں پر ملکیت کا حق حاصل ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو محبت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر خدا محض اپنی ملکیت اعلیٰ سے حق کے طور پر انسان کی ملکیت کو تباہ اور برباد کر سکتا ہے۔ تو پھر کونسا روحانی نظام دنیا میں کام کر رہا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا ثبوت کیا ہے۔ علاوہ ازیں اِس میں ایک اور عظیم الشان وہم کا بیان ہوا ہے۔ اور وہ یہ کہ سوروں میں جب یہ روحیں چلی گئیں تو وہ دریا میں کود کر مر گئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ بدروحیں ایک انسان میں گئیں تو وہ دریا میں نہ کودا لیکن دو ہزار سُوروں میں گئیں تو وہ دریا میں کود کر مر گئے۔ پس یہ آیات وہم پر دلالت کرتی ہیں اور ظالمانہ مضامین ان کے اندر پائے جاتے ہیں اور کوئی عقلمند انسان جو مسیح کی عظمت کا قائل ہو وہ اِن آیات کو مسیح یا اُنکے حواریوں کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ لازماً ماننا پڑتا ہے کہ یہ آیات بعد میں بنا کر انجیل میں داخل کی گئی ہیں۔

ج۔ انجیل میں لکھا ہے مسیح مُردے زندہ کیا کرتے تھے اور مُردے واپس شہر میں آکر داخل ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ یوحنا باب ۱۱ آیت ۴۳-۴۴ میں لکھا ہے۔ اور یہ کہہ کر بلند آواز سے چلّایا کہ اے لعزر باہر نکل۔ تب وہ جو مر گیا تھا کفن سے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نکل آیا اور اُس کا چہرہ گرداگرد رومال سے لپٹا ہُوا تھا۔

اسی طرح لکھا ہے۔" دیکھو ہیکل کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا۔ اور زمین کانپی اور پتھر تڑک گئے اور قبریں کھل گئیں۔ اور بہت لاشیں پاک لوگوں کی جو آرام میں تھے اُٹھیں اور اُٹھنے کے بعد قبروں سے نکل کر اور مقدس شہر میں جا کر بہتوں کو نظر آئیں۔" (متی باب ۲۷ آیت ۵۱ تا ۵۳)

کیا کوئی عقلمند اِن باتوں کو تسلیم کر سکتا ہے۔ اگر مُردے پہلے زندہ ہوتے تھے تو اب کیوں نہیں ہوتے؟ اگر کہو کہ یہ مسیح کی علامت تھی تو یہ غلط ہے۔ مسیح کہتا ہے اگر تم میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو۔ تو جو نشانات مَیں نے دکھائے ہیں اُن سے بہتر نشانات تم دکھا سکتے ہو۔ چنانچہ یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۲-۱۳ میں لکھا ہے:-

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان لاتا ہے۔ یہ کام جو میں کرتا ہوں وہ بھی کرے گا۔ اور اُن سے بھی بڑے کام کرے گا۔ کیونکہ مَیں اپنے باپ پاس جاتا ہوں۔ اور جو کچھ تم میرے نام سے مانگو گے وہی کرونگا

تاکہ باپ بیٹے میں جلال پاوے۔ اگر تم میرے نام سے کچھ مانگو گے تو میں وہی کروں گا۔"

مگر کیا اِس پیشگوئی کے مطابق اب بھی عیسائی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں؟

د۔ متی باب ۱۴ آیت ۲۵ تا ۲۷ میں لکھا ہے "اور رات کے پچھلے پہر یسوع دریا پر چلتا ہُوا اُن کے پاس آیا جب شاگردوں نے اُسے دریا پر چلتے دیکھا وے گھبرا کر کہنے لگے یہ بھوت ہے اور ڈر سے چلائے۔ وہیں یسوع نے انہیں کہا کہ خاطر جمع رکھو میں ہوں۔ مت ڈرو۔"

یہ بھی ایک وہم ہے جس کا انجیل میں ذکر کیا گیا۔ ورنہ پانی پر کون چل سکتا ہے۔

ہ۔ لوقا باب ۱۱ آیت ۲۴ تا ۲۶ میں لکھا ہے "جب ناپاک رُوح آدمی سے باہر نکلتی ہے تو سُوکھی جگہوں میں آرام ڈھونڈتی ہے اور جب نہیں پاتی تو کہتی ہے کہ میں اپنے گھر کو جس سے نکلی ہوں پھر جاؤں گی۔ اور یہ کہ اُسے جھاڑا ہُوا اور آراستہ پاتی ہے تب جا کے اور سات رُوحیں جو اُس سے بدتر ہیں اپنے ساتھ لاتی ہے اور وے اس میں داخل ہو کے وہاں بستی ہیں اور اُس آدمی کا پچھلا حال پہلے سے بُرا ہوتا ہے۔"

یہ کیسے وہمی خیالات ہیں۔ اول یہ بیان کرنا کہ ناپاک رُوح آدمی میں سے نکل کر سوکھی جگہ میں آرام ڈھونڈتی پھرتی ہے اور پھر سات اور گندی روحیں لیکر واپس آجاتی ہے۔ کیا کوئی عقلمند انسان ان باتوں کو تسلیم کر سکتا ہے؟ اور کیا اِن باتوں کو حضرت مسیح اور خدا کے کلام کی طرف منسوب کرنا جائز ہو سکتا ہے؟ جھوٹ بہت ہی بُری چیز ہے اور وہم بھی ایک نہایت گندی مرض ہے لیکن جھوٹ اور وہم کو خدا تعالیٰ کے نبیوں اور خدا تعالیٰ کے کلام کی طرف منسوب کرنا تو اور بھی ظالمانہ فعل ہے اور انجیل کے نادان دوستوں نے اِس جرم کا ارتکاب کر کے اُسے دنیا کی ہدایت دینے والی کتابوں سے ہمیشہ کے لیئے نکال دیا ہے۔

انجیل کی خلاف اخلاق باتیں

ا۔ مرقس باب ۱۱ آیت ۱۲ تا ۱۴ میں لکھا ہے "صبح کو جب وہ بیت عنیاہ سے باہر آئے اُس کو بھوک لگی۔ اور دُور سے انجیر کا ایک درخت پتوں سے لدا ہُوا دیکھ کے وہ گیا کہ شاید اس میں کچھ پاوے۔ جب وہ اُس پاس آیا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا تب یسوع نے اُس سے خطاب کر کے کہا کہ کوئی تجھ سے پھل نہ کھاوے۔"

اِس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ (ا) مسیح باوجودیکہ ایک ایسے ملک کے رہنے والے تھے جہاں انجیر کثرت سے ہوتی ہے، مگر وہ ایسے ناواقف تھے کہ اُنہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ انجیر کے درخت کو کب پھل لگتا ہے۔

(ب) وہ نعوذ باللہ من ذالک ایسے بداخلاق تھے کہ بجائے اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کے انہوں نے ایک بیجان درخت کو بددعا دی اور کہا کہ آئندہ کوئی تجھ سے کبھی پھل نہ کھاوے۔ ہم مسلمان جو مسیح کی خدائی کے قائل نہیں بلکہ اُنہیں خدا کا ایک نبی مانتے ہیں، ہم بھی تو اُن سے ایسی بدتہذیبی کے ارتکاب کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ پھر تعجب ہے ان لوگوں پر جو اُن کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں اور اخلاق کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں اور پھر انجیل میں ایسی باتیں ان کے متعلق پڑھتے ہیں اور اُنہیں برداشت کر لیتے ہیں اور اُن کے دل میں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ یہ باتیں مسیح نے کبھی نہیں کہی ہونگی بلکہ دوسرے لوگوں نے اُن کی طرف منسوب کر دی ہوں گی۔

آج کل کے بعض پادری اس حوالہ کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہودی قوم اب پھل دینے کے

نا قابل ہوگی۔ اس لیے آئندہ یہودیوں میں سے کوئی نیک پھل پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن کیا کوئی شخص جو علم ادب سے ذرا بھی حصّہ رکھتا ہو اس عبارت کے ایسے معنے کرسکتا ہے۔ کیا انجیر کے درخت سے یہودیوں کو تمثیل دینے کے لیے اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ مسیح اُس وقت انجیر کے درخت کے پاس جائے جب اُسے بھوک لگی ہو۔ پھر اُس درخت کے پاس جائے جس میں پتے موجود تھے اور پھر راوی اُس کے متعلق یہ الفاظ بھی کہے کہ مسیح اس لیے اُس درخت کے پاس گیا تھا کہ شاید اُس میں کچھ پاوے۔ مگر جب وہ اس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا۔ کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا مسیح کا بھوک لگنے پر درخت کے پاس جانا۔ اور ایسے درخت کے پاس جانا جس میں پتے لگے ہوئے تھے اور اس امید کے ساتھ جانا کہ مجھے اس سے پھل ملیگا جیسا کہ فقرہ "شاید اُس میں کچھ پاوے" سے ظاہر ہے اور پھر راوی کا یہ کہنا "کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا" صاف بتاتا ہے کہ کسی تمثیل کے لیے مسیح اس درخت کے پاس نہیں گیا تھا بلکہ اپنی بھوک کو دور کرنے کے لیے گیا اور ایسے موسم میں گیا جبکہ ممکن تھا کہ درخت میں پھل لگا ہُوا ہوتا مگر ابھی پورا وقت نہیں آیا تھا۔ یا شاید اس درخت میں پھل عام موسم سے ذرا دیر میں لگتا تھا یا شاید اُس کی بیماری کی وجہ سے اس درخت میں پھل ہی نہیں لگتا تھا۔ اس پر مسیح ناراض ہوگیا اور اس درخت پر لعنت کی۔

کیا درختوں، دریاؤں، پہاڑوں اور پتھروں کو لعنت کرنے والے انسان معقول انسان سمجھے جاتے ہیں؟ کیا انجیل میں تبدیلی کرنیوالا انسان یہ خیال کرتا تھا کہ مسیح جیسے شریف انسان کو آنیوالی دنیا ایسے بُرے اخلاق سے متصف سمجھ لیگی؟ عیسائی تو بیشک اُس کے دھوکے میں آگئے مگر ہم مسلمان یہ باتیں کبھی مسیح کی طرف منسوب نہیں کرسکتے۔ اس لیے نہیں کہ مسیح کی شخصیت دوسرے نبیوں سے نرالی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ کسی شریف انسان سے بھی ہم ایسی اُمید نہیں کرسکتے خواہ وہ نبی نہ بھی ہو۔

۲۔ متی باب ۷ آیت ۶ میں لکھا ہے "وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سُوروں کے آگے نہ پھینکو۔ ایسا نہ ہو کہ وے اُنہیں پامال کردیں اور پھر کر تمہیں پھاڑیں"۔ یہ چیز جسے پاک اور موتی قرار دیا گیا ہے خدا تعالےٰ کی وحی اور اس کے نشانات ہیں۔ اور کُتے اور سُور سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس وقت تک حضرت مسیح پر ایمان نہ لائے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا تعالےٰ کے نشانات پاکیزہ چیزوں سے بھی پاک ہیں اور موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ پاک چیزیں اور موتی ایسے ہی لوگوں کے لیے آتے ہیں جن کو ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ کیا خدا تعالےٰ کے نبی ان لوگوں کو ایمان دینے کے لیے آتے ہیں جو پہلے سے مومن ہوتے ہیں؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ کبھی بھی خدا تعالیٰ کے نبی ایسے زمانہ میں نہیں آئے جب دنیا مومن تھی ہمیشہ تاریکی اور ظلمت کے زمانہ میں خدا کے نبی آیا کرتے ہیں اور اُن کا کام یہی ہوتا ہے کہ دنیا کے بھُولے بھٹکوں کو راہِ ہدایت کی طرف لائیں۔ دنیا کی بھُولی ہوئی روحیں اُن کا مقصود ہوتی ہیں اور دنیا کے بھٹکے ہوئے لوگوں کو ہدایت دینا ہی اُن کا مدعا ہوتا ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا کا پیارا اُن کو کُتا اور سُور قرار دے محض اس جرم پر کہ ابھی تک ہدایت اُن پر ظاہر نہیں ہوئی۔ اور کیا خدا کا نبی یہ کہہ سکتا ہے کہ اُن کے آگے خدا کی تعلیمیں پیش نہ کرو کیونکہ وہ اُن کو پاؤں تلے روندیں گے۔ اگر خدا تعالےٰ کے نشانات نہ ماننے والے کے سامنے پیش نہ کیے جائیں تو وہ اُن کو قبول کس طرح کریں گے۔ اور دنیا

ہدایت کی طرف آئے گی کیونکر؟ پس یہ مسیح پر بہت بڑا الزام ہے کہ جن لوگوں کی ہدایت کے لیے اُسے بھیجا گیا تھا اُنہی کو اُس نے کتّے اور سؤر قرار دیا۔ کسی شرارت کی وجہ سے نہیں۔ کسی خاص معاندانہ فعل کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اِس لیے کہ اب تک اُن پر صداقت ظاہر نہ ہوئی تھی۔ اِس کے مقابلہ میں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شعراء ع۱) اے ہمارے رسول تو اپنی جان کو ہلاک کر رہا ہے اِس لیے کہ کافر لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ کیا ہی زمین و آسمان کا فرق ہے اِن دونوں مدعیان ہدایت وارشاد میں۔ کہ ایک تو ایمان نہ لانے والوں کے غم میں اپنی جان کو ہلاک کر رہا ہے اور دوسرا اپنے حواریوں کو حکم دے رہا ہے کہ اِن کتّوں اور سُوروں کی پروا نہ کرو۔ اور اِن کو خدا تعالیٰ کا کلام مت پہنچاؤ۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عالی اخلاق کی وجہ سے تمام انبیاء سے بڑھکر تھے۔ مگر مَیں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ حضرت مسیح اخلاق سے اتنا گرے ہوئے تھے۔ بیشک وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کو نہیں پہنچے تھے مگر وہ خدا کے نبی تھے خدا تعالیٰ کی طرف سے اخلاق اور روحانیت سکھانے کے لیے لوگوں کی طرف آئے تھے۔ اور یقیناً اُن کا نمونہ لاکھوں کروڑوں لوگوں سے اچھا تھا۔ افسوس ہے اُس شخص پر جس نے ایسی بُری بات مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب کی۔ اِس سلسلہ میں اُس کنعانی عورت کا واقعہ بھی نہیں بھلایا جا سکتا جس کا ذکر متی باب ۱۵ آیت ۲۱ تا ۲۶ اور مرقس باب ۷ آیت ۲۴ تا ۲۷ میں آتا ہے۔ اس عورت نے نہایت عاجزی سے مسیح سے عرض کی اور اپنے قومی رواج کے مطابق اُسے سجدہ بھی کیا اور اُس سے صرف اتنا چاہا کہ وہ اُس کو بھی اپنی لائی ہوئی ہدایت سے روشناس کرے۔ مگر مسیح نے بقول انجیل یہ جواب دیا کہ "مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لیکر کتّوں کو پھینک دیں"۔ وہ مسکین عورت کس اشتیاق اور تمنّا کے ساتھ مسیح کے پاس آئی ہوگی۔ اِس لیے نہیں کہ وہ اُس سے روٹی مانگے۔ اِس لیے نہیں کہ وہ اُس سے کپڑا مانگے۔ اِس لیے نہیں کہ وہ اُس سے پانی مانگے۔ وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ اُس کو کوئی ایسا رستہ بتا دیا جائے جس سے وہ اپنے خدا سے مل سکے۔ وہ اُسی چیز کو طلب کرنے آئی تھی جس کے دینے کا مسیح مدّعی تھا۔ مگر موجودہ اناجیل کہتی ہیں مسیح نے اُس کو دھتکار دیا۔ ایک طاقتور اور قوی مرد نے ایک کمزور اور مسکین عورت کو مُنہ در مُنہ کہہ کر اُس کی تذلیل کی۔ کیا اِس حوالہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مسیح نے اُس کنعانی عورت کی تذلیل نہیں کی بلکہ جنس نسوانی کی تذلیل کر کے اپنی نسبت یہ ثابت کر دیا کہ وہ مسکین عورتوں کا رہنما نہیں ہے اور یہودی نسل کا اِس قدر دلدادہ ہے کہ یہودی کنچنیوں سے اپنے پاؤں پر عطر ملوانا پسند کرتا ہے لیکن غیر یہودی عورت کو ہدایت دینا پسند نہیں کرتا۔ (لوقا باب ۷ آیت ۳۶ تا ۳۸) اگر عیسائی دنیا اِس حوالہ کو تسلیم کرتی ہے تو بیشک کرے۔ مگر مَیں کبھی مان نہیں سکتا کہ حواریوں نے اُس کی نسبت ایسا کہا ہو۔ میرے نزدیک یہ باتیں بعد کے لوگوں نے اپنے پاس سے بنائی ہیں اور ایسے وقت میں بنائی ہیں جبکہ مسیح کی حقیقی حیثیت لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو چکی تھی۔ اصلی مسیح دنیا سے غائب ہو چکا تھا اور ایک خیالی مسیح اُس زمانہ کے نادان اور دین سے ناواقف لوگ بنا رہے تھے۔

۳۔ یوحنّا باب ۲ آیت ۱ تا ۹ میں لکھا ہے "اور تیسرے دن قانائے جلیل میں کسی کا بیاہ ہُوا اور یسوع

کی ماں وہاں تھی۔ اور یسوع اور اُس کے شاگردوں کی بھی اُس بیاہ میں دعوت تھی۔ اور مَے گھٹ گئی۔ یسوع کی ماں نے اُس سے کہا کہ اُن کے پاس مَے نہ رہی۔ یسوع نے اُس سے کہا۔ "اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام!"

اِسی طرح متی باب ۱۲ آیت ۴۷۔ ۴۸ میں لکھا ہے۔ "کسی نے اُس سے کہا کہ دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے تجھ سے بات کیا چاہتے ہیں۔ پر اُس نے جواب میں خبر دینے والے سے کہا۔ کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی"

یوحنا اور متی کے یہ دونوں حوالے بتاتے ہیں کہ مسیح اُس سب سے قوی رشتہ کی بھی پرواہ نہیں کرتا تھا جس کی عزت و احترام ہر شریف انسان کا کام ہے۔ کیا آج مسیحی دنیا میں کوئی شریف انسان ماں سے کہہ سکتا ہے کہ "اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام" اور کیا آج مسیحی دنیا میں یہ کہہ کر کہ "کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی" شریفوں میں گنا جا سکتا ہے؟ پھر کیا مسیح کی ہی مقدس ذات اِس تمسخر کے لیے باقی رہ گئی تھی کہ انجیل اس کی طرف ایسی بات منسوب کرتی ہے؟ ماں کا ادب تو ادنیٰ قوموں میں بھی پایا جاتا ہے یہ اُن اخلاق میں سے ہے جن کی ذلیل ترین انسانوں سے بھی امید کی جاتی ہے۔ مگر بنی اسرائیل کا وہ آخری تاجدار، موسوی سلسلہ کا وہ آخری ہیرو جو اپنی قوم کو تاریکی اور ظلمت سے نکالنے اور اسے بااخلاق بنانے کے لیے آیا تھا۔ اُس کی نسبت موجودہ اناجیل ہم سے منوانا چاہتی ہیں کہ اُس نے اپنی ماں کے ساتھ ترشروئی کی۔ اور اُس کے متعلق گستاخانہ رویّہ اختیار کیا۔ عیسائی کہتے ہیں وہ خدا کا بیٹا تھا، وہ انسان تھا ہی نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ اگر مسیح کی اصل شان خدا کا بیٹا ہونا ہی تھی تو وہ مریم کے گھر میں پیدا کیوں ہُوا تھا۔ اگر مریم کے گھر میں پیدا ہونے کی حالت اُس نے اپنے لیے پسند کر لی۔ اور نو مہینہ تک مریم کو اُن تکالیف میں مبتلا رکھا جن تکالیف کو مائیں حمل کے ایام میں برداشت کیا کرتی ہیں۔ اگر خدا کے بیٹے نے دو سال تک مریم کی چھاتیوں سے دُودھ پینے کی تکلیف گوارا کر لی۔ اگر اُس نے کئی سال اپنی تربیت اور خبر گیری کا بوجھ اُس پر ڈالا۔ تو کیا وہ یہ بھی ذمہ واری اپنے اوپر نہیں لے سکتا تھا کہ اُس عورت کو جسے اُس نے اپنی ماں بننے کا موقعہ دیا ادب اور احترام کے ساتھ یاد کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف مسیحی دنیا کے عذرات ہیں۔ اُن کے دلوں میں مسیح کی اتنی محبت نہیں ہے، جتنی محرف و مبدل انجیلوں کی پیچ ہے۔ کیونکہ وہ انجیلیں اُن کی بنائی ہوئی ہیں اور مسیح خدا تعالیٰ کی مقدس مخلوق تھا۔ پس وہ سیدھا رستہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں کہ انجیلوں کی غلطی کا اقرار کریں۔ مگر اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ مسیح کو بدنام ہونے دیں لیکن دنیا کے تمام معقول انسان جنہوں نے مسیح کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور اس کی قوتِ قدسیّہ کو پہچاننے کی کوشش کی ہے وہ اِس امر کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ موجودہ اناجیل بگڑی ہوئی ہیں، غلط ہیں اور ایسے امور پر مشتمل ہیں جو روحانیت کے قریب نہیں کرتے بلکہ روحانیت سے دُور پھینک دیتے ہیں۔ اور یقیناً ان کی اِس حالت کے بعد خدا کی طرف سے ایک نئے الہام کی ضرورت تھی۔ جو اِس قسم کی غلطیوں سے پاک ہو۔ اور بنی نوع انسان کو اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ روحانیت کی طرف لے جائے اور وہ کتاب قرآن کریم ہے۔

ویدوں میں تحریف و تبدیل کا ثبوت

تیسرا مذہب جو اپنے ماننے والوں کی تعداد کے لحاظ سے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے، ہندو مذہب ہے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق ہمارا یقین ہے کہ ہندو مذہب کی بنیاد بھی الٰہی الہام کے ذریعہ پڑی ہے۔ اور چونکہ اس مذہب والوں کے نزدیک وید ہی شرعی کتاب ہے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہی الہام اُس کے نبیوں پر نازل ہوا تھا۔ لیکن اس کتاب کی موجودہ حالت یہ ہے کہ جن لوگوں پر یہ کتاب نازل ہوئی تھی اُن کے نام تک معلوم نہیں، وید منتروں کے شروع میں بعض لوگوں کے نام ہیں لیکن اُن کے متعلق خود ہندو علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ وہ نہیں جن پر الہام نازل ہوا تھا۔ بلکہ ویدوں کے جمع کرنے والے تھے۔ ایسی صورت میں ویدوں کی تاریخی حیثیت کچھ باقی نہیں رہتی۔ ویدوں کے علماء کی ویدوں کے متعلق مندرجہ ذیل رائیں ہیں:۔

۱۔ پنڈت ویدک منی صاحب اپنی کتاب "ویدسروسو" کے صفحہ ۹۷ پر لکھتے ہیں:۔

"حقیقت میں جس قدر بُری حالت اس اتھروید کی ہوئی ہے اِتنی اور کسی وید کی نہیں ہوئی۔ سائن آچاریہ کے بعد بھی کئی سُوکت اِس میں ملا دئے گئے ہیں۔ ملانے کا ڈھنگ بہت اچھا سوچا گیا ہے۔ وہ یہ کہ پہلے اُس کے شروع اور آخر میں "اتھ" (شروع) اور "اِتی" (ختم) لکھ دیا جاتا ہے۔ جب دیکھا کسی نے پوچھا تک نہیں تب شروع آخر میں اتھ اِتی لکھنا بند کر دیا جاتا ہے بس صرف اتنے سے وُہ (یعنی اضافہ) سنہتا (ویدک مجموعہ) میں مل جاتا ہے، جیسے رگوید سنہتا میں بالکھلیہ سُوکت ملائے جا رہے ہیں ویسے ہی اتھروید کے آخر میں آج کل کنتاپ سوکت ملائے جا رہے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ پانچویں انوواک سے لیکر کنتاپ سُوکتوں سمیت جتنے سوکت اتھروید میں ملائے جارہے ہیں وہ کہاں سے آئے تو کوئی جواب نہیں ملتا جہالت کا اتنا دَور دورہ ہے کہ آخر میں اتھروید سنہتا سماپتا لکھا ہُوا دیکھکر ہی یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ بس جو کچھ اس خاتمہ تک چھپا ہُوا یا لکھا ہُوا ہے وہ سب اتھروید سنہتا ہے یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ چھاپنے والا یا لکھنے والا کون اور کتنی قابلیت رکھتا ہے۔

۲۔ پنڈت مہیش چندر پرشاد بی۔ اے سنسکرت ساہتیہ کا اتہاس جلد دوم کے صفحہ ۱۶۰ پر لکھتے ہیں:۔

"واجسنئی تشکل یجروید سمہتا بالکل نئی طرز پر ہے۔ اِس میں وید اور برہمن بھاگ (حصے) الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ اس میں چالیس ادھیائے ہیں۔ مگر لوگوں کا وشواش ہے کہ اِن میں ۱۸ اصل ہیں اور باقی بعد میں ملائے گئے ہیں۔ ادھیائے ا سے ۸ انگ کا بھاگ تیئتری سنہتا و کرشن یجروید کے نظم و نثر سے مطابقت رکھتا ہے۔ اِن ۱۸ ادھیاؤں کے ہر ایک لفظ کی تشریح اُس کے براہمن میں ملتی ہے۔ مگر باقی ۱۷ ادھیاؤں کے صرف تھوڑے منتروں پر ہی اس میں ٹیپنی (حواشی) پائی جاتی ہے۔ کاتیائن نے ادھیائے ۲۶ سے ۳۵ تک کو کھِل (ملاوٹ) کے نام سے لکھا ہے۔ ادھیائے ۱۹ سے ۲۵ میں بھی یگیہ کے طریقوں کا ذکر ہے۔

یہ تیئتری سنہتا سے نہیں ملتے۔ ۲۶ سے لے کر ۲۹ ادھیاؤں تک کچھ خاص طور پر انہی یگیوں کے متعلق منتروں کا ذکر ہے جس کے بارہ میں پہلے ادھیاؤں میں بیان ہے۔ اور اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ضرور بعد میں دئے گئے ہیں۔

۳۔ پنڈت شانتی دیو شاستری رسالہ گنگا فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۳۲ پر لکھتے ہیں:۔

"پہلے تو آج تک یہ بھی فیصلہ نہیں ہُوا کہ وید چار ہیں یا تین۔ منو سمرتی اور شت پتھ براہمن کی رُو سے رگوید، یجر وید اور سام وید یہ تین وید ہیں۔ اور ورِ ہدیشی اپنشد ہر مینوا اپنشد اور منڈک اپنشد کی رو سے چار وید ہیں"۔

۴۔ پنڈت ہردے نرائن ایم۔ ایس۔ سی رسالہ گنگا بابت ماہ جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۴۳ پر لکھتے ہیں:۔

"شونک رشی کے چرن ویوہ وغیرہ تصانیف میں وید منتروں اور اُن کے لفظوں اور حرفوں تک کی جو گنتی دی ہوئی ہے وہ موجودہ ویدوں میں نہیں ملتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ویدوں میں کئی منتر ملائے گئے ہیں اور کئی نکالے گئے ہیں"۔

۵۔ پنڈت شانتی دیو شاستری رسالہ گنگا بابت ماہ فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۳۱ پر لکھتے ہیں:۔

"جس وقت شونک رشی کا چرن ویوہ تصنیف ہُوا۔ اس وقت شاکل سنہتا (رگوید) کے ایک لاکھ ۵۳ ہزار آٹھ سو چھبیس لفظ، چار لاکھ ۳۲ ہزار حروف اور دس ہزار چھ سو بائیس منتر تھے مگر آج کل گنتی کرنے پر یہ تعداد نہیں ملتی"۔

۶۔ ڈاکٹر تارا پد چودھری ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر پٹنہ کالج رسالہ گنگا کے وید نمبر بابت ماہ جنوری ۱۹۳۲ء کے صفحہ ۷۴ پر لکھتے ہیں:۔

"ان کے علاوہ (ویدوں میں) ایسے الفاظ بھی ہیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشدھ پاٹھ (غلط متن) معلوم ہوتا ہے کہ بولنے والوں اور لکھنے والوں کی خامیوں کے باعث کئی قسم کی غلطیاں واقع ہو گئی ہیں"۔

۷۔ پنڈت وید کُمنی جی اپنی کتاب وید سروسو کے صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶ پر لکھتے ہیں:۔

"گو پتھ براہمن کا زمانہ تصنیف عین وہ زمانہ ہے۔ جبکہ یگیوں کا عروج تھا۔ اُس زمانہ رگویدی۔ یجرویدی۔ سام ویدی اور اتھروویدی ایک دوسرے سے اینٹھے ہوئے تھے۔ اور مختلف قسم کے فرائض اور من گھڑت طریقوں سے یگ وغیرہ کرنے میں محو تھے۔ اور ان میں سے جس جس کو رگوید کے جس قدر منتر مطلوب تھے وہ اُس اُس نے اپنے اپنے وید میں شامل کر لیے تھے اور ہر ایک اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا تھا اور دوسروں سے نفرت کرتا تھا یہی نہیں بلکہ شاکھا بھید (نسخوں کے) اختلاف کے باعث رگویدی رگویدی سے۔ یجرویدی یجرویدی سے۔ سام ویدی سام ویدی سے اور اتھروویدی اتھروویدی سے بھی الگ ہو گیا تھا۔ واشکل سنہتا والا شاکل سنہتا (یہ رگ وید کے دو مختلف نسخوں کے نام ہیں) مادھنیدن سنہتا والا کانو سنہتا (یہ یجروید کے دو مختلف نسخوں کے نام ہیں) کوتھم سنہتا والا رانائنی سنہتا (یہ سام وید کے دو مختلف نسخوں کے نام ہیں) اور شونک سنہتا والا پیپلاد سنہتا (یہ اتھروید کے دو مختلف نسخوں کے نام ہیں) کے پاٹھ (متن) کو سب سے اعلیٰ اور خالص اور دوسری شاکھا (نسخے) کے متن کو قطعی بُرا اور غلط کہتا تھا۔ آج جو وید کے مختلف نسخوں میں طرح طرح کے اختلاف نظر آتے ہیں۔ یہ اکثر اُسی بُرے زمانہ میں جنم پائے ہوئے ہیں۔

۸ - اِسی کتاب کے صفحہ ۱۰۸ پر لکھا ہے "اِن کے علاوہ براہمن گرنتھوں کا بھی بہت سا حصّہ ان (ویدوں) میں شامل ہے، جو پڑھنے سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔ اتھروید کی بھی یہی حالت ہے۔ دِ دوانوں (علماء) کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ دینی کتاب کی ایسی حالت افسوسناک ہے۔"

۹ - پھر اس کتاب کے صفحہ ۱۰۹ پر لکھا ہے "یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس وقت اتھروید کی صرف دو شاکھا سنہتا (مختلف نسخے) ملتے ہیں۔ ایک پپلاد سنہتا اور دوسری شونک سنہتا۔ دونوں میں پپلاد زیادہ لائق تسلیم ہے، لیکن وہ چھپی نہیں اور نہ ہی اس پر سائن آچاریہ نے تفسیر کی ہے۔ دوسری شونک سنہتا چھپی ہوئی ملتی ہے جس کے تین اڈیشن مختلف پریسوں میں چھپے ہوئے ہیں جن میں دو[۲] مُول (صرف متن) اور ایک سائن اچاریہ کی تفسیر کے ساتھ چھپی ہے۔ دونوں مُول میں سے ایک ویدک پریس اجمیر کی دوسری بمبئی پریس کی چھپی ہوئی ہے۔ اس کا چھاپنے والا سیوک لال ہے۔ تینوں میں سُوکتوں (بابوں) اور منتروں کا اختلاف ہے۔

بعض آریہ سماجی عالموں نے اِس اختلاف کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے ہیں۔ چنانچہ آریہ سماجی عالم پنڈت رگھونندن شرما ساہتیہ بھوشن ویدک سمپتی صفحہ ۵۷۰ و ۵۷۱ پر اس اختلاف کی اہمیت کو کمزور کرنے کے لیے لکھتے ہیں:-

"جہاں تک ہمیں علم ہے اب تک اِس قسم کا کوئی ایک بھی ثبوت پیش نہیں کیا گیا جس سے معلوم ہو کہ ویدوں میں فلاں جگہ ملاوٹ ہے جس کو آج تک کوئی نہیں جانتا تھا جن مقامات میں ملاوٹ بتائی جاتی ہے وہ بہت دنوں سے (براہمن گرنتھوں کی تصنیف کے زمانہ سے) سب کو معلوم ہے وہ ملاوٹیں نہیں، بلکہ ایک قسم کے ضمیمے ہیں جو کاتبوں اور پریس والوں کی غفلت کی وجہ سے اصل متن میں گھس کر متن جیسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بال کھلیہ سُوکت رگوید میں (یہ ۱۱ سُوکت یعنی باب ہیں جن میں ۸۰ منتر ہیں) کِھل یعنی براہمن بھاگ یجروید میں (یہ بھی کئی باب ہیں) آرنیک اور سہانامنی سُوکت سام وید میں۔ (یہ دو باب ۶۵ منتر ہیں) اور کنتاپ سُوکت اتھروید میں ملے ہوئے ہیں (یہ اکٹھے دس سُوکت یعنی باب ہیں جن میں ۱۵۰ منتر ہیں) اور ان کو سبھی جانتے ہیں۔ اور ان سب کے متعلق مفصل ثبوت بھی موجود ہیں۔ اِن کے علاوہ کچھ مقامات یجروید اور اتھروید میں اور بھی ہیں جن کا علم ان فقروں اور منتروں کے پڑھنے سے ہو جاتا ہے کہ وہ ملاوٹی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شاکھاؤں (وید کے مختلف نسخوں) کی گڑبڑ کا سب کو علم ہے...... اور شدھ ویدک شاکھائیں موجود ہیں۔ اِسی طرح ملاوٹی حصّہ کا بھی سب کو علم ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ واجنئی (یجروید کے مروج نسخہ) کے منتروں کی تعداد ۱۹۰۰ ہے جن میں شکری کے منتر ملے ہوئے ہیں۔ کیونکہ لکھا ہے .... یعنی سو کم دو ہزار منتر واجنئی کے ہیں اور انہی میں شکری کے بھی شامل ہیں۔ جب یہ واجنئی سنہتا ہے۔ تب اِس میں سب منتر واجنئی کے ہونے چاہئیں شکری کے نہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ واجنئی سنہتا کے منتروں کی تعداد ۱۹۷۵ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ شکری کے منتر ۱۹۰۰ میں ہی گھسے ہیں اور باقی ۷۵ منتر کہیں باہر سے لا کر جوڑے گئے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ بیان ویدوں کو تحریف سے بری نہیں کرتا بلکہ انہیں تحریف کا اقرار کراتا ہے۔ان حوالہ جات سے صاف ظاہر ہے کہ ویدوں کے پرانے اور جدید علماء سب اِس بات پر متفق ہیں کہ ویدوں میں دوسرے لوگوں کے منتر بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ کہنا کہ براہمنوں نے دریافت کر لیا تھا کہ فلاں منتر بناوٹی ہے اور فلاں اصلی، یہ ایک بے معنی چیز ہے۔ اگر وید کے علماء کو یقین ہو گیا ہے کہ فلاں منتر بناوٹی ہے تو اُن کو نکال کیوں نہیں دیا۔ان کا ویدوں کے اندر رکھنا بتاتا ہے کہ ویدوں کے علماء کو یقین نہ تھا چنانچہ آریہ سماج کے مصنّف نے آخر میں یہی لکھ دیا ہے کہ یجروید کے ۱۹۰۰ منتر اصلی ہیں باقی ۵، کہیں باہر سے لا کر جوڑے گئے ہیں اور اِن ۱۹۰۰ کے متعلق بھی لکھ دیا ہے کہ ان میں بھی کچھ شُکری کے منتر ہیں"۔"باقی" اور "کچھ" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں۔ساری بنیاد وہم قیاس پر رکھی جاتی ہے۔مگر کیا واہمہ پر رکھی ہوئی بنیاد روحانیت کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے؟حقیقت یہ ہے کہ ہمیشہ سے اتھروید کی اصلیت کے متعلق شبہ پیدا ہوتا چلا آیا ہے اور یجروید اور رگ وید بھی اِسی طرح آپس میں ملے ہوئے ہیں۔صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِدھر کے منتر اُڑا کر کسی نے اُدھر رکھ دیئے ہیں جہاں اِس قدر گڑبڑ ہو وہاں کوئی شخص قطعی طور پر کس طرح فیصلہ کر سکتا ہے کہ فلاں منتر خدا کی طرف سے ہے اور فلاں منتر لوگوں کا داخل کردہ ہے اور جس کتاب کے متعلق ایسے شک و شبہات پیدا ہو چکے ہوں اُس پر دنیا کی ہدایت اور رہنمائی کی بنیاد رکھی ہی کب جا سکتی ہے۔یقیناً جب کسی کتاب کی یہ حالت ہو جائے تو اس کے بعد کسی اور کتاب کی ضرورت ہو گی جو انسانی دست بُرد سے پاک اور محفوظ ہو اور جس پر انسان یقین اور قطعیّت کے ساتھ اپنے عقیدوں کی بنیاد رکھ سکے اور جس کے متعلق وہ ویسا ہی یقین رکھے جیسے اُسے سورج اور چاند بلکہ اپنے نفس کے وجود پر یقین ہے اور وہ کہہ سکے کہ اس کا لفظ بلفظ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اُسکی رہنمائی میں یقیناً خدا تعالیٰ کو پا سکتا ہوں اور اس ضرورت کو پورا کرنیوالی اور ایسی ہی کتاب قرآن کریم ہے

ویدوں میں ظالمانہ احکام

۱۔اتھروید کانڈ ۴ سُوکت ۲۲ منتر میں لکھا ہے"اے ویدک دھومی راجاؤ اور دوسرے ویدک دھرمیو تم شیر جیسے بنکر رعیتوں کو کھا جاؤ اور چیتے جیسے بنکر اپنے دشمنوں کو باندھکر جکڑ لو۔اس کے بعد اپنی مخالفت کرنیوالوں کے کھانے تک اُٹھا لو۔

۲۔سام وید اُتر آرچک پرپھاٹک گیارہ منتر میں لکھا ہے"اے مخالف تم سر کٹے ہوئے سانپوں کی طرح بے سر اور اندھے ہو جاؤ۔اس کے بعد پھر جو تم میں چیدہ چیدہ ہوں اُن کو اندرا اور آگ دیوتا تباہ کریں"۔

۳۔سام وید اُتر آرچک ادھیائے ۱۱ منتر ۱ میں لکھا ہے"اے اِندر دیوتا ہمارا دیا ہُوا سوم رس تجھے خوش اور متوالا کرے۔تو ہمیں دھن و دولت دے اور وید کے دشمنوں کو تباہ اور ہلاک کر"۔

۴۔سام وید اُتر آرچک ادھیائے ۱ منتر ۳ میں لکھا ہے"اے اِندر دیوتا تو غیر ویدک دھرمیوں کو کب یُوں کُچل کرتباہ کریگا۔جیسے چھتری دار پھول کو پاؤں سے کُچل کر تباہ کر دیا جاتا ہے۔اے اِندر تو کب ہماری اِن دعاؤں کو سُنے گا"۔

۵۔اتھروید کانڈ ۱۹ سوکت ۲۸ منتر ۴ تا ۱۰ میں لکھا ہے"اے دبھ تو ہمارے دشمنوں کے دلوں کو توڑ دے جیسے تو اُگتے

وقت زمین کی کھال کو چیرتی ہوئی اُوپر کو نکل آتی ہے ویسے ہی ان ہمارے دشمنوں کے سروں کو چیر کر اوپر کو نکل کر انکو گرا کر تباہ کر دے"۔
۶۔ اتھروید کانڈ ۱۹ سوکت ۲۹ منتر ۱ تا ۹ میں لکھا ہے "اے دبھ تو میرے دشمنوں اور مقابلہ کرنیوالوں کو چھید اور میرے دوسرے ہر قسم کے مخالفین کو بھی چھید جا۔ اے دبھ تو میرے دشمنوں اور مقابلہ کرنے والوں کو تباہ کر۔ اور ہمارے مخالفین کو بھی تباہ و برباد کر وغیرہ وغیرہ"۔
۷۔ یجروید ادھیائے ۲۷ منتر ۲ میں لکھا ہے "اے آگ ہم براہمن لوگ جو تیرے پجاری ہیں۔ تو ہمیں عزت و دولت دے مگر ہمارے مخالفوں کو سمجھ نہ دے"۔
۸۔ یجروید ادھیائے ۱۱ منتر ۸۰ میں لکھا ہے "اے آگ دیوتا جو لوگ ہم کو دھن و دولت نہیں دیتے، بلکہ ہماری مخالفت کرتے ہیں، تو اُن کو جلا کر راکھ کر دے"۔
ویدوں کے علاوہ دوسری مذہبی کتب میں بھی اسی قسم کی تعلیم ہے۔ چنانچہ منوسمرتی جو تمام ہندوؤں کے نزدیک ویدوں کی حقیقی تفسیر ہے اُس میں لکھا ہے کہ
ویدوں پر اعتراض کرنے والوں کو ملک سے باہر نکال دو۔ ادھیائے ۱ شلوک ۱۱۔
۹۔ "جو شودر براہمن کے برابر بیٹھنا چاہے۔ راجہ یا تو اُس کی کمر پر گرم لوہے کے داغ دے اُسے ملک سے نکال دے یا سرین کٹوا دے"۔
۱۰۔ پھر ادھیائے ۸ شلوک ۴۱ میں بھی لکھا ہے۔ کہ "براہمن بغیر کسی شک و شبہ کے شودر کا مال و دولت لے لے۔ کیونکہ شودر کا تو اپنا کچھ بھی نہیں بلکہ اُس کا سب کچھ اُس کے مالک براہمن کا ہی ہے"۔
۱۱۔ ادھیائے ۸ شلوک ۴۱۳ میں لکھا ہے "شودر چاہے براہمن کا خریدا ہوا ہو یا نہ خریدا ہوا ہو۔ براہمن اُس سے ضرور غلامی کرائے کیونکہ برہماجی نے شودر کو پیدا ہی غلامی کے لیے کیا ہے"۔
۱۲۔ پھر ادھیائے ۸ شلوک ۴۱۴ میں لکھا ہے "شودر آزاد کرنے پر بھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ غلام ہی رہتا ہے۔ کیونکہ غلامی شودر کی فطرتی چیز ہے وہ بھلا اُس سے علیحدہ ہو سکتی ہے"۔
۱۳۔ پھر ادھیائے ۸ شلوک ۲۷۲ میں لکھا ہے "۔ اگر شودر فخر کے ساتھ مذہبی مسائل بتانے شروع کر دے تو تیل خوب گرم کر کے اُس کے کانوں اور مُنہ میں بھر دو"۔
اس تعلیم سے ظاہر ہے کہ ہندو دھرم کے نزدیک سوائے چند مخصوص ذاتوں کے باقی سب لوگ خدا تعالیٰ کے فضل اور اُسکے رحم سے محروم ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں جن کیلئے ویدوں کا پڑھنا یا سُننا یا جانا گناہ ہے۔ اور اگر وہ ایسی عبادت سے کام لیں کہ ویدوں کو پڑھیں یا سُنیں یا یاد کریں تو اُن کو سخت سے سخت سزا دینی چاہیئے حتیٰ کہ انہیں قتل تک کر دینا چاہیئے۔ یہ تعلیم بتاتی ہے کہ ویدک دھرم صرف چند اقوام کے لیے تھا اور عالمگیر مذہب نہیں تھا۔ برہمنوں، کھتریوں اور ویشوں کے سوا خدا تعالیٰ کی بہت سی مخلوق دنیا میں اور بھی پائی جاتی ہے۔ یہ قومیں تو صرف ہندوستان کی آبادی کا ایک حصہ ہیں مگر اُن سے

کئی گنا آبادی اور ہندوستان سے باہر ملتی ہے۔ اِس تعلیم کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ لوگ کسی صورت میں بھی ہدایت پا سکتے ہیں۔ مگر کیا خدائے رحیم و کریم کا یہ قانون ہو سکتا ہے۔ کیا ممکن ہے کہ وہ دُنیا کے ایک حصّہ کو ہدایت کے لیے پیدا کرے اور دوسرے حصّہ کو اپنی تقدیر کے ساتھ دوزخی بنا دے؟ یقیناً یہ تعلیم نہ صرف ظالمانہ ہے بلکہ خدا تعالیٰ پر بھی نہایت گندہ الزام لگانے والی ہے۔ ہمارا خدا وہ مہربان آقا ہے جس کے احسانوں سے دنیا کا کوئی بھی گوشہ خالی نہیں ہے۔ زمین کے اوپر بسنے والی مخلوق اور زمین کے نیچے بسنے والی مخلوق اور ہواؤں میں اُڑنے والی مخلوق ساری کی ساری اپنی قابلیت اور اپنی طاقتوں کے مطابق اُس کے فضلوں اور اُس کے احسانوں کے نیچے پرورش پا رہی ہے۔ اس نے تمام بنی نوع انسان کو ایک قسم کے دماغ اور ایک قسم کے افکار اور ایک قسم کی قوتیں عطا کی ہیں۔ وہ پاکیزہ جذبات جو انسان کو روحانیت کی اعلیٰ فضا میں اُڑا کر لیجاتے ہیں اُن سے ہمیں نہ یورپ کے لوگ محروم نظر آتے ہیں نہ امریکہ کے لوگ محروم نظر آتے ہیں نہ ایشیا کے لوگ محروم نظر آتے ہیں۔ نہ ہندوؤں کے دل اُن سے زیادہ پاک ہیں۔ نہ اُن کی فکریں اُن سے زیادہ بلند ہیں۔ پھر کیسے ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ اپنی اکثر مخلوق کو ہدایت سے محروم کر دیتا۔ اور صرف ۱/۳ مخلوق کو ہدایت کا اہل قرار دیتا۔ یہ تعلیم خود چلّا چلّا کر کہہ رہی ہے کہ ویدوں کے بعد ایک اور ایسی کتاب کی دنیا کو ضرورت تھی جو ساری دنیا کو خدا تعالیٰ کی ہدایت کے لیے بُلائے اور عجمی اور عربی کو ایک صف میں لا کر کھڑا کر دے اور وہ تمام بنی نوع انسان کی ہمدردی اور محبت کی تعلیم دینے والی ہو۔ اور ذلیل اور ادنیٰ اقوام اُس کے نزدیک حقیر نہ ہوں۔ بلکہ دوسروں سے زیادہ قابلِ امداد اور دوسروں سے زیادہ قابلِ رحم اور دوسروں سے زیادہ قابلِ ہمدردی ہوں۔ اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قرآن کریم نازل ہُوا تھا۔

ویدوں میں توہمات

وید ایسی تعلیموں سے بھی بھرے ہوئے ہیں جو محض توہمات پر مبنی ہیں مثلاً ویدوں میں عناصر کو دیوتاؤں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے آجکل بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف صفاتِ الٰہیہ کے نام ہیں۔ مگر ہم ویدوں میں دیکھتے ہیں کہ آگ جلا کر اس پر تیل اور دوسری قیمتی چیزیں چھڑکنے کا حکم ہے جیسا کہ رگوید کی دوسری کتاب کے دسویں منتر کے چوتھے شلوک سے ثابت ہوتا ہے اور اِن چیزوں کے چھڑکنے کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ گویا اگنی کی خوراک ہیں۔ اگر اگنی وغیرہ صفاتِ الٰہیہ ہیں تو پھر آگ جلا کر ان پر تیل اور دوسری قیمتی چیزیں چھڑکنے کے معنے کیا ہوئے اور ان چیزوں کو آگ کی خوراک قرار دینے کیا معنے ہوئے۔ اگر یہ صفاتِ الٰہیہ ہیں تو پھر ظاہر میں آگ جلا کر اُن پر تیل وغیرہ چھڑکنا محض ایک وہم ہے اور اگر یہ چیزیں دیوتا تسلیم کی گئی ہیں تو اُن کا دیوتا تسلیم کرنا خود ایک وہم ہے۔ بہرحال کوئی معنے لے لیے جائیں وہم ہی کی تعلیم اس سے نکلتی ہے۔ اسی طرح رگوید کی دوسری کتاب کے گیارھویں ادھیائے کے گیارھویں شلوک میں لکھا ہے:۔

"او اِندر! تُو سوم پی اور یہ خوشی دینے والا رس تجھے خوشی پہنچائے"۔

اب اِندر یا تو فرشتوں کا نام قرار دیا جا سکتا ہے یا خدا تعالیٰ کا۔ اگر یہ خدا تعالیٰ کا نام ہے تب بھی سوم کا رس خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کرنا ایک نہایت ہی ادنیٰ قسم کا وہم ہے اور اگر اِندر کسی فرشتے یا اور کسی

روح کا نام ہے تب بھی اُس کے آگے سوم کا رس پیش کرنا ایک نہایت ہی ادنیٰ وہم ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی ہستی وراء الوراء ہے اور اُس کے فرشتے روحانی وجود ہیں اُن کے لیے کسی شربت کے پینے یا پلانے کا خیال کرنا بھی ایک نہایت ہی مضحکہ خیز خیال ہے۔

پھر اسی ادھیائے کے پندرھویں منتر میں لکھا ہے "او اِندر! تو سوم کا رس پی تاکہ تجھے طاقت اور خوشی آئے"۔ خدا تعالیٰ یا اُس کے فرشتوں کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ سوم کا رس اُن کو طاقت بخشتا ہے یہ بھی کتنا مضحکہ انگیز خیال ہے۔

یہ ایک دو منتر نہیں بلکہ سینکڑوں منتر ویدوں میں ایسے پائے جاتے ہیں جو اس قسم کی وہم والی تعلیمیں پیش کرتے ہیں۔ دیوتاؤں کا آسمانوں پر کبھی بادلوں پر سواری کرنا اور کبھی رتھوں پر چڑھنا یہ اور اسی قسم کے بہت سے خیالات ویدوں میں بھرے ہوئے ہیں۔

ویدوں کی خلاف اخلاق تعلیم

ویدوں میں بہت سی خلاف اخلاق تعلیم بھی ہے، لیکن وہ اتنی عریاں ہے کہ اس کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شہوانی قوتوں اور شہوانی اعضاء کے متعلق ایسی ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں کہ جو اس عریانی کے ساتھ طب کی کتابوں میں بھی لکھنی جائز نہیں۔ اِن تمام وجوہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وید جس کے بہت سے حصے اِس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہوں گے۔ اِن میں انسانوں نے ایسی تعلیمیں ملا دی ہیں کہ جن کی بناء پر اب وہ قابلِ عمل نہیں رہے اور یقیناً اِس خرابی کے بعد جو ویدوں میں آج سے سینکڑوں سال پہلے واقعہ ہو چکی ہے ایک ایسے کلام کی ضرورت تھی، جو اِن تمام نقائص سے پاک ہو اور وہ کلام قرآن کریم ہے۔

ویدوں میں تناقض

چونکہ ویدوں میں مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں نے دست اندازی کی ہے اِس لیے اُن کے مضامین میں بہت کچھ تناقض بھی پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں اس تناقض کی چند مثالیں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ ویدوں میں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ سورج کو کس نے پیدا کیا ہے اور اِس کا جواب مختلف ویدوں میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ رگوید منڈل ۹ سوکت ۹۶ منتر ۵ میں لکھا ہے:۔

"سورج کو اکیلے سوم دیوتا نے پیدا کیا تھا"

لیکن رگوید منڈل ۳ سوکت ۳۶ منتر ۴ میں لکھا ہے:۔

"سورج کو اکیلے اِندر دیوتا نے پیدا کیا تھا"

یہ عجیب بات ہے کہ وہی کتاب ایک باب میں تو کہتی ہے کہ سورج کو اکیلے سوم دیوتا نے پیدا کیا تھا اور دوسرے باب میں یہ کہتی ہے کہ سورج کو اکیلے اِندر دیوتا نے پیدا کیا تھا، لیکن دوسرے وید تو اور بھی کمال کر دیتے ہیں۔ یجروید ادھیائے ۳۱ منتر ۱۲ میں لکھا ہے:۔

"سورج کو اکیلے برہما نے اپنی آنکھ سے پیدا کیا تھا"

گویا رگوید اکیلے سوم دیوتا اور اکیلے اِندر دیوتا سے سورج کو پیدا شدہ قرار دیتا ہے لیکن یجروید نہ اُسے سوم دیوتا کا پیدا کیا ہُوا قرار دیتا ہے نہ اِندر دیوتا کا بلکہ اُسے برہما دیوتا کا پیدا کیا ہُوا بتاتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُسے برہما نے پیدا بھی اپنی آنکھ سے کیا تھا۔ اتھروید اس کے بالکل خلاف ایک اور ہی حقیقت بیان کرتا ہے۔ اِس میں لکھا ہے:۔

"سب دیوتاؤں نے مل کر سورج کو پیدا کیا تھا" (اتھروید کانڈ ۱۹ سوکت ۲۷ منتر ۷)

اتھروید کی اِس روایت نے بالکل ہی حقیقت کو بدل دیا۔ وہ سورج کو نہ اکیلے سوم دیوتا کا پیدا کیا ہوا قرار دیتا ہے نہ اِندر دیوتا نہ برہما کا بلکہ وہ سب دیوتاؤں کو اُس کی پیدائش میں شریک قرار دیتا ہے۔

۲- ویدوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورج پہلے زمین پر تھا پھر اُس کو اُٹھا کر آسمان پر لے گئے۔ علمِ ہیئت کے لحاظ سے یہ بات کیسی ہی عجیب کیوں نہ ہو مَیں اِس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مَیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اِس حکایت کی تفصیلات کے متعلق بھی ویدوں میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔

کرشن یجروید تیتری سنگتا میں لکھا ہے "سورج پہلے زمین پر تھا۔ دیوتا اپنی پیٹھوں پر اُسے رکھ کر اُوپر جنت میں لے گئے اور وہیں رکھ دیا"۔

کرشن یجروید میں لکھا ہے "سورج کو صرف ورُن دیوتا ہی زمین سے اُٹھا کر اوپر جنت میں لے گیا تھا"۔ لیکن رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۵۶ منتر ۴ میں لکھا ہے "اکیلے آگ دیوتا نے سورج کو اُوپر جنت میں لے جا کر رکھا تھا"۔ اور رگ وید منڈل ۱۰ منتر ۳ میں لکھا ہے "سورج کو انگرا رشی کی اولاد نے اوپر لے جا کر جنت میں رکھا تھا"۔

اتھروید کانڈ ۱۳ سوکت ۲ منتر ۱۲ میں لکھا ہے "اے سورج تجھے اوپر جنت میں لے جا کر صرف اکیلے اتری رشی نے اِس لیے رکھا تھا تاکہ تُو مہینوں کو بنایا کرے"۔

شکل یجروید ادھیائے ۴ منتر ۱۳ میں لکھا ہے "سورج کو اوپر لے جا کر اکیلے ورُن دیوتا نے ہی رکھا تھا"۔

قطع نظر اس کے کہ سورج کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر رکھنے کا عقیدہ کیسا مضحکہ خیز ہے اور بتاتا ہے کہ پُرانے زمانہ کے ہندوؤں میں یہ خیال تھا کہ سورج ایک بہت چھوٹی سی چیز ہے اور زمین کے کسی گوشہ میں رکھی جا سکتی ہے یہ بات غور طلب ہے کہ اس مضحکہ انگیز خیال کے متعلق بھی اتنی متضاد روایتیں ہیں کہ وہ تضاد خود اپنی ذات میں مضحکہ انگیز ہو جاتا ہے۔ صرف رگوید کی مختلف فصلوں میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ ایک فصل میں تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ آگ دیوتا نے سورج کو اُٹھا کر آسمان پر رکھا لیکن اس کتاب کی دوسری فصل میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نہیں اِندر دیوتا نے ایسا کیا۔ اور پھر اسی کتاب کے ایک اور منتر میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ کام اِن دونوں ہی نے نہیں کیا تھا بلکہ انگرا رشی کی اولاد نے یہ کام کیا تھا۔ اسی طرح یجروید میں ایک جگہ تو یہ کہا ہے کہ سورج کو تمام دیوتا اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر لے گئے لیکن دوسری جگہ یہ لکھا ہے کہ سورج کو اکیلے ورُن دیوتا نے زمین سے اُٹھا کر آسمان پر رکھا۔ اتھروید اِن سب سے نرالی حکایت بیان کرتا ہے اور اتری رشی کو اس غیر معمولی شان کے کام کے لیے مخصوص کرتا ہے۔

۳۔ زمین و آسمان کی پیدائش کے متعلق بھی ویدوں نے بعض حقائق بیان کیے ہیں۔ لیکن وہ حقائق بھی ایک دوسرے سے ایسے ہی مختلف ہیں جیسا کہ جنوں اور پریوں کی کہانیاں آپس میں مختلف ہوتی ہیں۔

سام وید پُورَوْ آرچک میں لکھا ہے "زمین و آسمان کو اکیلے سوم دیوتا نے پیدا کیا تھا"۔ لیکن رگوید منڈل ۸ سوکت ۲۶ منتر ۴ میں لکھا ہے "زمین و آسمان کو سوم رس پینے والے اکیلے اِندر دیوتا نے ہی پیدا کیا تھا"۔ مگر اسی رگوید کے منڈل ۲ سوکت ۴۰ منتر ۱ میں لکھا ہے "زمین و آسمان کو پوشا دیوتا اور سوم دیوتا دونوں نے مل کر پیدا کیا تھا"۔

مگر یجر وید کہتا ہے کہ "زمین و آسمان کو اکیلے برہما نے پیدا کیا تھا"۔

منوسمرتی دشت پتھ برہمن میں لکھا ہے "زمین و آسمان کو اکیلے پرجاپتی نے ہی پیدا کیا تھا"۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ منوسمرتی وید نہیں مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہندو قوم اِس کو ویدوں کی صحیح تفسیر قرار دیتی ہے اصل ویدوں میں بھی زمین و آسمان کی پیدائش کے متعلق کچھ کم اختلاف نہیں تھا کہ منوجی نے اِس اختلاف کو اور بھی اُبھار دیا۔ سام وید سوم دیوتا کو زمین و آسمان کی پیدائش کا موجب قرار دیتا ہے لیکن رگوید ایک جگہ اِندر دیوتا کو اور دوسری جگہ پوشا دیوتا اور سوم دیوتا کو زمین و آسمان کی پیدائش کا موجب قرار دیتا ہے۔ مگر منوجی نے اِن تمام ویدوں کی تشریح کرتے ہوئے سوم اور اِندر اور پوشا اور برہما سب کو پیدائش کائنات سے جواب دیدیا اور پرجاپتی کو ان کا پیدا کرنے والا قرار دیدیا۔

دیوتاؤں کی تعداد کے متعلق اختلاف

۴۔ گو ہم مانتے ہیں کہ وید جب بھی نازل ہوئے تھے خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے تھے اور یقیناً وہ توحید کی تعلیم پر مشتمل تھے مگر موجودہ وید وہ نہیں جو کہ شروع میں رشیوں پر نازل ہوئے تھے۔ ان میں کثرت کے ساتھ شرک کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ بلکہ اس کثرت کے ساتھ کہ اُس نے توحید کی تعلیم کو دبا لیا ہے۔ چنانچہ اِس بارہ میں بھی جو تعلیم ویدوں میں بیان ہوئی ہے اُس کی ہم چند مثالیں دیتے ہیں۔

یجر وید میں لکھا ہے کہ "دیوتا کل ۳۳ ہیں۔ ۱۱ زمین میں ۱۱ آسمان میں اور ۱۱ اُوپر جنت میں"۔

رگوید منڈل ۳ سوکت ۹ منتر ۹ میں لکھا ہے کل دیوتا ۳۳۴۰ ہیں۔ ۳۳۴۰ کی تعداد اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ رگوید کے بیان کے مطابق ۳۳۳۹ دیوتاؤں نے مل کر آگ دیوتا کو گھی سے سینچا اور اُس کے پاس گئے پس ۳۳۳۹ میں ایک جمع ہوا تو ۳۳۴۰ ہو گئے۔ چنانچہ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۵۲ منتر ۶ میں صاف الفاظ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کل دیوتا ۳۳۴۰ ہیں۔

ویدوں میں دیوتاؤں کے متعلق اتنا اختلاف حیرت انگیز ہے کہ یجر وید میں تو دیوتاؤں کو ۳۳ قرار دیا گیا ہے اور رگوید میں ۳۳۴۰۔ توحید کو چھوڑنا ہی ایک نہایت خطرناک بات تھی، مگر جو خیالی دیوتا تجویز کیے گئے ان کی تعداد میں بھی اتنا اختلاف کہ وہ کبھی ۳۳ ہو جاتے ہیں اور کبھی ۳۳۴۰۔ یقیناً انسان کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کہ بے شک جب وید نازل ہوئے ہوں گے خدا تعالےٰ کی طرف سے ہوں گے۔ مگر موجودہ وید ہرگز انسان کی روحانیت کو تسلی نہیں دے سکتے۔ اور ان کے بعد اور ان کے باوجود بھی ایک ایسی کتاب کی

دنیا کو ضرورت تھی جو ہر قسم کی خلاف اخلاق متناقض، ظالمانہ اور وہموں سے پُر تعلیموں سے پاک ہو۔ اور یہی کتاب قرآن کریم ہے۔

چوتھا سوال اور اس کا جواب

چوتھا سوال جو پہلی کتب کی موجودگی میں قرآن کریم کے نزول کی ضرورت کے متعلق روشنی ڈال سکتا ہے یہ ہے کہ کیا سابق مذاہب اپنی تعلیم کو حتمی اور آخری قرار دے رہے تھے یا وہ خود بھی ایک ارتقاء کے قائل تھے اور روحانیت کی ترقی کے لیے ایک ایسے نقطہ کی خبر دے رہے تھے جس پر بنی نوع انسان نے جمع ہو کر انسانی پیدائش کے مقصد کو حاصل کرنا تھا۔

بائبل میں قرآن مجید کے نزول اور آنحضرت صلعم کے ظہور کے متعلق پیشگوئیاں

اس سوال کے متعلق یہ امر مدنظر رکھنا چاہیئے کہ انبیاء کی ایک مسلسل کڑی جو ہمیں الٰہی منشاء سے آگاہ کر سکے درحقیقت ہمیں بائبل میں ہی ملتی ہے۔ انبیاء کے حالات کو محفوظ رکھنے میں بائبل نے جو کام کیا وہ قرآن کریم سے پہلے اور کسی کتاب نے نہیں کیا۔ اس لیے ہم اس سوال کا جواب دینے کے لیے کہ آیا پہلی کتابیں اپنے بعد کسی اور کتاب کی اور پہلے نبی اپنے بعد کسی اور نبی کی خبر دیتے ہیں یا نہیں جس نے دنیا میں ہدایت اور راستی کی تعلیم کو مکمل کرنا تھا اور جو بنی نوع انسان کی روحانی ترقی کا آخری نقطہ بننے والا تھا، بائبل پر نظر ڈالتے ہیں۔

پہلی پیشگوئی

حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے وعدہ

بائبل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خدا تعالیٰ کے بہت سے وعدے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کسدیوں کے اُور میں پیدا ہوئے اور وہاں سے اپنے باپ کے ساتھ ہجرت کر کے کنعان کی طرف روانہ ہوئے لیکن اُن کے والد حاران میں آکر ٹھہر گئے۔ اُن کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ حاران سے نکل کر کنعان کو روانہ ہوں۔ اور فرمایا:-

" اور مَیں تجھے ایک بڑی قوم بناؤنگا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کرونگا اور تُو ایک برکت ہوگا۔ اور اُنکو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دُونگا اور اُس کو جو تجھ پر لعنت کرتا ہے لعنتی کرونگا اور دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے"۔ (پیدائش باب ۱۲ آیت ۲ و ۳)

اسی طرح لکھا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا:-

"کہ یہ تمام ملک جو تُو اب دیکھتا ہے مَیں تجھ کو اور تیری نسل کو ہمیشہ کے لیے دُوں گا (پیدائش باب ۱۳ آیت ۱۵)

پھر پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۰ تا ۱۲ میں لکھا ہے: "پھر خداوند کے فرشتے نے اُسے (یعنی ہاجرہ سے) کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے۔ اور خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اُس کا نام اسماعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دُکھ سُن لیا۔ وہ گورخر سا ہوگا اُس کا ہاتھ سب کے اور سب کے ہاتھ اُس کے برخلاف ہونگے۔ اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بودوباش کرے گا"۔

پھر اسی بائبل میں لکھا ہے "پھر خدا نے ابرہام سے کہا کہ تُو اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو۔ اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے"۔ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۹ تا ۱۱)

پھر لکھا ہے "اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہُوا وہی شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اُس نے میرا عہد توڑا"۔ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۴)

پھر لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ کو بھی ایک بیٹے کی بشارت دی اور فرمایا کہ "مَیں اُسے برکت دونگا اور اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا یقیناً میں اُسے برکت بخشوں گا۔ یقیناً مَیں اُسے برکت دونگا اور وہ قوموں کی ماں ہوگی اور ملکوں کے بادشاہ اُس سے پیدا ہونگے"۔ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۶)

پھر سارہ کی اولاد کے متعلق لکھا ہے کہ "مَیں اُس سے اور بعد اُس کے اُسکی اولاد سے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہے قائم کروں گا"۔ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۹)

پھر اسمٰعیل کے متعلق لکھا ہے "اور اسمٰعیل کے حق میں مَیں نے تیری سُنی (اسمٰعیل کے حق میں حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا کی تھی کہ کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے"۔) (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۸)

"دیکھ مَیں اُسے برکت دونگا اور اُسے برومند کرونگا اور اُسے بہت بڑھاؤنگا اور اُس سے بارہ سردار پیدا ہونگے اور مَیں اُسے بڑی قوم بناؤنگا، لیکن میں اضحاق کو جس کو سارہ دوسرے سال اسی وقت معیّن میں جنے گی اپنا عہد قائم کرونگا" (باب ۱۷ آیت ۲۰ تا ۲۲)

پھر لکھا ہے۔ "اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کرونگا۔ اس لیے کہ وہ بھی تیری نسل ہے" (پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۳)

پھر حضرت اسمٰعیل کے متعلق لکھا ہے۔ خدا نے حضرت ہاجرہ کو الہام کیا کہ "اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سُنی۔ اُٹھ اور لڑکے کو اُٹھا اور اُسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ مَیں اُس کو ایک بڑی قوم بناؤنگا"۔ (پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۷ و ۱۸)

پھر لکھا ہے "خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیرانداز ہوگیا اور وہ فاران کے بیابان میں رہا اور اُس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت اُس سے بیاہنے کو لی"۔ (پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۰-۲۱)

اِن حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ تھے۔ اسمٰعیلؑ بڑے بیٹے تھے اور اسحاقؑ دوسرے بیٹے تھے۔ خدا تعالیٰ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عہد تھا کہ وہ اُن کی نسل کو بڑھائیگا اور بابرکت کریگا۔ یہ بابرکت کرنے کے الفاظ حضرت اسحاقؑ کے متعلق بھی ہیں اور حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق بھی ہیں۔ اسی طرح نسل کے بڑھانے کے الفاظ بھی حضرت اسحاق کے متعلق بھی ہیں اور حضرت اسمٰعیل کے متعلق بھی ہیں۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسمٰعیل فاران کے بیابان میں رہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کنعان کی زمین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کو دے دی گئی۔ اور پھر یہ بھی کہ خدا تعالےٰ کے اس عہد کی علامت یہ ہوگی کہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی نرینہ نسل کا ختنہ کیا جائے گا۔ اِن پیشگوئیوں کے ماتحت ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسحاق کی نسل کو بڑی ترقی نصیب ہوئی اور خدا تعالیٰ نے جو عہد حضرت اسحاقؑ سے باندھا تھا وہ بڑی شان سے پورا ہوا۔ حضرت موسیٰ و حضرت داؤد اور حضرت حزقیل اور حضرت دانی ایل اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام اُن کی نسل سے ظاہر ہوئے اور دنیا کے لیے بڑی رحمت کا موجب ثابت ہوئے۔ کنعان کا ملک دو ہزار سال تک اُن کے قبضہ میں رہا سوائے ایک خفیف وقفہ کے کہ اس وقفہ میں بھی وہ ملک کلّی طور پر اُن کے ہاتھ سے نہیں نکلا۔ صرف وہ اس میں کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن ساتویں صدی بعد مسیح میں اسحاق کی اولاد اور موسیٰ کی تعلیم پر ظاہری طور پر چلنے والے لوگوں کو کلّی طور پر کنعان کے ملک سے دست بردار ہونا پڑا۔ اور اس ملک میں اسمٰعیل کی اولاد سیاسی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی غالب آ گئی۔ بنی اسرائیل کا اس زمانہ میں کنعان سے نکالا جانا صاف بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معرفت جو وعدہ کیا گیا تھا اب اُس کے مستحق بنی اسرائیل یا اُن کے متعلق خاندان نہیں رہے تھے مگر خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ مَیں قیامت تک یہ ملک بنی اسرائیل کے قبضہ میں رکھوں گا اور خدا کی بات جھوٹی نہیں ہو سکتی پس صاف ظاہر ہے کہ قیامت کے معنے ظاہری قیامت کے نہیں بلکہ ایک نئی شریعت کے ظہور کے ہیں جو الہامی اصطلاح میں نیا آسمان اور نئی زمین بنانا کہلاتا ہے اور لازماً قیامت کے برپا ہوئے بغیر نیا آسمان اور نئی زمین نہیں بنائے جا سکتے پس قیامت تک بنو اسحاق کے قبضہ کے یہی معنے تھے کہ جب ایک نیا شرعی نبی آئیگا تو اس وقت یہ ملک بنو اسحاق کے قبضہ میں نہ رہے گا چنانچہ اِس طرف حضرت داؤدؑ کے ایک کلام سے اشارہ بھی نکلتا ہے جہاں تورات میں لکھا ہے کہ قیامت تک بنو اسحاق اس ملک پر قابض رہیں گے وہاں حضرت داؤدؑ نے اِس پیشگوئی کو دُوسرے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"صادق زمین کے وارث ہوں گے اور ابد تک اُس میں بسیں گے۔" (زبور باب ۳۷ آیت ۲۹)

اِن الفاظ سے ظاہر ہے کہ بنو اسحاق کی تباہی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اب نبیوں کا کلام دنیا کی توجہ اِس طرف پھرا رہا تھا کہ اب نسلی وعدہ بدلکر روحانی شکل اختیار کرنے والا ہے اور بنو اسمٰعیل راستباز بنکر ابراہیمی پیشگوئیوں کے وارث بننے والے ہیں اور ایک نیا عہد اُن کے ذریعہ سے شروع ہونے والا ہے۔ اگر یہ بات نہیں تو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کے ماننے والے بنو اسمٰعیل کو فلسطین کی زمین میں کیوں غالب کر دیا اُس نے تو صاف طور پر عہد کیا تھا کہ فلسطین کی زمین بنو اسحاق کو دی جائے گی۔ اگر وہ عہد ایک اور قوم کے ذریعہ سے پورا نہیں ہونا تھا تو یہ تبدیلی خدا تعالیٰ نے کس طرح گوارا کی۔ اگر یہ تبدیلی چند سال کے لیے عارضی طور پر ہوتی تو کوئی بات نہ تھی کیونکہ قومی زندگیوں میں اُتار چڑھاؤ ہوا ہی کرتے ہیں۔ لیکن یہ تبدیلی تو اتنی لمبی چلی کہ آج تیرہ سو سال کے بعد بھی فلسطین کے اکثر حصہ پر مسلمان اور اسمٰعیلؑ کی اولاد قابض ہیں۔ یورپ اور امریکہ زور لگا رہے ہیں کہ کسی طرح اِن حالات کو بدل دیں لیکن اب تک وہ کامیاب نہیں ہوئے اور اگر کوئی کامیابی اُن کو حاصل بھی ہوئی تو وہ عارضی ہوگی۔ یا بنو اسرائیل مسلمان ہو کر نئے عہد کے ذریعہ سے ایک نئی زندگی فلسطین میں پائیں گے اور یا پھر وہ دوبارہ فلسطین میں سے نکال دیئے جائیں گے۔ کیونکہ فلسطین اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہے گا، جو ابراہیمی عہد کو پورا کرنے والے ہوں گے۔ مسیحی لوگ بھی اپنے آپ کو ابراہیمی عہد کا پورا کرنے والا

قرار دیتے ہیں، لیکن تعجب ہے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اِس عہد کی علامت ہی یہ ہے کہ وہ قوم ختنہ کروائے گی لیکن عیسائی تو ختنہ سے آزاد ہو چکے ہیں۔ ہاں بنو اسمٰعیل جو تیرہ سو سال سے فلسطین پر قابض ہیں وہ قرآن کریم کے نازل ہونے سے پہلے بھی ختنہ کرواتے تھے اور اب بھی ختنہ کرواتے ہیں۔ غرض جیسا کہ اِن پیشگوئیوں میں بتایا گیا تھا کہ اسمٰعیل اور اسحاق دونوں کو برکت دیجائے گی وہ پیشگوئیاں پوری ہونی ضروری تھیں۔ بنو اسحاق کو اُن کے وعدہ کے مطابق کنعان کی حکومت دی گئی اور بنو اسمٰعیل کو اُن کے وعدہ کے مطابق عرب کی حکومت دی گئی۔ آخر جب بنو اسحاق کی قیامت آگئی تو داؤد کی پیشگوئی کے مطابق نسلی لحاظ سے نہیں بلکہ راستباز ہونے کے لحاظ سے کنعان پر غلبہ بنو اسمٰعیل کو دے دیا گیا۔ گویا نسلی وعدۂ ابراہیم کے مطابق مسلمانوں کو مکّہ اور اس کے اِرد گرد کا علاقہ ملا جس کا دعویٰ قرآن کریم نے سورۂ بقرہ رکوع ۱۵/۱۵ میں کیا ہے۔ اور راستباز ہونے کے لحاظ سے بنو اسحاق کی مذہبی تباہی کے بعد وہ کنعان کے بھی وارث قرار پائے۔

دُوسری پیشگوئی

حضرت موسیٰ کے بعد ایک شرعی نبی کا ظہور

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب خدا تعالیٰ کے حکم سے طُور پر گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ "خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کریگا۔" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵)

پھر لکھا ہے "مَیں اُن کے لیے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا۔ اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہیگا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لیکے کہیگا نہ سُنے گا تو مَیں اس کا حساب اُس سے لُوں گا لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جسکے کہنے کا مَیں نے اُسے حکم نہیں دیا۔ یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ تا ۲۰)

اِن آیتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک نئے صاحب شریعت نبی کی پیشگوئی کی گئی تھی جو بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہوگا۔ صاحب شریعت ہونے کی پیشگوئی اِن الفاظ سے نکلتی ہے کہ وہ موسیٰ کی مانند ہوگا اور موسیٰ صاحبِ شریعت نبی تھے۔ دوسری خبر اس پیشگوئی میں یہ دی گئی ہے کہ سب باتیں جو اُسے کہی جائینگی وہ لوگوں سے بیان کریگا۔ یہ علامت بھی بتاتی ہے کہ وہ صاحبِ شریعت ہوگا کیونکہ صاحب شریعت نبی قوم کی بنیاد رکھنے والا ہوتا ہے محض ایک مصلح نہیں ہوتا۔ اس لیے اُسے حکم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ساری تعلیم لوگوں کے سامنے بیان کرے۔ کیونکہ شریعت کے بغیر قوم کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ مگر جو غیر تشریعی نبی ہوتا ہے وہ چونکہ صرف پہلی کتاب کا شارح ہوتا ہے اُس کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ساری وحی لوگوں کو سُنائے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض باتیں اُس کے ذاتی علم کے طور پر اُسے کہی گئی ہوں، لیکن ضروری نہ ہو کہ وہ اپنی قوم سے اُن کا ذکر کرے۔ یہ بھی اِن آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ اِس پیشگوئی کا موعود نبی اپنی تعلیم کو خدا تعالیٰ کا نام لیکر

دنیا کے سامنے پیش کریگا اور جو لوگ اُس کی تعلیم کو نہ سُنیں گے اُن کو سزا دیجائے گی اور وہ خدا کے عذاب کے نیچے آئیں گے۔ یہ بھی اِس پیشگوئی میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اِس پیشگوئی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اِس پیشگوئی کا مستحق ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرے گا تو ایسا شخص قتل کردیا جائیگا۔ اب پیشگوئی کے اِن تمام اجزاء کو سامنے رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اِس پیشگوئی کو پورا کرنیوالا نبی دنیا میں کوئی پیدا ہی نہیں ہُوا۔ درمیانی انبیاء کا تو ذکر جانے دو، اُن کی تو نہ کوئی اُمت موجود ہے نہ کوئی قوم پائی جاتی ہے۔ ایک عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں جن کے ماننے والے دنیا میں پائے جاتے ہیں اور جو اُنہیں آخری مصلح قرار دیکر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مگر اس پیشگوئی کو سامنے رکھ کر دیکھو کیا اِس پیشگوئی کی شرائط حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر پوری اُترتی ہیں ؟

اوّل۔ اِس پیشگوئی سے پتہ لگتا ہے کہ وہ صاحبِ شریعت نبی ہوگا۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام کوئی شریعت لائے ؟ عیسیٰ علیہ السلام نے تو یہ کہا ہے کہ "یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو" (متی باب ۵ آیت ۱۷۔ ۱۸) پھر اُن کے حواریوں نے یہاں تک کہہ دیا۔ کہ "شریعت کو ایمان سے کچھ نسبت نہیں۔ مسیح نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا" (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۲ و ۱۳)

گویا مسیحؑ خود کسی شریعت کے لانے کے مدعی نہیں اور اُن کے حواری شریعت کو ہی لعنت قرار دیتے ہیں۔ پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ حضرت مسیح اور اُن کی قوم اِس پیشگوئی کی مستحق ہو؟

(۲) اِس پیشگوئی میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ آنے والا نبی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہوگا، لیکن مسیح تو بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے نہیں تھا بلکہ خود بنی اسرائیل میں سے تھا۔ بعض عیسائی صاحبان ایسے موقعہ پر کہہ دیا کرتے ہیں کہ چونکہ اس کا کوئی باپ نہیں تھا اس لیے وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے کہلا سکتا ہے لیکن یہ دلیل ہرگز معقول نہیں۔ کیونکہ بائبل کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ وہ بھائی بہت سے ہوں گے اور اُن بہت سے بھائیوں کی نسل میں سے اُس موعود نے ظاہر ہونا تھا۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام کی قسم کے لوگ بھی بہت سے ہیں اگر نہیں تو پھر عیسیٰ علیہ السلام پر یہ پیشگوئی کیونکر چسپاں ہو سکتی ہے ؟

علاوہ ازیں بائبل میں تو مسیح کی نسبت لکھا ہے کہ وہ داؤدؑ کی نسل میں سے ہوگا (زبور باب ۱۳۲ آیت ۱۱ و یرمیاہ باب ۲۳ آیت ۵) اگر بن باپ ہونے کی وجہ سے حضرت مسیح کو بنی اسرائیل میں سے خارج کردیا جائے تو پھر وہ داؤد کی نسل میں بھی نہیں رہ سکتے اور اس پیشگوئی سے اُنہیں جواب مل جاتا ہے۔

(۳) اِس پیشگوئی میں لکھا ہے کہ میں اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا لیکن انجیل میں تو خدا کا کلام ہمیں کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ یا تو اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوانح ہیں یا اُن کے بعض لیکچر اور یا پھر حواریوں کی باتیں۔

(۴) اِس پیشگوئی میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ موعود ایک نبی ہوگا۔ مگر مسیح کے متعلق تو مسیحی قوم یہ کہتی ہے کہ وہ خدا کا بیٹا تھا نبی نہیں تھا۔ پس جب مسیحؑ نبی ہی نہ تھے تو وہ اس پیشگوئی کے پورا کرنے والے کس طرح ہو سکتے ہیں ؟

(۵) اِس پیشگوئی میں یہ کہا ہے کہ وہ خدا کا نام لے کر اپنا الہام لوگوں کو سنائے گا مگر اناجیل میں تو کوئی ایک فقرہ بھی ہمیں نہیں ملتا جس میں مسیح نے یہ کہا ہو کہ خدا نے مجھے یہ بات لوگوں کو پہنچانے کا حکم دیا ہے۔

(۶) اِس پیشگوئی میں یہ ذکر ہے "جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہیگا۔ اور ساری سچائی کی راہیں اُس کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوں گی"۔ لیکن مسیح خود کہتا ہے کہ وہ سچائیاں دنیا کو نہیں بتاتے۔ وہ کہتے ہیں "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں۔ پر اب اُنکی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی روحِ حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی۔ اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی، لیکن جو کچھ وہ سُنے گی سو کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی"۔ (یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۲ و ۱۳)

اِن حوالجات سے ظاہر ہے کہ مسیح علیہ السلام پر یہ پیشگوئی تو پوری نہیں ہوئی اور جب حضرت مسیح پر یہ پیشگوئی پوری نہیں ہوئی تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ مسیح علیہ السلام کے بعد آنیوالے ایک ایسے نبی کی پیشگوئی عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید میں موجود تھی جو ساری سچائیوں کو ظاہر کرے گا اور دنیا میں خدا تعالےٰ کے نام کو ہمیشہ کے لیے قائم کرے گا۔ ہمارا دعوےٰ ہے کہ قرآن کریم اس پیشگوئی کو پورا کرنے والا ہے۔ چنانچہ

(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم ہی وہ شخص تھے جو بنو اسمٰعیل میں پیدا ہوئے جو بنو اسحاق کے بھائی تھے۔

(۲) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ شخص تھے جنہوں نے موسیٰ کے مانند ہونے کا دعویٰ کیا چنانچہ قرآن میں آتا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (پ ۲۹ سورۃ مزمل ع ۱) ہم نے تمہاری طرف تم میں سے ایک رسول بھیجا جس طرح فرعون کی طرف ہم نے رسول بھیجا تھا۔ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی موسٰےؑ کی طرح نبی ہیں۔

(۳) اِس پیشگوئی میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ آنے والا موعود نبی ہونے کا دعویٰ کریگا نہ کہ کوئی اور دعویٰ۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا مگر اس کے برخلاف کہا جاتا ہے کہ مسیح نے نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ چنانچہ انجیل مرقس میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے حواریوں سے پوچھا کہ "لوگ کیا کہتے ہیں کہ میں کون ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ یوحنا بپتسمہ دینے والا اور بعضے الیاس اور بعضے نبیوں میں سے ایک۔ پھر اُس نے اُنہیں کہا کہ تم کیا کہتے ہو کہ میں کون ہوں پطرس نے جواب میں اُس سے کہا تُو تو مسیح ہے تب اُس نے اُنہیں تاکید کی کہ میری بابت کسی سے یہ مت کہو"۔ (مرقس باب ۸ آیت ۲۷ تا ۳۰)

اِس آیت میں مسیح نے اپنے متعلق یوحنا یا الیاس یا نبیوں میں سے کوئی نبی ہونے سے انکار کیا ہے لیکن موسیٰ کی پیشگوئی بتاتی ہے کہ وہ جو موسیٰ کے نقشِ قدم پر آنے والا ہے نبی ہوگا پس یقیناً یہ پیشگوئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں ہوتی ہے نہ کہ مسیح پر؟

(۴) اِس پیشگوئی میں کہا گیا تھا کہ میں اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا۔ لیکن ساری انجیلوں میں ہمیں خدا کا کلام کہیں نظر نہیں آتا۔ اِس کے برخلاف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو پیش کیا۔ جو شروع سے لے کر آخر تک خدا تعالےٰ کا کلام ہے اور اس کا نام بھی قرآن کریم میں کلام اللہ رکھا گیا ہے (سورۂ بقرہ رکوع ۹)

(۵) اِس پیشگوئی میں کہا گیا تھا کہ جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہیگا۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مسیح نے

خود اقرار کیا ہے کہ جو کچھ اُسے کہا گیا تھا وہ سب کا سب لوگوں کو نہیں سنا تا تھا لیکن اُس نے یہ پیشگوئی ضرور کی تھی کہ میرے بعد ایک ایسا شخص آئیگا جو سب سچائی کی راہیں لوگوں کو بتائے گا۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا سارا کلام لوگوں کو پہنچاتے ہیں اور کوئی بات جس کی دین کے لیے ضرورت ہے انہوں نے چھوڑی نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرماتا ہے یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدہ ع۱۰) اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے متعلق یہ پیشگوئی ہے کہ جب تو دنیا میں آئیگا تو ساری سچائیاں دنیا کو سُنائیگا۔ اس لیے دنیا خواہ بُرا منائے یا اچھا تو کسی کی پروا نہ کر اور جو وحی تجھے کی جاتی ہے وہ ساری کی ساری لوگوں کو سُنا دے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے متعلق فرماتا ہے اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ ع۱) میں نے آج اِس کلام کے ذریعہ سے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور ہدایت کی نعمت تمہارے لیے کمال تک پہنچا دی ہے اور امن اور سلامتی کو تمہارا مذہب قرار دیدیا ہے پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جن کو ساری سچائیاں بتائی گئیں اور جنہوں نے دنیا کو ساری سچائیاں بتا دیں اور کوئی ایک سچائی بھی نہیں چھپائی۔ کیونکہ مسیح کے زمانہ میں لوگ ابھی تک ساری سچائیوں کو سُننے اور قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کیوقت انسان روحانی ارتقاء کی سب منزلوں کو طے کر چکا تھا اور وقت آگیا تھا کہ ساری سچائیاں خدا تعالیٰ کیطرف سے نازل ہو جائیں اور خدا کا رسول وہ ساری سچائیاں لوگوں کو سُنا دے۔

(۶) اِس پیشگوئی میں یہ بتایا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا کلام جو اُس پر نازل ہو گا وہ خدا کا نام لیکر دنیا کو سنائیگا۔ یہ بات بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ہی پوری ہوئی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایک ایسے نبی ہیں جن کی الہامی کتاب کا ہر باب اِس آیت سے شروع ہوتا ہے "مَیں اللہ کا نام لے کر یہ باتیں تمہیں سُناتا ہوں"۔ پس یہ علامت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رُوحانی ارتقاء کی وہ آخری کڑی جس کی موسیٰ نے خبر دی تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات تھی۔

(۷) کہا گیا تھا کہ "وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا مَیں نے اُسے حکم نہیں دیا، یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے"۔

اِس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ دنیا کو یہ بتایا گیا تھا کہ جس نبی کی اِس آیت میں خبر دی گئی ہے چونکہ اُس کے لیے انسان کی روحانی ترقی کی آخری کڑی ہونا مقدر ہے اور اگر کوئی جھوٹا شخص اس عہدے کو اپنی طرف فریب سے منسوب کرے تو اس سے بڑے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں اس لیے خدا تعالےٰ نے فیصلہ فرمایا کہ جو شخص بھی جھوٹے طور پر اس پیشگوئی کو اپنی طرف منسوب کریگا وہ قتل کیا جائیگا اور خدا تعالےٰ کے عذاب میں مبتلا ہو گا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف الفاظ میں اس پیشگوئی کے مصداق ہونے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ جب آپ نے دعویٰ کیا آپ اکیلے تھے۔ آپ نہایت ہی کمزور تھے۔ دشمن بڑے جتھے والا اور بڑا طاقتور تھا مگر باوجود اس کے کہ دشمنوں نے اپنا سارا زور لگایا وہ آپ کو قتل نہیں کر سکے۔ باوجود اسکے کہ اُس وقت کی زبردست حکومتیں آپ کے مقابلہ پر آئیں سب پاش پاش ہو گئیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک کامیاب اور بامراد انسان کی حیثیت میں

فوت ہوئے۔ آپ کی ساری قوم آپ کی وفات سے پہلے آپ پر ایمان لے آئی اور آپ کی وفات کے چند سال بعد ہی آپ کے خلفاءؓ کے ذریعہ سے ساری دنیا میں اسلام پھیل گیا۔ اگر موسیٰ خدا کا راستباز نبی تھا اور اگر استثناء کی یہ پیشگوئی واقعہ میں خدا کی طرف سے تھی تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اس پیشگوئی کے مصداق ہونے کے مدعی تھے کیا اس طرح کامیاب و کامران ہو سکتے تھے جیسا کہ وہ ہوئے؟ اور کیا آپ کے دشمن آپ کو قتل کرنے میں اس طرح ناکام ہو سکتے تھے جیسا کہ ہوئے۔ یہی نہیں کہ اتفاقی طور پر آپ دشمن کے حملوں سے بچ گئے ہوں بلکہ موسیٰؑ کی اس پیشگوئی کے مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت قرآن کریم نے بڑے زور شور سے عربوں کے سامنے یہ اعلان کر دیا تھا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ ع ۱۴) یعنی اللہ تعالیٰ یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں کے حملوں سے بچائیگا اور آپ کی جان کی حفاظت کرے گا۔ اسی طرح آپ کے مخالفوں کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کریم نے یہ فرما دیا تھا کہ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (پ ۲۹ سورۃ جن ع ۱۲) خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ اپنے غیب کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا سوائے برگزیدہ رسولوں کے۔ پھر جب وہ کسی کو اپنا رسول بنا کر بھیجتا ہے تو وہ اُس کے آگے اور پیچھے اس کی حفاظت کے سامان کرتا رہتا ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اُس نے ایک خاص کام کے لیے بھیجا ہے تو وہ انہیں بغیر حفاظت کے نہیں چھوڑے گا اور دشمن کو آپ کے مارنے پر قادر نہیں کرے گا۔

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انجام اتفاقی انجام نہیں تھا بلکہ آپ نے شروع سے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ کو خدا تعالیٰ دشمن کے حملوں سے بچائیگا اور دشمن آپ کے قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اس طرح آپ نے دنیا کو ہوشیار کر دیا تھا کہ میں استثناء باب ۱۸ آیت ۲۰ کی پیشگوئی کے مطابق قتل نہیں کیا جاؤنگا کیونکہ میں جھوٹا نہیں بلکہ حقیقی طور پر موسیٰ کی پیشگوئی کا مصداق ہوں۔

خلاصہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے بعثتِ محمدیہ سے قریباً ۱۹۰۰ سو سال پہلے یہ خبر دی تھی کہ موسوی شریعت الہٰی کلام کا آخری نقطہ نہیں۔ ابھی انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے مزید ہدایتوں کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ آخری زمانہ میں ایک اور مامور بھیجیگا وہ مامور دنیا کے سامنے سب سچائیوں کو پیش کریگا اور وہی انسان کی روحانی ترقی کا آخری نقطہ ہوگا پس اس پیشگوئی کے مطابق دنیا میں ابھی ایک اور کتاب اور ایک اور نبی کی ضرورت تھی پس قرآن کریم نے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائبل اور موسیٰ و عیسیٰ کی بعثت کے بعد اگر دنیا کی ہدایت کا دعویٰ کیا۔ تو وہ بالکل حق بجانب اور خدا تعالیٰ کے کلام کو پورا کرنیوالے تھے۔ قرآن کریم غیر ضروری نہ تھا بلکہ اگر قرآن کریم نہ آتا تو خدا تعالیٰ کی بتائی ہوئی بہت سی باتیں غلط جاتیں اور دنیا بد اعتقادی اور شک کے مرض میں مبتلا ہو جاتی۔

تیسری پیشگوئی

جبلِ فاران سے دس ہزار قدوسیوں کیساتھ ایک عظیم الشان نبی کا ظہور

استثناء باب ۳۳ میں لکھا ہے ”اور اُس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے

پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہُوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے دہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی"۔ (آیت ۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس کلام میں اپنے تین جلوے بتائے ہیں۔ ان میں سے پہلا جلوہ سینا سے ظاہر ہوا۔ اِس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تورات (خروج باب ۱۹ آیت ۲۰) میں لکھا ہے:۔

"اور خداوند کوہِ سینا پہاڑ کی چوٹی پر نازل ہوا اور خداوند نے پہاڑ کی چوٹی پر موسیٰ کو بلایا اور موسیٰ چڑھ گیا"۔

یہ خدائی جلوہ ظاہر ہُوا اور جو برکتیں اس میں پوشیدہ تھیں وہ دنیا پر ظاہر کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد دوسرے جلوے کا ذکر کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ وہ شعیر سے طلوع ہوگا۔ شعیر وہ مقام ہے جس کے آس پاس حضرت مسیح علیہ السّلام کے معجزات ظاہر ہوئے۔ پس شعیر سے طلوع ہونے کے معنے حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے ہیں۔ مسیحی علماءِ اناجیل نے نہ معلوم کیوں شعیر کو سینا کا مترادف قرار دیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شعیر فلسطین کا حصّہ ہے یہ نام مختلف شکلوں میں بگڑ کر آیا ہے اور یہ نام ایک قوم کا بھی ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھی اور بنو آشر کہلاتی تھی اور یہ شمال مغربی فلسطین کے علاقے کا بھی نام ہے پس شعیر سے مراد وہی جلوہ ہے جو خصوصیت کے ساتھ فلسطین میں ظاہر ہونے والا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام تو کنعان پہنچے ہی نہیں اُسی جگہ پر فوت ہو گئے جہاں کنعان کی سرحدیں نظر آتی تھیں اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی ایسا جلوہ ظاہر نہیں ہوا جو اس قسم کی عظمت والا ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جلوہ تھا پس شعیر سے طلوع ہونے سے مراد حضرت مسیح کا ظہور ہے جو عین کنعان میں ظاہر ہوئے اور جن کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے پھر ایک دفعہ دنیا کو اپنی شکل دکھلائی۔

تیسرا جلوہ فاران سے ظاہر ہونا تھا۔ فاران سے مراد وہ پہاڑ ہیں جو مدینہ اور مکّہ کے درمیان ہیں چنانچہ عربی جغرافیہ نویس ہمیشہ سے ہی مدینہ اور مکّہ کے درمیانی علاقہ کا نام فاران رکھتے چلے آئے ہیں۔ مدینہ اور مکّہ کے درمیان ایک پڑاؤ ہے، جس کا نام وادیٔ فاطمہ ہے جب قافلے وہاں سے گذرتے ہیں تو وہاں کے بچے قافلہ والوں کے پاس پھول بیچتے ہیں اور جب اُن سے قافلہ والے پوچھیں کہ یہ پھول تم کہاں سے لائے ہو تو وہ کہتے ہیں مِنْ بَرِّيَّةِ فَارَان۔ فاران کے جنگل سے لائے ہیں۔ پس فاران یقینی طور پر عرب اور حجاز کا ہی علاقہ ہے۔ تورات سے ثابت ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اِسی فاران کے میدان میں رہتے تھے۔ لکھا ہے:۔

"اور خداوند اس لڑکے (یعنی اسمٰعیلؑ) کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا اور وہ فاران کے بیابان میں رہا۔ اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت اُس سے بیاہنے کو لی"۔ (پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۰-۲۱)

بائبل فاران کے مقام کو عربوں کے بیان کی نسبت کسی قدر مختلف جگہ پر قرار دیتی ہے اور کنعان کے کناروں پر ہی بتاتی ہے۔ لیکن جنگل اور پہاڑ شہروں کی طرح کسی چھوٹے سے علاقہ میں محدود نہیں ہوتے بلکہ بعض دفعہ سینکڑوں اور ہزاروں میل تک پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ پس اگر بائبل کا بیان صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو بھی اس کے یہی معنے ہوں گے کہ فاران کے پہاڑ اور اس کا بیابان کنعان کے پاس سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے یہ تو

ثابت نہ ہوگا کہ وہ خستم بھی وہیں ہو جاتا ہے۔ بائبل تسلیم کرتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک بیٹا اسمٰعیل نامی تھا اور بائبل بتاتی ہے کہ وہ فاران میں رہا۔ اب فاران کے جغرافیہ کے متعلق تو اسمٰعیل کی اولاد کی گواہی ہی تسلیم کی جائے گی کیونکہ وہی فاران کی رہنے والی ہے۔ بنو اسرائیل تو تاریخ اور جغرافیہ میں اتنے کمزور تھے کہ وہ اس رستہ کو بھی صحیح طور پر بیان نہیں کر سکے جس رستہ پر چل کر وہ مصر سے کنعان آئے تھے دوسرے ملکوں کے متعلق اُن کی گواہی کی قیمت ہی کیا ہے۔ دنیا میں ایک ہی قوم ہے جو اپنے آپ کو اسمٰعیل کی اولاد کہتی ہے اور وہ قریش ہیں اور وہ عرب میں بستے ہیں اور مکّہ مکرمہ اُن کا مرکز ہے۔ اگر عربوں کا یہ دعویٰ غلط ہے تو سوال یہ ہے کہ اس غلط دعویٰ کے بنانے کی اُنہیں غرض کیا تھی۔ بنو اسحاق تو اُن کو کوئی عزت دیتے ہی نہیں تھے۔ پھر ایک جنگل میں رہنے والی قوم کو اسبات کی کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اسمٰعیل کی اولاد قرار دے اور اگر اُس نے یہ جھوٹ بنایا ہی تھا تو اسمٰعیل کی اصل اولاد کہاں گئی؟ بائبل کہتی ہے کہ اسمٰعیل کے بارہ بیٹے تھے۔ بائبل کہتی ہے کہ اُن بارہ بیٹوں کی نسل آگے بہت پھیلیگی۔ لکھا ہے۔ "اور لونڈی کے بیٹے (اسمٰعیل) سے بھی ایک قوم پیدا کرونگا اس لیے کہ وہ بھی تیری نسل ہے۔" (پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۳)

پھر لکھا ہے۔ "اُٹھ اور لڑکے (اسمٰعیل) کو اُٹھا اور اُسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ مَیں اسکو ایک بڑی قوم بناؤنگا" (پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۸)

پھر لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا:۔

"اور اسمٰعیل کے حق میں مَیں نے تیری سُنی، دیکھ مَیں اُسے برکت دُونگا اور اُسے برومند کروں گا۔ اور اُسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور مَیں اُسے بڑی قوم بناؤں گا۔" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰)

ان پیشگوئیوں میں بتایا گیا ہے کہ اسمٰعیل کی نسل بہت پھیلے گی اور بڑی بابرکت ہوگی۔ اگر عرب کے لوگوں کا دعویٰ جھوٹا ہے تو پھر بائبل بھی جھوٹی ہے کیونکہ دنیا میں اور کوئی قوم اپنے آپ کو بنو اسمٰعیل نہیں کہتی جس کو پیش کر کے بائبل کی ان پیشگوئیوں کو سچا ثابت کیا جا سکے اور اگر قریش بنو اسمٰعیل ہیں تو پھر ابراہیمؑ بھی سچا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قریش کو برکت دی اور ابراہیمؑ کی وہ پیشگوئیاں اُن کے ذریعہ پوری ہوئیں جو بنو اسمٰعیل کے متعلق تھیں۔

تاریخ کا سب سے بڑا ثبوت قومی رُوایات ہی ہوتی ہیں اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ایک قوم سینکڑوں سال سے اپنے آپ کو بنو اسمٰعیل کہتی چلی آئی ہے اور اُس کے بیان کو مزید تقویت اس بات سے یہ حاصل ہوتی ہے کہ دنیا کی اور کوئی قوم اپنے آپکو بنو اسمٰعیل نہیں کہتی۔ پھر جہاں بائبل مانتی ہے کہ بنو اسمٰعیل فاران میں رہے وہاں عرب کے لوگ بھی مکّہ سے لیکر شمالی عرب کی سرحد تک کے علاقہ کو فاران کہتے چلے آرہے ہیں پس یقیناً یہی علاقہ فاران تھا جیسا کہ یقیناً قریش ہی بنو اسمٰعیل تھے اور فاران سے ظاہر ہونیوالا جلوہ عربوں سے ہی ظاہر ہونیوالا تھا۔

بنو اسمٰعیل کے عرب میں رہنے کا یہ بھی ثبوت ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کے نام جو بائبل میں آتے ہیں یہ ہیں۔ نبیت ۱۔ قیدار ۲۔ ادبئیل ۳۔ مبسام ۴۔ مشماع ۵۔ دومہ ۶۔ مسا ۷۔ حدد ۸۔ تیما ۹۔ یطور ۱۰۔ نفیس ۱۱۔ قدمہ ۱۲۔ (پیدائش باب ۲۵ آیت ۱۳ تا ۱۶)

قدیم رواج کے مطابق ان کی اولادوں کے نام بھی اپنے باپوں پر ہونگے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد

اپنے باپوں کے نام سے کہلاتی ہے اسی طرح ملکوں کے نام بھی پرانے دستور کے مطابق بالعموم قوموں کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ اِس رواج کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم دیکھتے ہیں، تو سارے عرب میں اِن بیٹوں کی اولاد پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ پہلا بیٹا نبیت تھا جس کی اولاد جغرافیہ نویسوں کے بیان کے مطابق ۳۰-۳۸ ڈگری عرض شمالی اور ۳۶-۳۸ ڈگری طول مشرقی کے درمیان رہی تھی۔ چنانچہ ریورنڈ کا تری بی کاری ایم اے نے اِس کو تسلیم کیا ہے کہ اُن کے نزدیک فلسطین سے لیکر بندر ینبوع تک جو مدینہ منوّرہ کا بندر ہے یہ قوم پھیلی ہوئی تھی۔

دوسرا بیٹا قیدار تھا۔ اِس کی قوم بھی عربوں میں پائی جاتی ہے۔ قیدار کے معنے ہیں "اونٹوں والا"۔ یہ قبیلہ حجاز اور مدینہ کے درمیان آباد ہے۔ بطلیموس اور پلینی دونوں نے اپنے جغرافیوں میں حجاز کی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے کیڈری اور گڈرونائینی قوموں کا ذکر کیا ہے جو صاف طور پر قیدار ہی کا بگڑا ہوا تلفظ ہے اور اب تک بعض عرب اپنے آپکو قیدار کی نسل سے بتاتے ہیں۔

تیسرا بیٹا ادبئیل تھا جو یفس کے بیان کے مطابق ادبئیل نامی قوم اسی عرب علاقہ میں بستی تھی۔

چوتھا بیٹا مبسام تھا اس کا ثبوت عام جغرافیوں میں کہیں نہیں ملتا۔ لیکن بالکل ممکن ہے کہ یہ نام بگڑ گیا ہو اور کسی اور شکل میں پایا جاتا ہو۔

پانچواں بیٹا مشماع تھا۔ عرب میں اب تک بنو سماع پائے جاتے ہیں۔

چھٹا بیٹا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا دُومہ تھا اور دومہ کا مقام اب تک عرب میں پایا جاتا ہے جس کا ذکر عرب جغرافیہ نویس ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں کہ دومہ اسمٰعیل کا بیٹا تھا جس کے نام پر یہ نام پڑا۔ چنانچہ عرب میں یہ ایک مشہور مقام ہے۔

ساتواں بیٹا مسا تھا۔ اس کے نام پر بھی ایک قوم یمن میں پائی جاتی ہے اور اس کی جائے رہائش کے کھنڈرات وہاں موجود ہیں۔ ریورنڈ کا تری بی کاری نے اپنی کتاب میں اُن کا ذکر کیا ہے۔

آٹھواں بیٹا حدد تھا اس کے نام پر یمن کا مشہور شہر حدیدہ بنا ہوا ہے۔

نواں بیٹا تیما تھا۔ نجد سے حجاز تک کا علاقہ تیما کہلاتا ہے اور یہاں یہ قوم بستی ہے بلکہ خلیج فارس تک پھیل گئی ہے۔

دسواں بیٹا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا یطور تھا۔ اِن کا مقام بھی عرب میں معلوم ہوتا ہے اور جدور کے نام سے مشہور ہے جو یطور کا بگڑا ہوا ہے یاء عام طور پر ج سے بدل جاتی ہے اور ط اور ت د سے بدل جاتے ہیں پس جدور اصل میں یطور ہی ہے۔

گیارھواں بیٹا نفیس تھا۔ اور مسٹر فاسٹر کا بیان ہے۔ جوزیفس اور تورات کی سند کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم بھی بیابانِ عرب میں رہتی تھی۔

بارھواں بیٹا قدمہ تھا۔ اِن کی جائے رہائش بھی یمن میں ثابت ہے۔ مشہور جغرافیہ نویس مسعودی لکھتا ہے کہ مشہور قبیلہ اصحاب الرس جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آتا ہے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا اور وہ دو قبیلے تھے ایک کا نام قدمان تھا اور ایک کا نام یامین تھا۔ بعض جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ دوسرے قبیلے کا نام یامین نہیں بلکہ رعویل تھا۔

اِن جغرافیائی اور تاریخی شواہد سے صاف ثابت ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تمام اولاد عرب میں بستی تھی۔ یہ تمام اولاد چونکہ خانہ کعبہ اور مکّہ کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتی چلی آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام مکّہ میں ہی آکر بسے تھے اور اسی وجہ سے یہی علاقہ عربوں اور تورات کے بیان کے مطابق فاران کا علاقہ ہے۔

یسعیاہ نبی کی پیشگوئی عرب کے متعلق

یسعیاہ نبی کے الہامی کلام کی شہادت بھی اِس بات کی تائید میں ہے کہ بنو اسمٰعیل عرب میں رہے۔ چنانچہ یسعیاہ باب ۲۱ میں لکھا ہے:-

"عرب کی بابت الہامی کلام۔ عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے۔ اے دوانیوں کے قافلو! پانی لے کر پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔" (آیت ۱۳ تا ۱۷)

اِس پیشگوئی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے ایک سال بعد جو جنگ بدر ہوئی تھی اُس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِس میں بنو قیدار یعنی مکّہ اور مکّہ کے اردگرد رہنے والے لوگ بہت بُری طرح مسلمانوں سے ہارے اور اُن کی تلواروں اور کمانوں کی تاب نہ لاکر نہایت ذلّت سے پسپا ہوئے۔ اِس پیشگوئی کے اوپر صاف لکھا ہے "عرب کی بابت الہامی کلام"۔ اور اس میں تیما اور قیدار کو عرب کا علاقہ قرار دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے الہام کے مطابق ۷۱۴ برس قبل مسیح جو یسعیاہ کا زمانہ تھا اُس وقت حجاز میں اسمٰعیلؑ کی اولاد بس رہی تھی۔

غرض جس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھیں یہ ثابت ہے کہ قریش بنو اسمٰعیل تھے اور فاران بائبل کے مطابق وہی علاقہ ہے جس میں بنو اسمٰعیل رہے۔

حبقوق نبی کی پیشگوئی

پس فاران سے ظاہر ہونے والا جلوہ یقیناً جلوہ محمدی ہی تھا جس کی خبر موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ دی گئی اور اس کی خبر حبقوق نبی نے مسیح سے ۶۲۶ برس پہلے دی اور کہا:-

"خدا تیما سے اور وہ جو قدوس ہے کوہِ فاران سے آیا سلاہ۔ اُس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور زمین اُس کی حمد سے معمور ہوئی۔ اور اُس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی۔ اُس کے ہاتھ سے کرنیں نکلیں پر وہاں بھی اُس کی قدرت در پردہ تھی۔ مری اسکے آگے آگے چلی اور اُس کے قدموں پر آتشی وبا روانہ ہوئی وہ کھڑا ہوا اور اُس نے زمین کو لرزہ دیا۔ اُس نے نگاہ کی اور قوموں کو پراگندہ کر دیا اور قدیم پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگئے اور پرانی پہاڑیاں اُسکے آگے دھنس گئیں۔ اُسکی قدیم راہیں یہی ہیں مَیں نے دیکھا کہ کوشان کے خیموں پر بپت تھی۔

اور زمین مدیان کے پردے کانپ جاتے تھے۔" (حبقوق باب ۳ آیت ۳ تا ۷)

اِس پیشگوئی میں بھی تیمہ اور کوہ فاران سے ایک قدوس کے ظاہر ہونے کا ذکر آتا ہے پس موسیٰ کی پیشگوئی اور حبقوق کی پیشگوئی سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح تک انسان اپنے ارتقاء کے آخری نقطہ کو پہنچنے والا نہ تھا بلکہ حضرت مسیح کے بعد ایک اور جلوہ الٰہی ظاہر ہونیوالا تھا جس نے صرف جمالی جلوہ نہ ہونا تھا بلکہ اُس کے ساتھ ایک آتشی شریعت کا ہونا بھی لازمی تھا۔ اور جیسا کہ ہم اُوپر ثابت کر چکے ہیں تیمہ کی سرزمین اور کوہ فاران سے ظاہر ہونے والے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور اُن کی آتشی شریعت قرآن کریم تھی جس نے گناہوں اور شیطانی کاروبار کو جلا کر رکھ دیا۔ موسیٰ نے کہا ہے جب وہ کوہ فاران سے ظاہر ہوگا تو اُس کے ساتھ دس ہزار قدوسی آئیں گے۔ وہ کون تھا جو کوہِ فاران سے ظاہر ہوُا اور اُسکے ساتھ دس ہزار قدوسی تھے؟ وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جو فاران کی پہاڑیوں پر سے ہوتے ہوئے جب مکّہ پر حملہ آور ہوئے تو آپکے ساتھ دس ہزار آدمی تھا جس پر ساری تاریخیں متفق ہیں۔ کیا مسیح پر یہ پیشگوئی چسپاں ہو سکتی ہے؟ کیا داؤد پر پیشگوئیاں چسپاں ہو سکتی ہیں؟ وہ کب فاران سے ظاہر ہوئے اور کب اُن کے ساتھ دس ہزار قدوسی تھے؟ مسیح کے ساتھ تو کُل بارہ حواری تھے جن میں سے ایک نے مسیح کو چند روپے لیکر بیچ دیا اور دوسرے نے اُس پر لعنت کی۔ باقی رہ گئے دس۔ سو بائبل کہتی ہے کہ وہ دس بھی بھاگ گئے۔ اگر وہ قائم بھی رہتے اور نہ بھاگتے تب بھی دس اور دس ہزار میں بڑا بھاری فرق ہے۔ اور تورات تو کہتی ہے کہ وہ اُس کے ساتھ ہونگے اور مسیح کے دس آدمیوں کی نسبت انجیل کہتی ہے کہ وہ اُس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اِسی طرح حبقوق میں لکھا ہے " زمین اُس کی حمد سے معمور ہوئی"۔ وہ کون ہے جس کا نام محمدؐ تھا اور جس کے دشمن اُسے گالیاں دیتے تو اُس کا نام لیکر اُنہیں گالیاں دینے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کیونکہ محمدؐ یعنی تعریف والا کہہ کر وہ اُسے کیا گالی دے سکتے تھے اِس لیے وہ اُس کو مذمّم کہہ کر گالی دیتے تھے اور جب کبھی آپ کے صحابہؓ کو گالیاں سُنکر جوش آتا تو آپؐ فرماتے تمہارے لیے جوش کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ مجھے تو گالیاں نہیں دیتے وہ تو کسی مذمّم کو گالیاں دیتے ہیں۔ پس وہ جس کے نام میں ہی حمد آتی ہے اور جس کی اُمّت کی شاعری کا ایک جزو ہی نعت محمدؐ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف) ہو گیا ہے۔ کیا اُس کے سوا کوئی اور شخص بھی اس پیشگوئی کا مستحق ہو سکتا ہے۔

پھر لکھا ہے " مری اُس کے آگے چلی اور اُس کے قدموں پر آتشی وبا روانہ ہوئی"۔ یہ پیشگوئی بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی صادق آتی ہے۔ کیونکہ آپ کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے آپ کے دشمن کو تباہ کیا۔ گو اِس جگہ مری کے الفاظ ہیں جو بیماری پر دلالت کرتے ہیں مگر مراد تباہی اور ہلاکت ہی ہے کیونکہ جس ذریعہ سے بھی موت عام ہو جائے وہ مری اور وبا کہلائے گا۔

پھر لکھا ہے " وہ کھڑا ہوُا اور اُس نے زمین کو لرزہ دیا اُس نے نگاہ کی اور قوموں کو پراگندہ کر دیا"۔

یہ پیشگوئی بھی نہ تو موسیٰ علیہ السلام پر صادق آسکتی ہے نہ مسیح علیہ السلام پر۔ موسیٰ علیہ السلام تو اپنے دشمن سے لڑتے ہوئے فوت ہو گئے اور مسیح علیہ السلام کو تو بقول عیسائیوں کے اُن کے دشمنوں نے پھانسی دے دیا۔ جس نے زمین کو لرزہ دیا اور جس کی نگاہ نے قوموں کو پراگندہ کر دیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے خود آپ نے دعویٰ فرمایا ہے

نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مسیرۃ شَھْرٍ (بخاری) خدا تعالیٰ نے مجھے رُعب عطا فرما کر میری مدد کی ہے میں جہاں جاؤں ایک مہینہ کے فاصلہ تک دشمن مجھ سے ڈر جاتا ہے۔

پھر لکھا ہے "قدیم پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے اور پُرانی پہاڑیاں اُس کے آگے دھنس گئیں"۔

یہ پیشگوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہی ثابت ہوئی، کیونکہ آپؐ کے دشمن آپ کے مقابلہ میں ہلاک و تباہ ہو گئے اور پہاڑ اور پہاڑیوں سے مراد طاقتور دشمن ہی ہوا کرتے ہیں۔

پھر لکھا ہے "مَیں نے دیکھا کہ کوشان کے خیموں پر بپت تھی اور زمین مدیان کے پردے کانپ جاتے تھے"۔

اِس پیشگوئی سے صاف ظاہر ہے کہ یہ آنے والا موعود شام سے کسی باہر کے علاقے کا ہوگا۔ اور جب اُس کی فوجیں کیش یا کوشان اور مدائن کے علاقوں کی طرف بڑھیں گی تو اُن علاقوں کی فوجیں اس کی فوجوں کے آگے لرز جائیں گی۔ اس پیشگوئی کے موعود بھی موسیٰ علیہ السلام نہیں ہو سکتے نہ مسیح علیہ السلام ہو سکتے ہیں یہ پیشگوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی صادق آتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب آپ کی مُٹھی بھر فوج آپ کے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں فلسطین کی طرف بڑھی تو باوجود اس کے کہ کنعان اُس وقت قیصر روما کے ماتحت تھا اور وہ آدھی دنیا کا بادشاہ تھا مسلمانوں کی مُٹھی بھر فوج کے آگے قیصر کی فوجیں اس طرح بھاگیں کہ کیش کے خیموں پر آفت آگئی اور زمین مدیان کے پردے کانپ گئے اور ان علاقوں نے اپنی نجات اس بات میں پائی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادموں کے قدموں میں اپنے ہتھیار ڈال دیں۔

چوتھی پیشگوئی

ایک محبوب نبی کا دس ہزار آدمیوں کے ساتھ ظہور

حضرت سلیمانؑ فرماتے ہیں:۔

(الف) "میرا محبوب سُرخ و سفید ہے۔ دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے اُس کا سر ایسا ہے جیسا چوکھا سونا۔ اُس کی زلفیں پیچ در پیچ ہیں اور کوّے کی سی کالی ہیں۔ اُسکی آنکھیں اُن کبوتریوں کی مانند ہیں جو لب دریا دُودھ میں نہا کے تمکنت سے بیٹھتی ہیں اُس کے رُخسارے پھولوں کے چمن اور بلسان کی اُبھری ہوئی کیاری کی مانند ہیں۔ اُسکے لب سوسن ہیں جن سے بہتا ہوا مُر ٹپکتا ہے۔ اُسکے ہاتھ ایسے ہیں جیسے سونے کی کڑیاں جن میں ترسیس کے جواہر جڑے گئے۔ اُس کا پیٹ ہاتھی دانت کا سا کام ہے جس پر نیلم کے گُل بنے ہوں۔ اُس کے پَیر ایسے جیسے سنگِ مرمر کے ستون جو سونے کے پایوں پر کھڑے کیے جاویں۔ اسکی قامت لبنان کی سی۔ وہ خوبی میں رشک سرو ہے۔ اس کا مُنہ شیرینی ہے ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے۔ اے یروشلم کی بیٹیو! یہ میرا پیارا ہے یہ میرا جانی ہے"۔ (غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۰ تا ۱۶)

اِس پیشگوئی میں بتایا گیا ہے کہ ایک ایسا نبی پیدا ہونے والا ہے جو دوسرے نبیوں سے افضل ہوگا۔ کیونکہ لکھا ہے:۔

"تیرے محبوب کو دوسرے محبوب کی نسبت سے کیا فضیلت ہے"۔ (غزل الغزلات باب ۵ آیت ۹)

پھر اُس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ وہ محبوب دس ہزار آدمیوں کے درمیان جھنڈے کی مانند کھڑا ہوگا۔ چونکہ

جھنڈا فوج کی علامت ہے اِس لیے اِس کے معنے یہ ہیں کہ ایک عظیم الشان موقعہ پر وہ دس ہزار سپاہیوں کی افسری کریگا۔

پھر لکھا ہے۔ "اُس کے لب سوسن ہیں جن سے بہتا ہُوا مُر ٹپکتا ہے"۔

مُر ایک گوند ہے جس کا مزہ تلخ لیکن تاثیر نہایت اعلیٰ اور خوشبو نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ کیڑوں کے مارنے کے لیے نہایت اعلیٰ سمجھی جاتی ہے اور زخموں کے اندمال میں نہایت ہی مفید ہے۔ کرم کُش ادویہ میں پڑتی ہے اور زخموں کی مرہموں میں ڈالی جاتی ہے۔ اسی طرح خوشبوؤں کے مصالحوں میں اُس کو استعمال کیا جاتا ہے اور عطروں کے بنانے میں بھی کام میں لائی جاتی ہے۔

پھر لکھا ہے۔ "وہ محمدیم ہے"۔ اس کا ترجمہ انگریزی بائبل میں ALTOGATHER LOUELY کیا گیا ہے اور اردو بائبل میں سراپا عشق انگیز کیا گیا ہے یعنی اُسے دیکھ کر انسان اُس سے محبّت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ پیشگوئی واضح طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں ہوتی ہے۔ آپ ہی موسیٰ کی پیشگوئی کے مطابق دس ہزار قدوسیوں کے سردار ہونے کی حیثیت میں فاران کی چوٹیوں پر سے گذرتے ہوئے مکّہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے۔ آپ ہی وہ شخص تھے جنکا کلام صحیح معنوں میں دُنیا کے لیے مُر ثابت ہوا ہے اور اُس میں انسانی اصلاح کے لیے تمام قواعد بیان کر دئے گئے ہیں۔ جو بعض قوموں کے منہ میں کڑوے معلوم ہوتے ہیں گو ہیں وہ کرم کُش اور خوشبودار۔ اور آپ ہی ہیں جن کا نام محمدؐ تھا۔

عیسائی مُصنّف اِس پیشگوئی سے گھبرا کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس موعود کا نام محمدؐ نہیں بلکہ محمدیم لکھا ہے۔ لیکن یہ اعتراض ایک بے معنی اعتراض ہے۔ تورات نے تو خدا کو بھی "الوہیم" لکھا ہے۔ عبرانی زبان کا قاعدہ ہے کہ وہ اعزاز اور اکرام کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کر دیتی ہے۔ اُردو زبان میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اعزاز کے موقعہ پر جمع کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اگر ایک اُردو لیکچرار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کوئی لیکچر دیگا تو آخر میں کہیگا یہ ہیں ہمارے محمدؐ۔ حالانکہ اس کی مراد یہ ہوگی کہ گو ہمارا آقا محمدؐ تو ایک ہی شخص ہے لیکن مَیں آپ کے اعزاز کے طور پر جمع کا لفظ بولتا ہوں۔

(ب) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک اور پیشگوئی غزل الغزلات باب ۴ میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں حضرت سلیمانؑ اپنی محبوبہ کو بہن بھی کہتے ہیں اور ساتھ ہی زوجہ بھی کہتے ہیں چنانچہ غزل الغزلات باب ۴ آیت ۹ میں اپنی محبوبہ کی نسبت کہتے ہیں "اے میری بوا میری زوجہ"۔ پھر آیت ۱۰ میں لکھا ہے "اے میری بہن میری زوجہ"۔ پھر آیت ۱۲ میں لکھا ہے "میری بوا میری زوجہ"

اِن دونوں الفاظ کا جوڑ بتاتا ہے کہ آنے والا محبوب بنو اسمٰعیل میں سے ہوگا۔ جیسے حضرت موسیٰ کو اللہ تعالےٰ نے کہا کہ وہ تیرے بھائیوں میں سے ہوگا۔ چونکہ حضرت سلیمانؑ اس کو ایک معشوق کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اِس لیے انہوں نے بجائے بھائی کے بہن کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس کی تعلیم بنو اسحاق کے نبیوں کی طرح صرف اپنی قوم کے لیے نہیں ہوگی بلکہ دوسری اقوام کے لیے بھی اُس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوگا جس کی طرف زوجہ کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اس پیشگوئی میں مؤنث کے صیغوں سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔

کیونکہ یہ ایک شاعرانہ رنگ کا کلام ہے چنانچہ اسی باب کے آخر میں جاکر کہا ہے۔
"میرا محبوب اپنے باغیچے میں آوے اور اُس کے لذیذ میوے کھاوے"۔
یہاں بجائے مؤنث کے مذکّر کا صیغہ استعمال کر دیا گیا ہے۔ یہ پیشگوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر پوری نہیں ہوتی۔ حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے نہیں تھے۔ نہ اُن کی تعلیم غیر قوموں کے لیے تھی جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے۔
(ج) اسی طرح غزل الغزلات میں لکھا ہے "میں سیاہ فام پر جمیلہ ہوں۔ اے یروشلم کی بیٹیو! قیدار کے خیموں کی مانند سلیمان کے پردوں کی مانند۔ مجھے مت تاکو کہ میں سیاہ فام ہوں"۔ (باب ا آیت ۵ و ۶)
اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک ایسے نبی کی خبر دی ہے جو جنوب کا رہنے والا ہوگا اور بنو اسحٰق کی نسبت جو شمال کے رہنے والے تھے اُس کا رنگ کم اُجلا ہوگا۔ یا یوں کہو کہ اسکی قوم کا رنگ کم اُجلا ہوگا۔ چنانچہ شامیوں اور فلسطینیوں کے رنگ بوجہ شمال میں رہنے کے عربوں کی نسبت زیادہ سفید ہوتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں پیدا ہوئے تھے۔
(د) اسی باب میں پھر آنے والے موعود کی یہ علامت بتائی گئی ہے کہ:
"میری ماں کے بیٹے ناخوش تھے۔ انہوں نے مجھ سے تاکستانیوں کی نگہبانی کرائی، پر میں نے اپنے تاکستانوں کی جو خاص میرا ہے نگہبانی نہیں کی"۔ (باب ا آیت ۶)
یہ درحقیقت موعود کی قوم کی طرف اشارہ ہے۔ عرب لوگ کہیں قیصر کی نوکری کرتے تھے اور کہیں ایرانیوں کی نوکریاں کرتے تھے مگر خود اپنے ملک کی ترقی کا اُن کو کوئی خیال نہ تھا۔ یہاں تک کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور انہوں نے اُن کے اندر بیداری پیدا کی اور اُن کی روحانی اور علمی اور سیاسی اصلاح کی جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ عرب اپنے تاکستانوں کے محافظ ہو گئے بلکہ وہ دنیا بھر کے تاکستانوں کے آزاد محافظ بن گئے۔
(ھ) اسی طرح غزل الغزلات میں یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ اسرائیلی سلسلہ کے لوگوں کو چاہیئے کہ آنے والے موعود کو خواہ مخواہ اپنی طرف متوجہ نہ کریں ورنہ وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ لکھا ہے۔
"اے یروشلم کی بیٹیو! میں غزالوں اور میدان کی ہرنیوں کی قسم تمہیں دیتا ہوں کہ تم میری پیاری کو نہ جگاؤ اور نہ اٹھاؤ جب تک کہ وہ اُٹھنے نہ چاہے"۔ (باب ۲ آیت ۷)
یہی مضمون پھر باب ۳ آیت ۵ میں بیان کیا گیا ہے اور یہی مضمون پھر سہ بارہ باب ۸ آیت ۴ میں بیان کیا گیا ہے ان عبارتوں کا مطلب یہی ہے کہ جب وہ نبی پیدا ہوگا تو یہود اور عیسائی بنی اسرائیل کی دو شاخیں اُسے دِق کرینگی اور وہ اس کو مجبور کرینگی کہ وہ اُن پر حملہ کرے۔ لیکن چونکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگا یہود اور عیسائی اُس کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ بلکہ خطرناک شکست کھائیں گے۔ حضرت سلیمانؑ اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہیں کہ دیکھو اُس کو جگانا نہیں یعنی اس کو چھیڑ کر اپنی طرف متوجہ نہ کرنا۔ ہاں جب وہ آپ جاگے یعنی جب خدا تعالیٰ کی مشیت چاہے کہ وہ تمہارے ملکوں کی طرف توجہ کرے تو پھر بے شک کرے مگر خود اُس کو نہ چھیڑنا۔ اس لیے

کہ جو قوم خود کسی نبی کو چھیڑتی ہے وہ اپنے آپ کو سزا کا مستحق بنا لیتی ہے جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھیڑ کر اپنے آپ کو سزا کا مستحق بنا لیا۔ لیکن اگر کوئی قوم نہ چھیڑے تو نبی اسکی طرف جارحانہ طور پر توجہ نہیں کرتا۔ صرف وعظ و نصیحت سے اُسکو مخاطب کرتا ہے۔ نبی تلوار اُسکے خلاف اُٹھاتے ہیں جو پہلے اُن کے خلاف تلوار اٹھاتے ہیں اور اُنہی کے خلاف جنگ کرتے ہیں جو خدا کے سچے دین کو مٹانے کے لیے جبر اور تعدّی سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس پر شاہد ہے اور حضرت سلیمانؑ نے اپنی قوم کو اسی خطرہ سے آگاہ کیا ہے۔

یہ پیشگوئیاں کسی صورت میں بھی حضرت مسیح پر چسپاں نہیں ہوسکتیں۔ نہ تو مسیح فلسطین کے جنوب میں پیدا ہوئے نہ ہی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے تھا نہ اُن کو کوئی ایسی طاقت حاصل تھی کہ اُن کو چھیڑنے کی وجہ سے بنو اسرائیل تباہ ہوتے۔ یہ ساری کی ساری پیشگوئیاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی چسپاں ہوسکتی ہیں اور اُنہی کی خبر غزل الغزلات میں دی گئی ہے۔ غزل الغزلات درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کے اظہار میں لکھی گئی ہے۔

پانچویں پیشگوئی

یسعیاہ نبی نے بھی ایک عظیم الشان نبی کے ظہور کی خبر دی

یسعیاہ کی کتاب بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں سے بھری پڑی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم الشان نبی اور آنیوالا ہے جو دنیا کے لیے سلامتی اور امن لائیگا لیکن جیسا کہ سُنّتِ الٰہی ہے پیشگوئیوں میں ایک رنگ اخفاء کا بھی پایا جاتا ہے چنانچہ یسعیاہ کی پیشگوئیوں میں بھی یروشلم اور صیہون وغیرہ کے نام آئے ہیں جسکی وجہ سے مسیحی مصنّفوں نے دھوکا کھایا ہے کہ یہ پیشگوئیاں مسیح کے متعلق ہیں حالانکہ یروشلم یا بنو اسرائیل یا صیہون کے الفاظ اپنی ذات میں تو پیشگوئی کا کوئی حصّہ نہیں۔ اگر یہ پیشگوئی کی تفصیلات مسیح پر چسپاں نہیں ہوتیں تو صرف یروشلم اور صیہون کے الفاظ سے کیا دھوکا لگ سکتا ہے۔ اس صورت میں ہمیں یہی ماننا پڑیگا کہ یروشلم اور صیہون اور بنی اسرائیل سے مراد صرف یہ ہے کہ میرے مقدّس مقامات اور میری پیاری قوم نہ کہ حقیقی طور پر یروشلم اور صیہون اور بنی اسرائیل۔

(الف) اس سلسلہ میں سب سے پہلی پیشگوئی مَیں یسعیاہ باب ۴ سے نقل کرتا ہوں۔ لکھا ہے:۔

"اُس دن سات عورتیں ایک مرد کو پکڑ کے کہیں گی کہ ہم اپنی روٹی کھائینگی اور اپنے کپڑے پہنیں گی تُو ہم سب سے صرف اتنا کر کہ ہم تیرے نام کی کہلاویں تاکہ ہماری شرمندگی مٹے۔ اُس دن خداوند کی شاخ شوکت اور حشمت ہوگی اور زمین کا پھل اُن کے لیے جو بنی اسرائیل میں سے بچ نکلے لذیذ اور خوشنما ہوگا۔ اور ایسا ہوگا کہ ہر ایک جو صیہون میں چھوٹا ہوا ہوگا۔ اور یروشلم میں باقی رہے گا۔ بلکہ ہر ایک جس کا نام یروشلم کے زندوں میں لکھا ہوگا مقدس کہلائے گا۔" (آیت ۱ تا ۳)

اس پیشگوئی میں اگر صیہون اور یروشلم کو استعارہ قرار دیا جائے تو جو مفہوم اس پیشگوئی کا نکلتا ہے وہ سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی پر صادق نہیں آتا۔ ان آیتوں میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ آنیوالے موعود کے ساتھ شوکت اور حشمت ہوگی اور

اُس کو دنیا کی غنیمتیں ملیں گی اور اس کی قوم کے لوگ مقدس کہلائیں گے اور اُس کے زمانہ میں کثرت ازدواج کی ضرورت ہوگی۔ کیا یہ باتیں مسیح اور اُس کے حواریوں پر چسپاں ہوتی ہیں؟ کیا مسیح کا زمانہ شوکت اور حشمت والا تھا یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ شوکت اور حشمت والا تھا؟ کیا دنیا کی غنیمتیں مسیح اور اس کے حواریوں کو ملیں یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ کو ملیں؟ کیا مسیح کے زمانہ میں کثرتِ ازدواج کی ضرورت پیش آئی یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسکی ضرورت پیش آئی؟ مسیح نے تو کثرتِ ازدواج کو ناپسند کیا ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت ازدواج کو مناسب حالات میں جائز بلکہ پسندیدہ کہا ہے آپ ہی کے زمانہ میں لڑائیاں ہوئیں اور لڑائیوں میں جوان آدمی مارے گئے اور عورتیں یا بیوہ ہوگئیں یا جوان عورتوں کے لیے رشتے میسر نہ آئے پس آپ نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ ایسی صورت میں مردوں کا فرض ہے کہ ایک سے زیادہ عورتوں سے شادیاں کریں تاکہ قوم میں بدکاری اور آوارہ گردی پیدا نہ ہو۔

(ب) یسعیاہ نبی اپنی کتاب کے باب ۵ میں پیشگوئی فرماتے ہیں:۔

"وہ قوموں کے لیے دُور سے ایک جھنڈا کھڑا کرتا ہے اور اُنہیں زمین کی انتہاء سے سیٹی بجا کے بُلاتا ہے اور دیکھ وے دَوڑ کے جلد آتے ہیں۔ کوئی اُن میں نہ تھک جاتا اور نہ پھسل پڑتا ہے۔ وے نہیں اُونگھتے اور نہیں سوتے۔ اُن کا کمربند کھلتا نہیں ہے اور نہ اُن کی جوتیوں کا تسمہ ٹوٹتا ہے۔ اُنکے تیر تیز ہیں اور اُنکی ساری کمانیں کشیدہ ہیں۔ اُن کے گھوڑوں کے سُم چقماق کے پتھر کی مانند ٹھہرتے اور اُن کے پہیے گردباد کی مانند۔ وے شیرنی کی مانند گرجتے ہیں۔ ہاں وے جوان شیروں کی مانند گرجتے ہیں وے غرّاتے اور شکار پکڑتے اور اُسے بے روک ٹوک لیجاتے ہیں اور کوئی بچانیوالا نہیں اور اُس دن اُن پر ایسا شور مچائیں گے جیسا سمندر کا شور ہوتا ہے اور یہ زمین کی طرف تاکیں گے اور کیا دیکھتے ہیں کہ اندھیرا اور تنگ حالی ہے اور روشنی اُسکی بدلیوں سے تاریک ہو جاتی ہے"۔ (آیت ۲۶ تا ۳۰)

اس پیشگوئی میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک زمانہ میں تمام قوموں کے لیے فلسطین سے دُور کسی جگہ پر ایک جھنڈا کھڑا کریگا اور اس جھنڈے والا دنیا کی مختلف قوموں کو بُلائے گا اور وہ جلدی سے دوڑ کر اُسکے پاس جمع ہو جائینگی۔ وہ لوگ بڑی بڑی قربانیاں کرنیوالے ہونگے اور غفلت اور سُستی سے محفوظ ہوں گے اُنہیں لڑائیاں کرنی پڑینگی۔ اُن کے گھوڑوں کے سُموں سے آگ نکلے گی اور جب وہ حملہ کرنے کیلئے چلیں گے تو ہوا میں گرد اُڑیگی۔ وہ اپنے شکار پر غالب آجائینگے اور اُنکے شکار کو کوئی بچانیوالا نہیں ہوگا۔ وہ ایسا کیوں کرینگے؟ اسلیے کہ وہ دیکھیں گے کہ زمین میں تاریکی اور ظلمت پھیلی ہوئی ہے اور لوگ ایک عظیم الشان انقلاب کے محتاج ہیں۔ یہ پیشگوئی کلی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ صرف چسپاں ہوتی ہے بلکہ قرآن کریم میں اس کا ذکر بھی موجود ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پیشگوئی کے مطابق فلسطین سے دُور یعنی مکہ میں ظاہر ہوئے اور آپ کا جھنڈا مدینہ میں کھڑا کیا گیا۔ آپ ہی تھے جنہوں نے قرآنی الفاظ میں یہ اعلان کیا یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (اعراف ع۲۰) اے انسانو! میں تمام لوگوں کیطرف خدا کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ آپ ہی کی آواز پر چاروں طرف سے لوگ دوڑنے لگ گئے اور جلد جلد آپکے گرد جمع ہوگئے۔ مسیح کی زندگی میں تو ایک شخص بھی غیر قوموں میں سے اُس پر ایمان نہیں لایا تھا۔ اُس کے سارے کے سارے حواری

چالیس پچاس میل کے حلقہ کے اندر رہنے والے تھے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر یمن کے رہنے والے اور نجد کے رہنے والے۔یہودیوں میں سے بھی اور ایرانیوں میں سے بھی اور عیسائیوں میں سے بھی ایمان لائے اور آپ کے گرد جمع ہوگئے۔اور اِس پیشگوئی کے مطابق اُنہوں نے ایسی قربانیاں اور اَن تھک کوششیں کیں کہ دشمن سے دشمن بھی اُن کی قربانیوں کی تعریف کیے بغیر نہیں رہتا اور خدا تعالیٰ نے بھی اپنے کلام میں اُن کی نسبت فرمایا ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (توبہ ع۱۳) اُنہوں نے ایسی قربانیاں کیں کہ خدا اُن سے راضی ہوگیا اور وہ خدا سے راضی ہوگئے۔اور پھر قرآن کریم میں اُن کا یوں ذکر بھی آتا ہے کہ مِنْھُمْ مَنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْھُمْ مَنْ یَّنْتَظِرُ (احزاب ع۳) کچھ وہ ہیں جنہوں نے اپنے عہد پورے کر دیئے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو اپنے عہد کے پورا کرنے کے انتظار میں ہیں۔پھر اُن کو جنگیں بھی پیش آئیں اور تیروں اور کمانوں سے انہوں نے کام لیا۔اُن کے گھوڑے چقماق کی طرح ہو گئے اور اُن کے پیچھے گرد باد کی مانند جس کی طرف خود قرآن کریم میں اشارہ کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا۔فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا۔فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا۔فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا۔فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا۔ (سورۃ عادیات ع۱) یعنی ہم قسم کھاتے ہیں اُن گھوڑ سواروں کی جو تیزی سے دشمن پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں ایسی تیزی سے کہ اُن کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے آگ نکلنے لگتی ہے اور اُن کے حملہ سے گرد و غبار کا ایک طوفان اُٹھ پڑتا ہے اور وہ ایسی شان اور طاقت کے ساتھ اپنے دشمن کی صفوں میں گھس کر اُسے مغلوب کر لیتے ہیں کس طرح لفظ بلفظ اس پیشگوئی کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔

پھر یہ جو اس پیشگوئی میں کہا ہے کہ "وہ زمین کی طرف تاکیں گے اور کیا دیکھتے ہیں کہ اندھیرا اور تنگ حالی ہے اور روشنی اس کی بدلیوں سے تاریک ہو جاتی ہے"

اِسی کی طرف قرآن کریم میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (سورۃ روم ع۵) تمام دنیا میں خشکی اور تری میں فساد اور خرابی پیدا ہو گئی ہے اور خدا تعالیٰ کے ایک مامور کے ظاہر ہونے کی ضرورت ہے اسی طرح فرماتا ہے۔ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (سورۃ طلاق ع۲) یہ خدا کا رسول اس لیے آیا ہے کہ دنیا سب کی سب تاریکی میں پڑی ہے اور وہ اس کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔

(ج) یسعیاہ باب ۸ میں لکھا ہے۔"رب الافواج جو ہے تم اُس کی تقدیس کرو اور اُس سے ڈرتے رہو اور اس کی ہی دہشت رکھو۔وہ تمہارے لیے ایک مقدس ہوگا۔پر اسرائیل کے دونوں گھرانوں کے لیے ٹکر کا پتھر اور ٹھوکر کھانے کی چٹان اور یروشلم کے باشندوں کے لیے پھندا اور دام ہووےگا۔بہت لوگ اُن سے ٹھوکر کھائیں گے اور گریں گے اور ٹوٹ جائیں گے اور دام میں پھنسیں گے اور پکڑے جائیں گے۔شہادت نامہ بند کرلو اور میرے شاگردوں کے لیے شریعت پر مہر کرو۔مَیں بھی خداوند کی راہ دیکھوں گا جو اب یعقوب کے گھرانے سے اپنا مُنہ چھپاتا ہے مَیں اس کا انتظار کروں گا۔" (آیت ۱۳ تا ۱۷)

اِس پیشگوئی میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ایک مقدّس ظاہر ہوگا۔ لیکن وہ بنی اسرائیل کے دونوں گھرانوں کے لیے ٹھوکر کا موجب ہوگا اور یروشلم کے باشندوں کے لیے پھندا اور دام بنیگا۔ اگر وہ اس کا مقابلہ کرینگے تو وہ شکست کھائیں گے اور پکڑے جائینگے۔ اُس کے زمانے میں یہودی شریعت ختم کردی جائے گی اور یعقوب کے گھرانے سے خدا تعالیٰ مُنہ پھیرلے گا۔

انجیل نویس اس پیشگوئی کے متعلق خاموش ہیں اور شاید وہ اسرائیل کے دونوں گھرانوں سے وہ دو گھرانے مراد لیتے ہیں جن میں سے ایک نے سلیمانؑ کے بیٹے کا ساتھ دیا تھا اور دوسرے نے اُن سے بغاوت کرکے الگ حکومت قائم کرلی تھی لیکن یہ درست نہیں ہوسکتا۔ اِس پیشگوئی میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کا ایک مقدّس کھڑا ہوگا اور اس کے زمانہ میں باتیں ہوں گی۔ یا تو اس مقدّس سے مراد مسیح ہے اور یا پھر مسیح کے بعد کوئی اور آنیوالا شخص ہے۔ کیونکہ یسعیاہ اور مسیح کے درمیان کوئی ایسا باعظمت انسان نہیں گذرا جس کے ساتھ بنو اسرائیل نے ٹکر کھائی ہو۔ صرف حضرت مسیح ہی ایسے تھے جن سے بنو اسرائیل نے ٹکر کھائی۔ مگر کیا مسیح سے ٹکّر کھا کر بنو اسرائیل پکڑے گئے تھے یا اُن کے شاگردوں کے لیے شریعت پر مُہر کردی گئی؟ مسیح تو صاف کہتا ہے کہ

"یہ خیال مت کرو کہ مَیں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا۔ مَیں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں کیونکہ مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو۔" (متی باب ۵ آیت ۱۷ و ۱۸)

بلکہ مسیح اپنے بعد کے زمانہ کے لیے بھی کہتا ہے کہ "کیا براتی جب تک کہ دُولہا اُن کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں۔ وے جب تک کہ دُولہا اُن کے ساتھ ہے روزہ نہیں رکھ سکتے۔ لیکن وے دن آویں گے جب دُولہا اُن سے جدا کیا جائیگا، تب انہی دنوں میں وے روزہ رکھیں گے۔" (مرقس باب ۲ آیت ۱۹-۲۰)

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے فیصلہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد بھی آپ کے حواریوں پر موسوی تعلیم پر عمل کرنا لازم ہوگا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مسیح یہ کہتا کہ مَیں نے تو ہمیشہ کیلئے روزے منسوخ کردیئے ہیں مگر وہ خود روزے رکھتا تھے اور اپنے حواریوں کے متعلق خبر دیتا ہے کہ گو آج کل اِن میں کمزوری پائی جاتی ہے لیکن آئندہ زمانہ میں وہ روزے رکھنے لگ جائیں گے۔

پس شریعت پر مُہر کرنے کے یہ معنے نہیں کہ شریعت کو بالکل اُڑا دیا گیا بلکہ اس پیشگوئی کے یہی معنے ہیں کہ اُس مقدس کے زمانہ میں موسوی شریعت منسوخ کردیجائیگی اور ایک نئی شریعت قائم کردیجائے گی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو یہ کیوں کہا جاتا کہ یعقوب کے گھرانے سے خدا اپنا مُنہ پھیرلے گا۔ کیا مسیح یعقوب کے گھرانے سے نہیں تھا؟ اگر مسیح یعقوب کے گھرانے میں سے نہیں تھا۔ تو وہ داؤد کی نسل میں سے نہیں تھا اور اگر وہ داؤد کی نسل میں سے نہیں تھا تو پھر مسیح کے متعلق جو پیشگوئیاں ہیں اُن کا بھی وہ مستحق نہیں تھا۔

(د) یسعیاہ باب ۹ میں لکھا ہے:-

"ہمارے لیے ایک لڑکا تولّد ہُوا۔ اور ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا اور سلطنت اُس کے کاندھے پر ہوگی اور وہ اِس نام سے کہلاتا ہے۔ عجیب۔ مشیر۔ خدائے قادر۔ ابدیّت کا باپ۔ سلامتی کا شہزادہ۔ اُس کی سلطنت

کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہاء نہ ہوگی۔ وہ داؤدؑ کے تخت پر اور اس کی مملکت پر آج سے لیکر ابد تک بندوبست کریگا۔ اور عدالت اور صداقت سے اُسے قیام بخشے گا۔ رب الافواج کی غیوری یہ کرے گی"۔ (آیت ۶ و ۷)

اِس پیشگوئی میں ایک موعود کی خبر دی گئی ہے جو بادشاہ ہوگا۔ اور جس کے پانچ نام ہونگے (۱) عجیب (۲) مشیر (۳) خدائے قادر (۴) ابدیت کا باپ (۵) سلامتی کا شہزادہ۔ اُس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہاء نہ ہوگی۔ اور وہ داؤد کے تخت پر ہمیشہ کے لیے بیٹھے گا۔ اور عدالت اور صداقت سے اُسے قیام بخشیگا۔ اناجیل کے حاشیہ نویسوں نے اِس باب کے شروع میں لکھا ہے کہ اس میں مسیح کی پیدائش کی خبر ہے۔ لیکن اُن علامتوں میں سے جو اِس پیشگوئی میں بیان کی گئی ہیں کوئی ایک بھی تو حضرت مسیح پر صادق نہیں آتی۔ وہ کب بادشاہ ہوئے۔ کب اُن کو عجیب، مشیر، خدائے قادر، ابدیت کا باپ۔ اور سلامتی کا شہزادہ کہا گیا؟ "عجیب" تو شاید اُن کی پیدائش کے لحاظ سے اُن کو کہا بھی جا سکے گو ایسا کہا نہیں گیا۔ کیونکہ جو اُن کو نہیں مانتے تھے وہ تو اُن کی پیدائش کو ناجائز قرار دیتے تھے۔ پس وہ انہیں "عجیب" نہیں قرار دے سکتے تھے اور جو مانتے تھے وہ اُن کی پیدائش کے متعلق مختلف شبہات میں تھے۔ کوئی اُنہیں داؤد کی اولاد قرار دیتا تھا اور کوئی روح القدس کی۔ دوسرا نام مشیر بتایا گیا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مشیر ہونے کا کبھی موقعہ نہیں ملا۔ ساری انجیل میں دیکھ لو کسی ایک جگہ بھی انہوں نے اپنی قوم سے مشورہ نہیں لیا۔ اور نہ انہوں نے اپنی قوم کو کوئی مشورہ دیا۔ پھر وہ مشیر کس طرح کہلائے۔ تیسرا نام خدائے قادر بتلایا گیا ہے۔ مسیح تو ساری عمر ابن اللہ کہلاتے رہے۔ وہ خدائے قادر کس طرح کہلا سکتے تھے اور پھر مسیح تو اناجیل کے بیان کے مطابق پھانسی دیکر مار دیا گیا تھا ایسا انسان قادر کس طرح کہلا سکتا ہے۔ اناجیل میں صاف آتا ہے کہ جب حضرت مسیح صلیب پر لٹکائے گئے تو یہودیوں نے اُن کو طعنہ دیا کہ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اُتر آ۔ چنانچہ لکھا ہے۔ "یُونہیں سردار کاہنوں نے بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ ٹھٹھا مار کے کہا۔ اِس نے اَوروں کو بچایا مگر آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اگر اسرائیل کا بادشاہ ہے تو اب صلیب پر سے اُتر آوے تو ہم اِس پر ایمان لاویں گے"۔ (متی باب ۲۷ آیت ۴۱-۴۲) حتیٰ کہ وہ چور بھی جو حضرت مسیح کے ساتھ صلیب دئے گئے تھے اُن کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی اُسے طعنے مارتے تھے (متی باب ۲۷ آیت ۴۴)

پس حضرت مسیح پر یہ حوالہ چسپاں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُس کی قدرت نہ کبھی ظاہر ہوئی نہ لوگوں نے اُس کی قدرت کا کبھی اقرار کیا۔ اُس کے دشمن بھی اُس کی قدرتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور اُسکے دوست بھی اُسکی قدرتوں کے منکر تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسیح کے حواری اُس کو چھوڑ کر بھاگ کیوں جاتے جیسا کہ لکھا ہے "تب سب شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے" (متی باب ۲۶ آیت ۵۶) کیا کبھی کوئی شخص قادر کو بھی چھوڑا کرتا ہے؟ چوتھا نام ابدیت کا باپ ہے۔ یہ نام بھی حضرت مسیح پر چسپاں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے وہ خود اپنے بعد ایک مامور کے آنے کی خبر دیتے ہیں۔ پانچواں نام سلامتی کا شہزادہ ہے۔ یہ نام بھی حضرت مسیح پر چسپاں نہیں ہو سکتا کیونکہ اُنہیں کبھی بادشاہت نصیب ہی نہیں ہوئی کہ اُن کے ذریعہ سے دنیا کو سلامتی ملی ہو وہ تو خود یہود سے دکھ پاتے رہے، آخر پکڑے گئے اور صلیب پر لٹکائے گئے۔ پس اُنہیں سلامتی کا شہزادہ کسی صورت میں بھی نہیں کہا جا سکتا۔

پھر لکھا ہے "اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہوگی"۔ یہ بات بھی حضرت مسیح میں نہیں پائی جاتی نہ انکو سلطنت ملی نہ اُسکا اقبال اور سلامتی انہوں نے دیکھی۔ اِسی طرح لکھا ہے "وہ داؤد کے تخت پر اور اس کی مملکت میں آج سے لیکر ابد تک بندوبست کریگا اور عدالت اور صداقت سے اُسے قیام بخشیگا"۔ یہ بات بھی حضرت مسیح کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ سب کی سب علامتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی پائی جاتی ہیں۔ آپ کے کندھے پر سلطنت رکھی گئی اور گو آپ نہیں چاہتے تھے کہ آپ بادشاہ ہوں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کردئے کہ آپ بادشاہ بننے پر مجبور ہو گئے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ حضرت مسیح تو باوجود اس کے کہ اُن کے پاس نہ کوئی حکومت تھی نہ طاقت پھر بھی بادشاہ کہلانے کے شوقین تھے جیسا کہ متی باب ۲۱ میں لکھا ہے:۔

"مسیح گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہُوا تا کہ جو نبی نے کہا تھا پورا ہو کہ صیہون کی بیٹی سے کہو کہ دیکھ تیرا بادشاہ فروتنی سے گدھی پر بلکہ گدھی کے بچہ پر سوار ہو کر تجھ پاس آتا ہے" (آیت ۴-۵)

اِسی طرح متی باب ۲۷ آیت ۱۱ میں لکھا ہے "یسوع حاکم کے روبرو کھڑا تھا اور حاکم نے اُس سے پوچھا کیا تُو یہودیوں کا بادشاہ ہے؟ یسوع نے اُس سے کہا ہاں تو ٹھیک کہتا ہے"۔

لوقا باب ۲۳ میں لکھا ہے "اور ساری جماعت اُٹھ کے اُسے پیلاطوس کے پاس لے گئی اور اس پر نالش کرنی شروع کی کہ اسے ہم نے قوم کو بہکاتے اور قیصر کو محصول دینے سے منع کرتے اور اپنے تئیں مسیح بادشاہ کہتے پایا۔ تب پیلاطوس نے اُس سے پوچھا، کیا تُو یہودیوں کا بادشاہ ہے؟ اس نے اُس کے جواب میں کہا وہی ہے جو تو کہتا ہے" (آیت ۱ تا ۶)

یوحنا باب ۱۸ آیت ۳۷ میں لکھا ہے "تب پیلاطوس نے اُسے کہا سو کیا تُو بادشاہ ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جیسا آپ فرماتے ہیں میں بادشاہ ہوں"۔

لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم باوجود حکومت اور طاقت حاصل ہونے کے بادشاہ کہلانے سے سخت نفرت رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ قیصر و کسریٰ والا رنگ ہم میں نہیں ہونا چاہیئے۔ اُن کو جب خدا تعالیٰ اقتدار بخشتا ہے تو وہ بنی نوع انسان کو غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں خدا تعالےٰ نے خدمتِ خلق کے لیے پیدا کیا ہے۔

پھر لکھا تھا کہ اُس کا نام "عجیب" ہوگا۔ حضرت مسیح خود تسلیم کرتے ہیں کہ یہ عجیب نام پانے والا وہ موعود ہے جو اُن کے بعد آئے گا چنانچہ انگورستان کی مثال میں حضرت مسیح کہتے ہیں "ایک مالک نے انگورستان لگایا اور باغبانوں کے حوالے کر دیا۔ پھر مالک نے نوکروں کو اُس کا پھل لانے کے لیے باغبانوں کے پاس بھیجا۔ مگر باغبانوں نے باری باری تمام نوکروں کو مارا پیٹا یا پتھراؤ کیا۔ اِس کے بعد اور بڑے بڑے نوکر بھیجے گئے مگر اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک ہُوا۔ پھر اُس نے اپنے بیٹے کو بھیجا مگر بیٹے کو بھی انہوں نے مار ڈالا"۔ اِس کے بعد مسیح نے لوگوں سے سوال کیا کہ وہ باغبان جنہوں نے یہ معاملہ کیا بتاؤ ان کے ساتھ کیا سلوک کریگا؟ لوگوں نے کہا "اِن بدوں کو بُری طرح مار ڈالے گا اور انگورستان کو اَور باغبانوں کو سونپے گا جو اُسے موسم میں میوہ پہنچاویں۔ یسوع نے اُنہیں کہا کیا تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راجگیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا

سرا ہُوا یہ خدا کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب۔ اِس لیے مَیں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائیگی اور ایک قوم کو جو اُس کو میوہ لاوے دی جائے گی۔ جو اس پتھر پر گرے گا چُور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا۔" (متی باب ۲۱ آیت ۳۳ تا ۴۴)

اِس تمثیل کے بیان کرتے وقت حضرت مسیح نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ بیٹے کو صلیب دینے کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک اور مامور ظاہر ہوگا جو کونے کا پتھر کہلائیگا۔ اور وہ مسیح اور تمام باقی لوگوں کی نظروں میں عجیب ہوگا پس جب مسیح خود کہتا ہے کہ عجیب وہ شخص کہلائے گا جو بیٹے کو صلیب دیئے جانے کے بعد آئے گا۔ تو یقیناً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی عجیب ہیں جو مسیح کے صلیب پانے کے بعد ظاہر ہوئے۔

دُوسرا نام آنیوالے کا مشیر رکھا گیا ہے۔ یہ نام بھی صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی چسپاں ہوتا ہے کیونکہ آپ ہی تھے جن سے ساری قوم مشورہ لیا کرتی تھی اور جنہوں نے اپنی قوم میں مشورے کا رواج ڈالا اور حکومت کے لیے یہ لازمی قرار دیا کہ وہ باشندگانِ ملک کے مشورہ سے ہر ایک کام کیا کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشوروں کا ذکر قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَاَطْھَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (مجادلہ ع ۲) اے مومنو! جب کبھی تم رسول سے مشورہ لیا کرو تو مشورہ لینے سے پہلے غرباء اور مساکین میں تقسیم کرنیکے لیے کچھ صدقہ پیش کیا کرو۔ یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر اور پسندیدہ ہوگا لیکن اگر تمہارے پاس کچھ نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اِس صورت میں تم بغیر صدقہ پیش کرنے کے بھی مشورہ لے سکتے ہو۔ اِس آیت سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگ کثرت سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل وقت تو تمام بنی نوع انسان کا ہے بعض لوگ اپنی خاص ضرورتوں کے لیے آپکے وقت کو نسبتاً زیادہ استعمال نہ کرنے لگ جائیں یہ قانون مقرر کر دیا گیا کہ جو شخص آپ سے مشورہ لے وہ غریبوں اور مسکینوں کے لیے کچھ صدقہ کی رقم بھی بیت المال میں ادا کیا کرے۔ تاکہ آپ کا وقت جو افراد کے کاموں میں لگے اُس کا کچھ نہ کچھ ازالہ اس صدقہ کے ذریعہ سے ہو جائے جس شخص سے لوگ اِس کثرت سے مشورہ لیا کرتے تھے کہ اُس کے مشورہ کو ایک مستقل ادارہ قرار دیدیا گیا۔ وہی شخص مشیر کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ پھر اس لیے بھی آپ مشیر کہلانے کے مستحق ہیں کہ آپنے حکومت کی بنیاد قومی مشوروں پر رکھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں جو آپ پر نازل ہونیوالی وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمْرُھُمْ شُوْرٰى بَیْنَھُمْ (شوریٰ ع ۵) مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ کوئی حکومتی کام نہ کریں جب تک کہ وہ ملک کے نمائندوں سے مشورہ نہ لے لیا کریں۔ اسکی تشریح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا خِلَافَةَ اِلَّا بِالْمَشْوَرَةِ (ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء) اسلامی حکومت مشورہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جو حکومت بھی باشندگانِ ملک کے مشورہ کے بغیر چلائی جائیگی وہ اسلامی نہیں کہلائیگی۔ مگر اس کے مقابلہ میں نہ مسیح نے کوئی مشورہ دنیا کو دیا نہ مشورہ کی اہمیت پر زور دیا پس یقیناً محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ شخص تھے جو مشیر کہلاتے تھے اور مشیر کہلاتے ہیں۔

تیسرا نام اُس کا "خدائے قادر" رکھا ہے۔ تورات کی رُو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ سے مشابہت حاصل تھی چنانچہ خروج باب ۷ آیت ۱ میں لکھا ہے "پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لیے خدا سا بنایا"۔ اسی طرح خروج باب ۴ آیت ۱۶ میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرماتا ہے "تو اُس (یعنی ہارون) کے لیے خدا کی جگہ ہوگا"۔ جس طرح مسیح بائبل کے محاورہ کے مطابق ابن اللہ کہلانے کے مستحق ہیں اسی طرح بائبل کے لحاظ سے حضرت موسیٰ مظہرِ خدا تھے۔ پس جب کبھی خدا کے لفظ سے کسی انسان کی طرف اشارہ کیا جائے گا تو اس سے مراد یا موسیٰ علیہ السلام ہونگے یا کوئی مثیلِ موسیٰ ہوگا اور یہ میں اُوپر بتا آیا ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد ایک ایسے نبی کے آنے کی خبر دی تھی جو اُن جیسا ہوگا (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸) اور یہ بھی میں بتا چکا ہوں کہ اس پیشگوئی کی تمام علامتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی خدا یا صحیح لفظوں میں یوں کہو کہ خدا کے مظہر کہلانے کے مستحق تھے۔ چنانچہ آپ کے متعلق قرآن کریم میں بھی آتا ہے وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال ع ۲) جب بدر کے موقعہ پر تو نے کنکر اُٹھا کر دشمن کی طرف پھینکے تھے تو اِن کنکروں کو پھینکنے والا تیرا ہاتھ نہیں تھا بلکہ خدا کا ہاتھ تھا۔ اسی طرح آپ کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (فتح ع ۱) جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ اللہ کی بیعت کرتے ہیں یعنی تو اللہ تعالیٰ کا مظہر ہے پس اِس پیشگوئی کے مطابق اگر کوئی شخص ہو سکتا ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہو سکتی ہے۔ پھر لفظ قادر بھی آپ ہی کی ذات پر دلالت کرتا ہے کیونکہ آپ ہی تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنے سارے دشمنوں کو زیر کر لیا اور تمام مخالفتوں اور عداوتوں کا سر کچل دیا۔

چوتھا نام "ابدیت کا باپ" بتایا گیا ہے۔ یہ علامت بھی آپ پر ہی چسپاں ہوتی ہے کیونکہ آپ ہی ہیں جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ آپکی تعلیم قیامت تک کے لیے ہے۔ اور یہ کہ جس آنے والے مسیح کی خبر دی گئی ہے وہ بھی آپ کی اُمت کا ایک فرد ہوگا کوئی نیا شخص نہیں ہوگا جس کی آمد کی وجہ سے آپکی بادشاہت میں کوئی فرق یا اختلال واقعہ ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَأْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ○ (سبا ع ۳ آیت ۲۹) یعنی ہم نے تجھے صرف اِس لیے بھیجا ہے تا کہ تمام بنی نوع انسان کو تو اس طرح جمع کرے کہ اُن میں سے کوئی طبقہ اور کوئی زمانہ تیری تبلیغ سے باہر نہ رہے اور تو تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر کے طور پر کام دے لیکن اکثر انسان تیری اس حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ پھر فرماتا ہے دشمن اعتراض کرتے ہیں کہ یہ وعدہ کہ تو سب دُنیا کی طرف اور ہمیشہ کے لیے ہے کس طرح پورا ہوگا۔ اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل دو۔ اِس کا جواب دیتا ہے کہ تو اُن سے کہہ دے کہ تمہارے لیے ہم ایک مدت مقرر کر چکے ہیں تم نہ اس مدت سے ایک ساعت پیچھے رہ سکتے ہو اور نہ آگے بڑھو گے۔ یعنی وہ وعدہ عین وقت پر پورا ہو جائے گا۔ یہ مدت وہی ہے جس کا ذکر سورۂ سجدہ میں کیا گیا ہے۔ سورۂ سجدہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ

فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (سجدہ ع۱) اللہ تعالیٰ اسلام کو دنیا میں قائم کریگا۔ پھر اسلام کا زور رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوگا۔ اور ایک دن میں جس کی لمبائی ایک ہزار سال کے برابر ہوگی وہ خدا تعالیٰ کی طرف چڑھنا شروع ہوگا اور اس میں کمزوری اور اضمحلال کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔ اسلام کی ترقی کا زمانہ قرآن کریم سے بھی اور احادیث سے بھی تین سو سال کا معلوم ہوتا ہے اس میں ہزار سال شامل کیا جائے تو یہ زمانہ تیرہ سو سال کا ہو جاتا ہے پس سورۃ سجدہ کی آیت کو ملا کر اِس آیت کے یہ معنے بنتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ کے لیے بشیر و نذیر ہونا اور تمام دنیا کی طرف ہونا تیرہ سو سال کے بعد کلی طور پر ثابت ہوگا۔ اِن آیات میں اِس بات کی خبر دی گئی ہے کہ تیرہ سو سال پر خدا تعالےٰ کی طرف سے مسیح موعود کا نزول ہوگا۔ اور مسیح موعودؑ آپ کی اُمت میں سے ہوگا۔ اور چونکہ تمام انبیاء کا وہی آخری موعود ہے۔ جب وہ آپ کی اُمت میں سے ہوگا تو اِس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ قیامت تک آپ کی شریعت قائم رہنے والی ہے۔ اور آپ کی شریعت کو منسوخ کرنے والا کوئی اور شخص نہیں آئے گا۔ اور چونکہ اُس کے زمانہ میں تبلیغ اسلام پر خاص طور پر زور دیا جائے گا اور اِسلام دنیا میں پھیل جائے گا۔ اِس لیے یہ امر اور بھی مستحکم ہو جائے گا کہ اسلام کو مٹانے والی کوئی طاقت دنیا میں نہیں۔ اور ہر قوم اور ہر علاقہ کے لوگ اُس کے مخاطب ہیں جو آہستہ آہستہ اُس میں شامل ہو جائیں گے۔ پس ابدیت کا باپ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی نہیں۔

پانچواں نام آپ کا "سلامتی کا شہزادہ" رکھا گیا ہے۔ چونکہ شہزادہ بمعنی بادشاہ بھی آتا ہے اِس لیے ہم اس کے یہ معنے کر سکتے ہیں کہ وہ سلامتی کا بادشاہ ہوگا۔ یہ پیشگوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی چسپاں ہوتی ہے۔ آپ جس مذہب کے بانی تھے اس کا نام خدا تعالےٰ نے اسلام رکھا تھا یعنی سلامتی۔ پس سلامتی کے شہزادے کے معنے ہوں گے اسلام کا بادشاہ۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ اسلام کے بادشاہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ اسلام آپ ہی کی لائی ہوئی تعلیم کا نام ہے۔ اسلام کے تمام مسائل آپ ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور آپ ہی کے فیصلہ کے مطابق تمام اسلامی عالم میں عمل کیا جاتا ہے۔ پس آپ تو سلامتی کے شہزادے ہیں لیکن مسیح سلامتی کا شہزادہ کیونکر کہلا سکتا ہے؟ پھر کسی شخص کو اگر کسی چیز کا شہزادہ کہا جائے۔ تو اس کے ایک یہ بھی معنے ہوتے ہیں کہ وہ چیز اُس میں کثرت سے پائی جاتی ہے اُس کو نہ حکومت ملی نہ اُس نے عفو اور رأفت سے کام لیا۔ محض مُنہ سے کہہ دینا کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو۔ اس میں تو کوئی خاص فضیلت نہیں۔ عمل اصل چیز ہے اور یہ عمل صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات سے ظاہر ہوا۔ کیسے کیسے مظالم تھے جو مکہ والوں نے آپ پر اور آپ کی جماعت پر کئے۔ کتنے خون تھے جو آپ کے رشتہ داروں اور آپ کے اتباع کے اِن لوگوں نے بہائے۔ شاید رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا جسم سر سے لیکر پَیر تک گواہ تھا اُن مظالم کا جو آپ کے دشمنوں نے آپ کے خلاف روا رکھے۔ کیونکہ کبھی آپ پر سنگباری کی گئی۔ کبھی آپ پر تیر اندازی کی گئی۔ کبھی آپ کے جسم کو اور ذرائع سے تکلیف پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ وطن سے آپ کو بے وطن ہونا پڑا اور آپ کے صحابہؓ کو بھی۔ پھر

ماؤں نے بچوں کو چھوڑ دیا۔ خاوندوں نے بیویوں کو چھوڑ دیا۔ بھائیوں نے بھائیوں کو چھوڑ دیا۔ اور مسلمان ایک منفور اور منتر دک جماعت ہو کر رہ گئے۔ غریب اور کمزور مردوں کو دو اونٹوں سے باندھ کر اور متضاد جہتوں کی طرف چلا کر چیر دیا گیا۔ عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار کر اُنہیں مار گیا۔ غلاموں کو ننگا کر کے سخت پتھروں پر سے گھسیٹا گیا۔ جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر اُن کے سینوں پر ظالم کُودے اور اصرار کیا کہ تم کہو خدا ایک نہیں بلکہ خدا کے شریک بُت بھی ہیں۔ جنگ میں مسلمان شہداء کی لاشیں چیر کر اُن کے جگر اور دِل نکال کر باہر پھینک دیئے گئے۔ اُن کے ناک اور کان کاٹ دیئے گئے۔ غرض زندوں اور مُردوں۔ مردوں اور عورتوں۔ جوانوں اور بوڑھوں ہر ایک کو دُکھ دیا گیا۔ ہر ایک کی تذلیل کی گئی۔ ہر ایک کے ساتھ خلاف انسانیت مظالم کا ارتکاب کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہُوا مگر جب خدا تعالیٰ کی نصرت نے آخر مسلمانوں کو فتح دی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک فاتح کی حیثیت سے مکّہ میں داخل ہُوئے، تو آپ نے اپنے دشمنوں کے سامنے صرف یہ اعلان کیا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ آج جب ہمیں خدا نے قوت اور طاقت دی ہے، ہم اعلان کرتے ہیں کہ مکّہ کے تمام لوگوں کو معاف کیا جاتا ہے اور اُن کے مظالم کی اُنہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ یہی نہیں کہ اُن کو سزا نہیں دی گئی بلکہ اُن کے جذبات کا اتنا احترام کیا گیا کہ جب اسلامی لشکر مکّہ میں داخل ہونے کے لیے بڑھ رہا تھا ایک اسلامی جرنیل نے یہ کہہ دیا آج ہم زور سے مکّہ میں داخل ہوں گے اور اُن مظالم کا بدلہ لیں گے جو مکّہ والوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہؓ پر کیے تھے۔ اِس پر آپ نے اُس جرنیل کو معزول کر دیا اور فرمایا اِن باتوں سے مکّہ والوں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ کیا مسیح کی زندگی میں کوئی بھی ایسا واقعہ ہے۔ کیا مسیح کے حواریوں کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ہے؟ کیا ساری مسیحی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ ہے؟ عیسائی بھی شروع میں مظلوم تھے۔ عیسائی بھی شروع میں مغلوب تھے۔ مگر جب اُنہیں حکومت ملی کیا اُنہوں نے اپنے دشمنوں اور اپنے مخالفوں کے ساتھ نرمی اور رحم کا برتاؤ کیا؟ روما کی تاریخ نکال کر دیکھو اُس کے اوراق اُن مظالم کی یاد سے سُرخ ہو رہے ہیں جو عیسائیوں نے فتح اور غلبہ کے وقت اپنے دشمنوں کے اُوپر ڈھائے۔ پھر مسیح سلامتی کا شہزادہ کس طرح ہُوا؟ اُسے تو کسی کو سلامتی دینے کی توفیق ہی نہیں ملی۔ جب اُسکے اتباع کو توفیق ملی تو اُنہوں نے سلامتی نہیں دی۔ اُنہوں نے ہلاکت دی۔ اُنہوں نے تباہی دی۔ اُنہوں نے بربادی دی۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنی زندگی میں خدا تعالےٰ نے فتح اور غلبہ بخشا اور آپ نے اُن وسیع مظالم کے باوجود جن کے مقابلہ میں وہ مظالم جو یہود نے مسیح پر کیے تھے بالکل زرد اور بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ رحم و عفو اور چشم پوشی سے کام لیا۔ پس آپ ہی سلامتی کے شہزادے تھے اور آپ ہی یسعیاہ کی پیشگوئی کے مصداق تھے۔

ساتویں علامت اُس موعود کی یہ لکھی ہے کہ "اُس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہاء نہ ہوگی"۔ میں بتا چکا ہوں کہ مسیح کو تو حکومت ملی ہی نہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جن کو حکومت ملی اور جن کے صحابہؓ کی زندگیوں میں ہی ساری دنیا پر اسلام قابض ہو گیا اور اس انصاف کے ساتھ اُنہوں نے حکومت کی کہ نہیں کہہ سکتے اُن کا اقبال بڑا تھا یا اُن کی سلامتی بڑی تھی۔

آٹھویں علامت یہ لکھی ہے کہ " وہ داؤدؑ کے تخت پر اور اُس کی مملکت پر آج سے لیکر ابد تک بندوبست کریگا

اور عدالت اور صداقت سے اُسے قیام بخشیگا"۔ مسیح داؤد کے تخت پر کب بیٹھے تھے؟ شاید کہا جائے کہ اُن کی بعثت کے تین سو سال کے بعد جب رومن حکومت عیسائیت میں داخل ہوگئی تو مسیح کو داؤد کے تخت پر حکومت مل گئی۔ لیکن یہ معنے درست نہیں ہو سکتے کیونکہ وہاں تو لکھا ہے کہ اُسے وہ حکومت ابد تک ملے گی لیکن مسیح کی حکومت تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ختم ہوگئی اور مسلمانوں کا قبضہ اُس ملک پر ہو گیا چنانچہ تیرہ سو سال سے مسلمان اس ملک پر قابض ہیں۔ کیا تین سو سال کی حکومت ابد کہلائیگی یا تیرہ سو سال والی حکومت ابد کہلائیگی؟ یہ صاف بات ہے کہ تیرہ سو سال والی حکومت ہی ابد کہلائے گی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اِس وقت انگریزی حکومت جو عیسائی حکومت ہے اس ملک پر قابض ہے لیکن خدا کی قدرت ہے کہ انگریزوں کو اس ملک پر بادشاہ ہونے کے لحاظ سے حکومت حاصل نہیں بلکہ منڈیٹری پاور (MANDATORY POWER) ہونے کے لحاظ سے تصرّف حاصل ہے اور عارضی طور پر تھوڑی مدّت کے لیے کسی کا درمیان میں آجانا یہ پیشگوئی کے خلاف ہونا بھی نہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بادشاہت کیسی عدالت اور انصاف والی تھی۔ اس کا ثبوت اِس بات سے ملتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عارضی طور پر اسلامی لشکر رومی لشکر کی کثرت اور اس کے دباؤ کی وجہ سے پیچھے ہٹا اور مسلمانوں نے بیت المقدس اور اُس کے اردگرد کے علاقوں والوں کو بُلا کر اُن کے ٹیکس یہ کہتے ہوئے واپس کیے کہ ٹیکس امن اور حفاظت کی غرض سے ہوتے ہیں۔ چونکہ ہم لوگ اس ملک کو اب چھوڑ رہے ہیں اور ہم آپ کو نہ امن دے سکتے ہیں نہ آپ کی حفاظت کر سکتے ہیں اِس لیے آپ کا روپیہ آپ کو واپس کیا جاتا ہے ہمارا اس روپیہ پر کوئی حق نہیں۔ تو تاریخیں بتاتی ہیں کہ اس بات کو سُنکر یروشلم کے باشندے ایسے متاثر ہوئے کہ باوجود اس کے کہ اُنکے ہم مذہبوں کی فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں اور اُن کے مذہب کے مخالف لوگ اُن کے ملک کو خالی کر رہے تھے۔ یروشلم کے باشندے روتے ہوئے شہر سے باہر اسلامی لشکر کو چھوڑنے کے لیے آئے اور ساتھ دعائیں کرتے جاتے تھے کہ خدا تعالیٰ آپ لوگوں کو جلد واپس لائے کہ ہم نے آپ جیسا انصاف اِس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوگا اِس بات کا کہ "وہ داؤد کے تخت پر اور اُسکی مملکت پر آج سے لیکر ابد تک بندوبست کریگا اور عدالت اور صداقت سے اُسے قیام بخشے گا"۔

(ھ) اسی طرح لکھا ہے "اور خداوند اپنے تئیں مصریوں پر ظاہر کرے گا اور اُس دن مصری خداوند کو پہچانیں گے اور ذبیحے اور ہدیے گذرانیں گے۔ ہاں وے خداوند کے لیے منتیں مانیں گے اور ادا کریں گے خداوند تو مصریوں کو بہت دن تک مارا کریگا لیکن وہ اُنہیں چنگا بھی کرے گا اور وے خداوند کی طرف رجوع ہونگے اور وہ اُن کی دعا سنے گا۔ اور اُنہیں صحت بخشیگا۔ اُس روز سے مصر سے اسور تک ایک شاہ راہ ہوگی اور اسوری مصر میں آویں گے اور مصری اسور کو جائیں گے اور مصری اسوریوں کے ساتھ مل کے عبادت کریں گے اُس روز اسرائیل مصر اور اسور کا ثالث ہوگا۔ اور زمین کے درمیان برکت کا باعث ٹھہرے گا کہ ربّ الافواج اُسے برکت بخشے گا اور فرماوے گا۔ مبارک ہو مصر میری اُمت۔ اسور میرے ہاتھ کی صفت اور اسرائیل میری میراث" (یسعیاہ باب ۱۹ آیت ۲۱ تا ۲۵)

اِس پیشگوئی میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے آپ کو مصریوں پر ظاہر کرے گا۔ اور مصری خدا تعالےٰ کو

پہچانیں گے اور وہ ذبیحے اور ہدیے گذاریں گے اور مصر اور شام کو آپس میں ملا دیا جائے گا۔ شامی مصر میں آئیں گے اور مصری شام میں جائیں گے اور مصری شامیوں کے ساتھ مل کر عبادت کریں گے۔ یہ پیشگوئی بھی بانی اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے پوری ہوئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کچھ عرصہ کے لیے مصری عیسائی ہو گئے تھے لیکن وہ نہایت ہی قلیل عرصہ تھا۔ اس کے بعد تیرہ سو سال سے مصر مسلمان چلا آتا ہے۔ یسعیاہ کی زبان سے خدا کہتا ہے "مبارک ہو مصر میری اُمّت"۔ مصریوں سے پوچھو کہ وہ کس کی اُمّت ہیں۔ آیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یا مسیح کی۔ پھر لکھا ہے "مبارک ہو اسور میرے ہاتھ کی صفت"۔ اسوریوں سے بھی پوچھو کہ وہ کس کی اُمّت ہیں۔ آیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت ہیں یا مسیح کی اُمّت۔ پھر لکھا ہے "مبارک ہو اسرائیل میری میراث"۔ اِن علاقوں میں جا کر دیکھ لو اسرائیل کا علاقہ فلسطین کس کی میراث ہے۔ اس وقت زور دیکر وہاں یہود کو داخل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر یہودی تو مسیح کی اُمّت نہیں۔ اِس پیشگوئی کو تو مسیح پر چسپاں کیا جا رہا ہے اور مسیحی اب بھی وہاں قلیل ہیں اور مسلمان اب بھی زیادہ ہیں۔ اگر یہودی اِس ملک پر قابض بھی ہو گئے تو یہ کہا جائیگا کہ عارضی طور پر مسلمانوں کے غلبہ میں اختلال واقع ہو گیا، مسیح کو تو پھر بھی کچھ فائدہ نہیں ہونے کا۔ خواہ مسلمان فلسطین پر حاکم رہیں خواہ یہودی۔ مسیح کا دامن تو خالی ہی رہتا ہے اور وہ اِس پیشگوئی کا مستحق کسی صورت میں بھی نہیں ہوتا۔ پھر اس پیشگوئی میں لکھا تھا کہ اسور اور مصر تک ایک شاہراہ ہو گی یعنی یہ ملک آپس میں مل جائیں گے۔ اسوری مصر میں آئیں گے اور مصری اسور کو جائیں گے اور مصری اسوریوں کے ساتھ مل کر عبادت کرینگے۔ کیا یہ مسیح کے ذریعہ سے ہُوا؟ عیسائی بے شک مصر پر قابض ہوئے اور اسور پر بھی قابض ہوئے اور ان ملکوں کی کثرت ایک وقت میں عیسائی بھی ہو گئی۔ لیکن کیا کبھی بھی وہ زمانہ آیا ہے جب مذکورہ بالا آیتوں کا مضمون مصر اور اسور کی حالت پر صادق آیا ہو؟ اِن آیتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِن دونوں ملکوں کی قومیت ایک ہو جائے گی اور اُن کی زبان ایک ہو جائے گی۔ مل کر عبادت کرنے کے بھی یہی معنے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ملک میں آنے جانے کا بھی یہی مطلب ہے۔ ورنہ ہر ملک کے لوگ دوسرے ملک میں آیا جایا ہی کرتے ہیں پیشگوئی کا مفہوم یہی ہے کہ وہ اتنے متحد ہو جائیں گے کہ اُن کی ایک قوم ہو جائیگی۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ عیسائی حکومت کے زمانہ میں کبھی بھی مصر اور اسور ایک نہیں ہوئے۔ روم کے ماتحت بے شک یہ دونوں ملک تھے لیکن ہمیشہ مصر کا انتظام اور رنگ کا رہا اور اسور کا انتظام اور رنگ کا رہا۔ مصر میں ایک نیم آزاد بادشاہ حکومت کرتا تھا اور اسور میں ایک گورنر رہتا تھا۔ بلکہ مصر کا کلیسیا اسور کے کلیسیا سے بالکل مختلف تھا۔ مصر میں عیسائیت نے اسکندریہ کے گرجا کے ماتحت ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی اور وہ فلسطین اور شامی گرجا کی شکل سے بالکل مختلف تھی۔ پھر مصریوں کی عبادت قبطی زبان میں ہوتی تھی اور شامیوں کی عبادت بگڑی ہوئی مخلوط عبرانی اور یونانی زبان میں۔ ہاں اسلامی زمانہ میں یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ صدیوں تک شام اور مصر ایک حکومت رہے دونوں ملکوں کی زبان ایک ہو گئی اور اب تک ایک ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں کی عبادت اکٹھی ہوتی تھی اور اکٹھی ہوتی ہے۔ دونوں ملکوں میں ایک قوم ہونے کا احساس پیدا ہو گیا۔ شامی علماء مصر میں جاتے تھے۔

اور وہ مصری علماء کی طرح ہی معزز گنے جاتے تھے اور مصری علماء شام میں آتے تھے اور وہ شامی علماء کی طرح ہی معزز گنے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں بھی کہ یورپین سیاست نے اسلامی ممالک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے عرب لیگ میں مصر، شام اور فلسطین دوش بدوش مل کر کام کر رہے ہیں۔ پس یہ پیشگوئی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے پوری ہوئی اور یہ پیشگوئی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی قوم کے متعلق ہی تھی مسیح اور کلیسیا کی طرف اس کو منسوب کرنا صریح ظلم ہے۔

(۹) پھر یسعیاہ میں لکھا ہے "تُو ایک نئے نام سے کہلایا جائیگا جو خداوند کا مُنہ تجھے رکھ دیگا" (باب ۶۲ آیت ۲) اسی طرح یسعیاہ باب ۶۵ میں لکھا ہے "اور تم اپنا نام اپنے پیچھے چھوڑو گے جو میرے برگزیدوں پر لعنت کا باعث ہوگا کیونکہ خداوند یہوواہ تم کو قتل کریگا اور اپنے بندوں کو دوسرے نام سے بلائیگا" (آیت ۱۵) اس پیشگوئی میں بتایا گیا ہے کہ آئندہ ایک نیا سلسلہ ایک نئے نام سے جاری کیا جائیگا اور اُس نئے نام کو یہ خصوصیت حاصل ہوگی کہ وہ نیا نام اس سلسلہ کے لوگ خود نہیں رکھیں گے بلکہ خدا تعالیٰ اپنے منہ سے اُن کا وہ نام تجویز کرے گا۔ اس پیشگوئی کو بھی بائبل نویسوں نے کلیسیا پر لگایا ہے حالانکہ مسیحوں کو کوئی نام خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ملا۔ ہاں اپنے طور پر مختلف مسیحی فرقوں نے اپنے اپنے نام رکھ لیے ہیں۔ ساری دنیا میں صرف ایک ہی قوم ہے جس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے نام ملا ہے اور وہ مسلمان ہیں چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا (حج ع۱۰) خدا تعالیٰ نے ہی تم لوگوں کا نام مسلمان رکھا ہے پہلے انبیاء کی پیشگوئیوں میں بھی اور اب اس قرآن کریم کے ذریعہ سے بھی۔ دیکھو کس طرح یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کی طرف صاف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم نے پہلے سے ہی بتا دیا تھا کہ ہم تمہارا نام خود رکھیں گے۔ چنانچہ اب ہم نے خود سلامتی کے شہزادہ کی پیشگوئی کے مطابق تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ یہ پیشگوئی نہایت ہی عجیب و لطیف ہے۔ تمام دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ کسی نبی نے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ اُس کی جماعت کا نام الہامی طور پر خدا تعالےٰ نے رکھا ہے۔ لیکن یسعیاہ کہتا ہے کہ پہلے دستوروں کے خلاف ایک نبی آئیگا کہ اللہ تعالیٰ اس کی جماعت کا نام خاص الہام سے رکھیگا چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پیشگوئی کے مصداق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اعلان فرماتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے میری اُمّت کا نام مسلم اور میرے مذہب کا نام اسلام رکھا ہے۔

چھٹی پیشگوئی

دانیال نبی کی کتاب کے دوسرے باب میں ایک خواب لکھی ہے جو بنوکدنضر بادشاہ نے دیکھی تھی۔ لیکن وہ اُسے دیکھنے کے بعد بھول گیا۔ تب اُس نے اپنے وقت کے حکیموں سے خواب اور اُس کی تعبیر دریافت کی۔ باقی لوگ تو نہ بتا سکے۔ دانیال نے خدا تعالےٰ سے دعا کر کے وہ خواب معلوم کرلی اور بادشاہ کے سامنے بیان کی وہ خواب یہ تھی۔

"تُو نے اے بادشاہ نظر کی تھی اور دیکھ ایک بڑی مُورت تھی۔ وہ بڑی مُورت جس کی رونق بے نہایت تھی تیرے سامنے کھڑی ہوئی اور اُس کی صورت ہیبت ناک تھی۔ اِس مُورت کا سر خالص سونے کا تھا۔ اس کا سینہ اور اُس کے

بازو چاندی کے۔ اُس کا شکم اور رانیں تانبے کی تھیں۔ اُس کی ٹانگیں لوہے کی۔ اور اُس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے تھے اور تُو اُسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایک پتھر بغیر اس کے کوئی ہاتھ سے کاٹ کے نکالے آپ سے نکلا جو اس شکل کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے لگا۔ اور اُنہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ تب لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور تابستانی کھلیان کی بھوسی کی مانند ہوئے اور ہوا اُنہیں اُڑا لے گئی یہاں تک کہ اُن کا پتہ نہ ملا اور وہ پتھر جس نے اُس مُورت کو مارا ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور تمام زمین کو بھر دیا۔" (دانی ایل باب ۲ آیت ۳۱ تا ۳۵) اس کی تعبیر دانیال نبی نے جو کی وہ یہ ہے:۔

"تو اے بادشاہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اس لیے کہ آسمان کے خدا نے تجھے ایک بادشاہت اور توانائی اور قوت اور شوکت بخشی ہے اور جہاں کہیں بنی آدم سکونت کرتے ہیں اُس نے میدان کے چوپائے اور ہوا کے پرندے تیرے قابو میں کر دیئے اور تجھے اُن سبھوں کا حاکم کیا۔ تُو ہی وہ سونے کا سر ہے۔ اور تیرے بعد ایک اَور سلطنت برپا ہوگی جو تجھ سے چھوٹی ہوگی۔ اور اُس کے بعد ایک اور سلطنت تانبے کی جو تمام زمین پر حکومت کریگی اور چوتھی سلطنت لوہے کی مانند مضبوط ہوگی۔ اور جس طرح کہ لوہا توڑ ڈالتا ہے اور سب چیزوں پر غالب ہوتا ہے ہاں لوہے کی طرح سے جو سب چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے۔ اُس ہی طرح وہ ٹکڑے ٹکڑے کریگی اور کچل ڈالے گی۔ اور جو کہ تُو نے دیکھا کہ اُس کے پاؤں اور اُنگلیاں کچھ تو کمہار کی ماٹی کی اور کچھ لوہے کی تھیں تو اس سلطنت میں تفرقہ ہوگا۔ مگر جیسا کہ تُو نے دیکھا کہ اس میں لوہا گلاوے سے ملا ہُوا تھا۔ سو لوہے کی توانائی اُس میں ہوگی۔ اور جیسا کہ پاؤں کی انگلیاں کچھ لوہے کی اور کچھ ماٹی کی تھیں۔ سو وہ سلطنت کچھ قوی کچھ ضعیف ہوگی۔ اور جیسا کہ تُو نے دیکھا کہ لوہا گلاوے سے ملا ہُوا ہے۔ وے اپنے کو انسان کی نسل سے ملاویں گے لیکن جیسا لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا تیسا وے باہم میل نہ کھاویں گے۔ اور اُن بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کرے گا جو تا ابد نیست نہ ہوگی اور وہ سلطنت دوسری قوم کے قبضہ میں نہ پڑے گی وہ اِن سب مملکتوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور نیست کریگی اور وہی تا ابد قائم رہے گی۔ جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اُس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا اور اُس نے لوہے اور تانبے اور مٹی اور چاندی اور سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ خدا تعالیٰ نے بادشاہ کو وہ کچھ دکھایا جو آگے کو ہونے والا ہے اور یہ خواب یقینی ہے اور اُس کی تعبیر یقینی۔" (دانی ایل باب ۲ آیت ۳۷ تا ۴۵)

اِس تعبیر میں خود حضرت دانیال نے سونے کے سر سے بابل کا بادشاہ مراد لیا ہے چاندی کے سینہ اور چاندی کے بازو سے مراد فارس اور مادہ کی حکومت تھی جو بابل کی بادشاہت کے بعد آئی۔ تانبے کی رانوں سے مراد سکندر کی حکومت تھی جو اُس کے بعد دنیا پر غالب ہوا۔ اور لوہے کی ٹانگوں سے مراد روما کی حکومت تھی جو ایرانی حکومت کے تنزل کے وقت دنیا میں طاقتور ہوئی۔ اس آخری حکومت کے متعلق لکھا ہے "اُس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے تھے"۔ جس کی تعبیر یہ تھی کہ یہ حکومت ایشیا سے یورپ میں پھیل جائیگی۔ لوہے کی ٹانگوں سے مراد یوروپین حکومت ہے کہ وہ بوجہ ایک قوم اور ایک مذہب ہونے کے زیادہ مضبوط تھی۔ لیکن پاؤں مٹی اور لوہے کے مشترک بنے ہوئے تھے۔ لیکن وہ یوروپین قوم بعض مشرقی اقوام کو فتح کر کے

ایک شہنشاہیت کی صورت اختیار کرے گی اور جیسا کہ شہنشاہیتوں کا قاعدہ ہے وہ اپنی وسعت اور سامانوں کی فراہمی کے لحاظ سے قوی ہوتی ہیں لیکن غیر قوموں کے اشتراک کی وجہ سے اُن میں ضعف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ حکومت اپنے آخری زمانہ میں بوجہ غیر قوموں کی شمولیت کے کمزوری کی طرف مائل ہو جائیگی۔ اس کے بعد لکھا ہے" ایک پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے کاٹ کے نکالے آپ سے نکلا جو اُس شخص کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے لگا اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا تب لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور تابستانی کھلیان کی بھوسی کے مانند ہوئے اور ہوا اُنہیں اُڑا لے گئی یہاں تک کہ اُن کا پتہ نہ ملا۔ اور وہ پتھر جس نے اُس مُورت کو مارا ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور تمام زمین کو بھر دیا"۔ اِن الفاظ میں محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے اتباع کی خبر دی گئی ہے۔ آپ کی جماعت کا ٹکراؤ پہلے قیصر روما سے اور پھر ایران کی حکومت سے ہوا۔ اور جب قیصر روما سے آپ کی جماعت کا ٹکراؤ ہُوا اُس وقت وہ سکندر کی وراثت پر بھی قابض تھا۔ اور روما کی وراثت کا بھی وارث تھا۔ اور جب آپ کا ٹکراؤ ایرانی حکومت سے ہوا تو وہ بابل اور فارس اور میدیا دونوں حکومتوں کی قائمقام تھی۔ جب آپ کے صحابہؓ سے ٹکرانے کی وجہ سے یہ دونوں حکومتیں تباہ ہوئیں تو دانیال کے قول کے مطابق لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور تابستانی کھلیان کی بھوسی کی مانند ہو گئے۔ خواب کی ترتیب اور دانیال کی کی ہوئی تعبیر دونوں ہی اس مضمون کی تائید کرتی ہیں۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ بابل کی جگہ فارس اور میدیا نے لی اور فارس اور میدیا کا زور سکندر نے توڑا۔ اور سکندر کی حکومت کو رومی حکومت کھا گئی جس نے اپنے مشرقی مرکز میں بیٹھ کر ایک زبردست یورپین ایشیائی شہنشاہیت قائم کی۔ اس شہنشاہیت کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے ہی توڑا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک لشکر لیکر قیصر کی سرحدوں کی طرف تشریف لے گئے تھے لیکن یہ معلوم کر کے کہ قیصر کی فوجوں کی عرب پر حملہ آور ہونے کی خبر قبل از وقت تھی واپس تشریف لے آئے۔ مگر اس کے بعد رومی حکومت کی سرحدوں سے برابر چھیڑ چھاڑ جاری رہی جس کے نتیجہ میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر تیار کر کے اس طرف بھجوایا اور آخر حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں رومیوں اور مسلمانوں میں باقاعدہ لڑائی چھڑ گئی اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران اس لڑائی میں شامل ہو گیا اور آپ کی زندگی میں ہی دونوں حکومتیں تباہ اور برباد ہو گئیں اور دُور سرحدوں پر چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنکر رہ گئیں۔ اس پتھر کے متعلق یسعیاہ اور متی میں بھی خبریں دی گئی ہیں۔ چنانچہ یسعیاہ باب ۸ آیت ۱۴ میں ایک آنے والے موعود کے متعلق لکھا ہے "وہ تمہارے لیے ایک مقدّس ہوگا پر اسرائیل کے دونوں گھرانوں کے لیے ٹکّر کا پتھر اور ٹھوکر کھانے کی چٹان" پھر آیت ۱۵ میں لکھا ہے "بہت لوگ اُن سے ٹھوکر کھائیں گے اور گریں گے اور ٹوٹ جائیں گے"۔ اور متی باب ۲۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موعود جسے پتھر کہا گیا ہے مسیح نہیں بلکہ مسیح کے بعد آنے والا دوسرا شخص ہے۔ اور آیت ۴۴ میں اس کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ "جو اس پتھر پر گرے گا چُور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا"۔ اسی طرح زبور باب ۱۱۸ آیت ۲۲ میں لکھا ہے "وہ پتھر جسے معماروں نے ردّ کیا کونے کا سرا ہو گیا"۔ متی باب ۲۱ میں بھی اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور لکھا ہے "یسوع نے اُنہیں کہا کیا تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ

جس پتھر کو راجگیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہُوا" (آیت ۴۲ ۴۴) جیسا کہ بتایا جاچکا ہے۔ اس پیشگوئی کے متعلق خود حضرت مسیح کا فیصلہ ہے کہ یہ پیشگوئی اُن پر صادق نہیں آتی بلکہ اس وجود پر صادق آتی ہے جو بیٹے کے صلیب پر لٹکا دینے کے بعد ظاہر ہوگا۔ عیسائی لوگ اپنی خوش فہمی سے اِس سے مراد کلیسیا لیتے ہیں حالانکہ کلیسیا اِس پیشگوئی سے مراد ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ دانیال نبی کی خواب میں رومی حکومت کو جو کلیسیا کی نمائندہ تھی تانبے کی رانیں اور لوہے کے پاؤں قرار دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ پتھر بُت کے پاؤں پر گریگا یعنی مشرقی رومی حکومت کے آخری حصّہ سے اس کا ٹکراؤ ہوگا۔ اور وہ رومی حکومت یعنی کلیسیا کی نمائندہ حکومت کو توڑ دیگا پس اس پیشگوئی سے مراد کلیسیا کسی صورت میں ہو ہی نہیں سکتا۔ مسیح تو مشرقی رومی حکومت سے پہلے آیا تھا۔ اور کلیسیا نے رومی حکومت کو کیوں توڑنا تھا۔ رومی حکومت تو اس کی نمائندہ تھی جس نے رومی حکومت کو توڑا وہی اس پتھر والی پیشگوئی کا موعود تھا پس یہ پیشگوئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اتباع کے سوا اور کسی کے ذریعہ سے پوری نہیں ہوئی پھر جیسا کہ پیشگوئی میں بتایا گیا تھا کہ وہ پتھر تمام دنیا پر پھیل جائیگا اور پہاڑ کی طرح بن جائیگا ویسا ہی ہُوا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے قیصر و کسریٰ کو شکست دی تو تمام دنیا پر اسلامی حکومت پھیل گئی اور وہ چھوٹا سا پتھر ایک پہاڑ بن کر دنیا پر چھا گیا اور ایک ہزار سال تک دنیا کی قسمت کا فیصلہ مسلمانوں کے ہاتھ میں دیدیا گیا۔

انجیل کی پیشگوئیاں

انگورستان کی تمثیل کی پیشگوئی

(۱) متی باب ۲۱ میں حضرت مسیح فرماتے ہیں:۔ "یہ ایک اور تمثیل سنو۔ ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگورستان لگایا اور اس کے چاروں طرف اوندھا اور اُس کے بیچ میں کھود کے کولھو گاڑا۔ اور بُرج بنایا۔ اور باغبانوں کو سونپ کر آپ پردیس گیا۔ اور جب میوہ کا موسم قریب آیا۔ اُس نے اپنے نوکروں کو باغبانوں کے پاس بھیجا کہ اُس کا پھل لائیں۔ پر اُن باغبانوں نے اسکے نوکروں کو پکڑ کے ایک کو پیٹا اور ایک کو مار ڈالا اور ایک کو پتھراؤ کیا۔ پھر اُس نے اَور نوکروں کو جو پہلوں سے بڑھکر تھے بھیجا۔ اُنہوں نے اُن کے ساتھ بھی ویسا ہی کیا آخر اُس نے اپنے بیٹے کو یہ کہکر بھیجا کہ وے میرے بیٹے سے دبیں گے لیکن باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا آپس میں کہنے لگے وارث یہی ہے آؤ اِسے مار ڈالیں کہ اس کی میراث ہماری ہو جائے۔ اور اُسے پکڑ کے اور انگورستان کے باہر لے جاکر قتل کیا جب انگورستان کا مالک آئیگا تو اُن باغبانوں کے ساتھ کیا کریگا۔ وے اُسے بولے اِن بدوں کو بُری طرح مار ڈالیگا اور انگورستان کو اَور باغبانوں کو سونپے گا جو اُسے موسم پر میوہ پہنچاویں۔ یسوع نے اُنہیں کہا کیا تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راجگیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہُوا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائیگی اور ایک قوم کو جو اس کا میوہ لاوے دی جائے گی۔ جو اُس پتھر پر گریگا چُور ہو جائے گا۔ جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا۔ جب سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اُس کی یہ تمثیلیں سُنیں تو سمجھ گئے، کہ

ہمارے ہی حق میں کہتا ہے اور انہوں نے چاہا کہ اُسے پکڑلیں پر عوام سے ڈرے کیونکہ وے اُسے نبی جانتے تھے (آیت ۳۳ تا ۴۶) اِس پیشگوئی کا پہلے بھی اشارتاً ذکر آتا رہا ہے۔ یہ تمثیل جو حضرت مسیح نے بیان فرمائی ہے اس میں آپ نے انبیاء کی تاریخ شروع سے لیکر آخر تک تمثیلاً دُہرادی ہے۔ جیسا کہ خود انجیل کی عبارت سے ظاہر ہے۔ تاکستان سے مراد دنیا ہے۔ باغبانوں سے مراد بنی نوع انسان ہیں اور مالک کے ٹیکس سے مراد نیکی اور تقویٰ اور خدا کی عبادت کرنا ہے۔ ملازموں سے مراد اللہ تعالیٰ کے انبیاء ہیں جو یکے بعد دیگرے دنیا میں آتے رہے۔ خدا کے بیٹے سے مراد خود مسیح ہیں جو انبیاء کے ایک لمبے سلسلہ کے بعد دنیا میں ظاہر ہوئے مگر باغبانوں نے ان کو صلیب پر لٹکا دیا اور ان کے پیغام کی طرف توجہ نہ کی۔ اِس کے بعد لکھا ہے کہ وہ کونے کا پتھر ظاہر ہوگا جسے راجگیروں نے ناپسند کیا۔ یعنی اسمٰعیلؑ کی اولاد جن کو بنو اسحاق حقارت کی نگاہ سے دیکھتے چلے آئے تھے اُن میں ایک نبی ظاہر ہوگا اور اسی کو خاتم النبیین ہونے کا فخر حاصل ہوگا۔ اُس کے ذریعہ سے تمام شریعتوں کو ختم کردیا جائے گا اور وہ آخری شریعت لانے والا ہوگا۔ بنو اسرائیل کو یہ بات عجیب معلوم ہوگی۔ مگر جیسا کہ حضرت مسیح کہتے ہیں۔ باوجود بنو اسرائیل کے ناپسند کرنے کے خدا اس اسمٰعیلی نبی کو بادشاہت دیگا اور خدا کی بادشاہت بنو اسرائیل سے لے لی جائیگی اور اس کی جگہ پر اس دوسری قوم کے سپرد یہ باغ کردیا جائیگا یعنی اُمتِ محمدیہ کے۔ جو اُس کے میوے لاتی رہے گی۔ یعنی خدا کی عبادت کو دنیا میں قائم رکھے گی۔ ہر شخص جو انصاف کے ساتھ غور کرنے کا عادی ہو وہ معلوم کرسکتا ہے کہ حضرت مسیح کے بعد ظاہر ہونے والے مدعیوں میں سے کوئی بھی سوائے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اِس پیشگوئی کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ آخر وہ کون تھا جس سے عیسائیت اور یہودیت ٹکرائی اور پاش پاش ہوگئی۔ وہ کون تھا جو اُس قوم کے ساتھ تعلق رکھتا تھا جسے بنو اسحاق حقارت کی نگاہ سے دیکھتے چلے آئے تھے۔ وہ کون تھا کہ جس پر وہ گرا اُسے اس نے چُور چُور کردیا اور جو اُس پر گرا وہ بھی چُور چُور ہوگیا۔ یقیناً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اس پیشگوئی کا مصداق اور کوئی نہیں۔

(ب) متی باب ۲۳ آیت ۳۸، ۳۹ میں لکھا ہے "دیکھو تمہارا گھر تمہارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ جب تک کہو گے مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام پر آتا ہے"۔ اِن آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسیح اپنی قوم سے عنقریب جدا ہونے والے ہیں اور ان کی قوم پھر انہیں نہ دیکھ سکے گی۔ جب تک وہ یہ نہ کہے گی کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام پر آتا ہے۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ مسیح کے چلے جانے کے بعد دو الٰہی مظہر ظاہر ہونے والے ہیں۔ ایک الٰہی ظہور مسیح کے غائب ہوجانے کے بعد ہوگا اور وہ خدا تعالےٰ کا ظہور کہلائے گا۔ اِس ظہور کے بعد دوبارہ مسیح ظاہر ہوگا۔ لیکن جب تک خدا تعالیٰ کے نام پر ظاہر ہونے والا مظہر پیدا نہ ہو جائے اُس وقت تک مسیح دوبارہ دنیا میں نہیں آسکتا۔ اور لوگ اُسے نہیں دیکھ سکتے۔ میں پہلے یہ ثابت کرچکا ہوں کہ خدا تعالےٰ کے نام پر ظاہر ہونے والے مظہر سے مراد مثیلِ موسیٰ ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسےٰ تھے۔ واقعاتی شہادت کی رُو سے بھی اور خود مسیح کی شہادت کی رُو سے بھی۔ پس "مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام پر آتا ہے" سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہے اور اس پیشگوئی میں خبر دی گئی ہے کہ مسیح روحانی ارتقاء کا آخری نقطہ نہیں بلکہ آخری نقطہ وہ ہے جو خداوند کے نام پر آئیگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خداوند کے نام پر آنے والے مظہر کے بعد پھر مسیح نے دوبارہ آنا ہے، اس لیے

..مسیح ہی روحانیت کا آخری نقطہ قرار پائیگا۔ تو اس کا جواب خود حضرت مسیح نے ہی دیدیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں"۔ اب تم مجھے پھر نہ دیکھو گے جب تک کہ کہو گے مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام پر آتا ہے"۔ یعنی مسیح کو دوبارہ دیکھنا اُسی کے لیے ممکن ہوگا جو مثیل موسیٰ پر ایمان لا چکا ہوگا۔ مثیل موسیٰ کا منکر مسیح کو نہیں دیکھ سکے گا یعنی اُس کو پہچان نہیں سکیگا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسیح اپنی دوبارہ آمد کے وقت مثیل موسیٰ کے اتباع میں سے ہوگا پس وہی شخص مسیح پر ایمان لائے گا جو پہلے اُس کے متبوع پر ایمان لا چکا ہوگا۔ پس آنے والا مسیح کوئی علیحدہ وجود نہیں بلکہ مثیل موسیٰ کا ہی ظل اور اس کا بروز ہے۔ اس لیے روحانی منازل کا آخری ارتقائی نقطہ مثیل موسیٰ ہی ہے اور کوئی نہیں۔

(ج) انجیل میں لکھا ہے کہ "یوحنا کے پاس لوگ آئے اور اُس سے پوچھا کہ کیا وہ مسیح ہے؟ تو اُس نے کہا میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انہوں نے اُس سے پوچھا تو اور کون۔ کیا تو الیاس ہے؟ اُس نے کہا میں نہیں ہوں۔ پھر انہوں نے اُس سے پوچھا۔ آیا تُو وہ نبی ہے اُس نے جواب دیا۔ نہیں"۔ (یوحنا باب ۱ آیت ۲۰-۲۱) پھر آگے چل کر لکھا ہے" انہوں نے اُس سے سوال کیا اور کہا کہ اگر تُو نہ مسیح ہے اور نہ الیاس اور نہ وہ نبی پس کیوں بپتسمہ دیتا ہے"۔ (آیت ۲۵) ان آیات سے ظاہر ہے کہ مسیح کے وقت یہود میں تین بشارتیں مشہور تھیں۔

اوّل۔ الیاسؑ دوبارہ دنیا میں آنے والا ہے۔ دوم۔ مسیح پیدا ہونے والا ہے۔ سوم۔ وہ نبی یعنی موسیٰ کا موعود نبی آنے والا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین وجود الگ الگ سمجھے جاتے تھے۔ الیاس الگ وجود تھا۔ مسیح الگ وجود تھا اور "وہ نبی" الگ وجود تھا۔ حضرت مسیح فرما چکے ہیں کہ یوحنا الیاسؑ ہے چنانچہ فرماتے ہیں" الیاس جو آنے والا تھا یہی ہے چاہو تو قبول کرو"۔ (متی باب ۱۱ آیت ۱۴) اور لوقا باب ۱ آیت ۱۷ سے بھی پتہ لگتا ہے کہ حضرت یوحنا کی پیدائش سے پہلے اُن کے والد حضرت ذکریا کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا" وہ اس سے آگے الیاس کی طبیعت اور قوت کے ساتھ چلے گا"۔ پھر مرقس باب ۹ آیت ۱۳ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا" مَیں تم سے کہتا ہوں الیاس تو آچکا"۔ پھر متی باب ۱۷ آیت ۱۲ میں لکھا ہے" پر مَیں تم سے کہتا ہوں کہ الیاس تو آچکا۔ لیکن اُنہوں نے اُس کو نہیں پہچانا۔ بلکہ جو چاہا اُس کے ساتھ کیا"۔

ان تمام حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ الیاسؑ سے مراد اناجیل کی تعلیم کے مطابق یوحنا تھے۔ مسیح کے متعلق تو فیصلہ ہی ہے کہ عہد نامہ جدید والا نبی یسوع ابن مریم ہی مسیح کے نام سے خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں ظاہر ہوا۔ اب رہ گیا "وہ نبی" نہ یوحنا وہ نبی ہو سکتا ہے نہ مسیح وہ نبی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ نبی ایک علیحدہ وجود ہے۔ پھر یہ بھی ثابت ہے کہ وہ نبی مسیح کے زمانہ تک نہیں آیا تھا پس معلوم ہوا کہ وہ موعود جسے بائبل "وہ نبی" کے نام سے یاد کرتی تھی اناجیل کی گواہی کے مطابق مسیح ناصری کے بعد نازل ہونے والا تھا اور مسیح ناصری کے بعد سوائے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کوئی شخص نہیں جس نے "وہ نبی" ہونے کا دعوےٰ کیا ہو اور جس پر وہ تمام علامتیں صادق آتی ہوں جو "وہ نبی" میں پائی جانے والی تھیں جیسا کہ اُوپر ثابت کیا جا چکا ہے۔

(د) اسی طرح لوقا میں لکھا ہے" اور دیکھو میں اپنے باپ کے اُس موعود کو تم پر بھیجتا ہوں لیکن جب تک عالم بالا کی قوت سے ملبس نہ ہوں یروشلم میں ٹھہرو" (باب ۲۴ آیت ۴۹) اس پیشگوئی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کے بعد ایک موعود ظاہر ہونیوالا تھا مگر وہ کون موعود ہے سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آجتک کوئی شخص بھی تو اس پیشگوئی کے پورا کرنے کا مدعی نہیں ہوا۔

(ھ) یوحنا میں لکھا ہے" لیکن وہ تسلّی دینے والا جو روح قدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجیگا۔ وہی تمہیں سب چیزیں سکھلا دے گا اور سب باتیں جو کچھ کہ میں نے تمہیں کہی ہیں تمہیں یاد دلا دیگا" (باب ۱۴ آیت ۲۶) یہ پیشگوئی بھی سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی پر صادق نہیں آتی۔ بیشک اس میں یہ لکھا ہے کہ باپ میرے نام سے اُسے بھیجیگا۔ لیکن نام سے بھیجنے کے یہی معنے ہیں کہ وہ میری تصدیق کریگا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تصدیق کی۔ اور آپ کو راستباز قرار دیا اور اعلان فرمایا کہ جو لوگ آپ کو لعنتی کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں مسیح خدا کا برگزیدہ اور اس کا رسول ہے۔ اس جگہ پر یہ صاف لکھا گیا ہے کہ" وہی تمہیں سب چیزیں سکھلا دیگا"۔ اور استثناء باب ۱۸ کی پیشگوئی میں بھی یہی الفاظ ہیں کہ" جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہیگا" (آیت ۱۸) پس اس پیشگوئی میں استثناء باب ۱۸ والے نبی ہی کی خبر دی گئی ہے اور یہ پیشگوئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی صادق آتی ہے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اور آپ ہی کا وجود دنیا کو تسلّی دینے والا تھا۔

(و) یوحنا باب ۱۶ میں لکھا ہے" میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لیے میرا جانا ہی فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو تسلّی دینے والا تم پاس نہ آئیگا پر اگر میں جاؤں تو میں اُسے تم پاس بھیجدونگا۔ اور وہ آن کر دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے تقصیروار ٹھہرائے گا۔ گناہ سے اس لیے کہ وے مجھ پر ایمان نہیں لائے راستی سے اس لیے کہ میں اپنے باپ پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت سے اس لیے کہ اس جہان کے سردار پر حکم کیا گیا ہے۔ میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دیگی اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سُنیگی سو کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبریں دیگی۔ وہ میری بزرگی کریگی۔ اس لیے کہ وہ میری چیزوں سے پاویگی اور تمہیں دکھاویگی" (آیت ۷ تا ۱۴) ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسیح کے اُٹھ جانے یعنی مسیح کی وفات کے بعد وہ تسلّی دینے والا موعود ظاہر ہوگا۔ وہ دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے تقصیروار ٹھہرائے گا۔ گناہ سے اس طرح کہ وہ یہود کو ملامت کرے گا کہ وہ کیوں مسیح پر ایمان نہیں لائے۔ راستی سے اس طرح کہ وہ مسیح کی زندگی کا عقیدہ جو غلط طور پر عیسائیوں میں رائج ہو گیا تھا اس کو دور کرے گا اور دنیا پر ثابت کرے گا کہ دنیا پھر اس مسیح کو دوبارہ نہیں دیکھے گی جو بنی اسرائیل میں نازل ہوا تھا۔ عدالت سے اس طرح کہ اُس کے ذریعہ شیطان کو کچل دیا جائے گا پھر یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ روح حق جب آئے گی تو وہ ساری سچائی کی راہیں بتائے گی اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اُس کی الہامی کتاب میں کوئی انسانی کلام نہیں ہوگا۔ بلکہ شروع سے لے کر آخر تک خدائی کلام ہی اُس میں ہوگا۔ پھر یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ آئندہ کی خبریں دے گا اور یہ بھی کہ وہ مسیح کی بزرگی بیان کرے گا۔

اور جو اُس پر عیب لگائے گئے ہیں اُن کو دُور کرے گا۔

یہ پیشگوئی واضح طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب تک مسیح آسمان پر نہ جائے، وہ تسلّی دلانے والا نہیں آسکتا۔ اعمال باب ۳ آیت ۲۱-۲۲ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے آسمان پر جانے اور اس کے دوبارہ نازل ہونے کے درمیان استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ کے موعود نے پیدا ہونا ہے پس تسلّی دلانے والے سے مراد استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ والا موعود ہی ہے۔

پھر لکھا ہے کہ وہ موعود مسیح کے منکروں کو ملامت کریگا۔ اس سے مراد عیسائی تو ہو نہیں سکتے کسی شخص کے متبع تو اُس کے دشمنوں کو ملامت کیا ہی کرتے ہیں۔ یہ علامت بتا رہی ہے کہ وہ موعود کسی غیر قوم کا ہوگا۔ اور بظاہر اُس کو مسیح کے ساتھ کوئی نسلی یا ملّی تعلق نہیں ہوگا مگر بوجہ اس کے کہ وہ راستباز ہوگا اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگا غیر قوم میں سے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو راستبازوں کی عزّت کا نگران سمجھیگا اور اُن کی عزّت کی حفاظت کرے گا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسمٰعیلی نبی تھے۔ عیسائی یا یہودی نہیں تھے۔ مگر باوجود اس کے دیکھو کس طرح اُنہوں نے مسیح کی عزّت کی حفاظت کی۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں یہود کی نسبت فرماتا ہے۔ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۝ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ (النساء ع ۲۲) یعنی یہود کے کفر کی وجہ سے اور اُن کے حضرت مریم پر نہایت گندہ الزام لگانے کی وجہ سے اور اُن کے اس قول کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح ابن مریم کو قتل کر دیا ہے جو اللہ کا رسول تھا۔ حالانکہ انہوں نے نہ تو اسکو تلوار سے مارا اور نہ صلیب پر لٹکا کر مارا۔ صرف اُن کو ایک شبہ پیدا ہو گیا کہ وہ صلیب پر مر گیا ہے مگر یہ صرف شبہ تھا انہیں الیسا یقین نہ تھا۔ چنانچہ خود اُن کی قوم میں یہ اختلاف چلا آیا ہے اور وہ اس کے بارے میں کسی یقینی بات پر قائم نہیں۔ اُن کو اِس بات کا علم حاصل نہیں بلکہ صرف تخمینی طور پر یہ بات کہتے ہیں۔ اور یہ قطعی بات ہے کہ وہ اُسے مارنے میں کامیاب نہیں ہوئے بلکہ اللہ تعالےٰ نے اُس کو صلیب کی لعنتی موت سے بچا کر اپنے مقربوں میں جگہ دی۔ اور اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔ ہر اہلِ کتاب اپنی موت سے پہلے پہلے اس کے متعلق ایمان ظاہر کرتا رہے گا کہ وہ صلیب پر مر گیا ہے لیکن قیامت کے دن مسیح اُن کے اوپر گواہی دے گا کہ انہوں نے اس پر یہ الزام لگا کر کہ وہ صلیب پر مر گیا ہے افتراء کیا ہے پس یہودیوں کے ان ظلموں کی وجہ سے ہم نے ان آسمانی نعمتوں سے ان کو محروم کر دیا جو پہلے اُن کا حق سمجھی جاتی تھیں۔ اِن آیات میں کس طرح حضرت مسیح کے منکروں پر حجت تمام کی گئی ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی تھی کہ وہ مسیح کی وفات ثابت کرے گا اور دنیا کو بتا دے گا کہ دنیا پھر اسرائیلی مسیح کو نہیں دیکھے گی۔ یہ کام بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا اور اس غلط عقیدہ کو باطل کر کے رکھ دیا جو عیسائیوں میں پھیلا ہوا تھا کہ مسیح آسمان پر بیٹھا ہوا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ

ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ ط اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ط تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ط اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ج وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ج فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ط وَ اَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ○ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ج وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ (المائدۃ ع ۱۶) ان آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ حضرت مسیح سے سوال کریگا کہ کیا تُو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو معبود بناؤ؟ حضرت مسیح فرمائیں گے اے ربّ تیری ذات پاک ہے بھلا میں ایسا کر سکتا تھا کہ وہ بات کہوں جس کا تُو نے مجھے حق نہیں دیا۔ اگر مَیں نے ایسا کہا ہوتا تو تیرے علم سے یہ بات چُھپ تو نہیں سکتی تھی۔ جو کچھ میرے جی میں ہے تُو جانتا ہے۔ اور جس غرض سے تُو نے یہ سوال کیا ہے مَیں اُسے نہیں جانتا، تُو سب غیبوں کو جاننے والا ہے۔ مَیں نے تو اُنہیں وہی بات کہی تھی جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اور جب تک میں اُن میں رہا اُن کا نگران رہا پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو تو اُن کا خود نگران تھا اور تو ہر چیز کو دیکھنے بھالنے والا ہے اگر تُو اُن کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تُو انہیں معاف کردے تو تُو بڑا غالب حکمت والا ہے۔

اِن آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسیح علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور مسیح کی قوم نے اُس وقت ان کو خدائی کا درجہ دیدیا۔ جب وہ فوت ہو کر اس دنیا سے جا چکے تھے۔ اور جیسا کہ پہلی آیت میں بیان کیا جا چکا ہے دنیا کو یہ بتا دیا کہ مسیح کے آسمان پر جانے کے معنے محض یہ ہیں کہ وہ اپنے کام میں کامیاب ہو کر اور باعزّت ہو کر خدا تعالےٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔

تیسری خبر یہ دی گئی تھی کہ شیطان اُس کے ذریعہ سے کُچل دیا جائیگا۔ تمام نبیوں میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایک ایسے نبی ہیں جنہوں نے شیطان کے کچلنے کے ذرائع کو اختیار کیا۔ اور بنی نوع انسان کی پاکیزگی کیلئے صحیح سامان بہم پہنچائے۔ مگر اس کی تفصیل کا ابھی وقت نہیں۔ اس کی تفصیل قرآن شریف کی تفسیر سے ملے گی یا کسی قدر میں آئندہ اسی دیباچے میں بیان کرونگا۔ مگر ایک موٹی بات تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کسی نبی نے بھی شیطان سے پناہ مانگنے کی دُعا اپنی اُمّت کو نہیں سکھائی سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مسلمان اپنے کاموں میں اُٹھتے بیٹھتے شیطان اور اُس کے حملوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہ تعلیم گذشتہ انبیاء میں سے کسی کے ہاں نہیں پائی جاتی پس جس قوم کو شیطان کا سر کچلنے کی ہدایت دن اور رات ملتی رہی ہو اور جسکے دل میں شیطانی حکومت کے توڑنے کا احساس ہر وقت زندہ رکھا جاتا ہو ظاہر ہے کہ وہی شیطان کو مارنے کی اہل سمجھی جائیگی۔ اور اسی قوم کا نبی شیطان کو مارنے والا کہلائیگا۔ یہ تو نہ کبھی پہلے ہُوا ہے نہ آئندہ ہو گا کہ شیطانی وسائل اس دُنیا سے بالکل مٹ جائیں۔ کیونکہ اس کے بغیر تو ایمان کی قدر ہی کوئی باقی نہیں رہتی۔ شیطان کے مارنے کے معنے یہی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ نیکی کو دنیا میں قائم کیا جائے۔ کلیسیا تو بہر حال اس کا مستحق نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس نے تو شریعت کو لعنت قرار دے کر نیکی کا وجود ہی مشتبہ کر دیا ہے۔ یہ جو کہا گیا تھا کہ وہ تمہیں ساری سچائی

کی راہ بتائے گی۔ اس کی تشریح میں استثناء باب ۱۸ کی پیشگوئی کے ماتحت کر آیا ہوں۔ آئندہ کی خبروں کے متعلق جو کہا گیا ہے۔ اِس کے متعلق بھی صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ جتنی آئندہ کی خبریں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہیں اور کسی نبی نے نہیں دیں۔ اِس کے متعلق کچھ روشنی دیباچہ میں آگے چل کر ڈالی جائے گی۔ یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ جو کہا گیا تھا کہ اُس کا کلام سارے کا سارا کلام اللہ ہوگا۔ یہ بھی ایک ایسی پیشگوئی ہے جس کا اَور کوئی مصداق نہیں ہو سکتا۔ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کی کوئی بھی تو کتاب نہیں جو انسانی کلام سے خالی ہو، لیکن قرآن کریم وہ کتاب ہے جس میں شروع سے لیکر آخر تک وہی بیان کیا گیا ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہُوا ہے۔ اَوروں کا تو ذکر کیا خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا بھی ایک لفظ اس کتاب میں نہیں۔ آخر میں یہ جو کہا گیا تھا کہ "وہ میری بزرگی کرے گی" سو یہ بزرگی کرنیوالے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں آپ ہی ہیں جنہوں نے مسیح کو اس الزام سے بچایا کہ مسیح صلیبی موت سے مر کر نعوذ باللہ لعنتی ہُوا۔ آپ ہی ہیں جنہوں نے حضرت مسیح کو اس الزام سے بچایا کہ نعوذ باللہ خدائی کا دعویٰ کر کے وہ خدا تعالیٰ سے بیوفائی اور غدّاری کرتے تھے۔ آپ ہی ہیں جنہوں نے حضرت مسیح کو یہودیوں کے اعتراضات سے نجات دلائی۔ پس اس پیشگوئی کا مصداق آپ کے سوا کوئی نہیں۔

(ز) کتاب اعمال میں لکھا ہے "ضرور ہے کہ آسمان اُسے (یعنی مسیح کو) لئے رہے اُس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے لیے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے ایک نبی میری مانند اُٹھائے گا۔ جو کچھ وہ تمہیں کہے اُس کی سب سُنو۔ اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس جو اُس نبی کی نہ سُنے وہ قوم میں سے نیست کیا جائے گا۔ بلکہ سب نبیوں نے سموئیل سے لے کر پچھلوں تک جتنوں نے کلام کیا ان دنوں کی خبر دی" (باب ۳ آیت ۲۱ تا ۲۴)

اِن آیات میں حضرت موسیٰ کی کتاب استثناء والی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ آنیوالا موعود جب تک ظاہر نہ ہو جائے اُس وقت تک مسیح کی دوبارہ آمد نہیں ہوگی۔ استثناء کی پیشگوئی میں یہ خبر دی گئی تھی کہ وہ موعود نئی شریعت لائے گا۔ پس اس پیشگوئی کو اعمال میں دوہرا کر اس بات کا اقرار کیا گیا ہے کہ آنیوالے موعود کے ذریعہ سے مسیح کی تعلیم منسوخ کر دی جائے گی۔ ورنہ نئی شریعت کے تو کوئی معنے ہی نہیں ہو سکتے۔ ایک ہی وقت میں ایک قوم میں دو شریعتیں تو چل نہیں سکتیں۔ پس یہ آنے والا موعود یقیناً ارتقاء کا آخری نقطہ ہے جس نے موسیٰ اور مسیح کی تعلیموں کو منسوخ کرنا تھا اور ایک نئی شریعت دنیا کے سامنے ظاہر کرنی تھی۔ اعمالؔ نے ایک اور روشنی بھی اس موعود کے متعلق ڈالی ہے اور وہ یہ کہ سموئیل سے لیکر پچھلوں تک جتنے نبی گذرے ہیں انہوں نے اِس موعود کی خبر دی ہے۔ موسیٰ کی خبر کا تو پہلے ذکر آچکا ہے اور داؤد نبی سموئیل کے بعد ہوئے ہیں۔ پس اعمال کی آیت ۲۴ کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ سے لیکر مسیح تک تمام انبیاء نے اس آنے والے کی خبر دی ہے۔ پس جب تک یہ نبی دنیا میں ظاہر نہ ہو اُس وقت تک دنیا کی روحانی تعمیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اور میں پہلے ثابت کر آیا ہوں کہ یہ نبی بائبل کی بتائی ہوئی علامتوں کے مطابق سوائے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے

اور کوئی شخص نہیں۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تمام انبیاء کا موعود تھا۔ اور آپ کی شریعت بھی تمام انبیاء کی موعود تھی۔ پس یہ اعتراض کسی صورت میں درست نہیں ہوسکتا کہ تورات اور انجیل کی موجودگی میں یا اور کتابوں کی موجودگی میں قرآن کریم کی کیا ضرورت ہے۔ جب سابق نبیوں نے قرآن کریم کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے اور اس کی پیشگوئی کی ہے تو اُن کی اُمتوں کو کیا حق ہے کہ وہ اس کی ضرورت سے انکار کریں۔ بلکہ اُنہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ قرآن کریم کی ضرورت سے انکار کرینگی، تو اُن کے نبیوں کی صداقت بھی مشتبہ ہو جائیگی۔ اور ان نبیوں کی پیشگوئیاں جھوٹی ثابت ہو کر وہ موسٰی کے اس قول کی زد میں آجائیں گی "جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور وہ جو اُس نے کہا ہے واقعہ نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی۔ اور اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے تو اس سے مت ڈر" (استثناء باب ۱۸ آیت ۲۲)

محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ مضمون بیان کرنے کے بعد کہ باوجود بہت سی الہامی کتب کے موجود ہونے کے آج سے تیرہ سو سال پہلے دنیا ایک اور شریعت اور ایک اور کتاب کی محتاج تھی میں اس مضمون کو اختصاراً لیتا ہوں کہ قرآن کریم کس شخص پر نازل ہوا اور کن حالات میں نازل ہوا۔ کیونکہ یہ مضمون بھی قرآن کریم کی اہمیت سمجھنے کے لیے نہایت ممد ہے گو فلسفی مزاج لوگوں کے لیے تو اتنا دیکھنا ہی کافی ہوتا ہے کہ جو مضمون ان کے سامنے پیش کیا گیا ہے وہ کیا قیمت رکھتا ہے چنانچہ عربی میں مثل ہے اُنْظُرْ اِلٰی مَا قِیْلَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ۔ تو یہ دیکھ کہ جو بات کہی گئی وہ کیا ہے اور اس بات کی طرف نہ دیکھ کہ اس کا کہنے والا کون ہے۔ مگر دنیا کی اکثریت یہ بھی دیکھنا چاہتی ہے کہ کہنے والا کون ہے اور خصوصاً الہامی کتابوں کے متعلق تو یہ نہایت ضروری ہوتا ہے کہ ان کتابوں کو پیش کرنے والوں کے یعنی اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے متعلق بھی دنیا کو یہ معلوم ہو کہ اُن کی زندگی کیسی تھی۔ کیونکہ مذہبی قانون صرف حکم سے منوایا نہیں جاتا ہے۔ حکومت نظام کے لیے قائم ہوتی ہے اور اُس کا تعلق صرف ظاہر سے ہوتا ہے۔ اِس لیے کسی ملک کی آئینی تنظیم کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اُس میں ایک آئین پایا جائے۔ کیونکہ قانون کا منشاء صرف اِس قدر ہوتا ہے کہ لوگوں کا ظاہر قانون کا پابند ہو جائے چنانچہ عدالتوں میں کسی کی نیت بُری ثابت کرنا اُس کو مجرم نہیں بنا دیتا جب تک اُس نیت کے مطابق اُس کے فعل کا صدور بھی اُس سے ثابت نہ ہو مگر مذہبی دنیا میں ظاہر سے بھی زیادہ باطن پر زور دیا جاتا ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ظاہر کو ترک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ظاہر باطن کی علامت ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ظاہری اصلاح کے ساتھ باطنی اصلاح بھی ہو جائے۔ مگر باطنی اصلاح کے ساتھ ظاہری اصلاح کا ہو جانا لازمی ہے۔ جس طرح یہ نہیں ہوسکتا کہ آگ ہو لیکن اس سے گرمی پیدا نہ ہو، اِسی طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ دل میں صفائی ہو اور ظاہری اعمال اُس کے مطابق نہ ہوں۔ عارضی کوتاہی یا غفلت اور بات ہے۔ لیکن عام طور پر دل کی صفائی کے مطابق انسان کے اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اور دل کی صفائی کا

بہترین ذریعہ اچھا نمونہ ہوتا ہے۔ قانون انسان کے دماغ پر اثر ڈالتا ہے لیکن اچھا نمونہ انسان کے دل پر اثر ڈالتا ہے۔ قانون کی حکومت فکر پر ہوتی ہے لیکن اچھے نمونہ کی حکومت جذبات پر ہوتی ہے۔ ہم صرف فکر کی اصلاح سے انسان کی رُوحانی اور جسمانی اصلاح نہیں کر سکتے۔ فکر کا نتیجہ غیر متواتر اعمال کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے لیکن جذبات کا نتیجہ متواتر اور مسلسل اعمال کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک عام خیر خواہ انسان جس رنگ میں اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی خیر خواہی کرتا ہے اُسکی خیر خواہی کا نمونہ اِس خیر خواہی کے نمونہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو ماں اپنے بچہ کے متعلق دکھاتی ہے۔ اِس لیے کہ جس کا دماغ اخلاقی تعلیم سے متاثر ہُوا ہے وہ اُس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس کے جذبات اخلاقی تعلیم سے متاثر ہوں۔ ماں کی محبت اپنے بچہ سے اُسکے جذبات کی وجہ سے ہوتی ہے اور ایک فلاسفر کی محبت اپنے ہمسایوں سے دلائل عقلیہ کی بناء پر ہوتی ہے۔

انبیاء کے اعمال فکری جذباتی ہوتے ہیں اور لوگوں کیلئے نمونہ

جو اعمال دلائل کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں وہ متواتر اور مسلسل نہیں ہو سکتے کیونکہ بعض دفعہ انسان کی توجہ حقیقت کی طرف نہیں پھرتی۔ بعض دفعہ اُس کے ارادہ اور عمل کے درمیان ایک لمبی سوچ اور فکر حائل ہو جاتی ہے مگر جو جذبات کے ماتحت لوگوں سے کوئی کام کرتا ہے اُس کے کام فوری ہوتے ہیں اور مسلسل ہوتے ہیں۔ ماں کو اگر کوئی لاکھ دلیل دے کہ تُو اپنے بچّہ کے لیے قربانی نہ کر جو کر رہی ہے تو وہ کبھی اُس کی بات نہیں مانیگی اور بچے کی تکلیف کے متعلق وہ سوچنے نہیں بیٹھے گی۔ وہ اندھا دُھند اور فوری طور پر اپنے بچہ کی خیر خواہی کے لیے وہ تدابیر اختیار کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گی جو تدابیر اُس کے نزدیک اُس کے بچہ کے فائدہ کے لیے ضروری ہونگی اور رات اور دن میں کوئی وقت بھی ایسا نہیں ہوگا جب اُس کا دماغ اپنے بچہ کی خیر خواہی سے خالی ہو۔ پس حقیقی اصلاح تبھی ہو سکتی ہے جب اخلاق فاضلہ بنی نوع انسان کے جذبات کا حصّہ بنا دئیے جائیں۔ وہ اخلاق کے مطالبات کو فکر کے بعد پورا نہ کریں بلکہ اخلاقی مطالبات کو اپنی ذات میں محسوس کرنے لگیں۔ جذبات کو بعض لوگ بُرا کہتے ہیں لیکن جذبات بُرے ہی نہیں اچھے بھی ہوتے ہیں۔ جذبہ کے اصل معنے تو یہ ہیں کہ ارادہ اور عمل کے درمیان جو فکر کی لمبی دیوار کھڑی ہوتی ہے اُس کو چھوٹا کر دیا جائے یا بالکل اُڑا دیا جائے تا کہ انسانی اعمال محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔ بلکہ جذبات کی وجہ سے وہ سینکڑوں گُنے زیادہ ترقی کر جائیں۔ جو شخص خالی فکر سے کام لیتا ہے وہ بہت سا وقت سوچنے اور غور کرنے میں گزار دیتا ہے لیکن جو شخص ایک دفعہ سوچکر اور غور کر کے ایک سچائی کو معلوم کر لیتا ہے اور ایک نیکی کو پا لیتا ہے پھر وہ اُس سچائی اور نیکی کو اپنے دل کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور اسے اپنے جذبات کا حصّہ بنا دیتا ہے تو وہ اس نیکی اور سچائی پر عمل کرنے میں اتنا تیز اور پھرتیلا ہوتا ہے کہ وہ شخص جو صرف فکر سے کام لینے کا عادی ہے اُس کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ فکر سے کام لینے والا جتنی دیر میں ایک کام کریگا جذبات سے کام لینے والا اُتنی دیر میں بیسیوں کام کر جائیگا! اور ہم اس جذبات سے کام لینے والے شخص کو وحشی نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ جذبات کا غلام نہیں ہے بلکہ پہلے اُس نے فکر اور غور سے سچائیوں اور نیکیوں کو دریافت کیا اس کے بعد اُس نے اُن سچائیوں اور نیکیوں کو اپنے جذبات کا حصّہ بنا لیا پس ایسے شخص کا جذباتی عمل غیر ارادی نہیں ہوتا بلکہ ارادہ کے تابع ہوتا ہے صرف اتنی بات ہے کہ یہ اُس کام کو جو ایک دفعہ فکر سے لے چکا ہے بار بار دُہراتا

نہیں چاہتا۔ اور ایک ایسا کام جو پہلے کیا جا چکا ہوُا اسکو بغیر ضرورت دُہرانا عقلمندی تو نہیں بیوقوفی کی بات ہے پس یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی اصلاح اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک سچائیاں اور نیکیاں انسان کے جذبات کا جزو نہ بن جائیں جب تک انسان صرف فکر کی اتباع کریگا وہ دُبدہ اور شک اور دیر کا شکار رہیگا جب وہ سچائیوں اور نیکیوں کے اصول کو فکر اور غور سے معلوم کر کے اپنے جذبات کا حصّہ بنا لیگا تو دُبدہ اور شک اور دیر سے وہ محفوظ ہو جائیگا۔ وہ سچائیوں پر عمل کریگا اور نیکیاں ظاہر کرے گا مگر بغیر تردد کے، بغیر شبہ کے، بغیر دُبدہ کے۔ اور یہ چیز جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے بغیر اچھے نمونہ کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم عقلی دلیل سے اپنے دماغ کو تسلّی دیتے ہیں عقلی دلیل محبّت کے جذبات کو نہیں اُبھارا کرتی محبّت کے جذبات کو قربانی اور ایثار کا نمونہ ہی اُبھارا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی عبادت کے الفاظ کتنے ہی شاندار ہوں اُن سے وہ سوز و گداز پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک انسان کو سوز و گداز سے عبادت کرتے ہوئے دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خالی نمونہ بھی ٹھوکر کا موجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب تک فکر پاکیزہ نہ ہو جذبات رسم و رواج کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور رسم و رواج عقل اور دانائی کو قتل کر دینے والی چیزیں ہیں پس ایک ہی وقت میں مدلّل تعلیم کی بھی ضرورت ہے اور پاک نمونہ کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتابیں ہمیشہ نبیوں پر نازل ہوتی رہی ہیں۔ خالی کتاب کبھی آسمان سے نہیں پھینکی گئی۔ کتاب انسان کے دماغ کو نور بخشتی ہے اور نمونہ اُس کتاب کے مضمون کو انسان کے دل میں داخل کر دیتا ہے اور اُس کے جذبات کا حصّہ بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن میدانوں میں خدا تعالیٰ کے انبیاء کامیاب ہوئے ہیں فلاسفر ان میدانوں میں ہمیشہ ناکام ہوئے ہیں۔ کیونکہ فلاسفر اپنے فلسفوں سے ہمیشہ لوگوں کے دماغوں کی اصلاح کی فکر کرتے ہیں مگر اپنے اچھے نمونہ سے اُن کے دلوں کی اصلاح نہیں کرتے جبکہ انبیاء آسمانی کتابوں کے ذریعہ سے لوگوں کے دماغوں کو بھی نور بخشتے ہیں اور اپنے نمونہ کے ذریعہ سے اُن کے دلوں کو بھی پاک کرتے ہیں اور اُن کی ذات میں جو خدا تعالیٰ کے معجزات اور نشانات ظاہر ہوتے ہیں وہ لوگوں کے ایمان اور یقین کو بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں۔ اس اصل کو مدّنظر رکھتے ہوئے مَیں سمجھتا ہوں یہ ضروری ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کچھ حالات بھی اس موقع پر بیان کر دیئے جائیں۔

آنحضرت صلعم کے حالاتِ زندگی

خدا تعالیٰ کا یہ ایک بہت بڑا نشان اور اسلام کی صداقت کا ایک ثبوت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات جتنے ظاہر ہیں اور کسی نبی کی زندگی کے حالات اتنے ظاہر نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تفصیل کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنے اعتراض ہوئے ہیں اتنے اعتراض اور کسی نبی کے وجود پر نہیں پڑے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان اعتراضوں کے حل ہو جانے کے بعد جس شرح صدر سے اور جس اخلاص سے ایک انسان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت کر سکتا ہے اور کسی انسان کی ذات سے اتنی محبت کر ہی نہیں سکتا کیونکہ جن کی زندگیاں پوشیدہ ہوتی ہیں اُن کی محبت میں رخنہ پڑ جانے کا احتمال ہمیشہ رہتا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو ایک کھلی کتاب تھی۔ دشمن کے اعتراضات حل ہونے کے بعد کوئی ایسا کونہ نہیں رہتا جس پر سے مڑنے کے بعد آپ کی زندگی کے متعلق ایک نیا زاویہ نگاہ ہمارے

سامنے آسکتا ہو۔ نہ کوئی تہ ایسی باقی رہتی ہے جس کے کھولنے کے بعد کسی اور قسم کی حقیقت ہم پر ظاہر ہوتی ہو۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ایسے انسان کی زندگی کے حالات قرآن کریم کے دیباچہ میں ضمنی طور پر مختصراً بھی نہیں بیان کیے جا سکتے۔ صرف اُن کی طرف ایک خفیف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ خفیف اشارہ بھی اِس سے بہتر رہے گا کہ مَیں اس مضمون کو ہی ترک کر دُوں۔ کیونکہ جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے آسمانی کتب کو صحیح معنوں میں لوگوں کے دماغوں میں راسخ کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ اعلیٰ نمونہ بھی ہو۔ اور سب سے اعلیٰ نمونہ وہی ہو سکتا ہے جس پر وہ کتاب نازل ہوئی ہو۔ یہ نقطہ باریک اور فلسفیانہ ہے اور بہت سے مذاہب نے تو اس کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔ چنانچہ ہندو مذہب ویدوں کو پیش کرتا ہے مگر ویدوں کے لانیوالے رشیوں اور مُنیوں کی تاریخ کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ ہندو مذہب کے علماء اس کی ضرورت کو آج تک بھی نہیں سمجھ سکے۔ اسی طرح عیسائی اور یہودی علماء اور پادری بڑی بیباکی سے کہہ دیتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے فلاں نبی میں فلاں نقص تھا۔ وہ یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ جس شخص کو خدا تعالےٰ نے اپنے کلام کے لیے چُنا جب وہ کلام اس کی اصلاح نہیں کر سکا تو دوسرے کی اصلاح وہ کیا کریگا۔ اور اگر وہ شخص ایسا ہی ناقابلِ اصلاح تھا تو خدا تعالےٰ نے اُسے چُنا کیوں۔ کیا وجہ ہے کہ کسی اَور کو نہیں چُن لیا۔ آخر خدا تعالیٰ کے لیے کیا مجبوری تھی کہ وہ زبور کے لیے داؤد کو چُنتا۔ وہ بنی اسرائیل میں سے کسی اور انسان کا انتخاب کر سکتا تھا پس یہ دونوں باتیں غیر معقول ہیں۔ یہ خیال کر لینا کہ خدا تعالیٰ نے جس پر کلام نازل کیا وہ کلام اُس کی اصلاح نہیں کر سکا یا یہ خیال کر لینا کہ خدا تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کو چُن لیا جو ناقابلِ اصلاح تھا۔ یہ دونوں باتیں عقل کے خلاف ہیں۔ مگر بہر حال مختلف مذاہب میں اپنے منبع سے دُوری کی وجہ سے اس قسم کے غلط خیالات پیدا ہو گئے ہیں یا یُوں کہو کہ انسانی دماغ کی ترقی کے کامل نہ ہونے کے سبب سے پُرانے زمانہ میں ان چیزوں کی اہمیّت کو سمجھا ہی نہیں گیا۔ مگر اسلام میں شروع سے ہی اس امر کی اہمیت سمجھی گئی تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت عائشہ رضہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں آپ سے بیاہی گئیں اور کوئی سات سال کا عرصہ آپ کی صحبت میں رہیں۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے اُن کی عمر ۲۱ سال کی تھی اور وہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھیں۔ لیکن باوجود اس کے اُن پر یہ فلسفہ روشن تھا۔ ایک دفعہ آپ سے کسی نے سوال کیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق تو کچھ فرمائیے تو آپ نے فرمایا کَانَ خُلُقُہٗ کُلُّہُ الْقُرْاٰن (بخاری) یعنی آپ کے اخلاق کا کیا پوچھتے ہو جو کچھ آپ کہا کرتے تھے اُنہی باتوں کا قرآن کریم میں حکم ہے اور قرآن کی لفظی تعلیم آپ کے عمل سے جدا گانہ نہیں ہے۔ ہر خُلق جو قرآن کریم میں بیان ہُوا ہے اُس پر آپ کا عمل تھا اور ہر عمل جو آپ کرتے تھے اُسی کی قرآن کریم میں تعلیم ہے۔ یہ کیسی لطیف بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے رسول کریم صلی اللہ کے اخلاق اتنے وسیع اور اتنے اعلیٰ تھے کہ ایک نوجوان لڑکی جو تعلیم یافتہ بھی نہیں تھی اُس کی توجہ کو بھی اِس حد تک پھرانے میں کامیاب ہو گئے کہ ہندو۔ یہودی اور مسیحی فلسفی جس امر کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس امر کی حقیقت کو پا گئیں اور ایک چھوٹے سے فقرہ میں آپ نے یہ لطیف فلسفہ بیان کر دیا۔ کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک راستباز اور مخلص انسان دنیا کو ایک تعلیم دے۔

اور پھر اُس پر عمل نہ کرے یا خود ایک نیکی پر عمل کرے اور دنیا سے اُسے چھپائے اس لیئے تمہیں محمد رسول اللہ صلعم کے اخلاق معلوم کرنے کے لیے کسی تاریخ کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک راستباز اور مخلص انسان تھے جو کہتے تھے وہ کرتے تھے اور جو کرتے تھے وہ کہتے تھے ہم نے اُن کو دیکھا اور قرآن کریم کو سمجھ لیا۔ تم جو بعد میں آئے ہو قرآن پڑھو اور محمد رسول اللہ کو سمجھ لو۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

محمد صلعم کے ظہور کے وقت عرب کی حالت

بُت پرستی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں پیدا ہوئے اُس زمانہ کے حالات کو بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا ایک حصّہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اسی پسِ پردہ کو مدِّ نظر رکھ کر آپ کی زندگی کے حالات کی حقیقت کو انسان اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ آپؐ مکّہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور آپؐ کی پیدائش شمسی حساب سے اگست ۵۷۰ء میں بنتی ہے۔ آپ کی پیدائش پر آپ کا نام محمد رکھا گیا جس کے معنے تعریف کیے گئے کے ہیں۔ جب آپ پیدا ہوئے اُس وقت تمام کا تمام عرب سوائے چند مستثنیات کے مشرک تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ابراہیم کی نسل میں سے قرار دیتے تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ ابراہیم مشرک نہیں تھے لیکن اِس کے باوجود وہ شرک کرتے تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ بعض انسان ترقی کرتے کرتے خدا تعالیٰ کے ایسے قریب ہو گئے ہیں کہ اُن کی شفاعت خدا تعالیٰ کی درگہ میں ضرور قبول کی جاتی ہے۔ اور چونکہ خدا تعالیٰ کا وجود بہت بلند شان والا ہے اُس تک پہنچنا ہر ایک انسان کا کام نہیں کامل انسان ہی اُس تک ہی پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے عام انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی وسیلہ بنائیں اور اس وسیلہ کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی رضا مندی اور مدد حاصل کریں۔ اس عجیب و غریب عقیدہ کے رُو سے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو موحد مانتے ہوئے اپنے لیے شرک کا جواز بھی پیدا کر لیتے تھے۔ ابراہیمؑ بڑا پاکباز تھا۔ وہ خدا کے پاس براہِ راست پہنچ سکتا تھا۔ مگر مکّہ کے لوگ اس درجہ کے نہیں تھے۔ اِس لیے اُنہیں بعض بڑی ہستیوں کو وسیلہ بنانے کی ضرورت تھی جس غرض کے حصول کے لیے وہ ان ہستیوں کے بتوں کی عبادت کرتے تھے اور اس طرح اُن کو خوش کر کے خدا تعالیٰ کے دربار میں اپنا وسیلہ بنا لیتے تھے۔ اس عقیدہ میں جو نقائص اور بے جوڑ حصے ہیں اُن کے حل کرنے کی طرف اُن کا ذہن کبھی گیا ہی نہیں تھا کیونکہ کوئی موحد معلم اُن کو نہیں ملا تھا۔ جب شرک کسی قوم میں شروع ہوتا ہے تو پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے ایک سے دو بنتے ہیں اور دو سے تین بنتے ہیں چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے وقت خانہ کعبہ میں (جو اَب مسلمانوں کی مقدس مسجد ہے اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا بنایا ہوا عبادت خانہ ہے) مؤرخین کے قول کے مطابق تین سو ساٹھ ۳۶۰ بُت تھے گویا قمری مہینوں کے لحاظ سے ہر دن کے لیے ایک علیحدہ بُت تھا۔ ان بتوں کے علاوہ اردگرد کے علاقوں کے بڑے بڑے قصبات میں اور بڑی بڑی اقوام کے مراکز میں علیحدہ بُت تھے گویا عرب کا چپہ چپہ شرک میں مبتلا ہو رہا تھا۔ عرب لوگوں میں زبان کی تہذیب اور اصلاح کا خیال بہت زیادہ تھا

اُنہوں نے اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ علمی بنانے کی کوشش کی۔ مگر اس کے سوا اُن کے نزدیک علم کے کوئی معنے نہ تھے۔ تاریخ، جغرافیہ، حساب وغیرہ علوم میں سے کوئی ایک علم بھی وہ نہ جانتے تھے۔ ہاں بوجہ صحراء کی رہائش اور اس میں سفر کرنے کے علم ہئیت کے ماہر تھے۔ سارے عرب میں ایک مدرسہ بھی نہ تھا۔ مکّہ مکرّمہ میں کہا جاتا ہے کہ صرف چند گنتی کے آدمی پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔

اخلاقی لحاظ سے عرب ایک عجیب متضاد قوم تھی۔ اُن میں بعض نہایت ہی خطرناک گناہ پائے جاتے تھے اور بعض ایسی نیکیاں بھی پائی جاتی تھیں کہ جو اُن کی قوم کے معیار کو بہت بلند کر دیتی تھیں۔

شراب نوشی اور جُوا بازی

عرب شراب کے سخت عادی تھے اور شراب کے نشہ میں بیہوش ہو جانا یا بکواس کرنے لگنا اُن کے نزدیک عیب نہیں بلکہ خوبی تھا ایک شریف آدمی کی شرافت کی علامتوں میں سے یہ بھی تھا کہ وہ اپنے دوستوں اور ہمسایوں کو خوب شراب پلائے۔ امراء کے لیے دن کے پانچ وقتوں میں شراب کی مجلسیں لگانا ضروری تھا۔ جوا اُن کی قومی کھیل تھی مگر اُس کو انہوں نے ایک فن بنا لیا تھا۔ وہ جُوا اس لیے نہیں کھیلتے تھے کہ اپنے اموال کو بڑھائیں بلکہ جُوئے کو اُنہوں نے سخاوت اور بڑائی کا ذریعہ بنایا ہُوا تھا۔ مثلاً جُوا کھیلنے والوں میں یہ معاہدہ ہوتا تھا کہ جو جیتے وہ جیتے ہوئے مال سے اپنے دوستوں اور اپنی قوم کی دعوتیں کرے۔ جنگوں کے موقعہ پر جُوئے کو ہی رُوپیہ جمع کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا تھا۔ جنگ کے ایام میں آج کل بھی لاٹری کا رواج بڑھ رہا ہے مگر یورپ اور امریکہ کے لاٹری بازوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس ایجاد کا سہرا عربوں کے سر ہے۔ جب کبھی جنگ ہوتی تھی عرب قبائل آپس میں جُوا کھیلتے تھے اور جو جیتتا تھا وہ جنگ کے اکثر اخراجات اُٹھاتا تھا۔ غرض دُنیا کی دوسری آسائشوں اور سہولتوں سے محروم ہونے کا بدلہ عربوں نے شراب اور جوئے سے لیا تھا۔

تجارت

عرب لوگ تاجر تھے اور اُن کے تجارت کے قافلے دُور دُور تک جاتے تھے۔ ایبے سینیا سے بھی وہ تجارت کرتے تھے اور شام اور فلسطین سے بھی وہ تجارت کرتے تھے۔ ہندوستان سے بھی اُن کے تجارتی تعلقات تھے۔ اُن کے امراء ہندوستان کی بنی ہوئی تلواروں کی خاص قدر کرتے تھے۔ کپڑا زیادہ تر یمن اور شام سے آتا تھا۔ یہ تجارتیں عرب کے شہروں کے ہاتھ میں تھیں۔ بقیہ عرب سوائے یمن اور بعض شمالی علاقوں کے بدوی زندگی بسر کرتے تھے نہ اُنکے کوئی شہر تھے نہ اُن کی کوئی بستیاں تھیں۔ صرف قبائل نے ملک کے علاقے تقسیم کیے ہوئے تھے۔ اِن علاقوں میں وہ چکّر کھاتے پھرتے تھے۔ جہاں کا پانی ختم ہو جاتا تھا وہاں سے چل پڑتے تھے اور جہاں پانی مل جاتا تھا وہاں ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ بھیڑ۔ بکریاں۔ اُونٹ اُن کی پونجی ہوتے تھے اُن کی صُوف اور اُون سے کپڑے بناتے۔ اُن کی کھالوں سے خیمے بناتے اور جو حصّہ بچ جاتا اُسے منڈیوں میں لے جا کر بیچ ڈالتے۔

عرب کے دیگر حالات وعادات وخصائل

سونے چاندی سے وہ ناآشنا تو نہ تھے۔ مگر سونا اور چاندی اُن کے لیے ایک نہایت ہی کمیاب جنس تھی۔ حتیٰ کہ اُن کے عوام اور غرباء میں زیورات کوڑیوں اور خوشبودار مصالحوں سے بنائے جاتے تھے۔ لونگ اور خربوزوں

اور لکڑیوں وغیرہ کے بیج اور اسی قسم کی چیزوں سے وہ ہار تیار کرتے اور اُن کی عورتیں یہ ہار پہنکر زیوروں سے مستغنی ہوجاتی تھیں فسق وفجور کثرت سے تھا۔ چوری کم تھی مگر ڈاکہ بے انتہاء تھا۔ ایک دوسرے کو لُوٹ لینا وہ ایک قومی حق سمجھتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی قول کی پاسداری جتنی عربوں میں ملتی ہے اُتنی اور کسی قوم میں نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص کسی طاقتور آدمی یا قوم کے پاس آکر کہہ دیتا کہ میں تمہاری پناہ میں آگیا ہوں تو اُس شخص یا اس قوم کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ وہ اس کو پناہ دے۔ اگر وہ قوم اُسے پناہ نہ دے تو سارے عرب میں وہ ذلیل ہوجاتی تھی۔ شاعروں کو بہت بڑا اقتدار حاصل تھا وہ گویا قومی لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ لیڈروں کے لیے زبان کی فصاحت اور اگر ہوسکے تو شاعر ہونا نہایت ضروری تھا۔ مہمان نوازی انتہاء درجہ تک پہنچی ہوئی تھی جنگل میں بھُولا بھٹکا مسافر اگر کسی قبیلہ میں پہنچ جاتا اور کہتا میں تمہارا مہمان آیا ہوں تو وہ بے دریغ بکرے اور دُنبے اور اونٹ ذبح کردیتے تھے۔ اُن کے لیے مہمان کی شخصیت میں کوئی دلچسپی نہ تھی، مہمان کا آجانا ہی اُن کے نزدیک قوم کی عزت اور احترام کو بڑھانے والا تھا اور قوم پر فرض ہوجاتا تھا کہ اُس کی عزّت کرکے اپنی عزت کو بڑھائے۔ عورتوں کو کوئی حقوق اُس قوم میں حاصل نہیں تھے۔ بعض قبائل میں یہ عزّت کی بات سمجھی جاتی تھی کہ باپ اپنی لڑکی مار ڈالے۔ مؤرخین یہ بات غلط لکھتے ہیں کہ سارے عرب میں لڑکیوں کو مارنے کا رواج تھا۔ یہ رواج تو طبعی طور پر سارے ملک میں ہو نہیں سکتا کیونکہ اگر سارے ملک میں یہ رواج جاری ہوجائے تو پھر اُس ملک کی نسل کس طرح باقی رہ سکتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عرب اور ہندوستان اور دوسرے ممالک میں جہاں بھی یہ رواج پایا جاتا ہے اس کی صورت یہ ہُوا کرتی ہے کہ بعض خاندان اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر یا بعض خاندان اپنے آپ کو ایسی مجبوریوں میں مبتلا دیکھ کر کہ اُن کی لڑکیوں کے لیے اُن کی شان کے مطابق رشتے نہیں ملیں گے لڑکیوں کو مار دیا کرتے ہیں۔ اس رواج کی بُرائی اُس کے ظلم میں ہے نہ اس امر میں کہ ساری قوم میں سے لڑکیوں کو مٹا دیا جاتا ہے۔ عربوں کی بعض قوموں میں تو لڑکیاں مارنے کا طریقہ یُوں رائج تھا کہ وہ لڑکی زندہ دفن کردیتے تھے اور بعض میں اس طرح کہ وہ اُس کا گلا گھونٹ دیتے تھے اور بعض اور طریقوں سے ہلاک کردیتے تھے۔ اصلی ماں کے سوا دوسری ماؤں کو عرب لوگ ماں نہیں سمجھتے تھے اور اُن سے شادیاں کرنے میں حرج نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ باپ کے مرنے کے بعد کئی لڑکے اپنی سوتیلی ماؤں سے بیاہ کرلیتے تھے۔ کثرتِ ازدواج عام تھی کوئی حدبندی نکاحوں کی نہیں ہوتی تھی۔ ایک سے زیادہ بہنوں سے بھی ایک شخص شادی کرلیتا تھا۔ لڑائی میں سخت ظلم کرتے تھے جہاں بُغض بہت زیادہ ہوتا تھا زخمیوں کے پیٹ چاک کرکے اُن کے کلیجے چبا جاتے تھے۔ ناک کان کاٹ دیتے تھے۔ آنکھیں نکال دیتے تھے۔ غلامی کا رواج عام تھا۔ اردگرد کے کمزور قبائل کے آدمیوں کو پکڑ کے لے آتے تھے اور اُن کو غلام بنا لیتے تھے غلام کو کوئی حقوق حاصل نہیں تھے۔ ہر مالک اپنے غلام سے جو چاہتا سلوک کرتا اُس کے خلاف کوئی گرفت نہ تھی۔ اگر وہ قتل بھی کردیتا تو اس پر کوئی الزام نہ آتا تھا۔ اگر کسی دوسرے آدمی کے غلام کو مار دیتا تب بھی وہ موت کی سزا سے محفوظ سمجھا جاتا تھا اور مالک کو کچھ معاوضہ دیکر آزادی حاصل کرلیتا تھا۔ لونڈیوں کو اپنی شہوانی ضرورتوں کے پورا کرنے کا ذریعہ بنانا ایک قانونی حق تسلیم کیا جاتا تھا لونڈیوں کی اولادیں بھی آگے غلام ہوتی تھیں اور صاحبِ اولاد لونڈیاں بھی لونڈیاں ہی رہتی تھیں۔ غرض جہاں تک علم و ترقی

کا سوال ہے عرب لوگ بہت پیچھے تھے، جہاں تک بین الاقوامی رحم اور حسنِ سلوک کا سوال ہے عرب لوگ بہت پیچھے تھے، جہاں تک جنسِ نازک کے تعلق کا سوال ہے عرب لوگ دوسری اقوام سے بہت پیچھے تھے۔ مگر بعض شخصی اور بہادرانہ اخلاق ان میں ضرور پائے جاتے تھے اور اس حد تک پائے جاتے تھے کہ شاید اُس زمانہ کی دوسری قوموں میں اس کی مثال نہیں پائی جاتی۔

آنحضرت صلعم کی ولادت

اس ماحول میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش سے پہلے ہی آپ کے والد جن کا نام عبداللہ تھا فوت ہو گئے تھے اور آپ کو اور آپ کی والدہ حضرت آمنہ کو اُن کے دادا عبدالمطلب نے اپنی کفالت میں لے لیا تھا عرب کے رواج کے مطابق آپ کو دُودھ پلانے کے لیے طائف کے پاس رہنے والی ایک عورت کے سپرد کیا گیا۔ عرب لوگ اپنے بچوں کو دیہاتی عورتوں کے سپرد کر دیا کرتے تھے تاکہ اُن کی زبان صاف ہو جائے اور اُن کی صحت درست ہو۔ آپ کی عمر کے پہلے سال میں آپکی والدہ بھی مدینہ سے آتے ہوئے جہاں وہ اپنے ننھیال کو ملنے گئی تھیں مدینہ اور مکّہ کے درمیان فوت ہو گئیں اور وہیں دفن ہوئیں اور آپکو ایک خادمہ اپنے ساتھ مکّہ لائی اور دادا کے سپرد کر دیا۔ آپ آٹھویں سال میں تھے کہ آپکے دادا جو آپ کے نگران تھے وہ بھی فوت ہو گئے اور آپکے چچا ابو طالب اپنے والد کی وصیّت کے مطابق آپ کے نگران ہوئے۔ عرب سے باہر آپ کو دو تین دفعہ جانے کا موقعہ ملا جن میں سے ایک سفر آپ نے بارہ سال کی عمر میں اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ کیا جو کہ تجارت کے لیے شام کی طرف گئے تھے۔ یہ سفر آپ کا غالباً شام کے جنوب مشرقی تجارتی شہروں تک ہی محدود تھا کیونکہ اس سفر میں بیت المقدس وغیرہ جگہوں میں سے کسی کا ذکر نہیں آتا۔ اس کے بعد آپ جوانی تک مکّہ میں ہی مقیم رہے۔

مجلس حِلف الفضُول میں آپؐ کی شمولیّت

آپؐ کی طبیعت بچپن سے ہی سوچنے اور فکر کرنے کی طرف مائل تھی اور لوگوں کی لڑائیوں جھگڑوں میں آپ دخل نہیں دیا کرتے تھے بلکہ لڑائیوں اور فسادوں کے دُور کرانے میں حصّہ لیتے تھے چنانچہ مکّہ اور اس کے گرد و نواح کے قبائل کی لڑائیوں سے تنگ آ کر جب مکّہ کے کچھ نوجوانوں نے ایک انجمن بنائی جس کی غرض یہ تھی کہ وہ مظلوموں کی مدد کیا کریگی، تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے شوق سے اُس مجلس میں شامل ہو گئے۔ اس مجلس کے ممبروں نے ان الفاظ میں قسمیں کھائی تھیں کہ :-

”وہ مظلوموں کی مدد کریں گے اور اُن کے حق اُن کو لیکر دیں گے جب تک کہ سمندر میں ایک قطرہ پانی کا موجود ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکیں گے تو وہ خود اپنے پاس سے مظلوم کا حق ادا کر دیں گے“

شاید اس قسم پر عمل کرنیکا موقعہ آپکے سوا اور کسی کو نہیں ملا جب آپنے دعوئ نبوّت کیا اور سب سے زیادہ مکّہ کے سردار ابوجہل نے آپکی مخالفت میں حصّہ لیا اور لوگوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کوئی بات نہ کرے۔ اُن کی کوئی بات نہ مانے۔ ہر ممکن طریق سے اُن کو ذلیل کرے۔ اُس وقت ایک شخص جس نے ابوجہل سے کچھ قرضہ وصول کرنا تھا مکّہ میں آیا اور اُس نے ابوجہل سے اپنے قرضہ کا مطالبہ کیا۔ ابوجہل نے اُس کا قرض ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے مکّہ کے بعض لوگوں سے اس امر کی شکایت کی اور بعض نوجوانوں نے شرارت سے اُسے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ بتایا کہ اُن کے پاس جاؤ وہ تمہاری اِس بارہ میں مدد کرینگے۔ اُن کی غرض یہ تھی کہ یا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس مخالفت کے مدّ نظر جو مکّہ والوں کی طرف سے عموماً اور ابوجہل کی طرف سے خصوصاً ہو رہی تھی اُس کی امداد کرنے سے انکار کر دینگے اور اس طرح عربوں میں ذلیل ہو جائیں گے اور قسم توڑنے والے کہلائیں گے۔ یا پھر آپ اُسکی مدد کے لیے ابوجہل کے پاس جائینگے اور وہ آپ کو ذلیل کر کے اپنے گھر سے نکال دیگا۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ شخص گیا اور اُس نے ابوجہل کی شکایت کی تو آپ بلا تامّل اُٹھ کر اُسکے ساتھ چل دیے اور ابوجہل کے دروازہ پر جا کر دستک دی۔ ابوجہل گھر سے باہر نکلا اور دیکھا کہ اُس کا قرضخواہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُسکے دروازہ پر کھڑا ہے۔ آپ نے فوراً اُسے توجہ دلائی کہ اِس شخص کا تم نے فلاں فلاں حق دینا ہے اس کو ادا کرو۔ اور ابوجہل نے بلا چون وچرا اُس کا حق اُسے ادا کر دیا۔ جب شہر کے دوسرے رؤوساء نے ابوجہل کو ملامت کی کہ تم ہم کو تو یہ کہا کرتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ذلیل کرو اور اُس سے کوئی تعلق نہ رکھو لیکن تم نے خود اُسکی بات مانی اور اسکی عزّت قائم کی، تو ابوجہل نے کہا خدا کی قسم اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔ میں نے دیکھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں اور بائیں مست اُونٹ کھڑے ہیں جو میری گردن مروڑ کر مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی روایت میں کوئی صداقت ہے یا نہیں۔ آیا اُسے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نشان دکھایا تھا یا صرف اس پر حق کا رُعب چھا گیا اور اُس نے یہ دیکھکر کہ سارے مکّہ کا مطعون اور مقہور انسان ایک مظلوم کی حمایت کے جوش میں اکیلا بغیر کسی ظاہری مدد کے مکّہ کے سردار کے دروازہ پر کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ اِس شخص کا جو حق تم نے دینا ہے وہ ادا کر دو تو حق کے رُعب نے اُس کی شرارت کی رُوح کو کچل دیا اور اُسے سچائی کے آگے سر جھکانا پڑا۔

حضرت خدیجہ رضؓ سے آنحضرت صلعم کی شادی

جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۵ سال کے ہوئے تو آپکی نیکی اور آپکے تقویٰ کی شہرت شہر میں عام طور پر پھیل چکی تھی۔ لوگ آپ کی طرف انگلیاں اُٹھاتے اور کہتے یہ سچا انسان جا رہا ہے۔ یہ امانت والا انسان جا رہا ہے۔ یہ خبریں مکّہ کی ایک مالدار بیوہ کو بھی پہنچیں اور اُس نے آپکے چچا ابوطالب سے خواہش کی کہ وہ اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہیں کہ اُس کا تجارتی مال جو شام کے تجارتی قافلہ کے ساتھ جا رہا ہے وہ اُس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے۔ ابوطالب نے آپؐ سے ذکر کیا اور آپ نے اس بات کو منظور کر لیا۔ اس سفر میں آپ کو بڑی کامیابی ہوئی اور اُمید سے زیادہ نفع کے ساتھ آپ لوٹے۔ خدیجہؓ نے محسوس کیا کہ یہ نفع صرف منڈیوں کے حالات کی وجہ سے نہیں بلکہ امیر قافلہ کی نیکی اور دیانت کی وجہ سے ہے۔ اُس نے اپنے غلام میسرہ سے جو آپ کے ساتھ تھا آپکے حالات دریافت کیے اور اُس نے بھی اُس کے خیال کی تائید کی اور بتایا کہ سفر میں جس دیانتداری اور خیر خواہی سے آپنے کام کیا ہے وہ صرف آپ ہی کا حصّہ تھا۔ اس بات کا حضرت خدیجہؓ کی طبیعت پر خاص اثر ہُوا۔ باوجود اس کے کہ وہ اُس وقت چالیس۴۰ سال کی تھیں اور دو دفعہ بیوہ ہو چکی تھیں انہوں نے اپنی ایک سہیلی کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھجوایا تا معلوم کرے کہ کیا آپ اُن سے شادی کرنے پر رضامند ہوں گے۔ وہ سہیلی آپؐ کے پاس آئی اور اُس نے آپ سے پوچھا کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے کہا میرے

پاس کوئی مال نہیں ہے جس سے میں شادی کروں۔ اُس سہیلی نے کہا اگر یہ مشکل دُور ہو جائے اور ایک شریف امیر عورت سے آپ کی شادی ہو جائے تو پھر؟ آپ نے فرمایا وہ کون عورت ہے؟ اُس نے کہا خدیجہؓ۔ آپ نے فرمایا میں اُس تک کس طرح پہنچ سکتا ہوں؟ اِس پر اُس سہیلی نے کہا کہ یہ میرے ذمہ رہا۔ آپ نے فرمایا مجھے منظور ہے۔ تب خدیجہؓ نے آپ کے چچا کی معرفت شادی کا فیصلہ پختہ کیا اور آپ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی۔ ایک غریب و یتیم نوجوان کے لیے دولت کا یہ پہلا دروازہ کھلا، مگر اُس نے اِس دولت کو جس طرح استعمال کیا وہ ساری دنیا کے لیے ایک سبق آموز واقعہ ہے۔

غلاموں کی آزادی اور زیدؓ کا ذکر

آپ کی شادی کے بعد جب حضرت خدیجہؓ نے یہ محسوس کیا کہ آپ کا حساس دل ایسی زندگی میں کوئی خاص لطف نہیں پائیگا کہ آپ کی بیوی مالدار ہو اور آپ اُس کے محتاج ہوں تو اُنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مَیں اپنا مال اور اپنے غلام آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے کہا خدیجہ کیا سچ مچ؟ جب اُنہوں نے پھر دوبارہ اقرار کیا تو آپ نے فرمایا۔ میرا پہلا کام یہ ہوگا کہ مَیں غلاموں کو آزاد کر دوں۔ چنانچہ آپ نے اُسی وقت حضرت خدیجہؓ کے غلاموں کو بُلایا اور فرمایا تم سب لوگ آج سے آزاد ہو اور مال کا اکثر حصہ غرباء میں تقسیم کر دیا۔ جو غلام آپ نے آزاد کیے اُن میں ایک زیدؓ نامی غلام بھی تھا۔ وہ دوسرے غلاموں سے زیادہ زیرک اور زیادہ ہوشیار تھا کیونکہ وہ ایک شریف اور معزز خاندان کا لڑکا تھا جسے بچپن میں ڈاکو چُرا کر لے گئے تھے اور وہ بکتا بکاتا مکّہ میں پہنچا تھا۔ اُس نوجوان نے اپنی زیرکی اور ہوشیاری سے اِس بات کو سمجھ لیا کہ آزادی کی نسبت اِس شخص کی غلامی بہت بہتر ہے۔ جب آپؐ نے غلاموں کو آزاد کیا جن میں زیدؓ بھی تھا تو زیدؓ نے کہا آپ تو مجھے آزاد کرتے ہیں پر مَیں آزاد نہیں ہوتا، مَیں آپ کے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ آپ کے ساتھ رہا اور روز بروز آپ کی محبت میں بڑھتا چلا گیا۔ چونکہ وہ ایک مالدار خاندان کا لڑکا تھا۔ اُس کے باپ اور چچا ڈاکوؤں کے پیچھے پیچھے اپنے بچہ کو تلاش کرتے ہوئے نکلے۔ آخر اُنہیں معلوم ہوا کہ اُن کا لڑکا مکّہ میں ہے چنانچہ وہ مکّہ میں آئے اور پتہ لیتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پہنچے اور آپ سے عرض کیا کہ آپ ہمارے بچے کو آزاد کر دیں اور جتنا روپیہ چاہیں لے لیں۔ آپ نے فرمایا زیدؓ کو تو مَیں آزاد کر چکا ہوں وہ بڑی خوشی سے آپ لوگوں کے ساتھ جا سکتا ہے۔ پھر آپ نے زیدؓ کو بُلا کر اُس کے باپ اور چچا سے ملوا دیا۔ جب دونوں فریق مل چکے اور آنسوؤں سے اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے۔ تو زیدؓ کے باپ نے اُس سے کہا کہ اس شریف آدمی نے تم کو آزاد کر دیا ہے تمہاری ماں تمہاری یاد میں تڑپ رہی ہے اب تم جلدی چلو اور اُس کے لیے راحت اور تسکین کا موجب بنو۔ زیدؓ نے کہا ماں اور باپ کس کو پیارے نہیں ہوتے میرا دل بھی اس محبت سے خالی نہیں ہے مگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت اس قدر میرے دل میں داخل ہو چکی ہے کہ اس کے بعد میں آپ سے جدا نہیں ہو سکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ مَیں نے آپ لوگوں سے مل لیا۔ لیکن محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے جدا ہونا میری طاقت سے باہر ہے۔ زیدؓ کے باپ اور چچا نے بہت زور دیا مگر زیدؓ نے اُن کے ساتھ جانا منظور نہ کیا۔ زیدؓ کی اِس محبت کو دیکھکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ زیدؓ آزاد تو پہلے ہی تھا مگر آج سے یہ میرا بیٹا ہے۔ اِس نئی صورتِ حالات کو دیکھکر زیدؓ کے باپ اور چچا

واپس وطن چلے گئے اور زید ہمیشہ کے لیے مکہ کے ہو گئے۔

غارِ حرا میں خدا کی عبادت کرنا

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب تیس سال سے زیادہ ہوئی تو آپ کے دل میں خدا تعالیٰ کی عبادت کی رغبت پہلے سے زیادہ جوش مارنے لگی۔ آخر آپ شہر کے لوگوں کی شرارتوں، بدکاریوں اور خرابیوں سے متنفر ہو کر مکہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک پتھروں سے بنی ہوئی چھوٹی سی غار میں خدا تعالیٰ کی عبادت کرنے لگ گئے۔ حضرت خدیجہؓ چند دن کی غذا آپ کے لیے تیار کر دیتیں۔ آپ وہ لیکر حرا میں چلے جاتے تھے اور اُن دو تین پتھروں کے اندر بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت میں رات اور دن مصروف رہتے تھے۔

پہلی قرآنی وحی

جب آپ چالیس سال کے ہوئے ایک دن آپ نے اسی غار میں ایک کشفی نظارہ دیکھا کہ ایک شخص آپ کو مخاطب ہو کے کہتا ہے "پڑھئیے"۔ آپ نے فرمایا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ اس پر اُس نے دوبارہ اور سہ بارہ کہا اور آخر پانچ فقرے اُس نے آپ سے کہلوائے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ یہ وہ قرآنی ابتدائی وحی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کو اپنے رب کے نام پر جس نے تجھ کو بھی اور سب مخلوق کو بھی پیدا کیا ہے پڑھکر آسمانی پیغام سُنا دے۔ وہ خدا جس نے انسان کو ایسے طور پر پیدا کیا ہے کہ اُس کے دل میں خدا تعالیٰ اور اس کی مخلوق کی محبت کا بیج پایا جاتا ہے۔ ہاں سب دنیا کو یہ پیغام سُنا دے کہ تیرا رب جو سب سے زیادہ عزت والا ہے تیرے ساتھ ہوگا۔ وہ جس نے دنیا کو علوم سکھانے کے لیے قلم بنائی ہے اور انسان کو وہ کچھ سکھانے کے لیے آمادہ ہُوا ہے جو اس سے پہلے انسان نہیں جانتا تھا۔ یہ چند الفاظ قرآن کریم کی اُن سب تعلیموں پر حاوی ہیں جو آئندہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونیوالی تھیں۔ اور دنیا کی اصلاح کا ایک اہم بیج اُن کے اندر پایا جاتا تھا۔ اِن کی تفسیر تو قرآن شریف میں اپنے موقع پر آئیگی اس موقع پر ان آیتوں کا اس لیے ذکر کر دیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ ایک اہم واقعہ ہے۔ اور قرآن کریم کے لیے یہ آیات ایک بُنیادی پتھر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ کلام نازل ہُوا۔ تو آپ کے دل میں یہ خوف پیدا ہُوا کہ کیا میں خدا تعالیٰ کی اتنی بڑی ذمہ واری ادا کر سکوں گا؟ کوئی اور ہوتا تو کبر اور غرور سے اُس کا دماغ بھر جاتا کہ خدائے قادر نے ایک کام میرے سپرد کیا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کام کرنا جانتے تھے کام پر اترانا نہیں جانتے تھے۔ آپ اس الہام کے بعد حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے۔ آپ کا چہرہ اُترا ہُوا تھا اور گھبراہٹ کے آثار ظاہر تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے پوچھا آخر ہُوا کیا؟ آپ نے سارا واقعہ سنایا اور فرمایا میرے جیسا کمزور انسان اس بوجھ کو کس طرح اُٹھا سکیگا۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِی الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری باب بدء الوحی) خدا کی قسم یہ کلام خدا تعالیٰ نے اِس لیے آپ پر نازل نہیں کیا کہ آپ ناکام اور نامراد ہوں اور خدا آپ کا ساتھ چھوڑ دے۔ خدا تعالیٰ ایسا کب کر سکتا ہے آپ تو وہ ہیں کہ آپ رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں

اور بیکس اور بے مددگار لوگوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ وہ اخلاق جو ملک سے مٹ چکے تھے وہ آپ کی ذات کے ذریعہ سے دوبارہ قائم ہو رہے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں اور سچی مصیبتوں پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ کیا ایسے انسان کو خدا تعالیٰ ابتلاء میں ڈال سکتا ہے؟ پھر وہ آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عیسائی ہو چکے تھے۔ انہوں نے جب یہ واقعہ سنا تو بے اختیار بول اُٹھے آپ پر وہی فرشتہ نازل ہوا ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوا تھا گویا استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ والی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا۔ جب اس بات کی خبر زیدؓ آپ کے آزاد کردہ غلام کو جو اُس وقت کوئی پچیس تیس سال کے تھے اور علیؓ آپ کے چچا کے بیٹے کو جن کی عمر اُس وقت گیارہ سال کی تھی پہنچی تو دونوں آپ پر فوراً ایمان لے آئے۔

حضرت ابوبکرؓ کا آنحضرت صلعم پر ایمان لانا

ابوبکرؓ آپ کے بچپن کے دوست جو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، جب شہر میں داخل ہوئے تو معاً اُن کے کانوں میں یہ آوازیں پڑنی شروع ہوئیں، تمہارا دوست پاگل ہو گیا ہے، وہ کہتا ہے آسمان سے فرشتے اُتر کر مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ ابوبکر سیدھے آپ کے دروازہ پر آئے اور دستک دی۔ جب آپ نے دروازہ کھولا تو انہوں نے آپ سے حقیقتِ حال کے متعلق سوال کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بچپن کے دوست کو ٹھوکر سے بچانے کے لیے کچھ تشریح کرنی چاہی۔ ابوبکرؓ نے روکا اور کہا کہ مجھے صرف اتنا جواب دیجیے کہ کیا آپ نے یہ اعلان کیا ہے کہ خدا کے فرشتے آپ کے پاس آئے اور انہوں نے آپ سے باتیں کیں؟ آپ نے پھر تشریح کرنی چاہی مگر ابوبکرؓ نے قسم دے کر کہا کہ صرف میرے اِس سوال کا جواب دیجئے اور کچھ نہ کہیئے۔ جب آپ نے اثبات میں جواب دیا تو ابوبکرؓ نے کہا گواہ رہیئے میں آپ پر ایمان لاتا ہوں اور پھر کہا یا رسول اللہؐ آپ تو دلائل دے کر میرے ایمان کو کمزور کرنے لگے تھے۔ جس نے آپ کی زندگی کو دیکھا ہو کیا اُسے آپ کی سچائی کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت ہو سکتی ہے؟

مومنوں کی چھوٹی سی جماعت

یہ ایک چھوٹی سی جماعت تھی جس سے اسلام کی بنیاد پڑی۔ ایک عورت کہ بڑھاپے کو پہنچ رہی تھی، ایک گیارہ سالہ بچہ، ایک جوان آزاد کردہ غلام بیوطن اور غیروں میں رہنے والا جس کی پشت پر کوئی نہ تھا۔ ایک نوجوان دوست اور ایک مدعیٔ الہام۔ یہ چھوٹا سا قافلہ تھا جو دنیا میں نُور پھیلانے کے لیے کفر و ضلالت کے میدان کی طرف نکلا۔ لوگوں نے جب یہ باتیں سُنیں اُنہوں نے قہقہے لگائے اُنہوں نے ایک دوسرے کو آنکھیں ماریں اور نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو جتایا کہ یہ لوگ مجنون ہو گئے ہیں اِن کی باتوں سے گھبراؤ نہیں، بلکہ سُنو اور مزہ اُٹھاؤ۔ مگر حق اپنی پوری شان کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہوا اور یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مطابق "حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون۔ قانون پر قانون۔" (باب ۲۸ آیت ۱۳) ہوتا گیا۔ "تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں" اور "ایک اجنبی زبان" سے جس سے عرب پہلے ناآشنا تھے، خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عربوں سے باتیں کرنی شروع کیں۔ نوجوانوں کے دل لرزنے لگے صداقت کے متلاشیوں کے جسموں پر کپکپی پیدا ہوئی۔ اُن کی ہنسی اور ٹھٹھے اور استہزاء کی آوازوں میں پسندیدگی اور تحسین کے کلمات بھی آہستہ آہستہ بلند ہونے شروع ہوئے۔ غلاموں، نوجوانوں اور مظلوم عورتوں کا ایک جتھا آپ کے گرد جمع ہونے لگ گیا۔ کیونکہ آپ کی

آوازیں عورتیں اپنے حقوق کی دادرسی دیکھ رہی تھیں۔ غلام اپنی آزادی کا اعلان سُن رہے تھے، نوجوان بڑی بڑی امیدوں اور ترقیوں کے راستے کھلتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔

لیڈرانِ مکّہ کی مخالفت

جب ہنسی اور ٹھٹھے کی آوازوں میں سے تحسین اور تعریف کی آوازیں بھی بلند ہونی شروع ہوگئیں، تو مکّہ کے رؤسا گھبرا گئے حکام کے دل میں خوف پیدا ہونے لگا۔ تب وہ جمع ہوئے اور انہوں نے مشورے کیے اور منصوبے باندھے اور ہنسی اور ٹھٹھے کی جگہ ظلم اور تعدّی اور سختی اور قطع تعلّق کی تجاویز کا فیصلہ کیا گیا اور اُن پر عمل ہونا شروع ہُوا۔ اب مکّہ سنجیدگی سے اسلام کے ساتھ ٹکرانے کا فیصلہ کر چکا تھا، اب وہ "پاگلانہ" دعویٰ ایک ترقی کرنے والی حقیقت نظر آرہا تھا مکّہ کی سیاست کے لیے خطرہ، مکّہ کے مذہب کے لیے خطرہ، مکّہ کے تمدّن کے لیے خطرہ اور مکّہ کے رسم ورواج کے لیے خطرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اسلام ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین بنا تا ہُوا نظر آتا تھا جس نئے آسمان اور نئی زمین کے ہوتے ہوئے عرب کا پُرانا آسمان اور پُرانی زمین قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ اب یہ سوال مکّہ والوں کے لیے ہنسی کا سوال نہیں رہا تھا اب یہ زندگی اور موت کا سوال تھا اُنہوں نے اسلام کے چیلنج کو قبول کیا اور اسی رُوح کے ساتھ قبول کیا جس رُوح کے ساتھ نبیوں کے دشمن نبیوں کے چیلنج کو قبول کرتے چلے آئے تھے۔ اور دلیل کا جواب دلیل سے نہیں بلکہ تلوار اور تیر کے ساتھ دینے پر آمادہ ہوگئے۔ اسلام کی خیر خواہی کا جواب ویسے ہی بلند اخلاق کے ذریعہ سے نہیں بلکہ گالی گلوچ اور بدکلامی سے دینے کا اُنہوں نے فیصلہ کر لیا۔ ایک دفعہ پھر دنیا میں کفر اور اسلام کی لڑائی شروع ہوگئی۔ ایک دفعہ پھر شیطان کے لشکروں نے فرشتوں پر حملہ بول دیا۔ بھلا اُن مُٹھی بھر آدمیوں کی طاقت ہی کیا تھی کہ مکّہ والوں کے سامنے ٹھہر سکیں۔ عورتیں بے شرمانہ طریقوں سے قتل کی گئیں، مردوں کی ٹانگیں چیر چیر کر اُن کو مار ڈالا گیا۔ غلاموں کو تپتی ہوئی ریت اور کھُردرے پتھروں پر گھسیٹا گیا۔ اِس حد تک کہ اُن کے چمڑے انسانی چمڑوں کی شکلیں بدل کر حیوانی چمڑے بن گئے۔ دیر بعد اسلام کی فتح کے زمانہ میں جب اسلام کا جھنڈا مشرق ومغرب میں لہرا رہا تھا۔ ایک دفعہ ایک ابتدائی نو مسلم غلام خبابؓ کی پیٹھ ننگی ہوئی تو اُن کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اُس کی پیٹھ کا چمڑہ انسانوں جیسا نہیں جانوروں جیسا ہے وہ گھبرا گئے اور اس سے دریافت کیا کہ آپ کو یہ کیا بیماری ہے؟ وہ ہنسے اور کہا بیماری نہیں یہ یادگار ہے اُس وقت کی جب ہم نو مسلم غلاموں کو عرب کے لوگ مکّہ کی گلیوں میں سخت اور کھُردرے پتھروں پر سے گھسیٹا کرتے تھے اور متواتر یہ ظلم ہم پر روا رکھے جاتے تھے اسی کے نتیجہ میں میری پیٹھ کا چمڑہ یہ شکل اختیار کر گیا ہے۔

مومن غلاموں پر کفارِ مکّہ کا ظلم وستم

یہ غلام جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے مختلف اقوام کے تھے اِن میں حبشی بھی تھے جیسے بلالؓ، یونانی بھی تھے جیسے صہیبؓ۔ پھر اُن میں عیسائی بھی تھے جیسے جبرؓ اور صہیبؓ اور مشرکین بھی تھے جیسے بلالؓ اور عمارؓ۔ بلالؓ کو اُسکے مالک تپتی ریت میں لٹا کر اوپر یا تو پتھر رکھ دیتے یا نوجوانوں کو سینہ پر کودنے کیلئے مقرر کر دیتے۔ حبشی النسل بلالؓ، امیہ بن خلف نامی ایک مکّی رئیس کے غلام تھے۔ امیہ اُنہیں دوپہر کے وقت گرمی کے موسم میں مکّہ سے باہر لے جا کر تپتی ہوئی ریت پر ننگا کر کے لٹا دیتا تھا اور بڑے بڑے گرم پتھر اُن کے

سینہ پر رکھ کر کہتا تھا کہ لات اور عزّیٰ کی الوہیت کو تسلیم کر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے علیحدگی کا اظہار کر۔ بلالؓ اُس کے جواب میں کہتے اَحَدٌ اَحَدٌ یعنی اللہ ایک ہی ہے اللہ ایک ہی ہے۔ بار بار آپ کا یہ جواب سُنکر اُمیّہ کو اور غصّہ آجاتا اور وہ آپ کے گلے میں رسّہ ڈال کر شریر لڑکوں کے حوالے کر دیتا اور کہتا کہ اُن کو مکّہ کی گلیوں میں پتھروں کے اُوپر سے گھسیٹتے ہوئے لے جائیں جس کی وجہ سے اُن کا بدن خون سے تر بتر ہو جاتا مگر وہ پھر بھی اَحَدٌ اَحَدٌ کہتے چلے جاتے یعنی خدا ایک خدا ایک۔ دیر بعد جب خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو مدینہ میں امن دیا جب وہ آزادی سے عبادت کرنے کے قابل ہو گئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کو اذان دینے کے لیے مقرر کیا۔ یہ حبشی غلام جب اذان میں اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی بجائے اَسْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہتا تو مدینہ کے لوگ جو اُس کے حالات سے ناواقف تھے ہنسنے لگ جاتے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بلالؓ کی اذان پر ہنستے ہوئے سُنا تو آپ لوگوں کی طرف مُڑے اور کہا تم بلالؓ کی اذان پر ہنستے ہو مگر خدا تعالیٰ عرش پر اُس کی اذان سُنکر خوش ہوتا ہے۔ آپ کا اشارہ اسی طرف تھا کہ تمہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ یہ "ش" نہیں بول سکتا۔ مگر "ش" اور "س" میں کیا رکھا ہے۔ خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ جب تپتی ریت پر ننگی پیٹھ کے ساتھ اُس کو لٹا دیا جاتا تھا اور اس کے سینہ پر ظالم اپنی جوتیوں سمیت کُودا کرتے تھے اور پوچھتے تھے کہ کیا اب بھی سبق آیا ہے یا نہیں؟ تو یہ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اَحَدٌ اَحَدٌ کہہ کر خدا تعالیٰ کی توحید کا اعلان کرتا رہتا تھا اور اپنی وفاداری، اپنے توحید کے عقیدہ اور اپنے دل کی مضبوطی کا ثبوت دیتا تھا۔ پس اُس کا اَسْھَدُ بہت سے لوگوں کے اَشْھَدُ سے زیادہ قیمتی تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب اُن پر یہ ظلم دیکھے تو اُن کے مالک کو اُن کی قیمت ادا کر کے انہیں آزاد کروا دیا۔ اسی طرح اور بہت سے غلاموں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے مال سے آزاد کرایا۔ اِن غلاموں میں سے صہیبؓ ایک مالدار آدمی تھے۔ یہ تجارت کرتے تھے اور مکّہ کے باحیثیت آدمیوں میں سمجھے جاتے تھے مگر باوجود اس کے کہ وہ مالدار بھی تھے اور آزاد بھی ہو چکے تھے قریش اُن کو مار مار کر بیہوش کر دیتے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تو آپ کے بعد صہیبؓ نے بھی چاہا کہ وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ چلے جائیں مگر مکّہ کے لوگوں نے اُن کو روکا کہ جو دولت تم نے مکّہ میں کمائی ہے تم اُسے مکّہ سے باہر کس طرح لیجا سکتے ہو۔ ہم تمہیں مکّہ سے جانے نہیں دینگے۔ صہیبؓ نے کہا اگر میں یہ سب کی سب دولت چھوڑ دوں تو کیا پھر تم مجھے جانے دو گے؟ وہ اس بات پر رضامند ہو گئے۔ اور آپ اپنی ساری دولت مکّہ والوں کے سپرد کر کے خالی ہاتھ مدینہ چلے گئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ صہیبؓ! تمہارا یہ سودا پہلے سودوں سے نفع مند رہا یعنی پہلے اسباب کے مقابلہ میں تم روپیہ حاصل کیا کرتے تھے مگر اب روپیہ کے مقابلہ میں تم نے ایمان حاصل کیا ہے۔

اِن غلاموں میں سے اکثر تو ظاہر و باطن میں مستقل رہے، لیکن بعض سے ظاہر میں کمزوریاں بھی ظاہر ہوئیں۔ چنانچہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم عمّارؓ نامی غلام کے پاس سے گذرے تو دیکھا کہ وہ سسکیاں لے رہے تھے اور آنکھیں پونچھ رہے تھے آپ نے پوچھا۔ عمّار کیا معاملہ ہے۔ عمّار نے کہا اے اللہ کے رسولؐ بہت ہی بُرا۔

وہ مجھے مارتے گئے اور دُکھ دیتے گئے اور اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک میرے مُنہ سے آپ کے خلاف اور دیوتاؤں کی تائید میں کلمات نہیں نکلوا لیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ لیکن تم اپنے دل میں کیا محسوس کرتے تھے؟ عمّار نے کہا دل میں تو ایک غیر متزلزل ایمان محسوس کرتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا اگر دل ایمان پر مطمئن تھا تو خدا تعالیٰ تمہاری کمزوری کو معاف کر دے گا۔ آپ کے والد یاسرؓ اور آپ کی والدہ سمیّہؓ کو بھی کفار بہت دُکھ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ جبکہ اُن دونوں کو دکھ دیا جا رہا تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس سے گذرے۔ آپؐ نے اُن دونوں کی تکلیفوں کو دیکھا اور آپ کا دل درد سے بھر آیا۔ آپؐ ان سے مخاطب ہو کر بولے صَبْرًا آلَ یَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ۔ اے یاسر کے خاندان صبر سے کام لو۔ خدا نے تمہارے لیے جنت تیار کر چھوڑی ہے اور یہ پیشگوئی تھوڑے ہی دنوں میں پوری ہو گئی۔ کیونکہ یاسرؓ مار کھاتے کھاتے مر گئے مگر اس پر بھی کفار کو صبر نہ آیا اور اُنہوں نے اُن کی بڑھیا بیوی سمیّہؓ پر ظلم جاری رکھے۔ چنانچہ ابوجہل نے ایک دن غصّہ میں اُن کی ران پر زور سے نیزہ مارا جو ران کو چیرتا ہُوا اُن کے پیٹ میں گھس گیا اور تڑپتے ہوئے انہوں نے جان دیدی۔

زنبیرہؓ بھی ایک لونڈی تھیں اُن کو ابوجہل نے اتنا مارا کہ اُن کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔

ابو فکیہہؓ صفوان بن امیّہ کے غلام تھے۔ اُن کو اُن کے مالک اور اس کا خاندان گرم تپتی ہوئی زمین پر لٹا دیتا اور بڑے بڑے گرم پتھر اُن کے سینہ پر رکھ دیتا یہاں تک کہ اُن کی زبان باہر نکل آتی۔ یہی حال باقی غلاموں کا بھی تھا۔

بیشک یہ ظلم انسانی طاقت سے بالا تھے، مگر جن لوگوں پر ظلم کیے جا رہے تھے وہ ظاہر میں انسان تھے اور باطن میں فرشتے۔ قرآن صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل اور کانوں پر نازل نہیں ہو رہا تھا خدا اُن لوگوں کے دلوں میں بھی بول رہا تھا۔ اور کبھی کوئی مذہب قائم نہیں ہو سکتا جب تک اُس کے ابتدائی ماننے والوں کے دلوں میں سے خدا کی آواز بلند نہ ہو جب انسانوں نے اُن کو چھوڑ دیا جب رشتہ داروں نے اُن سے مُنہ پھیر لیا۔ تو خدا تعالےٰ اُن کے دلوں میں کہتا تھا مَیں تمہارے ساتھ ہوں، مَیں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور یہ سب ظلم اُن کے لیے راحت ہو جاتے تھے۔ گالیاں دُعائیں بنکر لگتی تھیں پتھر مرہم کے قائمقام ہو جاتے تھے مخالفتیں بڑھتی گئیں مگر ایمان بھی ساتھ ہی ترقی کرتا گیا۔ ظلم اپنی انتہاء کو پہنچ گیا۔ مگر اخلاص بھی تمام گذشتہ حد بندیوں سے اُوپر نکل گیا۔

آزاد مسلمانوں پر ظلم

آزاد مسلمانوں پر بھی کچھ کم ظلم نہیں ہوتے تھے۔ اُن کے بزرگ اور خاندانوں کے بڑے لوگ اُنہیں بھی قسم قسم کی تکلیفیں دیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ چالیس سال کی عمر کے قریب تھے اور مالدار آدمی تھے مگر باوجود اس کے جب قریش نے مسلمانوں پر ظلم کرنے کا فیصلہ کیا تو اُن کے چچا حکم نے اُن کو رسیوں سے باندھ کر خوب پیٹا۔ زبیرؓ بن العوام ایک بہت بڑے بہادر نوجوان تھے۔ اسلام کی فتوحات کے زمانہ میں وہ ایک زبردست جرنیل ثابت ہوئے۔ ان کا چچا بھی اُن کو خوب تکلیفیں دیتا تھا چٹائی میں لپیٹ دیتا تھا اور نیچے سے دھواں دیتا تھا تاکہ اُن کا سانس رُک جائے اور پھر کہتا تھا کہ کیا اب بھی اسلام سے باز آؤ گے یا نہیں؟ مگر وہ ان تکالیف کو برداشت کرتے اور جواب میں یہی کہتے کہ مَیں صداقت کو پہچان کر اُس سے انکار نہیں کر سکتا۔

حضرت ابوذرؓ غفار قبیلہ کے ایک آدمی تھے، وہاں اُنہوں نے سُنا کہ مکّہ میں کسی شخص نے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ تحقیقات کے لیے مکّہ آئے تو مکّہ والوں نے اُنہیں ورغلایا اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہمارا رشتہ دار ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اُس نے ایک دُکان کھولی ہے۔ مگر ابوذرؓ اپنے ارادہ سے باز نہ آئے اور کئی تدابیر اختیار کر کے آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیم بتائی اور آپ اسلام لے آئے۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی کہ اگر میں کچھ عرصہ تک اپنی قوم کو اپنے اسلام کی خبر نہ دُوں تو کچھ حرج تو نہیں؟ آپ نے فرمایا اگر چند دن خاموش رہیں تو کوئی حرج نہیں۔ اس اجازت کے ساتھ وہ اپنے قبیلہ کی طرف واپس چلے اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ کچھ عرصہ تک میں اپنے حالات کو درست کر لونگا تو اپنے اسلام کو ظاہر کروں گا۔ جب وہ مکّہ کی گلیوں میں سے گذر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ رؤساءِ مکّہ اسلام کے خلاف گالی گلوچ کر رہے ہیں۔ کچھ دنوں کے لیے اپنے عقیدہ کو چھپائے رکھنے کا خیال اُن کے دل سے اسی وقت محو ہو گیا اور بے اختیار ہو کر اُنہوں نے اِس مجلس کے سامنے یہ اعلان کیا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ دشمنوں کی اِس مجلس میں اِس آواز کا اُٹھنا تھا کہ سب لوگ اُن کو مارنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اتنا مارا کہ وہ بیہوش ہو کر جا پڑے۔ لیکن پھر بھی ظالموں نے اپنے ہاتھ نہ کھینچے اور مارتے ہی چلے گئے۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ جو اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے وہاں آ گئے۔ اور انہوں نے اِن لوگوں کو سمجھایا اور کہا کہ ابوذر کے قبیلہ میں سے ہو کر تمہارے غلّے کے قافلے آتے ہیں اگر اُس قوم کو غصّہ آ گیا تو مکّہ بھوکا مر جائیگا۔ اِس پر اُن لوگوں نے اُن کو چھوڑا۔ ابوذرؓ نے ایک دن آرام کیا اور دوسرے دن پھر اُسی مجلس میں پہنچے وہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باتیں کرنا روزانہ کا شغل تھا۔ جب یہ خانہ کعبہ میں گئے تو پھر وہی ذکر ہو رہا تھا۔ انہوں نے پھر کھڑے ہو کر اپنے عقیدۂ توحید کا اعلان کیا اور پھر اُن لوگوں نے اُن کو مارنا پیٹنا شروع کیا۔ اِسی طرح تین دن ہوتا رہا۔ اس کے بعد یہ اپنے قبیلہ کی طرف چلے گئے۔

آنحضرت صلعم پر مظالم

خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی محفوظ نہ تھی۔ طرح طرح سے آپ کو دکھ دیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ عبادت کر رہے تھے کہ آپ کے گلے میں پٹکا ڈال کر لوگوں نے کھینچنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آپکی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ وہاں آ گئے اور اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے چھڑایا۔ کہ اے لوگو! کیا تم ایک آدمی کو اِس جرم میں قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے خدا میرا آقا ہے۔ ایک دفعہ آپ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کی پیٹھ پر اُونٹ کی اوجھری لا کر رکھ دی گئی اور اس کے بوجھ سے اُس وقت تک آپ سر نہ اُٹھا سکے جب تک کہ بعض لوگوں نے پہنچ کر اُس اوجھری کو آپ کی پیٹھ پر سے ہٹایا نہیں۔

ایک دفعہ آپ بازار سے گذر رہے تھے تو مکّہ کے اوباشوں کی ایک جماعت آپ کے گرد ہو گئی اور رستہ بھر آپ کی گردن پر یہ کہہ کر تھپڑ مارتی چلی گئی کہ لوگو! یہ وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔

آپؐ کے گھر میں ارگرد کے گھروں سے متواتر پتھر پھینکے جاتے تھے۔ باورچی خانہ میں گندی چیزیں پھینکی جاتی تھیں جن میں بکروں اور اونٹوں کی انتڑیاں بھی شامل ہوتی تھیں جب آپ نماز پڑھتے تو آپؐ کے اُوپر گرد و غبار ڈالی جاتی حتیٰ کہ مجبور ہو کر آپ کو چٹان میں سے نکلے ہوئے ایک پتھر کے نیچے چھپ کر نماز پڑھنی پڑتی۔ مگر یہ مظالم بیکار نہ جا رہے تھے۔ شریف الطبع لوگ اُن کو دیکھتے اور اسلام کی طرف اُن کے دل کھچے چلے جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن خانہ کعبہ کے قریب صَفا پہاڑی پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ابوجہل آپ کا سب سے بڑا دشمن اور مکّہ کا سردار وہاں سے گذرا اور اُس نے آپ کو بے نقط گالیاں دینی شروع کیں۔ آپؐ اس کی گالیاں سنتے رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ اور خاموشی سے اُٹھ کر اپنے گھر چلے گئے۔ آپ کے خاندان کی ایک لونڈی اس واقعہ کو دیکھ رہی تھی، شام کے وقت آپ کے چچا حمزہؓ جو ایک نہایت ہی دلیر اور بہادر آدمی تھے اور جن کی بہادری کی وجہ سے شہر کے لوگ اُن سے خائف تھے، شکار کھیل کر جنگل سے واپس آئے اور کندھے کے ساتھ کمان لٹکائے ہوئے نہایت ہی تبختر کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوئے۔ لونڈی کا دل صبح کے نظّارہ سے بے حد متاثر تھا وہ حمزہؓ کو اس شکل میں دیکھ کر برداشت نہ کر سکی اور اُنہیں طعنہ دیکر کہا تم بڑے بہادر بنے پھرتے ہو ہر وقت اسلحہ سے مسلّح رہتے ہو۔ مگر کیا تمہیں معلوم ہے کہ صبح ابوجہل نے تمہارے بھتیجے سے کیا کیا۔ حمزہؓ نے پوچھا کیا کیا؟ اُس نے وہ سب واقعہ حمزہؓ کے سامنے بیان کیا۔ حمزہ گو مسلمان نہ تھے مگر دل کے شریف تھے۔ اسلام کی باتیں تو سُنی ہوئی تھیں اور یقیناً اُن کے دل پر اُن کا اثر ہو چکا تھا۔ مگر اپنی آزاد زندگی کی وجہ سے سنجیدگی کے ساتھ اُن پر غور کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا، لیکن اس واقعہ کو سُنکر اُن کی رگِ حمیّت جوش میں آگئی۔ آنکھوں پر سے غفلت کا پردہ دُور ہو گیا۔ اور اُنہیں یُوں معلوم ہوا کہ ایک قیمتی چیز ہاتھوں سے نکلی چلی جا رہی ہے۔ اُسی وقت گھر سے باہر آئے اور خانہ کعبہ کی طرف گئے جو رؤوساء کے مشورے کا مخصوص مقام تھا۔ اپنی کمان کندھے سے اُتاری اور زور سے ابوجہل کو ماری اور کہا سُنو! میں بھی محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے مذہب کو اختیار کرتا ہوں۔ تم نے صبح اُسے بلا وجہ گالیاں دیں اِسی لیے کہ وہ آگے سے جواب نہیں دیتا۔ اگر بہادر ہو تو اب میری مار کا جواب دو۔ یہ واقعہ ایسا اچانک ہوا کہ ابوجہل بھی گھبرا گیا۔ اس کے ساتھی حمزہؓ سے لڑنے کو اُٹھے۔ لیکن حمزہؓ کی بہادری کا خیال کر کے اور اُن کے قومی جتھا پر نظر کر کے ابوجہل نے خیال کیا کہ اگر لڑائی شروع ہو گئی تو اس کا نتیجہ نہایت خطرناک نکلے گا۔ اِس لیے مصلحت سے کام لیتے ہوئے اُس نے اپنے ساتھیوں کو یہ کہتے ہوئے روک دیا کہ جانے دو میں نے واقعہ میں اِس کے بھتیجے کو بہت بُری طرح گالیاں دی تھیں۔

پیغامِ اسلام

جب مخالفت تیز ہو گئی۔ اور اِدھر سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے اصرار سے مکّہ والوں کو خدا تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچانا شروع کیا کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا خدا ایک ہے، اُس کے سوا اَور کوئی معبود نہیں۔ جس قدر نبی گذرے ہیں، سب ہی اُس کی توحید کا اقرار کیا کرتے تھے اور اپنے ہم قوموں کو بھی اسی تعلیم کی طرف بلایا کرتے تھے۔ تم خدائے واحد پر ایمان لاؤ۔ اِن پتھر کے بُتوں کو چھوڑ دو کہ یہ بالکل بے کار ہیں اور

اِن میں کوئی طاقت نہیں۔ اے مکّہ والو! کیا تم دیکھتے نہیں کہ اُن کے سامنے جو نذر و نیاز رکھی جاتی ہے اگر اُس پر مکّھیوں کا جھرمٹ آ بیٹھے تو وہ اِن مکھیوں کو اُڑانے کی بھی طاقت نہیں رکھتے، اگر کوئی اُن پر حملہ کرے تو وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی اُن سے سوال کرے تو وہ جواب نہیں دے سکتے۔ اگر کوئی اُن سے مدد مانگے تو وہ اسکی مدد نہیں کر سکتے۔ مگر خدائے واحد تو مانگنے والوں کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ سوال کرنے والوں کو جواب دیتا ہے۔ مدد مانگنے والوں کی مدد کرتا ہے اور اپنے دشمنوں کو زیر کرتا ہے اور اپنے عبادت گذار بندوں کو اعلیٰ ترقیات بخشتا ہے۔ اُس سے روشنی آتی ہے جو اُس کے پرستاروں کے دلوں کو منوّر کر دیتی ہے پھر تم کیوں ایسے خدا کو چھوڑ کر بے جان بُتوں کے آگے جھکتے ہو اور اپنی عمر ضائع کر رہے ہو تم دیکھتے نہیں کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو چھوڑ کر تمہارے خیالات بھی گندے اور دل بھی تاریک ہو گئے ہیں۔ تم قسم قسم کی وہمی تعلیموں میں مبتلا ہو۔ حلال و حرام کی تم میں تمیز نہیں رہی۔ اچھے اور بُرے میں تم امتیاز نہیں کر سکتے۔ اپنی ماؤں کی بے حُرمتی کرتے ہو۔ اپنی بہنوں اور بیٹیوں پر ظلم کرتے ہو اور اُن کے حق اُنہیں نہیں دیتے۔ اپنی بیویوں سے تمہارا سلوک اچھا نہیں۔ یتامیٰ کے حق مارتے ہو اور بیواؤں سے بُرا سلوک کرتے ہو۔ غریبوں اور کمزوروں پر ظلم کرتے ہو۔ اور دوسروں کے حق مار کر اپنی بڑائی قائم کرنا چاہتے ہو جھوٹ اور فریب سے تم کو عار نہیں چوری اور ڈاکہ سے تم کو نفرت نہیں۔ جؤا اور شراب تمہارا شغل ہے۔ حصولِ علم اور قومی خدمت کی طرف تمہاری توجہ نہیں۔ خدائے واحد کی طرف سے کب تک غافل رہو گے۔ آؤ اور اپنی اصلاح کرو اور ظلم چھوڑ دو، ہر حقدار کو اُس کا حق دو۔ خدا نے اگر مال دیا ہے تو ملک و قوم کی خدمت اور کمزوروں اور غریبوں کی ترقی کے لیے اُسے خرچ کرو۔ عورتوں کی عزّت کرو اور اُن کے حق ادا کرو۔ یتیموں کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھو اور اُن کی خبر گیری کو اعلیٰ درجہ کی نیکی سمجھو۔ بیواؤں کا سہارا بنو۔ نیکیوں اور تقویٰ کو قائم کرو۔ انصاف اور عدل ہی نہیں بلکہ رحم اور احسان کو اپنا شعار بناؤ۔ اِس دنیا میں تمہارا آنا بیکار نہ جانا چاہیئے۔ اچھے آثار اپنے پیچھے چھوڑو۔ تا دائمی نیکی کا بیج بویا جائے۔ حق لینے میں نہیں بلکہ قربانی اور ایثار میں اصل عزت ہے پس تم قربانی کرو، خدا کے قریب ہو۔ خدا کے بندوں کے مقابل پر ایثار کا نمونہ دکھاؤ تا خدا تعالیٰ کے ہاں تمہارا حق قائم ہو۔ بیشک ہم حاکم ہیں مگر ہماری کمزوری کو نہ دیکھو۔ آسمان پر سچائی کی حکومت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عدل کا ترازو رکھا جائیگا اور انصاف اور رحم کی حکومت قائم کی جائیگی جس میں کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ مذہب کے معاملہ میں دخل اندازی نہ کی جائے گی۔ عورتوں اور غلاموں پر جو ظلم ہوتے رہے ہیں اُنہیں مٹا دیا جائیگا اور شیطان کی حکومت کی جگہ خدائے واحد کی حکومت قائم کر دی جائے گی۔

کفّارِ مکّہ کی ابُو طالب کے پاس شکایت اور آنحضرت صلعم کا استقلال

جب یہ تعلیمیں بار بار مکّہ والوں کو سُنائی جانے لگیں اور شریف الطبع لوگوں کی رغبت اسلام کی طرف بڑھنے لگی تو ایک دن مکّہ کے سردار جمع ہو کر آپ کے چچا ابو طالب کے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ آپ ہمارے رئیس ہیں اور آپ کی خاطر ہم نے آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کچھ نہیں کہا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ کے ساتھ ہم آخری فیصلہ کریں۔ یا تو آپ اسے سمجھائیں اور اُس سے پوچھیں کہ آخر وہ ہم سے چاہتا کیا ہے۔ اگر اُس کی خواہش عزّت حاصل کرنے کی ہے تو ہم اُسے اپنا سردار بنانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر وہ دولت کا خواہشمند ہے تو

ہم میں سے ہر شخص اپنے مال کا کچھ حصّہ اُس کو دینے کے لیے تیار ہے۔ اگر اُسے شادی کی خواہش ہے تو مکّہ کی ہر لڑکی جو اُسے پسند ہو اس کا نام لے ہم اُس سے اُس کا بیاہ کرانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اسکے بدلہ میں اُس سے کچھ نہیں چاہتے اور کسی بات سے نہیں روکتے۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے بتوں کو بُرا کہنا چھوڑ دے، وہ بیشک کہے خدا ایک ہے مگر یہ نہ کہے کہ ہمارے بُت بُرے ہیں۔ اگر وہ اتنی بات مان لے تو ہماری اُس کی صلح ہو جائے گی۔ آپ اُسے سمجھائیں اور ہماری تجویز کے قبول کرنے پر آمادہ کریں۔ ورنہ پھر دو باتوں میں سے ایک ہوگی یا آپ کو اپنا بھتیجا چھوڑنا پڑیگا۔ یا آپ کی قوم آپ کی ریاست سے انکار کر کے آپ کو چھوڑ دے گی۔ ابوطالب کے لیے یہ بات نہایت ہی شاق تھی۔ عربوں کے پاس روپیہ پیسہ تو تھوڑا ہی ہوتا تھا اُن کی ساری خوشی اُن کی ریاست میں ہوتی تھی۔ رؤساء قوم کے لیے زندہ رہتے تھے اور قوم رؤساء کے لیے زندہ رہتی تھی۔ یہ بات سُنکر ابوطالب بیتاب ہو گئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوایا اور کہا اے میرے بھتیجے! میری قوم میرے پاس آئی ہے اور اُس نے مجھے یہ پیغام دیا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے مجھے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر تمہارا بھتیجا اِن باتوں میں سے کسی ایک بات پر بھی راضی نہ ہو، تو پھر ہماری طرف سے ہر ایک قسم کی قربانی کی پیشکش ہو چکی ہے اگر وہ اِس پر بھی اپنے طریقہ سے باز نہیں آتا تو آپ کا کام ہے کہ اُسے چھوڑ دیں اور اگر آپ اُسے چھوڑنے کیلئے تیار نہ ہوں تو پھر ہم لوگ آپ کی ریاست سے انکار کر کے آپکو چھوڑ دیں گے۔ جب ابوطالب نے یہ بات کی تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُن کے آنسوؤں کو دیکھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور آپ نے فرمایا اے میرے چچا! میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنی قوم کو چھوڑ دیں اور میرا ساتھ دیں۔ آپ بیشک میرا ساتھ چھوڑ دیں اور اپنی قوم کے ساتھ مل جائیں لیکن مجھے خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم ہے کہ اگر سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لا کر کھڑا کر دیں تب بھی میں خدا تعالیٰ کی توحید کا وعظ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ مَیں اپنے کام میں لگا رہونگا جب تک خدا مجھے موت دے۔ آپ اپنی مصلحت خود سوچ لیں۔ یہ ایمان سے پُر اور یہ اخلاص سے بھرا ہؤا جواب ابوطالب کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا۔ اُنہوں نے سمجھ لیا کہ گو مجھے ایمان لانے کی توفیق نہیں ملی لیکن اِس ایمان کا نظّارہ دیکھنے کی توفیق ملنا ہی سب دولتوں سے بڑی دولت ہے! ور آپنے کہا۔ اے میرے بھتیجے جا اور اپنا فرض ادا کر بارہ قوم اگر مجھے چھوڑنا چاہتی ہے تو بیشک چھوڑ دے مَیں تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ (ابن ہشام۔ زرقانی)

حبشہ کی طرف ہجرت

جب مکّہ والوں کا ظلم انتہاء کو پہنچ گیا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے ساتھیوں کو بُلوایا اور فرمایا مغرب کی طرف سمندر پار ایک زمین ہے جہاں خدا کی عبادت کی وجہ سے ظلم نہیں کیا جاتا۔ مذہب کی تبدیلی کیوجہ سے لوگوں کو قتل نہیں کیا جاتا وہاں ایک منصف بادشاہ ہے، تم لوگ ہجرت کر کے وہاں چلے جاؤ شاید تمہارے لیے آسانی کی راہ پیدا ہو جائے۔ کچھ مسلمان مرد اور عورتیں اور بچے آپؐ کے اس ارشاد پر ابیسینیا کی طرف چلے گئے۔ اِن لوگوں کا مکّہ سے نکلنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مکّہ کے لوگ اپنے آپکو خانہ کعبہ کا متولّی سمجھتے تھے۔ اور مکّہ سے باہر چلے جانا اُنکے لیے ایک ناقابلِ برداشت صدمہ تھا۔ وہی شخص یہ بات کہہ سکتا تھا جس کے لیے دنیا میں کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہے پس ان لوگوں کا نکلنا ایک نہایت ہی دردناک واقعہ تھا۔ پھر نکلنا بھی اُن لوگوں کو

چوری ہی پڑا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر مکہ والوں کو معلوم ہوگیا تو وہ ہمیں نکلنے نہیں دیں گے اور اس وجہ سے وہ اپنے عزیزوں اور پیاروں کی آخری ملاقات سے بھی محروم جا رہے تھے۔ اُن کے دلوں کی جو حالت تھی سو تھی، اُن کے دیکھنے والے بھی ان کی تکلیف سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ چنانچہ جس وقت یہ قافلہ نکل رہا تھا حضرت عمرؓ جو اس وقت تک کافر اور اسلام کے شدید دشمن تھے اور مسلمانوں کو تکلیف دینے والوں میں سے چوٹی کے آدمی تھے اتفاقاً اُس قافلہ کے بعض افراد کو مل گئے۔ اُن میں ایک صحابیہ اُم عبداللہ نامی بھی تھیں۔ بندھے ہوئے سامان اور تیار سواریوں کو جب آپ نے دیکھا تو آپ سمجھ گئے کہ یہ لوگ مکہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ نے کہا اُم عبداللہ! یہ تو ہجرت کے سامان نظر آ رہے ہیں۔ اُم عبداللہ کہتی ہیں مَیں نے جواب میں کہا ہاں خدا کی قسم ہم کسی اور ملک میں چلے جائیں گے کیونکہ تم نے ہم کو بہت دُکھ دیئے ہیں اور ہم پر بہت ظلم کیے ہیں۔ ہم اس وقت تک اپنے وطن نہیں لوٹیں گے جب تک خدا تعالیٰ ہمارے لیے کوئی آسانی اور آرام کی صورت نہ پیدا کر دے۔ اُم عبداللہ بیان کرتی ہیں کہ عمرؓ نے جواب میں کہا اچھا خدا تمہارے ساتھ ہو اور مَیں نے اُن کی آواز میں رِقّت محسوس کی جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں محسوس کی تھی۔ پھر وہ جلدی سے مُنہ پھیر کر چلے گئے اور مَیں نے محسوس کیا کہ اِس واقعہ سے ان کی طبیعت نہایت ہی غمگین ہو گئی ہے۔ جب اُن لوگوں کے ہجرت کرنے کی مکہ والوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے اُن کا تعاقب کیا اور سمندر تک اُن کے پیچھے گئے مگر یہ قافلہ اِن لوگوں کے سمندر تک پہنچنے سے پہلے ہی حبشہ کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ جب مکہ والوں کو یہ معلوم ہُوا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک وفد بادشاہِ حبشہ کے پاس بھیجا جائے جو اُسے مسلمانوں کے خلاف بھڑکائے اور اُسے تحریک کرے کہ وہ مسلمانوں کو مکہ والوں کے سپرد کر دے تاکہ وہ انہیں اُن کی اس شوخی کی سزا دیں کہ رؤوساء شہر کے ظلموں کو برداشت نہ کرتے ہوئے وہ مکہ سے کیوں بھاگ گئے تھے۔ اِس وفد میں عمرو بن العاص بھی تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ اور مصر اُنہی کے ہاتھوں فتح ہُوا۔ یہ وفد حبشہ گیا اور بادشاہ سے ملا۔ اور امراء دربار کو اُنہوں نے خوب اُکسایا، لیکن اللہ تعالیٰ نے بادشاہ حبشہ کے دل کو مضبوط کر دیا اور اُس نے باوجود اِن لوگوں کے اصرار کے اور باوجود درباریوں کے اصرار کے مسلمانوں کو کفار کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ جب یہ وفد ناکام واپس آیا تو مکہ والوں نے اِن مسلمانوں کو بُلانے کے لیے ایک اور تدبیر سوچی اور وہ یہ کہ حبشہ جانے والے بعض قافلوں میں یہ خبر مشہور کر دی کہ مکہ کے سب لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ جب یہ خبر حبشہ پہنچی تو اکثر مسلمان خوشی سے مکہ کی طرف واپس لوٹے مگر مکہ پہنچ کر اُن کو معلوم ہُوا کہ یہ خبر محض شرارتاً مشہور کی گئی تھی اور اس میں کوئی حقیقت نہیں اس پر کچھ لوگ تو واپس حبشہ چلے گئے اور کچھ مکہ میں ہی ٹھہر گئے۔ اِن مکہ میں ٹھہرنے والوں میں سے عثمان بن مظعونؓ بھی تھے جو مکہ کے ایک بہت بڑے رئیس کے بیٹے تھے۔ اِس دفعہ اُن کے باپ کے ایک دوست ولید بن مغیرہ نے اُن کو پناہ دی اور وہ امن سے مکہ میں رہنے لگے۔ مگر اس عرصہ میں انہوں نے دیکھا کہ بعض دوسرے مسلمانوں کو دکھ دیئے جاتے ہیں اور انہیں سخت سے سخت تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں۔ چونکہ وہ غیرتمند نوجوان تھے ولید کے پاس گئے اور اُسے کہہ دیا کہ مَیں آپ کی پناہ کو واپس کرتا ہوں کیونکہ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ دوسرے مسلمان دُکھ اُٹھائیں اور میں آرام میں رہوں۔ چنانچہ ولید نے اعلان کر دیا کہ عثمان اب میری پناہ میں نہیں۔ اِس کے بعد ایک دن لبید عرب کا مشہور شاعر مکہ کے رؤوساء میں بیٹھا اپنے شعر سُنا رہا تھا کہ اُس نے ایک مصرع پڑھا ؎

وَ كُلُّ نَعِيْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلُ

جس کے معنے یہ ہیں کہ ہر نعمت آخر مٹ جانے والی ہے۔ عثمانؓ نے کہا یہ غلط ہے جنّت کی نعمتیں ہمیشہ قائم رہینگی۔ لبید ایک بہت بڑا آدمی تھا یہ جواب سُنکر جوش میں آگیا اور اُس نے کہا اے قریش کے لوگو! تمہارے مہمان کو تو پہلے اس طرح ذلیل نہیں کیا جا سکتا تھا اب یہ نیا رواج کب سے شروع ہُوا ہے۔ اِس پر ایک شخص نے کہا۔ یہ ایک بیوقوف آدمی ہے اِس کی بات کی پروا نہ کریں۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی بات پر اصرار کیا اور کہا بیوقوفی کی کیا بات ہے جو بات مَیں نے کہی ہے وہ سچ ہے۔ اس پر ایک شخص نے اُٹھ کر زور سے آپکے مُنہ پر گھونسہ مارا جس سے آپکی ایک آنکھ نکل گئی۔ ولید اُس وقت اُس مجلس میں بیٹھا ہُوا تھا عثمانؓ کے باپ کے ساتھ اسکی بڑی گہری دوستی تھی۔ اپنے مُردہ دوست کے بیٹے کی یہ حالت اُس سے دیکھی نہ گئی۔ مگر مکّہ کے رواج کے مطابق جب عثمانؓ اُس کی پناہ میں نہیں تھے تو وہ اُس کی حمایت بھی نہیں کر سکتا تھا، اِس لیے اور تو کچھ نہ کر سکا نہایت ہی دُکھ کے ساتھ عثمانؓ ہی کو مخاطب کر کے بولا۔ اے میرے بھائی کے بیٹے! خدا کی قسم تیری یہ آنکھ اس صدمہ سے بچ سکتی تھی جبکہ تو ایک زبردست حفاظت میں تھا (یعنی میری پناہ میں تھا) لیکن تُو نے خود ہی اُس پناہ کو چھوڑ دیا اور یہ دِن دیکھا عثمانؓ نے جواب میں کہا جو کچھ میرے ساتھ ہُوا ہے مَیں خود اس کا خواہشمند تھا تم میری پھُوٹی ہوئی آنکھ پر ماتم کر رہے ہو حالانکہ میری تندرست آنکھ اس بات کے لیے تڑپ رہی ہے کہ جو میری بہن کے ساتھ ہُوا ہے وہی میرے ساتھ کیوں نہیں ہوتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ میرے لیے بس ہے۔ اگر وہ تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں تو مَیں کیوں نہ اُٹھاؤں۔ میرے لیے خدا کی حمایت کافی ہے۔

حضرت عمرؓ کا قبولِ اِسلام

اِسی زمانہ میں مکّہ میں ایک واقعہ ظاہر ہُوا جس نے مکّہ میں آگ لگا دی۔ اور یہ واقعہ اس طرح ہُوا کہ عمرؓ جو بعد میں اسلام کے دُوسرے خلیفہ ہوئے اور جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں شدید ترین دشمنوں میں سے تھے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اُن کے دل میں خیال آیا کہ اِس وقت تک اسلام کے مٹانے کیلئے بہت کچھ کوششیں کی گئی ہیں مگر کامیابی نہیں ہوئی کیوں نہ اسلام کے بانی کو قتل کر دیا جائے اور اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی اُنہوں نے تلوار اُٹھائی اور گھر سے نکلے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں اُن کا کوئی دوست ملا اور اس حالت میں دیکھ کر کچھ حیران ہُوا۔ اور آپ سے سوال کیا کہ عمر! کہاں جا رہے ہو۔ عمرؓ نے کہا مَیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ اُس نے آگے سے کہا کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قبیلہ سے محفوظ رہ سکو گے؟ اور ذرا اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن اور تمہارا بہنوئی بھی مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ خبر حضرت عمرؓ کے سر پر بجلی کی طرح گری۔ انہوں نے سوچا مَیں جو اسلام کا بدترین دشمن ہوں۔ مَیں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مارنے کے لیے جا رہا ہوں۔ میری ہی بہن اور میرا ہی بہنوئی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پہلے مجھے اپنی بہن اور اپنے بہنوئی سے نپٹنا چاہیئے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اپنی بہن کے گھر کی طرف چلے۔ جب دروازہ پر پہنچے تو اُنہیں اندر سے خوش الحانی سے کسی کلام کے پڑھنے کی آوازیں آئیں۔ یہ پڑھنے والے خبابؓ تھے جو اُن کی بہن اور اُن کے بہنوئی کو قرآن شریف

سکھا رہے تھے۔ عمرؓ تیزی سے گھر میں داخل ہوئے۔ اُن کے پاؤں کی آہٹ سُنکر خبابؓ جھٹ کسی کونہ میں چھُپ گئے۔ اور اُن کی بہن نے جنکا نام فاطمہؓ تھا قرآن شریف کے وہ اوراق جو اُس وقت پڑھے جا رہے تھے، چھپا دیئے۔ حضرت عمرؓ کمرہ میں داخل ہوئے تو غصّہ سے پوچھا میں نے سُنا ہے تم اپنے دین سے پھر گئے ہو اور یہ کہکر اپنے بہنوئی پر جو اُنکے چچازاد بھائی بھی تھے حملہ آور ہوئے۔ فاطمہؓ نے جب دیکھا اُنکے بھائی عمرؓ اُن کے خاوند پر حملہ کرنے لگے ہیں تو وہ دوڑ کر اپنے خاوند کے آگے کھڑی ہوگئیں۔ عمرؓ ہاتھ اُٹھا چکے تھے اُن کا ہاتھ زور سے اُنکے بہنوئی کے مُنہ کی طرف آ رہا تھا اور اب اِس ہاتھ کو روکنا اُن کی طاقت سے باہر تھا مگر اب اُنکے ہاتھ کے سامنے اُنکے بہنوئی کی بجائے اُن کی بہن کا چہرہ تھا۔ عمرؓ کا ہاتھ زور سے فاطمہؓ کے چہرہ پر گرا اور فاطمہؓ کے ناک سے خون کے تراڑے بہنے لگے۔ فاطمہؓ نے مار تو کھالی مگر دلیری سے کہا عمر! یہ بات سچ ہے کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور یاد رکھیئے ہم اِس دین کو نہیں چھوڑ سکتے تم سے جو کچھ ہو سکتا ہو کر لو۔ عمرؓ ایک بہادر آدمی تھے ظلم نے اُن کی بہادری کو مٹا نہیں دیا تھا۔ ایک عورت اور پھر اپنی بہن کو اپنے ہی ہاتھ سے زخمی دیکھا تو شرمندگی اور ندامت سے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بہن کے چہرہ سے خون بہ رہا تھا، مگر عمرؓ کے دل سے اب اُنکا غصّہ دُور ہو چکا تھا۔ اپنی بہن سے معافی مانگنے کی خواہش زور پکڑ رہی تھی، اور تو کوئی بہانہ نہ سُوجھا، بہن سے بولے اچھا! لاؤ مجھے وہ کلام تو سُناؤ، جو تم لوگ ابھی پڑھ رہے تھے۔ فاطمہؓ نے کہا میں نہیں دکھاؤنگی، کیونکہ تم اُن اوراق کو ضائع کر دو گے۔ عمرؓ نے کہا نہیں بہن، میں ایسا نہیں کرونگا۔ فاطمہؓ نے کہا تم تو نجس ہو پہلے غسل کرو پھر دکھاؤں گی۔ عمرؓ ندامت کی شدّت کی وجہ سے سب کچھ کرنے کے لیئے تیار تھے وہ غسل پر بھی راضی ہوگئے۔ جب غسل کر کے واپس آئے، تو فاطمہؓ نے اُن کے ہاتھ میں قرآن کریم کے اوراق دے دیئے۔ یہ قرآن کریم کے اوراق سورۂ طٰہٰ کی کچھ آیات تھیں۔ جب وہ اِسے پڑھتے ہوئے اِس آیت پر پہنچے اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۞ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی ۞ (سورۂ طٰہٰ ع ۱) یقیناً میں ہی اللہ ہوں، اور کوئی معبود نہیں صرف میں ہی معبود ہوں پس اے مخاطب میری عبادت کر اور نماز پڑھ اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر میری عبادت کو قائم کر۔ رسمی عبادت نہیں بلکہ میری بزرگی کو دنیا میں قائم کرنے والی عبادت۔ یاد رکھ کہ اس کلام کو قائم کرنے والی گھڑی آ رہی ہے میں اُس کے ظاہر کرنے کے سامان پیدا کر رہا ہوں جن کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ایک جان کو جیسے جیسے وہ کام کرتی ہے اُس کے مطابق بدلہ مل جائے گا۔ حضرت عمرؓ جب اِس آیت پر پہنچے تو بے اختیار اُن کے مُنہ سے نکل گیا یہ کیسا عجیب اور پاک کلام ہے۔ خبابؓ نے جب یہ الفاظ سُنے تو وہ اُس جگہ جہاں چھپے ہوئے تھے باہر نکل آئے۔ اور کہا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دعا کا نتیجہ ہے۔ مجھے خدا کی قسم! میں نے کل ہی آپؐ کو یہ دُعا کرتے ہوئے سُنا تھا کہ الٰہی عمر بن الخطاب یا عمرو ابن ہشام میں سے کسی ایک کو اسلام کی طرف ضرور ہدایت بخش۔ عمرؓ کھڑے ہوگئے اور کہا مجھے بتاؤ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہیں؟ جب آپ کو بتایا گیا کہ آپ دارِ ارقم میں رہتے ہیں تو آپ اُسی طرح ننگی تلوار کھینچے ہوئے وہاں پہنچے اور دروازہ پر دستک دی۔ صحابہؓ نے دروازہ کی دراڑوں میں سے دیکھا تو اُنہیں عمرؓ ننگی تلوار لیے کھڑے نظر آئے۔ وہ ڈرے کہ ایسا نہ ہو دروازہ کھولدیں تو عمرؓ اندر آ کر کوئی فساد کرے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہُوا کیا دروازہ کھولدو۔ عمرؓ اسی طرح تلوار

پکڑے اندر داخل ہوئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور فرمایا عمرؓ! کس ارادہ سے آئے ہو؟ عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ میں مسلمان ہونے آیا ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنکر بلند آواز سے اللہ اکبر کہا یعنی اللہ سب سے بڑا ہے اور آپ کے سب ساتھیوں نے بھی یہی الفاظ زور سے دہرائے یہاں تک کہ مکہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں اور تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر مکہ میں آگ کی طرح پھیل گئی اور عمرؓ سے بھی وہی سختی کا برتاؤ ہونا شروع ہوگیا جو پہلے دوسرے صحابہؓ سے ہوتا تھا۔ مگر وہی عمرؓ جو پہلے مارنے اور قتل کرنے میں مزہ اٹھایا کرتا تھا اب مار کھانے اور پٹتے جانے میں لذت حاصل کرنے لگا چنانچہ خود عمرؓ کا بیان ہے کہ ایمان لانے کے بعد میں مکہ کی گلیوں میں ماریں ہی کھاتا رہتا تھا۔

مسلمانوں سے بائیکاٹ

غرض ظلم اب حد سے باہر ہوتے چلے جارہے تھے کچھ لوگ مکہ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جو باقی تھے وہ پہلے سے بھی زیادہ ظلموں کا شکار ہونے لگ گئے تھے مگر ظالموں کے دل ابھی ٹھنڈے نہ ہوئے تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ ہمارے گذشتہ ظلموں سے مسلمانوں کے دل نہیں ڈرے۔ اُن کے ایمانوں میں تزلزل واقعہ نہیں ہوا بلکہ وہ خدائے واحد کی پرستش میں اور بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں اور بتوں سے اُن کی نفرت ترقی ہی کرتی چلی جاتی ہے تو اُنہوں نے پھر ایک مجلس شوریٰ قائم کی اور یہ فیصلہ کردیا کہ مسلمانوں کے ساتھ کلی طور پر مقاطعہ کردیا جائے کوئی شخص سودا اُن کے پاس فروخت نہ کرے۔ کوئی شخص اُنکے ساتھ لین دین نہ کرے۔ اُس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند متبعین اور اُن کے بیوی بچوں سمیت اور اپنے چند ایسے رشتہ داروں کے ساتھ جو باوجود اسلام نہ لانے کے آپکا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے ایک الگ مقام میں جو ابو طالب کی ملکیت تھا پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ جن لوگوں کے پاس نہ روپیہ تھا نہ سامان نہ ذخائر تھے جنکی مدد سے وہ جیتے وہ اِس تنگی کے زمانہ میں جن حالات میں سے گذرے ہونگے اُن کا اندازہ لگانا دوسرے انسان کے لیے ممکن نہیں، قریباً تین سال تک حالات اسی طرح قائم رہے اور مکہ کے مقاطعہ کے فیصلہ میں کوئی کمزوری پیدا نہ ہوئی۔ قریباً تین سال کے بعد مکہ کے پانچ شریف آدمیوں کے دل میں اِس ظلم کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی۔ وہ شعب ابی طالب کے دروازہ پر گئے اور محصورین کو آواز دیکر کہا کہ وہ باہر نکلیں اور کہ وہ اس مقاطعہ کے معاہدہ کو توڑنے کیلئے بالکل تیار ہیں۔ ابو طالب جو اس لمبے محاصرہ اور فاقوں کی وجہ سے کمزور ہو رہے تھے باہر آئے اور اپنی قوم کو مخاطب کرکے اُنہیں ملامت کی کہ اُن کا یہ لمبا ظلم کس طرح جائز ہوسکتا ہے۔ اِن پانچ شریف انسانوں کی بغاوت فوراً بجلی کی طرح شہر میں پھیل گئی فطرت انسانی نے پھر سر اٹھانا شروع کیا۔ نیکی کی روح نے پھر ایک دفعہ سانس لیا اور مکہ کے لوگ اس شیطانی معاہدہ کو توڑنے پر مجبور ہوگئے۔ معاہدہ تو ختم ہوگیا مگر تین سالہ فاقوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفا شعار بیوی حضرت خدیجہؓ اس مقاطعہ کے دنوں کی تکلیفوں کے نتیجہ میں فوت ہوگئیں۔ اور اس کے ایک مہینہ بعد ابو طالب بھی اِس دنیا سے رخصت ہوگئے

حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کے بعد تبلیغ میں روکاوٹیں اور آنحضرت صلعم کا سفر طائف

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اب ابو طالب کے مصالحانہ اثر سے محروم ہوگئے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کی ساتھی حضرت خدیجہؓ بھی آپ سے جدا ہوگئیں۔ اِن دونوں کی وفات

سے طبعی طور پر اُن لوگوں کی ہمدردیاں بھی آپ سے اور آپؐ کے صحابہؓ سے کم ہو گئیں جو اُنکے تعلقات کی وجہ سے ظالموں کو ظلم سے روکتے رہتے تھے ابو طالب کی وفات کے تازہ صدمہ کی وجہ سے اور ابو طالب کی وصیّت کی وجہ سے چند آپکے شدید دشمن اور ابو طالب کے چھوٹے بھائی ابو لہب نے آپکا ساتھ دیا لیکن جب مکّہ والوں نے اُس کے جذبات کو یہ کہکر اُبھارا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو تمام اُن لوگوں کو جو توحید الٰہی کے قائل نہیں مجرم اور قابلِ سزا سمجھتا ہے تو اپنے آباء کی غیرت کے جوش میں ابو لہب نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور عہد کیا کہ وہ آئندہ پہلے سے بھی زیادہ آپکی مخالفت کریگا۔ محصوری کی زندگی کی وجہ سے چونکہ تین سال تک لوگ اپنے رشتہ داروں سے جدا رہے تھے اس لیے تعلقات میں ایک سردی پیدا ہو گئی تھی۔ مکّہ والے مسلمانوں سے قطع کلامی کے عادی ہو چکے تھے۔ اِس لیے تبلیغ کا میدان محدود ہو گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ حالت دیکھی تو آپ نے فیصلہ فرمایا کہ وہ مکّہ کی بجائے طائف کے لوگوں کو جا کر اسلام کی دعوت دیں۔ آپ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ مکّہ والوں کی مخالفت نے اِس ارادہ کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ اوّل تو مکّہ والے بات سننے ہی نہیں تھے دوسرے اب انہوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گلیوں میں چلنے ہی نہ دیتے جب آپ باہر نکلتے آپکے سر پر مٹی پھینکی جاتی تاکہ آپ لوگوں سے مل ہی نہ سکیں۔ ایک دفعہ اسی حالت میں واپس لوٹے تو آپ کی ایک لڑکی آپکے سر پر سے مٹی ہٹاتے ہوئے رونے لگی۔ آپ نے فرمایا او میری بچّی رو نہیں کیونکہ یقیناً خدا تمہارے باپ کے ساتھ ہے۔ آپؐ تکالیف سے گھبراتے نہ تھے، لیکن مشکل یہ بھی کہ لوگ بات سننے کو تیار نہ تھے۔ جہاں تک تکالیف کا سوال ہے آپ اُن کو ضروری سمجھتے تھے۔ بلکہ آپکے لیے سب سے زیادہ تکلیف کا دن وہ ہوتا تھا جب کوئی شخص آپ کو تکلیف نہ دیتا تھا۔ لکھا ہے کہ ایک دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ کی گلیوں میں تبلیغ کے لیے نکلے مگر اُس دن کسی منصوبہ کے ماتحت کسی شخص نے آپ سے کلام نہ کیا اور نہ آپکو کسی قسم کی کوئی تکلیف دی نہ کسی غلام نے نہ کسی آزاد نے۔ تب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صدمہ اور غم سے خاموش لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو تسلّی دی اور فرمایا کہ جاؤ اور اپنی قوم کو پھر اور پھر اور پھر ہوشیار کرو اور ان کی عدم توجہی کی پروا نہ کرو۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات گراں نہ گذرتی تھی کہ لوگ آپ کو دُکھ دیتے تھے۔ لیکن خدا کا نبی جو دنیا کو ہدایت دینے کے لیے مبعوث ہوا تھا وہ اِس بات کو کب برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اُس سے بات ہی نہ کریں اور اس کی بات سننے کے لیے تیار ہی نہ ہوں۔ ایسی بیکار زندگی اُس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دِہ تھی۔ پس آپ نے پختہ فیصلہ کر لیا کہ اب آپ طائف کی طرف جائیں گے اور طائف کے لوگوں کو خدا تعالےٰ کا پیغام پہنچائیں گے۔ اور خدا تعالےٰ کے نبیوں کے لیے یہی مقدّر ہوتا ہے کہ وہ اِدھر سے اُدھر مختلف قوموں کو مخاطب کرتے پھریں موسیٰ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، کبھی وہ آلِ فرعون سے مخاطب ہوا تو کبھی آلِ اسحاق سے اور کبھی مدین کے لوگوں سے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی تبلیغ کے شوق میں کبھی جلیل کے لوگوں کبھی یردن پار کے لوگوں کبھی یروشلم کے لوگوں اور کبھی اور دوسرے لوگوں کو مخاطب کرنا پڑا۔ جب مکّہ کے لوگوں نے باتیں سننے سے ہی انکار کر دیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ مارو اور پیٹو مگر بات بالکل نہ سنو، تو آپ نے طائف کی طرف رُخ کیا۔ طائف مکّہ سے کوئی ساٹھ میل کے قریب جنوب مشرق کی طرف ایک شہر ہے، جو اپنے پھلوں اور اپنی زراعت کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ یہ شہر بُت پرستی میں مکّہ والوں سے کم نہ تھا۔ خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے

بتوں کے سوا لات نامی ایک مشہور بت طائف کی اہمیت کا موجب تھا جس کی زیارت کیلئے عرب کے لوگ دُور دُور سے آتے تھے۔ طائف کے لوگوں کی مکّہ سے بہت رشتہ داریاں بھی تھیں اور طائف ور مکّہ کے درمیان کئی سرسبز مقامات میں مکّہ والوں کی جائیدادیں بھی تھیں جب آپ طائف پہنچے تو وہاں کے رؤوساء آپ سے ملنے کے لیے آنے شروع ہوئے۔ لیکن کوئی شخص حق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہُوا عوام الناس نے بھی اپنے رؤوساء کی اتباع کی اور خدا کے پیغام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ دنیا داروں کی نگاہ میں بے سامان اور بے مددگار نبی حقیر ہی ہُوا کرتا ہے وہ تو اسلحہ اور فوجوں کی آواز سننا جانتے ہیں۔ آپ کی نسبت باتیں تو پہنچ ہی چکی تھیں جب آپ طائف پہنچے اور انہوں نے دیکھا کہ بجائے اِس کے کہ آپ کے ساتھ کوئی فوج اور جتھہ ہوتا آپ صرف زیدؓ ہی کی ہمراہی طائف کے مشہور حصوں میں تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ تو دل کے اندھوں نے اپنے سامنے خدا کا نبی نہیں بلکہ ایک حقیر اور دھتکارا ہوا انسان پایا اور سمجھے کہ شاید اس کو دکھ دینا اور تکلیف پہنچانا قوم کے رؤوساء کی نظروں میں ہم کو معزز کر دیگا۔ وہ ایک دن جمع ہوئے۔ کتّے انہوں نے اپنے ساتھ لیے۔ لڑکوں کو اکسایا اور پتھروں سے اپنی جھولیاں بھر لیں اور بیدردی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھراؤ کرنا شروع کیا وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو شہر سے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ آپ کے پاؤں لہولہان ہو گئے اور زیدؓ آپ کو بچاتے ہوئے سخت زخمی ہوئے مگر ظالموں کا دل ٹھنڈا نہ ہُوا وہ آپ کے پیچھے چلتے گئے اور چلتے گئے جب تک شہر سے کئی میل دُور کی پہاڑیوں تک آپ پہنچ گئے انہوں نے آپ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب یہ لوگ آپکا پیچھا کر رہے تھے تو آپ اس ڈر سے کہ خدا تعالیٰ کا غضب ان پر نہ بھڑک اٹھے آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے اور نہایت الحاح سے دعا کرتے۔ الٰہی اِن لوگوں کو معاف کر کہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ زخمی تھکے ہوئے اور دنیا کے لوگوں کی طرف سے دھتکارے ہوئے آپ ایک انگورستان کے سایہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہ انگورستان مکّہ کے دو سرداروں کا تھا۔ یہ سردار اُس وقت اِس انگورستان میں تھے پُرانے اور شدید دشمن جنہوں نے دس سال تک آپ کی مخالفت میں اپنی زندگی گذاری تھی شاید اُس وقت اس بات سے متاثر ہو گئے کہ ایک مکّہ کے آدمی کو طائف کے لوگوں نے زخمی کیا ہے یا شاید وہ گھڑی ایسی گھڑی تھی جب نیکی کا بیج اُن کے دلوں میں سر اُٹھا رہا تھا۔ انہوں نے ایک تھال انگوروں کا بھرا اور اپنے غلام عدّاس کو کہا کہ جاؤ اور ان مسافروں کو اسے دو۔ عدّاس نینوا کا رہنے والا ایک عیسائی تھا جب اُس نے یہ انگور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے اور آپنے یہ کہتے ہوئے اُن انگوروں کو لیا کہ خدا کے نام پر جو بے انتہاء کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے میں یہ لیتا ہوں تو عیسائیت کی یاد اُس کے دل میں پھر تازہ ہو گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کے سامنے خدا کا ایک نبی بیٹھا ہے جو اسرائیلی نبیوں کی سی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ اُس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ جب اُس نے کہا نینوہ کا۔ تو آپ نے فرمایا وہ نیک انسان یونسؑ جو متی کا بیٹا تھا اور نینوا کا باشندہ وہ میری طرح خدا کا ایک نبی تھا۔ پھر آپنے اُسکو اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ عدّاس کی حیرانی چند ہی لمحوں میں تعجب سے بدل گئی۔ تعجب ایمان میں تبدیل ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اجنبی غلام آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے لپٹ گیا اور آپ کے سر اور ہاتھوں اور پیروں کو بوسہ دینے لگا۔ عدّاس کی باتوں سے فارغ ہو کر آپ اللہ تعالیٰ کی طرف مخاطب ہوئے اور آپنے خدا سے یُوں دُعا مانگی۔

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَمْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ اِنْ لَّمْ یَکُنْ بِکَ عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیْ وَلٰکِنْ عَافِیَتُکَ ھِیَ اَوْسَعُ لِیْ اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ وَصَلُحَ عَلَیْہِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ مِنْ اَنْ تَنْزِلَ بِیْ غَضَبُکَ اَوْ یَحِلَّ عَلَیَّ سَخَطُکَ لَکَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِکَ (سیرت ابن ہشام جلد ا صفحہ ۱۴۷) یعنی اے میرے رب! میں تیرے پاس اپنی کمزوریوں اور اپنے سامانوں کی کمی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے حقیر ہونے کی شکایت کرتا ہوں۔ لیکن تو غریبوں اور کمزوروں کا خدا ہے اور تو میرا بھی خدا ہے تو مجھے کس کے ہاتھوں میں چھوڑ یگا۔ کیا اجنبیوں کے ہاتھوں میں جو مجھے اِدھر اُدھر دھکیلتے پھریں گے یا اُس دشمن کے ہاتھ میں جو میرے وطن میں مجھ پر غالب ہے اگر تیرا غضب مجھ پر نہیں تو مجھے اِن دشمنوں کی کوئی پروا نہیں تیرا رحم میرے ساتھ ہے اور تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے میں تیرے چہرہ کی روشنی میں پناہ چاہتا ہوں۔ یہ تیرا ہی کام ہے کہ تُو تاریکی کو دنیا سے بھگا دے اور اس دنیا اور اگلی دنیا میں امن بخشے۔ تیرا غصّہ اور تیری غیرت مجھ پر نہ بھڑکیں تو اگر ناراض بھی ہوتا ہے تو اس لیے کہ پھر خوشی کا اظہار کرے اور تیرے سوا کوئی حقیقی طاقت اور کوئی حقیقی پناہ کی جگہ نہیں۔

یہ دعا مانگ کر آپ مکّہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن درمیان میں نخلہ نامی مقام پر ٹھہر گئے۔ چند دن وہاں سستا کر پھر آپ مکّہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن عرب کے دستور کے مطابق لڑائی کی وجہ سے مکّہ چھوڑ دینے کے بعد آپ مکّہ کے باشندے نہیں رہے تھے اب مکّہ والوں کا اختیار تھا کہ وہ آپ کو مکّہ میں آنے دیتے یا نہ آنے دیتے۔ اس لیے آپ نے مکّہ کے ایک رئیس مطعم بن عدی کو کہلا بھیجا کہ میں مکّہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں کیا تم عرب کے دستور کے مطابق مجھے داخلہ کی اجازت دیتے ہو؟ مطعم باوجود شدید دشمن ہونے کے ایک شریف الطبع انسان تھا اُس نے اُسی وقت اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں کو ساتھ لیا اور مسلّح ہو کر کعبہ کے صحن میں جا کھڑا ہوا اور آپ کو پیغام بھیجا کہ وہ مکّہ میں آپ کو آنے کی اجازت دیتا ہے۔ آپ مکّہ میں داخل ہوئے کعبہ کا طواف کیا اور مطعم اپنی اولاد اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تلواریں کھینچے ہوئے آپ کو آپکے گھر تک پہنچانے کے لیے آیا۔ یہ پناہ نہیں تھی کیونکہ اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم ہوتے رہے اور مطعم نے کوئی حفاظت آپ کی نہیں کی۔ بلکہ یہ صرف مکّہ میں داخلہ کی قانونی اجازت تھی۔

آپ کے اِس سفر کے متعلق دشمنوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اِس سفر میں آپ نے بے نظیر قربانی اور استقلال کا نمونہ دکھایا ہے۔ سر ولیم میور اپنی کتاب "محمدؐ" میں لکھتے ہیں:۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طائف کے سفر میں ایک شاندار شجاعانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اکیلا آدمی جس کی اپنی قوم نے اُس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور اُسے دھتکار دیا خدا کے نام پر بہادری کے ساتھ نینوا کے یوناہ نبی کی طرح ایک بُت پرست شہر کو توبہ کی اور خدائی مشن کی دعوت دینے کے لیے نکلا۔ یہ امر اُس کے اِس ایمان پر کہ وہ اپنے آپ کو کلّی طور پر خدا کی طرف سے سمجھتا تھا ایک بہت تیز روشنی ڈالتا ہے۔"

مکّہ نے پھر ایذا دہی اور استہزاء کے دروازے کھول دیئے۔ پھر خدا کے نبی کے لیے اُس کا وطن جہنم کا نمونہ بننے لگا۔

مگر اس پر بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم دلیری سے لوگوں کو خدا کی تعلیم پہنچاتے رہے۔ مکہ کے گلی کوچوں میں "خدا ایک ہے خدا ایک ہے" کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ محبت سے، پیار سے، خیر خواہی سے، آپ مکہ والوں کو بُت پرستی کے خلاف وعظ کرتے رہے۔ لوگ بھاگتے تھے تو آپ اُن کے پیچھے جاتے تھے۔ لوگ مُنہ پھیرتے تھے تو آپ پھر بھی باتیں سنائے چلے جاتے تھے۔ صداقت آہستہ آہستہ گھر کر رہی تھی۔ وہ تھوڑے سے مسلمان جو ہجرتِ حبشہ سے بچے ہوئے مکہ میں رہ گئے تھے وہ اندر ہی اندر اپنے رشتہ داروں، دوستوں ساتھیوں اور ہمسائیوں میں تبلیغ کر رہے تھے۔ بعض کے دل ایمان سے منور ہو جاتے تھے تو علی الاعلان اپنے مذہب کا اظہار کر دیتے تھے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ ماریں کھانے اور تکلیفیں اُٹھانے میں شریک ہو جاتے تھے۔ مگر بہت تھے جنہوں نے روشنی کو دیکھ تو لیا مگر اُسکے قبول کرنے کی اُن کو توفیق نہیں ملی تھی۔ وہ اُس دن کا انتظار کر رہے تھے جب خدا کی بادشاہت زمین پر آئے اور وہ اُس میں داخل ہوں۔

باشندگانِ مدینہ کا قبولِ اسلام

اسی عرصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کی طرف سے بار بار خبر دی جا رہی تھی کہ تمہارے لیے ہجرت کا وقت آ رہا ہے اور آپ پر یہ بھی کھل چکا تھا کہ آپ کی ہجرت کا مقام ایک ایسا شہر ہے جس میں کنوئیں بھی ہیں اور کھجوروں کے باغ بھی پائے جاتے ہیں۔ پہلے آپ نے یمامہ کی نسبت خیال کیا کہ شاید وہ ہجرت کا مقام ہو گا مگر جلد ہی یہ خیال آپ کے دل سے نکال دیا گیا۔ اور آپ اِس انتظار میں لگ گئے کہ خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کے مطابق جو شہر بھی مقدر ہے وہ اپنے آپکو اسلام کا گھوارہ بنانے کیلئے پیش کریگا۔ اسی دَوران میں حج کا زمانہ آ گیا عرب کے چاروں طرف سے لوگ مکہ میں حج کے لیے جمع ہونے شروع ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عادت کے مطابق جہاں کچھ آدمیوں کو کھڑا دیکھتے تھے اُن کے پاس جا کر اُنہیں توحید کا وعظ سُنانے لگ جاتے تھے اور خدا کی بادشاہت کی خوشخبری دیتے تھے۔ اور ظلم اور بدکاری اور فساد اور شرارت سے بچنے کی نصیحت کرتے تھے۔ بعض لوگ آپ کی بات سنتے اور حیرت کا اظہار کر کے جدا ہو جاتے۔ بعض باتیں سُن رہے ہوتے تو مکہ والے آ کر اُن کو وہاں سے ہٹا دیتے تھے۔ بعض جو پہلے سے مکہ والوں کی باتیں سُن چکے ہوتے وہ ہنسی اُڑا کر آپ سے جدا ہو جاتے۔ اسی حالت میں آپ منٰی کی وادی میں پھر رہے تھے کہ چھ سات آدمی جو مدینہ کے باشندے تھے آپکی نظر پڑے۔ آپ نے اُن سے کہا آپ کس قبیلہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا خزرج قبیلہ کے ساتھ۔ آپ نے کہا وہی قبیلہ جو یہودیوں کا حلیف ہے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا آپ لوگ تھوڑی دیر بیٹھ کر میری باتیں سُنیں گے؟ اُن لوگوں نے چونکہ آپکا ذکر سُنا ہوا تھا اور دل میں آپ کے دعویٰ سے کچھ دلچسپی تھی اُنہوں نے آپکی بات مان لی۔ اور آپکے پاس بیٹھ کر آپکی باتیں سننے لگ گئے۔ آپ نے اُنہیں بتایا کہ خدا کی بادشاہت قریب آ رہی ہے بُت اب دنیا سے مٹا دیئے جائینگے۔ توحید کو دنیا میں قائم کر دیا جائیگا۔ نیکی اور تقویٰ پھر ایک دفعہ دنیا میں قائم ہو جائیں گے۔ کیا مدینہ کے لوگ اِس عظیم الشان نعمت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟ انہوں نے آپ کی باتیں سُنیں اور متاثر ہوئے اور کہا آپ کی تعلیم کو تو ہم قبول کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ مدینہ اسلام کو پناہ دینے کیلئے تیار ہے یا نہیں۔ اِس کے لیے ہم اپنے وطن جا کر اپنی قوم سے بات کرینگے پھر ہم دوسرے سال اپنی قوم کا فیصلہ آپ کو بتائیں گے۔ یہ لوگ واپس گئے اور انہوں نے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں میں آپ کی تعلیم کا ذکر کرنا شروع

کیا۔ اُس وقت مدینہ میں دو عرب قبائل اوس اور خزرج بستے تھے اور تین یہودی قبائل یعنی بنو قریظہ اور بنو نضیر اور بنو قینقاع۔ اوس اور خزرج کی آپس میں لڑائی تھی۔ بنو قریظہ اور بنو نضیر اوس کے ساتھ اور بنو قینقاع خزرج کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ مدّتوں کی لڑائی کے بعد اُن میں یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ ہمیں آپس میں صلح کر لینی چاہیئے۔ آخر باہمی مشورہ سے یہ قرار پایا کہ عبداللہ بن اُبیّ بن سلول جو خزرج کا سردار تھا اُسے سارا مدینہ اپنا بادشاہ تسلیم کر لے۔ یہودیوں کے ساتھ تعلّق کی وجہ سے اوس اور خزرج بائبل کی پیشگوئیاں سنتے رہتے تھے۔ جب یہودی اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کا حال بیان کرتے تو اُس کے آخر میں یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ ایک نبی جو موسیٰ کا مثیل ہوگا ظاہر ہونے والا ہے اُس کا وقت قریب آ رہا ہے جب وہ آئیگا ہم پھر ایک دفعہ دنیا پر غالب آ جائیں گے۔ یہود کے دشمن تباہ کر دیئے جائینگے۔ جب اُن حاجیوں سے مدینہ والوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کو سُنا آپ کی سچائی اُن کے دلوں میں گھر کر گئی اور اُنہوں کہا یہ تو وہی نبی معلوم ہوتا ہے جس کی یہودی ہمیں خبر دیا کرتے تھے۔ پس بہت سے نوجوان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی سے متاثر ہوئے اور یہودیوں سے سُنی ہوئی پیشگوئیاں اُن کے ایمان لانے میں مؤیّد ہوئیں۔ چنانچہ اگلے سال حج کے موقعہ پر پھر مدینہ کے لوگ آئے۔ بارہ آدمی اِس دفعہ مدینہ سے یہ ارادہ کر کے چلے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہو جائیں گے۔ اِن میں سے دس خزرج قبیلہ کے تھے اور دو اوس کے۔ منیٰ میں وہ آپ سے ملے اور اُنہوں نے آپکے ہاتھ پر اِس بات کا اقرار کیا کہ وہ سوائے خدا کے اَور کسی کی پرستش نہیں کریں گے، وہ چوری نہیں کرینگے، وہ بدکاری نہیں کرینگے، وہ اپنی لڑکیوں کو قتل نہیں کرینگے، وہ ایک دوسرے کے اوپر جھوٹے الزام نہیں لگائیں گے، نہ وہ خدا کے نبی کی دوسری نیک تعلیمات میں نافرمانی کرینگے۔ یہ لوگ واپس گئے تو اُنہوں نے اپنی قوم میں اور بھی زیادہ زور سے تبلیغ شروع کر دی۔ مدینہ کے گھروں سے بُت نکال کر باہر پھینکے جانے لگے۔ بتوں کے آگے سر جھکانے والے لوگ اب گردنیں اُٹھا کر چلنے لگے۔ خدا کے سوا اب لوگوں کے ماتھے کسی کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہودی حیران تھے کہ صدیوں کی دوستی اور صدیوں کی تبلیغ سے جو تبدیلی وہ پیدا نہ کر سکے اسلام نے وہ تبدیلی چند دنوں میں پیدا کر دی۔ توحید کا وعظ مدینہ والوں کے دلوں میں گھر کرتا جاتا تھا۔ یکے بعد دیگرے لوگ آتے اور مسلمانوں سے کہتے ہمیں اپنا دین سکھاؤ۔ لیکن مدینہ کے نو مسلم نہ تو خود اسلام کی تعلیم سے پوری طرح واقف تھے اور نہ اُن کی تعداد اتنی تھی کہ وہ سینکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو اسلام کے متعلق تفصیل سے بتا سکیں اس لیے اُنہوں نے مکّہ میں ایک آدمی بھجوایا اور مبلّغ کی درخواست کی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعبؓ نامی ایک صحابی کو جو حبشہ کی ہجرت سے واپس آئے تھے مدینہ میں تبلیغ اسلام کے لیے بھجوا دیا۔ مصعبؓ مکّہ سے باہر پہلا اسلامی مبلّغ تھا۔

اسراء

اُنہی ایّام میں خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آئندہ کے لیے پھر ایک زبردست بشارت دی۔ آپ کو ایک کشف میں بتایا گیا کہ آپ یروشلم گئے ہیں اور نبیوں نے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ یروشلم کی تعبیر مدینہ تھا، جو آئندہ کے لیے خدائے واحد کی عبادت کا مرکز بننے والا تھا اور آپ کے پیچھے نبیوں کے نماز پڑھنے کی تعبیر یہ تھی کہ مختلف مذاہب کے لوگ آپ کے مذہب میں داخل ہوں گے اور آپ کا مذہب عالمگیر ہو جائے گا۔ یہ وقت

مکہ میں مسلمانوں کے لیے نہایت ہی سخت تھا اور تکالیف انتہاء کو پہنچ چکی تھیں۔ اس کشف کا سُنانا مکہ والوں کے لیے ہنسی اور استہزاء کا ایک نیا موجب ہوگیا اور اُنہوں نے ہر مجلس میں آپ کے اِس کشف پر ہنسی اڑانی شروع کی۔ مگر کون جانتا تھا کہ نئے یروشلم کی تعمیر شروع تھی مشرق و مغرب کی قومیں کان دھرے خدا کے آخری نبی کی آواز سُننے کے لیے متوجہ کھڑی تھیں۔

رومیوں کے غلبہ کی پیشگوئی

انہی ایام میں قیصر اور کسریٰ کے درمیان ایک خطرناک جنگ ہوئی اور کسریٰ کو فتح حاصل ہوئی۔ شام میں ایرانی فوجیں پھیل گئیں۔ یروشلم تباہ کر دیا گیا حتیٰ کہ ایرانی فوجیں یونان اور ایشیائے کوچک تک پہنچ گئیں اور باسفورس کے دہانہ پر ایرانی جرنیلوں نے قسطنطنیہ سے صرف دس میل کے فاصلہ پر اپنے خیمے گاڑ دیئے۔ اِس واقعہ پر مکہ کے لوگوں نے خوشیاں منانی شروع کیں اور کہا خدا کا فیصلہ ظاہر ہو گیا ہے۔ بُت پرست ایرانیوں نے اہلِ کتاب عیسائیوں کو شکست دیدی۔ اُس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو خبر دی گئی کہ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (سورہ روم ع۱) یعنی رومی فوجیں عرب کے قریب ممالک میں شکست کھا گئی ہیں لیکن اپنی شکست کے بعد پھر اُن کو فتح حاصل ہوگی چند سال کے اندر اندر۔ خدا ہی کا اختیار دنیا میں پہلے بھی رائج تھا اور آئندہ بھی رائج رہے گا۔ جب وہ فتح کا دن آئے گا اُس وقت مومنوں کو بھی خدا کی مدد سے خوشی نصیب ہوگی۔ خدا جنکو چُن لیتا ہے اُن کی مدد کرتا ہے وہ بڑی شان والا اور بڑا مہربان ہے۔ یہ اُس خدا کا وعدہ ہے جو اپنے وعدوں کو تبدیل نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ خدا کی قدرتوں سے ناواقف ہیں۔ چند ہی سال بعد خدا تعالیٰ نے یہ پیشگوئی پوری کر دی۔ ایک طرف رومیوں نے ایرانیوں کو شکست دے کر اپنے ملک کو آزاد کرا لیا اور دوسری طرف جیسا کہ کہا گیا تھا۔ انہی ایام میں مسلمانوں کو مکہ کے لوگوں کے خلاف فتوحات حاصل ہونی شروع ہوئیں جبکہ مکہ کے لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ اُنہوں نے لوگوں کو مسلمانوں کی باتیں سننے سے روک کر اور مسلمانوں پر ظلم کرنے پر آمادہ کر کے اسلام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ خدا کا کلام متواتر اسلام کی فتوحات کی خبریں دے رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ مکہ والوں کی تباہی کی گھڑی قریب سے قریب تر آرہی ہے۔ چنانچہ انہی ایام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے زور سے خدا تعالیٰ کی اس وحی کا اعلان کیا کہ وَقَالُوْا لَوْلَا یَاْتِیْنَا بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۝ وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی ۝ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَمَنِ اهْتَدٰی ۝ (طٰہٰ ع۸) یعنی مکہ والے کہتے ہیں کہ کیوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رب کے پاس سے کوئی نشان ہمارے لیے نہیں لاتا۔ کیا پہلے نبیوں کی پیشگوئیاں جو اُس کے حق میں ہیں وہ اُن کے لیے کافی نشان نہیں ہے۔ ہم اگر پوری تبلیغ سے پہلے ہی مکہ والوں کو ہلاک کر دیتے تو مکہ والے کہہ سکتے تھے کہ اے ہمارے رب! کیوں تو نے ہماری طرف کوئی رسول نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیری

تعلیموں کے پیچھے چلتے۔ تو کہہ دے ہر شخص کو اپنے وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے پس تم بھی اُس گھڑی کا انتظار کرو جب حجت تمام ہو جائے گی تب تم یقیناً جان لو گے کہ سیدھے راستہ پر اور خدا تعالیٰ کی ہدایت پر کون چل رہا ہے۔

ہر روز خدا کی نئی وحی نازل ہو رہی تھی اور ہر روز وہ اسلام کی ترقی اور کفار کی تباہی کی خبریں دے رہی تھی۔ مکّہ والے ایک طرف اپنی طاقت اور شوکت کو دیکھتے تھے اور دوسری طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کی کمزوری کو دیکھتے تھے اور پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں خدا تعالےٰ کی نصرتوں اور مسلمانوں کی کامیابیوں کی خبریں پڑھتے تھے تو حیران ہو کر سوچتے تھے کہ آیا وہ پاگل ہو گئے ہیں یا محمد "رسول اللہ" پاگل ہو گیا ہے۔ مکّہ والے تو یہ امیدیں کر رہے تھے کہ ہمارے ظلموں اور ہماری تعدّی کی وجہ سے اب مسلمانوں کو مایوس ہو کر ہماری طرف آجانا چاہیئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود بھی اور اُن کے ساتھیوں کو بھی ان کے دعویٰ میں شبہات پیدا ہونے لگ جانے چاہئیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ اعلان کر رہے تھے کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝ (سورۃ حاقہ ع۲) اے مکّہ والو! جن خیالات میں تم پڑے ہوئے ہو وہ درست نہیں۔ مَیں قسم کھا کر کہتا ہوں ان چیزوں کی جو تمہیں نظر آرہی ہیں اور اُنکی بھی جو تمہاری نظروں سے ابھی پوشیدہ ہیں کہ یہ قرآن ایک معزز رسول کی زبان سے تم کو سنایا جا رہا ہے یہ کسی شاعر کا کلام نہیں مگر تمہارے دل میں ایمان کم ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ کسی کاہن کی تُک بندی نہیں ہے۔ مگر افسوس تم کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ یہ سب جہانوں کے پیدا کرنے والے خدا کی طرف سے اُتارا گیا ہے اور ہم جو سب جہانوں کے رب ہیں تم سے کہتے ہیں کہ اگر یہ ایک آیت بھی جھوٹی بنا کر ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اُس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر اُس کی رگِ جان کو کاٹ دیتے اور اگر تم سب لوگ مل کر بھی اُسکو بچانا چاہتے تو تم اُس کو بچا نہ سکتے۔ مگر یہ قرآن تو خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک نصیحت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں اس قرآن کو جھٹلانیوالے بھی موجود ہیں مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اِس کی تعلیم اِسکے منکروں کے دلوں میں حسرتیں پیدا کر رہی ہے اور وہ کہہ رہے ہیں کہ کاش یہ تعلیم ہمارے پاس ہوتی۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جو باتیں اِس قرآن میں بتائی گئی ہیں وہ لفظاً لفظاً پوری ہو کر رہینگی پس اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اِن لوگوں کی مخالفتوں کی پروا نہ کر اور اپنے عظیم الشان رب کے نام کی بزرگی بیان کرتا چلا جا۔

آخر تیسرا حج بھی آ پہنچا اور مدینہ کے حاجیوں کا قافلہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پر مشتمل مکّہ میں وارد ہوا۔ مکّہ والوں کی مخالفت کی وجہ سے مدینہ کے لوگوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے علیحدہ ملنے کی خواہش کی۔ اب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ذہن اِدھر منتقل ہو چکا تھا کہ شاید ہجرت مدینہ ہی کی طرف مقدّر ہے۔ آپ نے اپنے معتبر رشتہ داروں سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور انہوں نے آپ کو سمجھانا شروع کیا کہ آپ ایسا نہ کریں۔

مکہ والے دشمن ہی سہی پھر بھی اس میں بڑے بڑے با اثر لوگ آپ کے رشتہ داروں میں سے موجود ہیں نہ معلوم مدینہ میں کیا ہو اور وہاں آپ کے رشتہ دار آپ کی مدد کر سکیں یا نہ کر سکیں۔ مگر چونکہ آپ سمجھ چکے تھے کہ خدائی فیصلہ یہی ہے آپ نے اپنے رشتہ داروں کی باتوں کو ردّ کر دیا اور مدینہ جانے کا فیصلہ کر دیا۔

آدھی رات کے بعد پھر وادئی عقبہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مدینہ کے مسلمان جمع ہوئے۔ اب آپ کے ساتھ آپ کے چچا عباسؓ بھی تھے۔ اس دفعہ مدینہ کے مسلمانوں کی تعداد ۷۳ تھی۔ ان میں ۶۲ خزرج قبیلہ کے تھے اور گیارہ اوس کے تھے اور اس قافلہ میں دو عورتیں بھی شامل تھیں جن میں سے ایک بنی نجار قبیلہ کی اُمّ عمارہؓ بھی تھیں۔ چونکہ مصعبؓ کے ذریعہ سے ان لوگوں تک اسلام کی تفصیلات پہنچ چکی تھیں یہ لوگ ایمان اور یقین سے پُر تھے، بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ یہ لوگ آئندہ اسلام کا ستون ثابت ہونے والے تھے اُمّ عمارہؓ جو اس دن شامل ہوئیں اُنہوں نے اپنی اولاد میں اسلام کی محبت اتنی داخل کر دی کہ اُن کا بیٹا خبیبؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسیلمہ کذّاب کے لشکر کے ہاتھ میں قید ہو گیا تو مسیلمہ نے اُسے بلا کر پوچھا کہ کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں؟ خبیبؓ نے کہا ہاں! پھر مسیلمہ نے کہا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ خبیبؓ نے کہا نہیں! اس پر مسیلمہ نے حکم دیا کہ اُن کا ایک عضو کاٹ دیا جائے۔ تب مسیلمہ نے پھر اُن سے پوچھا۔ کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟ خبیبؓ نے کہا ہاں! پھر اُس نے کہا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ خبیبؓ نے کہا نہیں! پھر اُس نے آپکا ایک دوسرا عضو کاٹنے حکم دیا۔ ہر عضو کاٹنے کے بعد وہ سوال کرتا جاتا تھا کہ کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور خبیبؓ کہتا تھا کہ نہیں! اسی طرح اُس کے سارے اعضاء کاٹے گئے اور آخر میں اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہوئے وہ خدا سے جا ملا۔ خود اُمّ عمارہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت سی جنگوں میں شامل ہوئیں۔ غرض یہ ایک مخلص اور ایمان والا قافلہ تھا جس کے افراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دولت اور مال مانگنے نہیں آئے تھے بلکہ صرف ایمان طلب کرنے آئے تھے۔ عباسؓ نے اُنکو مخاطب کر کے کہا اے خزرج قبیلہ کے لوگو! یہ میرا عزیز اپنی قوم میں معزز ہے اس کی قوم کے لوگ خواہ وہ مسلمان ہیں یا نہیں اس کی حفاظت کرتے ہیں لیکن اب اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہارے پاس جائے۔ اے خزرج کے لوگو! اگر یہ تمہارے پاس گیا تو سارا عرب تمہارا مخالف ہو جائیگا۔ اگر تم اپنی ذمہ واری کو سمجھتے اور اُن خطرات کو پہچانتے ہوئے جو تمہیں اس کے دین کی حفاظت میں پیش آنیوالے ہیں اس کو لے جانا چاہتے ہو تو خوشی سے لے جاؤ ورنہ اس ارادہ سے باز آ جاؤ۔ اس قافلہ کے سردار البراء تھے اُنہوں نے کہا ہم نے آپ کی باتیں سُن لیں۔ ہم اپنے ارادہ میں پختہ ہیں ہماری جانیں خدا کے نبیؐ پر نثار ہیں۔ اب فیصلہ اُس کے اختیار میں ہے۔ ہم اُس کا ہر فیصلہ قبول کریں گے۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسلام کی تعلیم سمجھانی شروع کی اور خدا کی توحید کے قیام کا وعظ کیا اور اُنہیں کہا کہ اگر وہ اسلام کی حفاظت اپنی بیویوں اور اپنے بچوں کی طرح کرنے کا وعدہ کرتے ہیں تو وہ آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ اپنی بات ختم کرنے نہ پائے تھے کہ مدینہ کے ۷۳ جاں نثار یک زبان ہو کر چلّائے ہاں! ہاں!! اُس وقت جوش میں اُنہیں

مکّہ والوں کی شرارتوں کا خیال نہ رہا اور اُن کی آوازیں فضاء میں گونج گئیں۔عباسؓ نے اُنہیں ہوشیار کیا اور کہا خاموش! خاموش! ایسا نہ ہو کہ مکّہ کے لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہو جائے۔ مگر اب وہ ایمان حاصل کر چکے تھے، اب موت اُن کی نظروں میں حقیر ہو چکی تھی۔ عباسؓ کی بات سُنکر اُن کا ایک رئیس بولا۔ یارسول اللہ ؐ ہم ڈرتے نہیں، آپ اجازت دیجئے ابھی مکّہ والوں سے لڑ کر اُنہوں نے جو ظلم آپ پر کیے ہیں اُس کا بدلہ لینے کو تیار ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابھی خدا تعالیٰ نے مجھے اُن کے مقابل پر کھڑا ہونے کا حکم نہیں دیا۔ اِس کے بعد مدینہ کے لوگوں نے آپ کی بیعت کی اور یہ مجلس برخاست ہوئی۔

مکّہ کے لوگوں کو اِس واقعہ کی بھنک پڑ گئی اور وہ مدینہ کے سرداروں کے پاس شکایت لیکر گئے۔ لیکن چونکہ عبداللہ بن ابی ابن سلول مدینے کے قافلہ کا سردار تھا اُسے خود اس واقعہ کا علم نہیں تھا اُس نے اُنہیں تسلّی دلائی اور کہا کہ اُنھوں نے یونہی کوئی جھوٹی افواہ سُن لی ہے ایسا کوئی واقعہ نہیں۔ کیونکہ مدینہ کے لوگ میرے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ مگر وہ کیا سمجھتا تھا کہ اب مدینہ کے لوگوں کے دلوں میں شیطان کی جگہ خدا تعالیٰ کی بادشاہت قائم ہو چکی تھی۔ اِس کے بعد مدینہ کا قافلہ واپس چلا گیا۔

مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں نے ہجرت کی تیاری شروع کی۔ ایک کے بعد ایک خاندان مکّہ سے غائب ہونا شروع ہُوا۔ اب وہ لوگ بھی جو خدا تعالیٰ کی بادشاہت کا انتظار کر رہے تھے دلیر ہو گئے۔ بعض دفعہ ایک ہی رات میں مکّہ کی ایک پوری گلی کے مکانوں کو تالے لگ جاتے تھے اور صبح کے وقت جب شہر کے لوگ گلی کو خاموش پاتے تو دریافت کرنے پر اُنہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس گلی کے تمام رہنے والے مدینہ کو ہجرت کر گئے ہیں اور اسلام کے اِس گہرے اثر کو دیکھ کر جو اندر ہی اندر مکّہ کے لوگوں میں پھیل رہا تھا وہ حیران رہ جاتے تھے۔

آخر مکّہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا، صرف چند غلام، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ مکّہ میں رہ گئے۔ جب مکّہ کے لوگوں نے دیکھا کہ اب شکار ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو رؤوساء پھر جمع ہوئے اور مشورے کے بعد اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینا ہی مناسب ہے۔ خدا تعالیٰ کے خاص تصرّف سے آپ کے قتل کی تاریخ آپکی ہجرت کی تاریخ سے موافق پڑی۔ جب مکّہ کے لوگ آپکے گھر کے سامنے آپ کے قتل کے لیے جمع ہو رہے تھے آپ رات کی تاریکی میں ہجرت کے ارادہ سے اپنے گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ مکّہ کے لوگ ضرور شبہ کرتے ہونگے کہ اُن کے ارادہ کی خبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مل چکی ہو گی۔ مگر پھر بھی جب آپؐ اُن کے سامنے سے گذرے تو اُنھوں نے یہی سمجھا کہ یہ کوئی اور شخص ہے اور بجائے آپ پر حملہ کرنے کے سمٹ سمٹ کر آپ سے چھپنے لگ گئے، تا کہ اُن کے ارادوں کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ ہو جائے۔ اِس رات سے پہلے دن ہی آپکے ساتھ ہجرت کرنیکے لیے ابو بکرؓ کو بھی اطلاع دیدی گئی تھی پس وہ بھی آپ کو مل گئے۔ اور دونوں مل کر تھوڑی دیر میں مکّہ سے روانہ ہو گئے۔ اور مکّہ سے تین چار میل پر ثور نامی پہاڑی کے سرے پر ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے۔ جب مکّہ والوں کو معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکّہ سے

چلے گئے ہیں تو انہوں نے ایک فوج جمع کی اور آپ کا تعاقب کیا۔ ایک کھوجی اُنہوں نے اپنے ساتھ لیا جو آپ کا کھوج لگاتے ہوئے ثور پہاڑ پر پہنچا۔ وہاں اُس نے غار کے پاس پہنچکر جہاں آپ ابوبکرؓ کے ساتھ چھپے ہوئے تھے یقین کے ساتھ کہا کہ یا تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اِس غار میں ہے یا آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ اُس کے اِس اعلان کو سُنکر ابوبکرؓ کا دل بیٹھنے لگا اور انہوں نے آہستہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا دشمن سر پر آپہنچا ہے اور اب کوئی دم میں غار میں داخل ہونے والا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ ابوبکر ڈرو نہیں خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ ابوبکرؓ نے جواب میں کہا یا رسول اللہ! میں اپنی جان کے لیے نہیں ڈرتا کیونکہ میں تو ایک معمولی انسان ہوں مارا گیا تو ایک آدمی ہی مارا جائیگا یا رسول اللہ مجھے تو صرف یہ خوف تھا کہ اگر آپکی جان کو کوئی گزند پہنچا تو دنیا میں سے روحانیت اور دین کا نام مٹ جائیگا۔ آپ نے فرمایا کوئی پروا نہیں یہاں ہم دو ہی نہیں ہیں تیسرا خدا تعالیٰ بھی ہمارے پاس ہے۔ چونکہ اب وقت آپہنچا تھا کہ خدا تعالیٰ اسلام کو بڑھائے اور ترقی دے اور مکّہ والوں کے لیے مہلت کا وقت ختم ہو چکا تھا خدا تعالیٰ نے مکّہ والوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور اُنہوں نے کھوجی سے استہزاء شروع کر دیا اور کہا کیا اُنہوں نے اِس کھُلی جگہ پر پناہ لینی تھی۔ یہ کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے۔ اور پھر اس جگہ کثرت سے سانپ بچھو رہتے ہیں یہاں کون عقلمند پناہ لے سکتا ہے۔ اور بغیر اس کے کہ غار میں جھانک کر دیکھتے کھوجی سے ہنسی کرتے ہوئے وہ واپس لوٹ گئے۔

دو دن اسی غار میں انتظار کرنیکے بعد پہلے سے طے کی ہوئی تجویز کے مطابق رات کے وقت غار کے پاس سواریاں پہنچائی گئیں اور دو تیز رفتار اُونٹنیوں پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی روانہ ہوئے ایک اُونٹنی پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور رستہ دکھانے والا آدمی سوار ہُوا اور دوسری اُونٹنی پر حضرت ابوبکرؓ اور ان کا ملازم عامر بن فہیرہ سوار ہوئے۔

مدینہ کی طرف روانہ ہونے سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مُنہ مکّہ کی طرف کیا۔ اُس مقدس شہر پر جس میں آپ پیدا ہوئے جس میں آپ مبعوث ہوئے اور جس میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ سے آپکے آباؤ اجداد رہتے چلے آئے تھے آپ نے آخری نظر ڈالی اور حسرت کے ساتھ شہر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اے مکّہ کی بستی! تو مجھے سب جگہوں سے زیادہ عزیز ہے مگر تیرے لوگ مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ اُسوقت حضرت ابوبکرؓ نے بھی نہایت افسوس کے ساتھ کہا اِن لوگوں نے اپنے نبی کو نکالا ہے اب یہ ضرور ہلاک ہوں گے۔

سراقہ کا تعاقب اور اُس کے متعلق آنحضرت صلعم کی ایک پیشگوئی

جب مکّہ والے آپ کی تلاش میں ناکام رہے تو اُنہوں نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) یا ابوبکرؓ کو زندہ یا مُردہ واپس لے آئیگا اُس کو سَو اونٹنی انعام دیجائے گی۔ اور اس اعلان کی خبر مکّہ کے اردگرد کے قبائل کو بھجوا دی گئی۔ چنانچہ سراقہ بن مالک ایک بدوی رئیس اس انعام کے لالچ میں آپکے پیچھے روانہ ہُوا۔ تلاش کرتے کرتے اُس نے مدینہ کی سڑک پر آپکو جا لیا۔ جب اُس نے دو اُونٹنیوں اور اُنکے سواروں کو دیکھا اور سمجھ لیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُنکے ساتھی ہیں تو اُس نے اپنا گھوڑا اُن کے پیچھے دوڑا دیا۔ مگر راستہ میں گھوڑے نے زور سے ٹھوکر کھائی اور سراقہ گر گیا۔ سراقہ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا وہ اپنا واقعہ خود

اِس طرح بیان کرتا ہے کہ جب میں گھوڑے سے گرا تو مَیں نے عربوں کے دستور کے مطابق اپنے تیروں سے فال نکالی اور فال بُری نکلی، مگر انعام کی لالچ کی وجہ سے مَیں پھر گھوڑے پر سوار ہو کر پیچھے دوڑا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وقار کے ساتھ اپنی اُونٹنی پر سوار چلے جا رہے تھے۔ اُنہوں نے مڑ کر مجھے نہیں دیکھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ اس ڈر سے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی گزند نہ پہنچے) بار بار مُنہ پھیر کر مجھے دیکھتے تھے۔ جب دوسری دفعہ مَیں اُن کے قریب پہنچا تو پھر میرے گھوڑے نے زور سے ٹھوکر کھائی اور مَیں گر گیا۔ اِس پر پھر مَیں نے اپنے تیروں سے فال لی اور فال خراب نکلی۔ مَیں نے دیکھا کہ ریت میں گھوڑے کے پاؤں اتنے دھنس گئے تھے کہ اُنکا نکالنا مشکل ہو رہا تھا۔ تب مَیں سمجھا کہ یہ لوگ خدا کی حفاظت میں ہیں۔ اور مَیں نے اُنہیں آواز دی کہ ٹھہرو اور میری بات سُنو! جب وہ لوگ میرے پاس آئے تو مَیں نے اُنہیں بتایا کہ مَیں اِس اِس ارادہ سے یہاں آیا تھا مگر اب مَیں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور مَیں واپس جا رہا ہوں، کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا جاؤ، مگر دیکھو کسی کو ہمارے متعلق خبر نہ دینا۔ اُس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ چونکہ یہ شخص سچا معلوم ہوتا ہے اِس لیے ضرور ہے کہ ایک دن کامیاب ہو۔ اِس خیال کے آنے پر مَیں نے درخواست کی کہ جب آپ کو غلبہ حاصل ہو گا اُس زمانہ کے لیے مجھے کوئی امن کا پروانہ لکھ دیں۔ آپؐ نے عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکرؓ کے خادم کو ارشاد فرمایا کہ اِسے امن کا پروانہ لکھ دیا جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے امن کا پروانہ لکھ دیا۔ جب سراقہ لوٹنے لگا تو معاً اللہ تعالیٰ نے سراقہ کے آئندہ حالات آپ پر غیب سے ظاہر فرما دیئے۔ اور اُن کے مطابق آپ نے اُسے فرمایا۔ سراقہ اُس وقت تیرا کیا حال ہو گا جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن ہوں گے۔ سراقہ نے حیران ہو کر پوچھا، کسریٰ بن ہُرمز شہنشاہ ایران کے؟ آپ نے فرمایا ہاں! آپؐ کی یہ پیشگوئی کوئی سولہ سترہ سال کے بعد جا کر لفظ بلفظ پوری ہوئی۔ سراقہ مسلمان ہو کر مدینہ آ گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلے حضرت ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی شان کو دیکھ کر ایرانیوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے اور بجائے اسلام کو کچلنے کے خود اسلام کے مقابلہ میں کچلے گئے۔ کسریٰ کا دارالامارۃ اسلامی فوجوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہُوا۔ اور ایران کے خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے۔ جو مال اُس ایرانی حکومت کا اسلامی فوجوں کے قبضہ میں آیا اس میں وہ کڑے بھی تھے جو کسریٰ ایرانی دستور کے مطابق تخت پر بیٹھتے وقت پہنا کرتا تھا۔ سراقہ مسلمان ہونے کے بعد اپنے اس واقعہ کو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت اُسے پیش آیا تھا مسلمانوں کو نہایت فخر کے ساتھ سنایا کرتا تھا اور مسلمان اِس بات سے آگاہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسے مخاطب کر کے فرمایا تھا، سراقہ اُس وقت تیرا کیا حال ہو گا جب تیرے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن ہوں گے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب اموالِ غنیمت لا کر رکھے گئے اور اُن میں اُنہوں نے کسریٰ کے کنگن دیکھے تو سب نقشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ وہ کمزوری اور ضعف کا وقت جب خدا کے رسول کو اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ آنا پڑا تھا۔ وہ سراقہ اور دوسرے آدمیوں کا آپ کے پیچھے اِس لیے گھوڑے دَوڑانا کہ آپ کو مار کر یا زندہ کسی صورت میں بھی مکّہ والوں تک پہنچا دیں تو وہ سَو اونٹوں کے مالک ہو جائیں گے اور اُس وقت آپؐ کا سراقہ سے کہنا

سراقہ اُس وقت تیرا کیا حال ہوگا جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن ہوں گے کیسی بڑی پیشگوئی تھی کتنا مصفّٰی غیب تھا حضرت عمرؓ نے اپنے سامنے کسریٰ کے کنگن دیکھے تو خدا کی قدرت اُن کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ انہوں نے کہا سراقہ کو بلاؤ۔ سراقہ بلائے گئے تو حضرت عمرؓ نے انہیں حکم دیا کہ وہ کسریٰ کے کنگن اپنے ہاتھوں میں پہنیں۔ سراقہ نے کہا۔ اے خدا کے رسولؐ کے خلیفہ! سونا پہننا تو مسلمانوں کے لیے منع ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں منع ہے مگر ان موقعوں کے لیے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے ہاتھ میں سونے کے کنگن دکھائے تھے یا تو تم یہ کنگن پہنو گے یا میں تمہیں سزا دونگا۔ سراقہ کا اعتراض تو محض شریعت کے مسئلہ کی وجہ سے تھا ورنہ وہ خود بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کو پورا ہوتے دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ سراقہ نے وہ کنگن اپنے ہاتھ میں پہن لیے۔ اور مسلمانوں نے اس عظیم الشان پیشگوئی کو پورا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

آنحضرت صلعم کا مدینہ منوّرہ میں ورُود

مکّہ سے بھاگ کر نکلنے والا رسول اب دنیا کا بادشاہ تھا، وہ خود اِس دنیا میں موجود نہیں تھا مگر اُس کے غلام اُس کی پیشگوئیوں کو پورا ہوتے دیکھ رہے تھے۔ سراقہ کو رخصت کرنیکے بعد چند منزلیں طے کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچ گئے مدینہ کے لوگ بے صبری سے آپؐ کا انتظار کر رہے تھے اور اس سے زیادہ اُن کی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ سورج جو مکّہ کے لیے نکلا تھا مدینہ کے لوگوں پر جا طلوع ہُوا۔

جب اُنہیں یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکّہ سے غائب ہیں تو وہ اُسی دن سے آپکی انتظار کر رہے ہیں۔ اُن کے وفد روزانہ مدینہ سے باہر کئی میل تک آپکی تلاش کے لیے نکلتے تھے اور شام کو مایوس ہو کر واپس آجاتے تھے۔ جب آپ مدینہ کے پاس پہنچے تو آپ نے فیصلہ کیا کہ پہلے آپ قبا میں جو مدینہ کے پاس ایک گاؤں تھا ٹھہریں۔ ایک یہودی نے آپ کی اُونٹنیوں کو آتے دیکھا تو سمجھ لیا کہ یہ قافلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور اُس نے آواز دی اے قیلہ کی اولاد! (قیلہ مدینہ والوں کی ایک وادی تھی) وہ جس کی تم انتظار میں تھے آگیا ہے۔ اِس آواز کے پہنچتے ہی مدینہ کا ہر شخص قبا کی طرف دوڑ پڑا قبا کے باشندے اِس خیال سے کہ خدا کا نبی اُن کے ہاں ٹھہرنے کے لیے آیا ہے خوشی سے پُھولے نہ سماتے تھے۔

اِس موقعہ پر ایک ایسی بات ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی کے کمال پر دلالت کرتی تھی۔ مدینہ کے اکثر لوگ آپ کی شکل سے واقف نہ تھے۔ جب قبا سے باہر آپ ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ بھاگتے ہوئے مدینہ سے آپ کی طرف آرہے تھے تو چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ سادگی سے بیٹھے ہوئے تھے اُن میں سے ناواقف لوگ حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر جو عمر میں گو چھوٹے تھے مگر اُن کی ڈاڑھی میں کچھ سفید بال آئے ہوئے تھے اور اسی طرح اُن کا لباس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بہتر تھا یہی سمجھتے تھے کہ ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور بڑے ادب سے آپ کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب یہ بات دیکھی تو سمجھ لیا کہ لوگوں کو غلطی لگ رہی ہے۔ وہ جھٹ چادر پھیلا کر سورج کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہا یا رسول اللہ آپ پر دھوپ پڑ رہی ہے میں آپ پر سایہ کرتا ہوں اور اس لطیف طریق سے اُنہوں نے لوگوں پر اُن کی غلطی کو ظاہر کر دیا۔ قبا میں دس دن رہنے کے بعد مدینہ

کے لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ لے گئے جب آپ مدینہ میں داخل ہوئے مدینہ کے تمام مسلمان کیا مرد کیا عورتیں اور کیا بچے سب گلیوں میں نکلے ہوئے آپکو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ بچے اور عورتیں یہ شعر گا رہے تھے ؎

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

أیھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع ۔

یعنی چودھویں رات کا چاند ہم پر وداع کے موڑ سے چڑھا ہے۔ اور جب تک خدا کی طرف بلانے والا دنیا میں کوئی موجود ہے ہم پر اس احسان کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔ اور اے وہ جسکو خدا نے ہم پر مبعوث کیا ہے تیرے حکم کی پوری طرح اطاعت کی جائے گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس جہت سے مدینہ میں داخل ہوئے تھے وہ مشرقی جہت نہیں تھی۔ مگر چودھویں رات کا چاند تو مشرق سے چڑھا کرتا ہے۔ پس مدینہ کے لوگوں کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ اصل چاند تو روحانی چاند ہے۔ ہم اس وقت تک اندھیرے میں تھے اب ہمارے لیے چاند چڑھا ہے اور چاند بھی اُس جہت سے چڑھا ہے جدھر سے وہ چڑھا نہیں کرتا۔ یہ پیر کا دن تھا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے اور پیر ہی کے دن آپ غارِ ثور سے نکلے تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ پیر ہی کے دن مکّہ آپ کے ہاتھ پر فتح ہُوا۔

جب آپ مدینہ میں داخل ہوئے ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ آپ اُس کے گھر میں ٹھہریں جس جس گلی میں سے آپ کی اونٹنی گذرتی تھی اُس گلی کے مختلف خاندان اپنے گھروں کے آگے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرتے تھے اور کہتے تھے۔ یا رسول اللہ یہ ہمارا گھر ہے اور یہ ہمارا مال ہے اور یہ ہماری جانیں ہیں جو آپکی خدمت کے لیے حاضر ہیں یا رسول اللہ اور ہم آپکی حفاظت کرنے کے قابل ہیں آپ ہمارے ہی پاس ٹھہریں۔ بعض لوگ جوش میں آگے بڑھتے اور آپ کی اونٹنی کی باگ پکڑ لیتے تا کہ آپ کو اپنے گھر میں اُتروالیں۔ مگر آپ ہر ایک شخص کو یہی جواب دیتے تھے کہ میری اُونٹنی کو چھوڑ دو یہ آج خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے یہ وہیں کھڑی ہوگی جہاں خدا تعالیٰ کا منشاء ہوگا۔ آخر مدینہ کے ایک سرے پر بنو نجار کے یتیموں کی ایک زمین کے پاس جا کر اونٹنی ٹھہر گئی۔ آپ نے فرمایا خدا تعالیٰ کا یہی منشاء معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں ٹھہریں۔ پھر فرمایا یہ زمین کس کی ہے؟ زمین کچھ یتیموں کی تھی اُن کا ولی آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ فلاں فلاں یتیم کی زمین ہے اور آپکی خدمت کیلیے حاضر ہے آپ نے فرمایا ہم کسی کا مال مُفت نہیں لے سکتے۔ آخر اُسکی قیمت مقرر کی گئی اور آپ نے اس جگہ پر مسجد اور اپنے مکانات بنانے کا فیصلہ کیا۔

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ انصاری کے مکان پر قیام

اس کے بعد آپ نے فرمایا سب سے قریب گھر کس کا ہے؟ ابو ایوب رضی اللہ عنہ انصاری آگے بڑھے اور کہا یا رسول اللہ میرا گھر سب سے قریب ہے اور آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔ آپ نے فرمایا گھر جاؤ اور ہمارے لیے کوئی کمرہ تیار کرو۔ ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا مکان دو منزلہ تھا اُنہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے اُوپر کی منزل تجویز کی۔

مگر آپ نے اِس خیال سے کہ ملنے والوں کو تکلیف ہو گی نچلی منزل کو پسند فرمایا۔
انصار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے جو شدید محبت پیدا ہو گئی تھی، اُس کا مظاہرہ اِس موقعہ پر بھی ہُوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصرار پر حضرت ابو ایوبؓ مان تو گئے کہ آپ نچلی منزل میں ٹھہریں، لیکن ساری رات میاں بیوی اس خیال سے جاگتے رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے نیچے سو رہے ہیں۔ پھر وہ کس طرح اِس بے ادبی کے مرتکب ہو سکتے ہیں کہ وہ چھت کے اوپر سوئیں رات کو ایک برتن پانی کا گر گیا تو اس خیال سے کہ چھت کے نیچے پانی نہ ٹپک پڑے حضرت ایوبؓ نے دوڑ کر اپنا لحاف اُس پانی پر ڈال کر پانی کی رطوبت کو خشک کیا۔ صبح کے وقت پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارے حالات عرض کیے جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اوپر جانا منظور فرما لیا۔ حضرت ابو ایوب روزانہ کھانا تیار کرتے اور آپ کے پاس بھجواتے پھر جو آپ کا بچا ہُوا کھانا آتا وہ سارا گھر کھاتا۔ کچھ دنوں کے بعد اصرار کے ساتھ باقی انصار نے بھی مہمان نوازی میں اپنا حصّہ طلب کیا اور جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اپنے گھر کا انتظام نہ ہو گیا باری باری مدینہ کے مسلمان آپ کے گھر میں کھانا پہنچاتے تھے۔

حضرت انسؓ خادم آنحضرت صلعم کی شہادت

مدینہ کی ایک بیوہ عورت کا ایک ہی لڑکا اَنسؓ نامی تھا۔ اُن کی عمر آٹھ نو سال کی تھی وہ اُنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائیں اور کہا یا رسول اللہ! میرے اِس لڑکے کو اپنی خدمت کے لیے قبول فرمائیں۔ وہ عورت اپنی محبت کی وجہ سے اپنے لڑکے کو قربانی کیلئے پیش کر رہی تھی لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس کا لڑکا قربانی کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کی زندگی کے لیے قبول کیا گیا۔
اَنسؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں اسلام کے بہت بڑے عالم ہوئے اور آہستہ آہستہ بہت بڑے مالدار ہو گئے۔ اُنہوں نے ایک سو سال سے زیادہ عمر پائی اور اسلامی بادشاہت میں بہت عزت کی نگاہ کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ اَنسؓ کا بیان ہے کہ مَیں نے چھوٹی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا شرف حاصل کیا اور آپ کی زندگی تک آپ کے ساتھ رہا کبھی آپ نے مجھ سے سختی کے ساتھ بات نہیں کی، کبھی جھڑکی نہیں دی۔ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کہا جو میری طاقت سے باہر ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے ایام میں صرف اَنسؓ سے ہی خدمت لینے کا موقعہ ملا اور انسؓ کی شہادت اِس بارہ میں آپ کے اخلاق پر نہایت تیز روشنی ڈالنے والی ہے۔

مکّہ سے اہل و عیال منگوانا۔ مسجد نبوی کی بنیاد رکھنا

کچھ عرصہ کے بعد آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ کو مکّہ میں بھجوایا کہ وہ آپ کے اہل و عیال کو لے آئے۔ چونکہ مکّہ والے اِس اچانک ہجرت کی وجہ سے کچھ گھبرا گئے تھے۔ اِس لیے کچھ عرصہ تک مظالم کا سلسلہ بند رہا۔ اور اسی گھبراہٹ کی وجہ سے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کے خاندان کے مکّہ چھوڑنے میں مزاحم نہیں ہوئے اور یہ لوگ خیریت سے مدینہ پہنچ گئے۔ اِس عرصہ میں جو زمین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خریدی تھی سب سے پہلے وہاں آپ نے مسجد کی بنیاد رکھی۔ اور اس کے بعد اپنے لیے اور اپنے ساتھیوں کے لیے

مکان بنوائے جس پر کوئی سات مہینے کا عرصہ لگا۔

مدینہ کے مشرک قبائل کا اسلام میں داخل ہونا

مدینہ میں آپ کے داخلہ کے بعد چند ہی دن میں مدینہ کے مشرک قبائل میں سے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے، جو دل سے مسلمان نہ ہوئے تھے وہ ظاہری طور پر مسلمانوں میں شامل ہو گئے اور اس طرح پہلی دفعہ مسلمانوں میں منافقوں کی ایک جماعت قائم ہوئی جو بعد کے زمانہ میں کچھ تو سچے طور پر ایمان لے آئی اور کچھ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف منصوبے اور سازشیں کرتی رہی کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ظاہر میں بھی اسلام نہ لائے مگر یہ لوگ مدینہ میں اسلام کی شوکت کو برداشت نہ کر سکے اور مدینہ سے ہجرت کر کے مکّہ چلے گئے۔ اس طرح مدینہ دنیا کا پہلا شہر تھا جس میں خالصتہً خدائے واحد کی عبادت قائم کی گئی۔ یقیناً اس وقت دنیا کے پردہ پر اس شہر کے سوا اور کوئی شہر یا گاؤں خالصتہً خدائے واحد کی عبادت کرنیوالا نہیں تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ کتنی بڑی خوشی اور اُن کے ساتھیوں کی نگاہوں میں یہ کتنی عظیم الشان کامیابی تھی کہ مکّہ سے ہجرت کرنیکے چند دنوں بعد ہی خدا تعالیٰ نے اُن کے ذریعے سے ایک شہر کو پورے طور پر خدائے قادر کا پرستار بنا دیا جس میں اور کسی بت کی پوجا نہیں کی جاتی تھی، نہ ظاہری بت کی نہ باطنی بت کی لیکن اس تبدیلی سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے لیے اب امن آ گیا تھا۔ مدینہ میں عربوں میں سے بھی ایک جماعت منافقوں کی ایسی موجود تھی جو آپ کی جان کی دشمن تھی۔ اور یہود بھی ریشہ دوانیاں کر رہے تھے چنانچہ اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے آپ خود بھی چوکس رہتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی چوکس رہنے کی تاکید کرتے تھے۔ شروع میں بعض دن ایسے بھی آئے کہ آپ کو رات بھر جاگنا پڑا۔ ایک دفعہ ایسی ہی حالت میں جب آپکو جاگتے رہنے سے تکان محسوس ہوئی تو آپ نے فرمایا اِس وقت کوئی مخلص آدمی پہرہ دیتا تو میں سو جاتا۔ تھوڑی دیر میں ہتھیاروں کی جھنکار سُنائی دی آپ نے پوچھا کون ہے؟ تو آواز آئی یا رسول اللہ میں سعد بن ابی وقاص ہوں، جو آپ کا پہرہ دینے کے لیے آیا ہوں۔ اِس پر آپ نے آرام فرمایا۔ انصار کو خود بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ کی رہائش ہم پر بہت بڑی ذمہ واری ڈالتی ہے اور یہ کہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم مدینہ میں دشمنوں کے حملوں سے محفوظ نہیں چنانچہ انہوں نے باہمی فیصلہ کر کے مختلف قبائل کی باریاں مقرر کر دیں۔ ہر قبیلہ کے کچھ لوگ باری باری آپ کے گھر کا پہرہ دیتے تھے۔

غرض مکّی زندگی اور مدنی زندگی میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ ہے کہ اب مسلمان خدا کے نام پر قائم کی ہوئی مسجد میں بغیر دوسرے لوگوں کی دخل اندازی کے پانچوں وقت نمازیں پڑھ سکتے تھے۔

مکّہ والوں کی مسلمانوں کو دوبارہ دکھ دینے کی سکیمیں

دو تین مہینے گذرنے کے بعد مکّہ کے لوگوں کی پریشانی دُور ہوئی اور انہوں نے نئے سرے سے مسلمانوں کو دُکھ دینے کی تدابیر سوچنی شروع کیں۔ مگر مشورہ کے بعد اُنہوں نے محسوس کیا کہ صرف مکّہ اور گرد و نواح میں مسلمانوں کو تکلیف دینا انہیں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں کر سکتا۔ وہ اسلام کو نہیں مٹا سکتے ہیں جب مدینہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکلوا دیں۔ چنانچہ یہ مشورہ کر کے مکّہ کے لوگوں نے عبداللہ بن ابی بن سلول کے نام جس کی نسبت پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مدینہ والوں نے اُسے اپنا

بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر دیا تھا خط لکھا اور اسے توجہ دلائی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ جانے کی وجہ سے مکہ کے لوگوں کو بہت صدمہ ہُوا ہے۔ مدینہ کے لوگوں کو چاہیئے نہیں تھا کہ وہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو پناہ دیتے۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ تھے:۔"اِنَّکُمْ اٰوَیْتُمْ صَاحِبَنَا وَاِنَّا نُقْسِمُ بِاللّٰہِ لَتُقَاتِلُنَّہٗ اَوْ تُخْرِجُنَّہٗ اَوْ لَنَسِیْرَنَّ اِلَیْکُمْ بِاَجْمَعِنَا حَتّٰی نَقْتُلَ مُقَاتِلَتَکُمْ وَنَسْتَبِیْحَ نِسَاءَکُمْ"

یعنی اب جبکہ تم لوگوں نے ہمارے آدمی (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے گھروں میں پناہ دی ہے ہم خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ یا تو تم مدینہ کے لوگ اس کے ساتھ لڑائی کرو یا اُسے اپنے شہر سے نکال دو۔ نہیں تو ہم سب کے سب مل کر مدینہ پر حملہ کریں گے اور مدینہ کے تمام قابلِ جنگ آدمیوں کو قتل کر دیں گے اور عورتوں کو غلام بنا لیں گے۔ اِس خط کے ملنے پر عبداللہ بن ابی ابن سلول کی نیت کچھ خراب ہوئی اور اُس نے دوسرے منافقوں سے مشورہ کیا کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم نے یہاں رہنے دیا تو ہمارے لیے خطرات کا دروازہ کھُل جائیگا۔ اِس لیے چاہیئے کہ ہم آپ کے ساتھ لڑائی کریں اور مکّہ والوں کو خوش کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اطلاع مل گئی اور آپ عبداللہ بن ابی ابن سلول کے پاس گئے اور اُسے سمجھایا کہ تمہارا یہ فعل خود تمہارے ہی لیے مضر ہوگا۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ مدینہ کے بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور اسلام کے لیے جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں اگر تم ایسا کرو گے تو وہ لوگ یقیناً مہاجرین کے ساتھ ہونگے اور تم لوگ اس لڑائی کو شروع کر کے بالکل تباہ ہو جاؤ گے۔ عبداللہ ابن ابی ابن سلول پر اپنی غلطی کھُل گئی اور وہ اِس ارادہ سے باز آگیا۔

انصار و مہاجرین میں مؤاخات

اِنہی ایام میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک اور تدبیر اسلام کی مضبوطی کے لیے اختیار کی اور وہ یہ کہ آپ نے تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور دو دو آدمیوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ اِس مؤاخات یعنی بھائی چارے کا انصار نے ایسی خوشدلی سے استقبال کیا کہ ہر انصاری اپنے بھائی کو اپنے گھر لے گیا اور اپنی جائیداد اُس کے سامنے پیش کر دی کہ اُسے نصف نصف بانٹ لیا جائے۔ ایک انصاری نے تو یہاں تک حد کر دی کہ اپنے مہاجر بھائی سے اصرار کیا کہ مَیں اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے دیتا ہوں تم اُس سے شادی کر لو۔ مگر مہاجرین نے اُن کے اِس اخلاص کا شکریہ ادا کر کے اُن کی جائیدادوں میں سے حصّہ لینے سے انکار کر دیا۔ مگر پھر بھی انصار مصر رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جب یہ مہاجر ہمارے بھائی ہو گئے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے مال میں حصہ دار نہ ہوں۔ ہاں چونکہ یہ زمینداری سے واقف نہیں اور تاجر پیشہ لوگ ہیں اگر یہ ہماری زمینوں سے حصّہ نہیں لیتے تو پھر ہماری زمینوں کی جو آمدنیاں ہوں اس میں ضرور ان کو حصّہ دار بنایا جائے۔ مہاجرین نے اِس پر بھی اُن کے ساتھ حصّہ دار بننا پسند نہ کیا اور اپنے آبائی پیشہ تجارت میں لگ گئے اور تھوڑے ہی دنوں میں اُن میں سے کئی مالدار ہو گئے۔ مگر انصار اس حصّہ بٹانے پر اتنے مصر تھے کہ بعض انصار جو فوت ہوئے اُن کی اولادوں نے عرب کے دستور کے مطابق اپنے مہاجر

بھائیوں کو مرنے والے کی جائیداد میں سے حصّہ دیا اور کئی سال تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ قرآن کریم میں اس عمل کی منسوخی کا ارشاد نازل ہُوا۔

مہاجرین وانصار اور یہود کے مابین معاہدہ

علاوہ مسلمانوں کو بھائی بھائی بنانے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اہل مدینہ کے درمیان ایک معاہدہ کرایا۔ آپ نے یہودیوں اور عربوں کے سرداروں کو جمع کیا اور فرمایا۔ پہلے یہاں صرف دو گروہ تھے، مگر اب تین گروہ ہو گئے ہیں۔ یعنی پہلے تو صرف یہود اور مدینہ کے عرب یہاں بستے تھے مگر اب یہود، مدینہ کے عرب اور مکّہ کے مہاجر تین گروہ ہو گئے ہیں۔ اِس لیے چاہیئے کہ آپس میں ایک صلح نامہ قائم ہو جائے۔ چنانچہ آپس کے سمجھوتے کے ساتھ ایک معاہدہ لکھا گیا! اس معاہدہ کے الفاظ یہ ہیں :۔

" معاہدہ مابین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ مومنوں اور اُن تمام لوگوں کے جو اُن سے بخوشی مل جائیں مہاجرین سے اگر کوئی قتل ہو جائے تو وہ اُس کے خون کا ذمہ وار ہونگے اور اپنے قیدیوں کو خود چھڑائیں گے اور مدینہ کے مختلف مسلمان قبائل بھی اسی طرح اِن امور میں اپنے قبائل کے ذمہ وار ہونگے۔ جو شخص بغاوت پھیلائے یا دشمنی پیدا کرے اور نظام میں تفرقہ ڈالے تمام معاہدین اُس کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔ خواہ وہ اُن کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر کوئی کافر مسلمان کے ہاتھ سے لڑائی میں مارا جائے تو اُس کے مسلمان رشتہ دار مسلمان سے بدلہ نہیں لیں گے اور نہ کسی مسلمان کے مقابلہ میں ایسے کافر کی مدد کرینگے۔ جو کوئی یہودی ہمارے ساتھ مل جائے اس کی ہم سب مدد کریں گے۔ یہودیوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دی جائیگی۔ نہ کسی دشمن کی اُن کے خلاف مدد کی جائیگی۔ کوئی غیر مومن مکہ کے لوگوں کو اپنے گھر میں پناہ نہیں دیگا نہ اُن کی جائیداد اپنے پاس امانت رکھیگا اور نہ کافروں اور مومنوں کی لڑائی میں کسی قسم کی دخل اندازی کریگا۔ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو ناجائز طور پر مار دے تو تمام مسلمان اس کے خلاف متحدہ کوشش کرینگے۔ اگر ایک مشرک دشمن مدینہ پر حملہ کرے تو یہودی مسلمانوں کا ساتھ دینگے اور بحصہ رسدی خرچ برداشت کرینگے یہودی قبائل جو مدینہ کے مختلف قبائل کے ساتھ معاہدہ کر چکے ہیں اُن کے حقوق مسلمانوں کے سے حقوق ہونگے۔ یہودی اپنے مذہب پر قائم رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب پر قائم رہیں گے۔ جو حقوق یہودیوں کو ملیں گے وہی ان کے اتباع کو بھی ملیں گے۔ مدینہ کے لوگوں میں سے کوئی شخص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کوئی لڑائی شروع نہیں کر سکے گا۔ لیکن اس شرط کے ماتحت کسی شخص کو اُس کے جائز انتقام سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ یہودی اپنی تنظیم میں اپنے اخراجات خود برداشت کرینگے اور مسلمان اپنے اخراجات خود برداشت کرینگے لیکن لڑائی کی صورت میں وہ دونوں مل کر کام کریں گے۔ مدینہ ان تمام لوگوں کے لیے جو اس معاہدہ میں شامل ہوتے ہیں ایک محترم جگہ ہو گی۔ جو اجنبی لوگ شہر کے لوگوں کی حمایت میں آ جائیں اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو اصل باشندگانِ شہر کے ساتھ ہوگا۔ لیکن مدینہ کے لوگوں کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ کسی عورت کو اُس کے رشتہ داروں کی مرضی کے بغیر اپنے گھروں میں رکھیں۔ جھگڑے اور فساد خدا اور اُس کے رسول کے پاس فیصلہ کے لیے پیش کیے جائیں گے۔ مکّہ والوں اور اُن کے حلیف قبائل کے ساتھ اِس معاہدہ میں شامل ہونے والے

کوئی معاہدہ نہیں کریں گے، کیونکہ اِس معاہدہ میں شامل ہونے والے مدینہ کے دشمنوں کے خلاف اِس معاہدہ کے ذریعہ سے اتفاق کر چکے ہیں جس طرح جنگ علیٰحدہ نہیں کی جاسکے گی اِسی طرح صلح بھی علیٰحدہ نہیں کی جا سکے گی۔ لیکن کسی کو مجبور نہیں کیا جائیگا کہ وہ لڑائی میں شامل ہو۔ ہاں اگر کوئی شخص ظلم کا کوئی فعل کرے گا تو وہ سزا کا مستحق ہو گا۔ یقیناً خدا نیکوں اور دینداروں کا محافظ ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے رسول ہیں۔"

یہ معاہدہ کا خلاصہ ہے۔ اس معاہدہ میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ دیانتداری اور صفائی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا جائیگا اور ظالم اپنے ظلم کا خود ذمہ وار ہو گا۔ اس معاہدہ سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ یہودیوں کے ساتھ اور مدینہ کے باشندوں کے ساتھ جو اسلام میں شامل نہ ہوں محبّت، پیار اور ہمدردی کا سلوک کیا جائیگا اور انہیں بھائیوں کی طرح رکھا جائیگا۔ پس بعد میں یہود کے ساتھ جس قدر جھگڑے پیدا ہوئے اُن کی ذمہ واری خالصتہً یہود پر تھی۔

اہل مکّہ کی طرف سے از سرِ نو شرارتوں کا آغاز

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے دو تین مہینہ کے بعد مکّہ والوں کی پریشانی جب دُور ہوئی تو اُنہوں نے پھر سے اسلام کے خلاف ایک نیا محاذ قائم کیا۔ چنانچہ انہی ایام میں مدینہ کے ایک رئیس سعد بن معاذؓ جو اوس قبیلہ کے سردار تھے بیت اللہ کا طواف کرنے کیلئے مکّہ گئے، تو ابو جہل نے انکو دیکھ کر بڑے غصہ سے کہا کیا تم لوگ یہ خیال کرتے ہو کہ اُس مرتد (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو پناہ دینے کے بعد تم لوگ امن کے ساتھ کعبہ کا طواف کر سکو گے اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم اُس کی حفاظت اور امداد کی طاقت رکھتے ہو۔ خدا کی قسم اگر اس وقت تیرے ساتھ ابو صفوان نہ ہوتا تو تُو اپنے گھر والوں کے پاس بچ کر نہ جا سکتا۔ سعد بن معاذؓ نے کہا۔ واللہ! اگر تم نے ہمیں کعبہ سے روکا تو یاد رکھو پھر تمہیں بھی تمہارے شامی راستہ پر امن نہیں مل سکے گا۔ اِنہی دنوں میں ولید بن مغیرہ مکّہ کا ایک بہت بڑا رئیس بیمار ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ اُس کی موت قریب ہے ایک دن مکّہ کے بڑے بڑے رئیس اُس کے پاس بیٹھے تھے تو وہ بے اختیار ہو کر رونے لگ گیا۔ مکّہ کے روٴساء حیران ہوئے اور اُس سے پوچھا کہ آخر آپ روتے کیوں ہیں؟ ولید نے کہا کیا تم سمجھتے ہو کہ میں موت کے ڈر سے روتا ہوں واللہ! ایسا ہرگز نہیں، مجھے تو یہ غم ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین پھیل جائے اور مکّہ بھی اس کے قبضہ میں چلا جائے۔ ابو سفیان نے جواب میں کہا۔ اس بات کا غم نہ کرو۔ جب تک ہم زندہ ہیں ایسا نہیں ہو گا۔ ہم اس بات کے ضامن ہیں۔ اِن تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مکّہ کے لوگوں کے مظالم میں جو وقفہ ہُوا تھا وہ عارضی تھا۔ دوبارہ قوم کو اُکسایا جا رہا تھا۔ مرنے والے روٴساء موت کے بستر پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی قسمیں لے رہے تھے۔ مدینہ کے لوگوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑائی پر آمادہ کیا جا رہا تھا اور اُن کے انکار پر دھمکیاں دی جا رہی تھیں کہ مکّہ والے اور اُن کے حلیف قبائل لشکر لیکر مدینہ پر حملہ کرینگے اور مدینہ کے مردوں کو ماردیں گے اور عورتوں کو غلام بنا لیں گے۔

آنحضرت صلعم کی مدافعانہ تدابیر

پس اِن حالات میں اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں خاموش بیٹھے رہتے اور مدینہ کی حفاظت کا کوئی

سامان نہ کرتے تو یقیناً آپ پر ایک بہت بڑی ذمہ واری عاید ہوتی۔ پس آپ نے چھوٹے چھوٹے وفدوں کی صورت میں اپنے صحابہ کو مکّہ کے اِرد گرد بھجوانا شروع کیا۔ تا کہ مکّہ والوں کی کارروائیوں کا آپ کو علم ہوتا رہے۔ بعض دفعہ اِن لوگوں کی مکّہ کے قافلوں یا مکّہ کی بعض جماعتوں سے مٹھ بھیڑ بھی ہو جاتی اور ایک دُوسرے کو دیکھ لینے کے بعد لڑائی تک بھی نوبت پہنچ جاتی۔ مسیحی مصنف لکھتے ہیں کہ یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے چھیڑ چھاڑ تھی۔ کیا مکّہ میں تیرہ سال تک جو مسلمانوں پر ظلم کیا گیا اور مدینہ کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف کھڑا کرنے کی جو کوشش کی گئی اور پھر مدینہ پر حملہ کرنے کی جو دھمکیاں دی گئیں۔ اِن واقعات کی موجودگی میں آپ کا خبردار رہنے کے لیے وفود کو بھجوانا کیا چھیڑ چھاڑ کہلا سکتا ہے؟ کونسا دنیا کا قانون ہے جو مکّہ کے تیرہ سال کے مظالم کے بعد بھی مسلمانوں اور اہلِ مکّہ میں لڑائی چھیڑنے کے لیے کسی مزید وجہ کی ضرورت سمجھتا ہو۔ آج مغربی ممالک اپنے آپ کو بہت ہی مہذّب سمجھتے ہیں۔ جو کچھ مکّہ میں ہُوا کیا اُن سے نصف واقعات پر بھی اگر کوئی قوم لڑے تو کوئی شخص اُسے مجرم قرار دے سکتا ہے؟ کیا اگر کوئی حکومت کسی دوسرے ملک کے لوگوں کو ایک جماعت کے قتل کرنے یا اپنے ملک سے نکال دینے پر مجبور کرے تو اس جماعت کو حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اُس سے لڑائی کا اعلان کرے؟ پس مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد کسی نئی وجہ کے پیدا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ مکّی زندگی کے واقعات مسلمانوں کو پُورا حق دیتے تھے کہ وہ مکّہ والوں سے جنگ کا اعلان کر دیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔ اُنہوں نے صبر کیا اور صرف دشمنوں کی شرارتوں کا پتہ لگاتے رہنے کی حد تک اپنی کوششوں کو محدود رکھا۔ مگر جب مکّہ والوں نے خود مدینہ کے عربوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا، مسلمانوں کو حج کرنے سے روک دیا۔ اُن کے قافلے جو شام میں تجارت کے لیے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے اصل راستے کو چھوڑ کر مدینہ کے ارد گرد کے قبائل میں سے ہو کر گذرنا شروع کیا اور ان کو مدینہ والوں کے خلاف اُکسانا شروع کیا تو مدینہ کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کا بھی فرض تھا کہ وہ اس لڑائی کے چیلنج کو جو مکّہ والے متواتر چودہ سال سے دے رہے تھے قبول کرتے۔ اور دنیا کے کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ چیلنج کے قبول کرنے پر اعتراض کرے۔

مدینہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد

جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیرونی حالات کی خبر گیری کر رہے تھے وہاں آپ مدینہ کی اصلاح سے بھی غافل نہیں تھے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ مدینہ کے مشرک اکثر اخلاص کے ساتھ اور بعض منافقت کے ساتھ مسلمان ہو چکے تھے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی طریق حکومت کو اُن میں قائم کرنا شروع کیا۔ پہلے عرب کے دستور کے مطابق لوگ لڑ بھڑ کر اپنے حقوق کا فیصلہ کر لیا کرتے تھے۔ اب باقاعدہ قاضی مقرر کیے گئے جن کے فیصلہ کے بغیر کوئی شخص اپنا حق دوسرے سے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے مدینہ کے لوگوں کو علم کی طرف توجہ نہیں تھی اب اِس بات کا انتظام کیا گیا کہ پڑھے لکھے لوگ اَن پڑھوں کو پڑھانا شروع کریں۔ ظلم، تعدّی اور بے انصافی کو روک دیا گیا۔ عورتوں کے حقوق کو قائم کیا گیا۔ شریعت کے مطابق تمام مالداروں پر ٹیکس مقرر کیے گئے جو غرباء پر خرچ کیے جاتے تھے اور شہر کی عام حالت

کی ترقی کے لیے بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کی گئی۔ لاوارثوں کے لیے باقاعدہ تعلیموں کا انتظام کیا گیا۔ لین دین میں تحریر اور معاہدہ کی پابندیاں مقرر کی گئیں۔ غلاموں پر سختی کو سختی سے روکا جانے لگا۔ صفائی اور حفظانِ صحت کے اصول پر زور دیا جانے لگا۔ مردم شماری کی ابتداء کی گئی۔ گلیوں اور سڑکوں کے چوڑا کرنے کے احکام جاری کیے گئے۔ سڑکوں کی صفائی کے متعلق احکام جاری کیے گئے۔ غرض عائلی اور شہری زندگی کے تمام اصول مدوّن کیے گئے اور اُن کو باقاعدگی سے جاری کرنے کے لیے تدابیر اختیار کی گئیں اور عرب پہلی دفعہ منظم اور مہذّب سوسائٹی کے اصول سے روشناس ہوئے۔

اِدھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے لیے ایک ایسا قانون پیش کر رہے تھے جو نہ صرف اُس زمانہ کے لیے بلکہ ہمیشہ کے لیے اُن کے لیے اور دنیا کی دوسری اقوام کے لیے بھی عزّت، شرف، امن اور ترقی کا موجب تھا اِدھر مکّہ کے لوگ اسلام کے خلاف باقاعدہ جنگ کی تیاریاں کرنے میں مشغول تھے جس کا نتیجہ بدر کی جنگ کی صورت میں ظاہر ہُوا۔

قریش کے تجارتی قافلہ کی آمد اور غزوۂ بدر

ہجرت کے تیرھویں مہینے میں شام سے ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں آ رہا تھا کہ اُس کی حفاظت کے بہانہ سے مکّہ والوں نے ایک زبردست لشکر مدینہ کی طرف لیجانے کا فیصلہ کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی اطلاع مل گئی۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی ہوئی۔ اب وقت آگیا ہے کہ دشمن کے ظلم کا اُس کے اپنے ہتھیار کے ساتھ جواب دیا جائے۔ چنانچہ آپ مدینہ کے چند ساتھیوں کو لیکر نکلے۔ جب آپ مدینہ سے نکلے ہیں اُس وقت تک یہ ظاہر نہ تھا کہ آیا مقابلہ قافلہ والوں سے ہوگا یا اصل لشکر سے۔ اس لیے تین سو آدمی آپ کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔

یہ نہیں سمجھنا چاہئیے کہ قافلہ سے مراد مال سے لدے ہُوئے اُونٹ تھے۔ بلکہ مکّہ والے اِن قافلوں کے ساتھ ایک مضبوط فوجی جتھہ بھجوایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اِن قافلوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو مرعوب بھی کرنا چاہتے تھے چنانچہ اس قافلہ سے پہلے دو قافلوں کا ذکر تاریخ میں آتا ہے کہ اُن میں سے ایک کی حفاظت پر دو سو سپاہی مقرر تھا اور دُوسرے کی حفاظت پر تین سو سپاہی مقرر تھا پس ان حالات میں مسیحی مصنّفوں کا یہ لکھنا کہ تین سو سپاہی لیکر آپ مکّہ کے ایک نہتّے قافلہ کو لوٹنے کے لیے نکلے تھے محض دھوکا دہی کے لیے ہے۔ یہ قافلہ چونکہ بہت بڑا تھا اِس لیے پہلے قافلوں کے حفاظتی دستوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہئیے کہ اُسکے ساتھ چار پانچ سو سوار ضرور موجود ہوگا۔ اتنے بڑے حفاظتی دستہ کے ساتھ مقابلہ کرنیکے لیے اگر اسلامی لشکر جو صرف تین سو آدمیوں پر مشتمل تھا اور جن کے پاس پُورا ساز و سامان بھی نہ تھا نکلا تو اُسے لُوٹ کا نام دینا محض تعصّب، ضدّ اور بے انصافی ہی کہلا سکتا ہے اگر صرف اس قافلہ کا سوال ہوتا تب بھی اُس سے لڑائی جنگ ہی کہلاتی اور جنگ بھی مدافعانہ جنگ۔ کیونکہ مدینہ کا لشکر کمزور تھا اور صرف اسی فتنہ کو دُور کرنیکے لیے نکلا تھا جسکی اردگرد کے قبائل کو شرارت پر اُکسا کر مکّہ کے قافلے بنیاد رکھ رہے تھے۔ مگر جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے الٰہی منشاء بھی تھا کہ قافلہ سے نہیں بلکہ اصل مکّی لشکر سے مقابلہ ہو اور صرف مسلمانوں کے اخلاص اور اُن کے ایمان کو ظاہر کرنے کے لیے پہلے سے اِس امر کا اظہار نہ کیا گیا۔ جب مسلمان بغیر پوری تیاری کے مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے تو کچھ دُور جا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

صحابہؓ پر ظاہر کیا کہ الٰہی منشاء یہی ہے کہ مکّہ کے اصل لشکر سے مقابلہ ہو۔ لشکر کے متعلق مکّہ سے جو خبریں آچکی تھیں اُن سے معلوم ہوتا تھا کہ لشکر کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے اور پھر وہ سب کے سب تجربہ کار سپاہی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آنیوالے لوگ صرف ۳۱۳ تھے اور اُن میں سے بھی بہت سے ایسے تھے جو لڑائی کے فن سے نا واقف تھے۔ پھر سامانِ جنگ بھی اُن کے پاس پورا نہ تھا۔ اکثر یا تو پیدل تھے یا اونٹوں پر سوار تھے۔ گھوڑا صرف ایک تھا۔ اِس چھوٹے سے لشکر کے ساتھ جو بے سرو سامان بھی تھا ایک تجربہ کار دشمن کا مقابلہ جو تعداد میں اُن سے تگنے سے بھی زیادہ تھا نہایت ہی خطرناک بات تھی۔ اس لیے آپ نے نہ چاہا کہ کسی شخص کو اُس کی مرضی کے خلاف جنگ پر مجبور کیا جائے چنانچہ آپنے اپنے ساتھیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ اب قافلہ کا کوئی سوال نہیں صرف فوج ہی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ وہ اِس بارہ میں آپ کو مشورہ دیں۔ ایک کے بعد دوسرا مہاجر کھڑا ہوا اور اُس نے کہا یا رسول اللہ اگر دشمن ہمارے گھروں پر چڑھ کر آیا ہے تو ہم اُس سے ڈرتے نہیں ہم اُس کا مقابلہ کرنیکے لیے تیار ہیں۔ ہر ایک کا جواب سُنکر آپ یہی فرماتے چلے جاتے مجھے اور مشورہ دو مجھے اور مشورہ دو۔ مدینہ کے لوگ اُس وقت تک خاموش تھے اِس لیے کہ حملہ آور فوج مہاجرین کی رشتہ دار تھی۔ وہ ڈرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ اُن کی بات سے مہاجرین کا دل دُکھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا مجھے مشورہ دو۔ تو ایک انصاری سردار کھڑے ہوئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مشورہ تو آپ کو مل رہا ہے مگر پھر بھی جو آپ بار بار مشورہ طلب فرما رہے ہیں تو شاید آپکی مراد ہم باشندگانِ مدینہ سے ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں! اُس سردار نے جواب میں کہا یا رسول اللہ! شاید آپ اس لیے ہمارا مشورہ طلب کر رہے ہیں کہ آپ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے ہمارے اور آپکے درمیان ایک معاہدہ ہُوا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ اگر مدینہ میں آپ پر اور مہاجرین پر کسی نے حملہ کیا تو ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ لیکن اب اِس وقت آپ مدینہ سے باہر تشریف لے آئے ہیں اور شاید وہ معاہدہ اِن حالات کے ماتحت قائم نہیں رہتا۔ یا رسول اللہ! جس وقت وہ معاہدہ ہُوا تھا اُس وقت تک ہم پر آپ کی حقیقت پورے طور پر روشن نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب جبکہ ہم پر آپؐ کا مرتبہ اور آپ کی شان پُورے طور پر ظاہر ہو چکی ہے یا رسول اللہ اب اُس معاہدہ کا کوئی سوال نہیں۔ ہم موسٰی کے ساتھیوں کی طرح آپ کو یہ نہیں کہیں گے اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔ تُو اور تیرا ربّ جاؤ اور دشمن سے جنگ کرتے پھرو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے اور آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور یا رسول اللہ! دشمن جو آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے آیا ہے، وہ آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہماری لاشوں پر سے گذرتا ہوا نہ جائے۔ یا رسول اللہ! جنگ تو ایک معمولی بات ہے، یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر سمندر ہے آپ ہمیں حکم دیجئے کہ سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دو اور ہم بلا دریغ سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دینگے۔ یہ وہ فدائیت اور اخلاص کا نمونہ تھا جس کی مثال کوئی سابق نبی پیش نہیں کر سکتا۔ موسٰی کے ساتھیوں کا حوالہ تو اُن لوگوں نے خود ہی دے دیا تھا حضرت مسیح کے حواریوں نے دشمن کے مقابلہ میں جو نمونہ دکھایا انجیل اس پر گواہ ہے۔ ایک نے تو چند روپوں پر اپنے اُستاد کو بیچ دیا۔ دوسرے نے اُس پر لعنت کی اور باقی دسؔ اُس کو چھوڑ کر ادھر سے اُدھر بھاگ گئے۔ مگر محمّد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھی صرف ڈیڑھ سال کی صحبت کے بعد ایمان میں اتنے

پختہ ہو گئے کہ وہ اُن کے کہنے پر سمندر میں کودنے کے لیے بھی تیار تھے۔

یہ مشورہ محض اِس غرض سے تھا تا کہ جو لوگ ایمان کے کمزور ہوں اُن کو واپس جانے کی اجازت دیدی جائے لیکن جب مہاجرین و انصار نے ایک دوسرے سے بڑھ کر اخلاص اور ایمان کا نمونہ دکھایا اور دونوں فریق نے اِس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ خدا کے وعدوں کے باوجود تعداد میں دشمن سے ایک تہائی ہونے کے اور باوجود سامانوں کے لحاظ سے دشمنوں سے کئی گنا کم ہونیکے بے غیرتی دکھاتے ہوئے جنگ سے پیٹھ نہیں دکھائیں گے بلکہ خدا تعالیٰ کے دین کی غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں خوشی سے جان دیدیں گے، تو آپ آگے بڑھے۔ جب آپ بدر کے مقام پر پہنچے تو ایک صحابی کے مشورہ سے دشمن کے قریب جا کر بدر کے چشمہ پر اسلامی لشکر اُتار دیا گیا۔ لیکن اِس طرح گو پانی پر تو قبضہ ہو گیا مگر وہ میدان جو مسلمانوں کے حصّہ میں آیا بوجہ ریتلا ہونے کے جنگی حرکات کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہُوا اور صحابہ گھبرا گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات دعا کرتے رہے اور بار بار خدا تعالیٰ سے یہ فرماتے تھے کہ اے میرے ربّ! ساری دنیا کے پردہ پر صرف یہی لوگ تیری عبادت کرنے والے ہیں۔ اے میرے ربّ! اگر یہ لوگ آج اِس لڑائی میں مارے گئے، تو تیرا نام لینے والا دنیا میں کون باقی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاؤں کو سُنا اور رات کو بارش ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جس میدان میں مسلمان تھے بوجہ ریتلا ہونے کے بارش کی وجہ سے جم گیا اور وہ میدان جو کفار کے قبضہ میں تھا بوجہ چکنی مٹی کا ہونے کے بارش کی وجہ سے نہایت پھسلواں ہو گیا۔ شاید کفارِ مکہ نے باوجود اُس میدان میں مسلمانوں سے پہلے پہنچ جانے کے اِس لیے اُس میدان کو چُنا تھا کہ پختہ مٹی کی وجہ سے اُس میں جنگی حرکات بڑی آسانی کے ساتھ ہو سکتی تھیں اور سامنے کا ریتلا میدان اِس لیے چھوڑ دیا کہ مسلمان وہاں ڈیرہ لگائیں گے اور جنگی حرکات کرتے وقت اُن کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جائینگے مگر اللہ تعالیٰ نے راتوں رات پانسہ پلٹ دیا۔ ریتلا میدان ایک جما ہُوا پختہ میدان بن گیا اور پختہ میدان پھسلواں زمین بن گیا۔ رات کو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی اور بتایا کہ تمہارے فلاں فلاں دشمن مارے جائیں گے اور فلاں فلاں جگہ پر مارے جائینگے چنانچہ جنگ میں ایسا ہی ہُوا اور وہ دشمن اُنہی جگہوں پر جو آپ نے بتائی تھیں مارے گئے۔ جب فوج ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آراء ہوئی اُس وقت جو اخلاص کا نمونہ صحابہؓ نے دکھایا اُس پر مندرجہ ذیل مثال سے خوب روشنی پڑتی ہے:۔

اسلامی لشکر میں جو چند تجربہ کار جرنیل تھے، اُن میں سے ایک حضرت عبد الرحمٰن بن عوف بھی تھے جو مکّہ کے سرداروں میں سے تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ میرا خیال تھا کہ آج مجھ پر بہت سی ذمہ واری عاید ہوتی ہے اور اس خیال سے مَیں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو مجھے معلوم ہُوا کہ میرے دائیں بائیں مدینہ کے دو نوجوان لڑکے ہیں تب میرا دل سینہ میں بیٹھ گیا اور مَیں نے کہا۔ بہادر جرنیل لڑنے کے لیے اِس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ اُس کا دایاں اور بایاں پہلو مضبوط ہو، تاکہ وہ دشمن کی صفوں میں دلیری سے گھس سکے، لیکن میرے گرد تو مدینہ کے ناتجربہ کار لڑکے ہیں۔ مَیں آج اپنے فن کا مظاہرہ کس طرح کر سکوں گا۔ ابھی یہ خیال میرے دل میں گذر ہی رہا تھا کہ میرے ایک پہلو میں کھڑے ہوئے لڑکے نے میری پسلی میں کُہنی ماری۔ جب مَیں اس کی طرف متوجہ ہُوا تو اُس نے میرے کان میں

کہا چچا! ہم نے سُنا ہے ابوجہل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت دُکھ دیا کرتا تھا، چچا میرا دل چاہتا ہے کہ مَیں آج اُس کے ساتھ مقابلہ کروں آپ مجھے بتائیں وہ کون ہے؟ وہ کہتے ہیں ابھی میں جواب دینے نہ پایا تھا کہ میرے دوسرے پہلو میں دوسرے ساتھی نے کُہنی ماری اور جب مَیں اُس کی طرف متوجہ ہُوا تو اُس نے بھی آہستہ سے وہی سوال مجھ سے کیا۔ وہ کہتے ہیں مَیں اُن کی اس دلیری پر حیران رہ گیا۔ کیونکہ باوجود تجربہ کار سپاہی ہونے کے مَیں بھی یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ لشکر کے کمانڈر پر اکیلا جاکر حملہ کرسکتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں مَیں نے اُن کے اِس سوال پر اُنگلی اُٹھائی اور کہا وہ شخص جو سر سے پَیر تک مسلّح ہے اور دشمن کی صفوں کے پیچھے کھڑا ہے اور جس کے آگے دو تجربہ کار جرنیل ننگی تلواریں لیے کھڑے ہیں وہی ابوجہل ہے۔ وہ کہتے ہیں ابھی میری اُنگلی نیچے نہیں گری تھی کہ وہ دونوں لڑکے جس طرح عقاب چڑیا پر حملہ کرتا ہے اس طرح جھپٹتے ہوئے کفار کی صفوں میں گُھس گئے۔ اُن کا یہ حملہ ایسا اچانک اور ایسا خلاف توقع تھا کہ کسی شخص کی تلوار اُن کے خلاف نہ اُٹھ سکی۔ اور وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ ابوجہل تک جا پہنچے اُس کے پہرہ داروں نے اُن پر وار کیے، ایک کا وار خالی گیا اور دوسرے کے وار سے ایک نوجوان کا ہاتھ کٹ گیا لیکن دونوں میں سے کسی نے کوئی پروا نہ کی اور صرف ابوجہل کی طرف متوجہ ہوئے اور اُس پر اِس زور سے جاکر حملہ کیا کہ وہ زمین پر گر گیا اور پھر اُنہوں نے اُسے نہایت شدید زخمی کردیا۔ مگر بوجہ تلوار چلانے کا فن نہ جاننے کے اُسے قتل نہ کرسکے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ مظالم جو مکّہ کے لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کرتے رہے تھے وہ قریب سے دیکھنے والوں کو کتنے بھیانک نظر آتے تھے۔ اب بھی ان مظالم کو تاریخ میں پڑھ کر ایک شریف آدمی کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر مدینہ کے لوگ تو اُن لوگوں کے مُنہ سے مظالم کی داستانیں سنتے تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ مظالم ہوتے دیکھے۔ ایک طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مقدّس اور صلح جویانہ زندگی وہ دیکھتے تھے۔ دوسری طرف مکّہ والوں کے انسانیت سوز مظالم کے واقعات سنتے تھے تو اُن کے دل اس حسرت سے بھر جاتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنی صلح جوئی اور پُر عافیت مزاج کی وجہ سے ان لوگوں کا جواب نہیں دیا کاش! وہ ہمارے سامنے آجائیں تو ہم اُنہیں بتائیں کہ اگر اُن کے ظلموں کا جواب نہیں دیا گیا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مسلمان کمزور تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو خدا تعالےٰ کی طرف سے اُن کا جواب دینے کی اجازت نہیں تھی۔ مسلمانوں کے دلوں کی کیفیت کا اندازہ اِس سے بھی ہوسکتا ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ابوجہل نے ایک بدوی سردار کو اِس بات کے لیے بھیجا کہ وہ اندازہ کرے کہ مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے۔ جب وہ واپس لَوٹا تو اُس نے بتایا کہ مسلمان تین سوا تین سو کے قریب ہونگے۔ اِس پر ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا اب مسلمان ہم سے بچ کر کہاں جاتے ہیں۔ مگر اُس شخص نے کہا۔ اے مکّہ والو! میری نصیحت تم کو یہی ہے کہ تم اِن لوگوں سے نہ لڑو۔ کیونکہ مَیں نے جتنے آدمی مسلمانوں کے دیکھے ہیں اُن کو دیکھ کر مجھ پر یہی اثر ہُوا ہے کہ اونٹوں پر آدمی سوار نہیں موتیں سوار ہیں، یعنی اُن میں سے ہر شخص مرنے کے لیے اِس میدان میں آیا ہے زندہ واپس جانے کے لیے نہیں آیا۔ اور جو شخص موت کو اپنے لیے آسان کرلیتا ہے اور موت کو ملنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے اُس کا مقابلہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہُوا کرتی۔

ایک عظیم الشّان پیشگوئی کا پُورا ہونا

جب جنگ شروع ہونے کا وقت آیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اس جگہ سے جہاں آپ بیٹھ کر دُعا کر رہے تھے باہر تشریف لائے اور فرمایا سَیُھزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔ دشمنوں کا لشکر شکست کھا جائیگا اور پیٹھ پھیر کر میدان چھوڑ جائیگا۔ یہ الفاظ جو آپ نے فرمائے یہ قرآن کریم کی ایک پیشگوئی تھی جو مکّہ میں ہی اس جنگ کے متعلق قرآن کریم میں نازل ہوئی تھی۔ مکّہ میں جب مسلمان کفار کے ظلموں کا تختۂ مشق ہو رہے تھے اور اِدھر اُدھر ہجرت کر کے جا رہے تھے خدا تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی یہ آیات نازل فرمائیں:۔

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کُلِّھَا فَاَخَذْنٰھُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ اَکُفَّارُکُمْ خَیْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِکُمْ اَمْ لَکُمْ بَرَآءَۃٌ فِی الزُّبُرِ ۝ اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝ سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَۃُ مَوْعِدُھُمْ وَالسَّاعَۃُ اَدْھٰی وَاَمَرُّ ۝ اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝ (سورۃ قمر ع۳)

یعنی اے مکّہ والو! فرعون کی طرف بھی انذار کی باتیں آئی تھیں، لیکن اُنہوں نے ہماری تمام آیتوں کا انکار کیا پس ہم نے اُنکو اس طرح پکڑ لیا جیسے ایک طاقتور غالب ہستی پکڑا کرتی ہے (اے مکّہ والو!) تباؤ کیا تمہارے کفار اُن (کفار) سے اچھے ہیں یا تمہارے لیے پہلی کتابوں میں حفاظت کا کوئی وعدہ آچکا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم تو ایک بڑی طاقت ہیں جو دشمنوں سے ہارتی نہیں بلکہ دشمنوں سے بدلے لیا کرتی ہے (وہ یہ باتیں کرتے رہیں) اُن کے جتھے عنقریب اکٹھے ہونگے اور پھر انہیں شکست ملے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، بلکہ اُن کی تباہی کی گھڑی کا خدا تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور یہ تباہی کی گھڑی بڑی ہلاکت والی اور بڑی کڑوی ہوگی اُس دن مجرم پریشانی اور عذاب میں مبتلا ہونگے اور اپنے مونہوں کے بل گھسیٹ کر اُن کو آگ کے گڑھوں میں ڈالدیا جائیگا اور کہا جائیگا اب بڑے عذاب چکھو۔

یہ آیتیں سورۂ قمر کی ہیں اور سورۂ قمر تمام اسلامی روایتوں کے مطابق مکّہ میں نازل ہوئی تھی مسلمان علماء بھی اس سورۃ کو پانچویں سے دسویں سال بعد دعوٰی نبوّت کے قرار دیتے ہیں۔ یعنی ہجرت سے کم سے کم تین سال پہلے یہ نازل ہوئی تھی بلکہ غالباً آٹھ سال پہلے یورپین محقق بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ چنانچہ نولڈکے اس سورۃ کو دعوٰئ نبوت کے پانچ سال بعد کی قرار دیتا ہے۔ ریورنڈ ویری لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک نولڈکے نے اس سورۃ کے نزول کا وقت کسی قدر پہلے قرار دیدیا ہے۔ وہ اپنا اندازہ یہ بتاتے ہیں کہ چھٹے یا ساتویں سال ہجرت سے پہلے یہ نازل ہوئی جس کے معنے یہ ہیں کہ اُن کے نزدیک یہ سورۃ چھٹے یا ساتویں سال بعد دعوئے نبوت کی ہے۔ بہرحال مسلمانوں کے دشمنوں نے بھی اس سورۃ کو ہجرت سے کئی سال پہلے کا قرار دیا ہے۔ اُس زمانہ میں کس صفائی کے ساتھ اس جنگ کی خبر دی گئی تھی اور کفار کا انجام بتا دیا گیا تھا اور پھر کس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کی جنگ شروع ہونے سے پہلے ان آیات کو پڑھ کر مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خدا کا وعدہ پُورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔

غرض چونکہ وہ وقت آگیا تھا جس کی خبر یسعیاہ نبی نے (یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۷) قبل از وقت دے چھوڑی

تھی اور جس کی خبر قرآن کریم نے دوبارہ جنگ شروع ہونے سے چھ یا آٹھ سال پہلے دی تھی اس لیے باوجود اس کے کہ مسلمان اِس جنگ کے لیے تیار نہ تھے اور باوجود اس کے کہ کفار کو بھی اُن کے بعض ساتھیوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ لڑائی نہیں کرنی چاہیئے۔ لڑائی ہوگئی اور ۳۱۳ آدمی جن میں سے اکثر ناتجربہ کار اور سب ہی بے سامان تھے کفار کے تجربہ کار لشکر کے مقابلہ میں جس کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی کھڑے ہوگئے۔ جنگ ہوئی اور چند ہی گھنٹوں کے اندر عرب کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ یسعیاہ کی پیشگوئی کے مطابق قیدار کی حشمت جاتی رہی اور مکہ کی فوج کچھ لاشیں اور کچھ قیدی چھوڑ کر سر پر پاؤں رکھ کر مکہ کی طرف بھاگ پڑی۔ جو قیدی پکڑے گئے اُن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ بھی تھے جو ہمیشہ آپؐ کا ساتھ دیا کرتے تھے، اُنہیں مجبور کرکے مکہ والے اپنے ساتھ لڑائی کے لیے لے آئے تھے۔ اسی طرح قیدیوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بیٹی کے خاوند ابوالعاص بھی تھے۔ مارے جانے والوں میں ابوجہل مکہ کی فوج کا کمانڈر اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن بھی شامل تھا۔

بدر کے قیدی

اِس فتح پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوش بھی تھے کہ وہ پیشگوئیاں جو متواتر چودہ سال سے آپ کے ذریعہ سے شائع کی جارہی تھیں اور وہ پیشگوئیاں جو پہلے انبیاء اِس دن کے متعلق کر چکے تھے پوری ہوگئیں، لیکن مکہ کے مخالفوں کا عبرتناک انجام بھی آپ کی نظروں کے سامنے تھا۔ آپ کی جگہ پر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو خوشی سے اُچھلتا اور کودتا لیکن جب آپ کے سامنے سے مکہ کے قیدی رسیوں میں بندھے ہوئے گذرے تو آپ اور آپ کے باوفا ساتھی ابوبکرؓ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوگئے۔ اس وقت حضرت عمرؓ جو بعد میں آپ کے دوسرے خلیفہ ہوئے سامنے سے آئے تو اُنہیں حیرت ہوئی کہ اس فتح اور خوشی کے وقت میں آپ کیوں رو رہے ہیں اور انہوں نے کہا یارسول اللہ! مجھے بھی بتائیے کہ اِس وقت رونے کا کیا باعث ہے۔ اگر وہ بات میرے لیے بھی رونے کا موجب ہے تو میں بھی روؤں گا، نہیں تو کم سے کم میں آپ کے ساتھ شریک ہونے کے لیے رونی صورت ہی بناؤں گا۔ آپ نے فرمایا دیکھتے نہیں خدا تعالےٰ کی نافرمانی سے آج مکہ والوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔

آپ کے انصاف اور آپ کی عدالت کا جس کی خبر یسعیاہ نبی نے بار بار اپنی پیشگوئیوں میں دی ہے اِس موقعہ پر ایک لطیف ثبوت ملا۔ مدینہ کی طرف واپس آتے ہوئے رات کو جب آپ سونے کے لیے لیٹے تو صحابہؓ نے دیکھا کہ آپ کو نیند نہیں آتی۔ آخر اُنہوں نے سوچ کر یہ نتیجہ نکالا کہ آپ کے چچا عباسؓ چونکہ رسیوں میں جکڑے ہونے کی وجہ سے سو نہیں سکتے اور اُن کے کراہنے کی آوازیں آتی ہیں اِس لیے اُن کی تکلیف کا خیال کرکے آپؐ کو نیند نہیں آتی۔ اُنہوں نے آپس میں مشورہ کرکے حضرت عباسؓ کے بندھنوں کو ڈھیلا کر دیا۔ حضرت عباسؓ سو گئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی نیند آگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد یکدم گھبرا کے آپ کی آنکھ کھلی اور آپ نے پوچھا عباسؓ خاموش کیوں ہیں اُن کے کراہنے کی آواز اب کیوں نہیں آتی؟ آپ کے دل میں یہ وہم پیدا ہوا کہ شاید تکلیف کی وجہ سے وہ بیہوش ہوگئے۔ صحابہؓ نے کہا یارسول اللہ! ہم نے آپ کی تکلیف کو دیکھ کر

اُن کے بندھن ڈھیلے کر دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں! نہیں!! یہ بے انصافی نہیں ہونی چاہیئے جس طرح عباسؓ میرا رشتہ دار ہے دوسرے قیدی بھی تو دوسروں کے رشتہ دار ہیں۔ یا تو سب قیدیوں کے بندھن ڈھیلے کر دو تاکہ وہ آرام سے سو جائیں اور یا پھر عباسؓ کے بندھن بھی کس دو۔ صحابہؓ نے آپ کی بات سنکر سب قیدیوں کے بندھن ڈھیلے کر دیئے اور حفاظت کی ساری ذمہ داری اپنے سر پر لے لی۔ جو لوگ قید ہوئے تھے اُن میں سے جو پڑھنا جانتے تھے آپ نے اُن کا صرف یہی فدیہ مقرر کیا کہ وہ مدینہ کے دس دس لڑکوں کو پڑھنا سکھا دیں بعض جن کا فدیہ دینے والا کوئی نہیں تھا اُن کو یونہی آزاد کر دیا۔ وہ امراء جو فدیہ دے سکتے تھے اُن سے مناسب فدیہ لیکر اُن کو چھوڑ دیا۔ اور اس طرح اِس پُرانی رسم کو کہ قیدیوں کو غلام بنا کر رکھا جاتا تھا آپ نے ختم کر دیا۔

جنگِ اُحد

کفار کے لشکر نے میدان سے بھاگتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ اگلے سال ہم دوبارہ مدینہ پر حملہ کرینگے اور اپنی شکست کا مسلمانوں سے بدلہ لیں گے چنانچہ ایک سال کے بعد وہ پھر پوری تیاری کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ مکّہ والوں کے غصہ کا یہ حال تھا کہ بدر کی جنگ کے بعد اُنہوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کسی شخص کو اپنے مُردوں پر رونے کی اجازت نہیں۔ اور جو تجارتی قافلے آئیں گے اُن کی آمد آئندہ جنگ کے لیے محفوظ رکھی جائے گی۔ چنانچہ بڑی تیاری کے بعد تین ہزار سپاہیوں سے زیادہ تعداد کا ایک لشکر ابوسفیان کی قیادت میں مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ لیا کہ آیا ہم کو شہر میں ٹھہر کر مقابلہ کرنا چاہیئے یا باہر نکل کر۔ آپ کا اپنا خیال یہی تھا کہ دشمن کو حملہ کرنے دیا جائے تاکہ جنگ کی ابتداء کا بھی وہی ذمہ دار ہو اور مسلمان اپنے گھروں میں بیٹھ کر اُس کا مقابلہ آسانی سے کر سکیں، لیکن وہ نوجوان مسلمان جن کو بدر کی جنگ میں شامل ہونے کا موقعہ نہیں ملا تھا اور جن کے دلوں میں حسرت رہی تھی کہ کاش! ہم کو بھی خدا کی راہ میں شہید ہونے کا موقع ملتا۔ اُنہوں نے اصرار کیا کہ ہمیں شہادت سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اُن کی بات مان لی۔ مشورہ لیتے وقت آپ نے اپنی ایک خواب بھی سنائی۔ فرمایا خواب میں میں نے ایک گائے دیکھی ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ میری تلوار کا سرا ٹوٹ گیا ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ گائے ذبح کی جا رہی ہے۔ اور پھر یہ کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط اور محفوظ زرہ کے اندر ڈالا ہے۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں ایک مینڈھے کی پیٹھ پر سوار ہوں۔ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے اِن خوابوں کی کیا تعبیر فرمائی۔ آپ نے فرمایا گائے کے ذبح ہونے کی تعبیر یہ ہے کہ میرے بعض صحابہ شہید ہونگے اور تلوار کا سرا ٹوٹنے سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ میرے عزیزوں میں سے کوئی اہم وجود شہید ہوگا یا شاید مجھے ہی اس مہم میں کوئی تکلیف پہنچے۔ اور زرہ کے اندر ہاتھ ڈالنے کی تعبیر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارا مدینہ میں ٹھہرنا زیادہ مناسب ہے۔ اور مینڈھے پر سوار ہونیوالے خواب کی تعبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ کفار کے لشکر کے سردار پر ہم غالب آئینگے یعنی وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا جائیگا۔ گو اس خواب میں مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ انکا مدینہ میں رہنا زیادہ اچھا ہے۔ مگر چونکہ خواب کی تعبیر رسول کریم صلی اللہ کی اپنی تھی، الہامی نہیں تھی۔ آپ نے اکثریت کی رائے کو تسلیم کر لیا اور لڑائی کے لیے باہر جانے کا فیصلہ کر دیا۔ جب آپ باہر نکلے تو نوجوانوں کو اپنے

دلوں میں ندامت محسوس ہوئی اور اُنہوں نے کہا۔ یارسول اللہ! جو آپ کا مشورہ ہے وہی صحیح ہے۔ ہمیں مدینہ میں ٹھہر کر دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا خدا کا نبی جب زرہ پہن لیتا ہے تو اُتارا نہیں کرتا اب خواہ کچھ ہو ہم آگے ہی جائیں گے۔ اگر تم نے صبر سے کام لیا تو خدا کی نصرت تم کو مل جائیگی۔ یہ کہکر آپ ایک ہزار لشکر کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور تھوڑے فاصلہ پر جا کر رات بسر کرنے کے لیئے ڈیرہ لگا دیا۔ آپ کا ہمیشہ طریق تھا کہ آپ دشمن کے پاس پہنچکر اپنے لشکر کو کچھ دیر آرام کرنے کا موقع دیا کرتے تھے تا کہ وہ اپنے سامان وغیرہ تیار کرلیں صبح کی نماز کے وقت جب آپ نکلے تو آپکو معلوم ہُوا کہ کچھ یہودی بھی اپنے معاہد قبیلوں کی مدد کے بہانہ سے آئے ہیں۔ چونکہ یہود کی ریشہ دوانیوں کا آپ کو علم ہو چکا تھا آپ نے فرمایا کہ اِن لوگوں کو واپس کردیا جائے۔ اِس پر عبداللہ بن ابی بن سلول جو منافقوں کا رئیس تھا وہ بھی اپنے تین سو ساتھیوں کو لیکر یہ کہتے ہوئے واپس لَوٹ گیا کہ اب یہ لڑائی نہیں رہی یہ تو ہلاکت کے مُنہ میں جانا ہے۔ کیونکہ خود اپنے مددگاروں کو لڑائی سے روکا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمان صرف سات سو رہ گئے جو تعداد میں کفار کی تعداد سے چوتھے حصہ سے بھی کم تھے اور سامانوں کے لحاظ سے اور بھی کمزور۔ کیونکہ کفار میں سات سو زرہ پوش تھا اور مسلمانوں میں صرف ایک سو زرہ پوش۔ اور کفار میں دو سو گھوڑ سوار تھا مگر مسلمانوں کے پاس دو گھوڑے تھے۔ آخر آپ اُحد مقام پر پہنچے۔ وہاں پہنچکر آپ نے ایک پہاڑی درّہ کی حفاظت کے لیے پچاس سپاہی مقرر کیے اور سپاہیوں کے افسر کو تاکید کی کہ یہ درّہ اتنا ضروری ہے کہ خواہ ہم مارے جائیں یا جیت جائیں تم نے اِس جگہ سے نہیں ہلنا۔ اِس کے بعد آپ بقیہ ساڑھے چھ سو آدمی لیکر دشمن کے مقابلہ کے لیے نکلے۔ جو اب دشمن کی تعداد سے قریباً پانچواں حصہ تھے۔ لڑائی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت سے تھوڑی دیر میں ساڑھے چھ سو مسلمانوں کے مقابلہ میں تین ہزار مکّہ کا تجربہ کار سپاہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

فتح مبدّل بہ شکست

مسلمانوں نے اُن کا تعاقب شروع کیا، تو وہ لوگ جو پشت کے درّہ کی حفاظت کے لیے کھڑے تھے اُنہوں نے اپنے افسر سے کہا۔ اب تو دشمن کو شکست ہو چکی ہے اب ہمیں بھی جہاد کا ثواب لینے دیا جائے۔ افسر نے اُن کو اِس بات سے روکا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات یاد دلائی۔ مگر انہوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا صرف تاکید کے لیے فرمایا تھا۔ ورنہ آپکی مراد یہ تو نہ ہو سکتی تھی کہ دشمن بھاگ بھی جائے تو یہاں کھڑے رہو۔ یہ کہکر اُنہوں نے درّہ چھوڑ دیا اور میدان جنگ میں کود پڑے۔ بھاگتے ہوئے لشکر میں سے خالد بن ولید کی جو بعد میں اسلام کے بڑے بھاری جرنیل ثابت ہوئے نظر خالی درّہ پر پڑی، جہاں صرف چند آدمی اپنے افسر کے ساتھ کھڑے تھے۔ خالدؓ نے کفار کے لشکر کے دوسرے جرنیل عمرو ابن العاص کو آواز دی اور کہا۔ ذرا اپنے پیچھے پہاڑی درّہ پر نگاہ ڈالو عمروؓ ابن العاص نے جب درّہ پر نگاہ ڈالی تو اُس نے سمجھا کہ عمر کا بہترین موقعہ مجھے حاصل ہو رہا ہے اپنے بھاگتے ہوئے دستوں کو دونوں جرنیلوں نے سنبھالا اور اسلامی لشکر کا بازو کاٹتے ہوئے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ چند مسلمان جو وہاں درّہ کی حفاظت کے لیے کھڑے رہ گئے تھے، اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے پشت پر سے اسلامی لشکر پر آپڑے اُنکے فاتحانہ نعروں کو

سُن کر سامنے کا بھاگتا ہُوا بقیہ لشکر بھی میدانِ جنگ کی طرف لوٹ پڑا۔ یہ حملہ ایسا اچانک ہُوا اور کافروں کا تعاقب کرنے کی وجہ سے مسلمان اتنے پھیل چکے تھے کہ کوئی باقاعدہ اسلامی لشکر اُن لوگوں کے مقابلہ میں نہیں تھا۔ اکیلا اکیلا سپاہی میدان میں نظر آرہا تھا، جن میں سے بعض کو اُن لوگوں نے مار دیا۔ باقی اِس حیرت میں کہ یہ ہو کیا گیا ہے پیچھے کی طرف دوڑے۔ چند صحابہؓ دوڑ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے، جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس۲۰ تھی۔ کفار نے شدّت کے ساتھ اُس مقام پر حملہ کیا جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے۔ یکے بعد دیگرے صحابہؓ آپ کی حفاظت کرتے ہوئے مارے جانے لگے۔ علاوہ شمشیر زنوں کے تیر انداز اُونچے ٹیلوں پر کھڑے ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے تحاشہ تیر مارتے تھے اُس وقت طلحہؓ نے جو قریش میں سے تھے اور مکّہ کے مہاجرین میں شامل تھے یہ دیکھتے ہوئے کہ دشمن سب کے سب تیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ کی طرف پھینک رہا ہے اپنا ہاتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مُنہ کے آگے کھڑا کر دیا۔ تیر کے بعد تیر جو نشانہ پر گرتا تھا وہ طلحہؓ کے ہاتھ پر گرتا تھا، مگر جانباز اور وفادار صحابیؓ اپنے ہاتھ کو کوئی حرکت نہیں دیتا تھا۔ اِس طرح تیر پڑتے گئے اور طلحہؓ کا ہاتھ زخموں کی شدّت کی وجہ سے بالکل بیکار ہو گیا اور صرف ایک ہی ہاتھ اُن کا باقی رہ گیا۔ سالہا سال بعد اسلام کی چوتھی خلافت کے زمانہ میں جب مسلمانوں میں خانہ جنگی واقع ہوئی تو کسی دشمن نے طعنہ کے طور پر طلحہؓ کو کہا ٹُنڈا۔ اس پر ایک دُوسرے صحابیؓ نے کہا ہاں ٹُنڈا ہی ہے مگر کیسا مبارک ٹُنڈا ہے۔ تمہیں معلوم ہے طلحہؓ کا یہ ہاتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مُنہ کی حفاظت میں ٹُنڈا ہُوا تھا۔ اُحد کی جنگ کے بعد کسی شخص نے طلحہؓ سے پوچھا کہ جب تیر آپ کے ہاتھ پر گرتے تھے تو کیا آپ کو درد نہیں ہوتی تھی اور کیا آپ کے مُنہ سے اُف نہیں نکلتی تھی؟ طلحہؓ نے جواب دیا۔ درد بھی ہوتی تھی اور اُف بھی نکلنا چاہتی تھی، لیکن مَیں اُف کرتا نہیں تھا۔ تا ایسا نہ ہو کہ اُف کرتے وقت میرا ہاتھ ہل جائے اور تیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ پر آگرے۔

مگر یہ چند لوگ کب تک اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ لشکرِ کفّار کا ایک گروہ آگے بڑھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد کے سپاہیوں کو دھکیل کر اُس نے پیچھے کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تن تنہا پہاڑ کی طرح وہاں کھڑے تھے کہ زور سے ایک پتھر آپ کے خود پر لگا اور خود کے کیل آپ کے سر میں گھس گئے اور آپ بیہوش ہو کر اُن صحابہؓ کی لاشوں پر جا گرے جو آپ کے ارد گرد لڑتے ہوئے شہید ہو چکے تھے اس کے بعد کچھ اور صحابہؓ آپ کے جسم کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے اور اُن کی لاشیں آپ کے جسم پر جا گریں۔ کفار نے آپ کے جسم کو لاشوں کے نیچے دبا ہُوا دیکھ کر سمجھا کہ آپ مارے جا چکے ہیں۔ چنانچہ مکّہ کا لشکر اپنی صفوں کو درست کرنے کے لیے پیچھے ہٹ گیا۔ جو صحابہ آپ کے گرد کھڑے تھے اور جن کو کفار کے لشکر کا ریلا دھکیل کر پیچھے لے گیا تھا اُن میں حضرت عمرؓ بھی تھے جب آپ نے دیکھا کہ میدان سب لڑنے والوں سے صاف ہو چکا ہے تو آپ کو یقین ہو گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں اور وہ شخص جس نے بعد میں ایک ہی وقت میں قیصر اور کسریٰ کا مقابلہ بڑی دلیری سے کیا اور اُس کا دل کبھی نہ گھبرایا اور کبھی نہ ڈرا وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر بچوں کی طرح رونے لگ گیا۔ اِتنے میں مالکؓ نامی ایک صحابی جو اسلامی لشکر کی فتح کے وقت پیچھے ہٹ گئے تھے کیونکہ اُنہیں فاقہ تھا اور رات سے اُنہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا جب فتح ہو گئی تو وہ چند کھجوریں لے کر پیچھے کی طرف چلے گئے تا کہ اُنہیں کھا کر

اپنی بھوک کا علاج کریں۔ وہ فتح کی خوشی میں ٹہل رہے تھے کہ ٹہلتے ٹہلتے حضرت عمرؓ تک جا پہنچے اور عمرؓ کو روتے ہوئے دیکھ کر نہایت ہی حیران ہوئے اور حیرت سے پوچھا عمر! آپ کو کیا ہوا، اسلام کی فتح پر آپکو خوش ہونا چاہیئے یا رونا چاہیئے؟ عمرؓ نے جواب میں کہا مالک! شاید تم فتح کے معاً بعد پیچھے ہٹ آئے تھے تمہیں معلوم نہیں کہ لشکرِ کفار پہاڑی کے دامن سے چکر کاٹ کر اسلامی لشکر پر حملہ آور ہوا اور چونکہ مسلمان پراگندہ ہو چکے تھے اُن کا مقابلہ کوئی نہ کر سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہؓ سمیت اُنکے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے اور مقابلہ کرتے کرتے شہید ہو گئے۔ مالکؓ نے کہا عمرؓ! اگر یہ واقع صحیح ہے تو آپ یہاں بیٹھے کیوں رو رہے ہیں جس دنیا میں ہمارا محبوب گیا ہے ہمیں بھی تو وہاں جانا چاہیئے۔ یہ کہا اور وہ آخری کھجور جو آپکے ہاتھ میں تھی جسے آپ مُنہ میں ڈالنے ہی والے تھے اُسے یہ کہتے ہوئے زمین پر پھینک دیا کہ اے کھجور! مالک اور جنت کے درمیان تیرے سوا اور کونسی چیز روک ہے۔ یہ کہا اور تلوار لے کر دشمن کے لشکر میں گھس گئے۔ تین ہزار آدمی کے مقابلہ میں ایک آدمی کر ہی کیا سکتا تھا مگر خدائے واحد کی پرستار روح ایک بھی بہتوں پر بھاری ہوتی ہے۔ مالکؓ اِس بے جگری سے لڑے کہ دشمن حیران ہو گیا۔ مگر آخر زخمی ہوئے پھر گرے اور گر کر بھی دشمن کے سپاہیوں پر حملہ کرتے رہے جس کے نتیجہ میں کفارِ مکہ نے اِس وحشت سے آپ پر حملہ کیا کہ جنگ کے بعد آپ کی لاش کے ستر ٹکڑے ملے۔ حتیٰ کہ آپکی لاش پہچانی نہیں جاتی تھی۔ آخر ایک اُنگلی سے آپکی بہن نے پہچان کر بتایا کہ یہ میرے بھائی مالک کی لاش ہے۔

وہ صحابہؓ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد تھے اور جو کفار کے ریلے کی وجہ سے پیچھے دھکیل دیئے گئے تھے کفار کے پیچھے ہٹتے ہی وہ پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے۔ آپکے جسم مبارک کو انہوں نے اُٹھایا اور ایک صحابی عبیدہ بن الجراحؓ نے اپنے دانتوں سے آپؐ کے سر میں گھسی ہوئی میخ کو زور سے نکالا جس سے اُن کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ تھوڑی دیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوش آگیا اور صحابہؓ نے چاروں طرف میدان میں آدمی دوڑا دیئے کہ مسلمان پھر اکٹھے ہو جائیں۔ بھاگا ہُوا لشکر پھر جمع ہونا شروع ہُوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُنہیں لیکر پہاڑ کے دامن میں چلے گئے۔ جب دامنِ پہاڑ میں بچا کھچا لشکر کھڑا تھا۔ تو ابوسفیان نے بڑے زور سے آواز دی اور کہا ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مار دیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کی بات کا جواب نہ دیا تا ایسا نہ ہو دشمن حقیقتِ حال سے واقف ہو کر حملہ کر دے اور زخمی مسلمان پھر دوبارہ دشمن کے حملہ کا شکار ہو جائیں جب اسلامی لشکر سے اِس بات کا کوئی جواب نہ ملا تو ابوسفیان کو یقین ہو گیا کہ اُسکا خیال درست ہے۔ اور اس نے بڑے زور سے آواز دیکر کہا ہم نے ابوبکرؓ کو بھی مار دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کو بھی حکم فرمایا کہ کوئی جواب نہ دیں۔ پھر ابوسفیان نے آواز دی ہم نے عمرؓ کو بھی مار دیا۔ تب عمرؓ جو بہت جوشیلے آدمی تھے انہوں نے اُس کے جواب میں یہ کہنا چاہا کہ ہم لوگ خدا کے فضل سے زندہ ہیں اور تمہارے مقابلہ کے لیے تیار ہیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ مسلمانوں کو تکلیف میں مت ڈالو اور خاموش رہو اب کفار کو یقین ہو گیا کہ اسلام کے بانی کو بھی اور اُن کے دائیں بائیں بازو کو بھی ہم نے مار دیا ہے۔ اِس پر ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں نے خوشی سے نعرہ لگایا اُعْلُ ھُبَلْ۔ اُعْلُ ھُبَلْ۔ ہمارے معزز بت ہُبل کی شان بلند ہو کہ اُس نے آج اسلام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ وہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو اپنی موت کے اعلان پر، ابوبکرؓ کی موت کے

اعلان پر اور عمرؓ کی موت کے اعلان پر خاموشی کی نصیحت فرما رہے تھے تا ایسا نہ ہو کہ زخمی مسلمانوں پر پھر کفار کا لشکر لوٹ کر حملہ کر دے اور مٹھی بھر مسلمان اُس کے ہاتھوں شہید ہو جائیں۔ اب جبکہ خدائے واحد کی عزت کا سوال پیدا ہُوا اور شرک کا نعرہ میدان میں مارا گیا تو آپ کی روح بیتاب ہو گئی اور آپؐ نے نہایت جوش سے صحابہؓ کی طرف دیکھ کر فرمایا تم لوگ جواب کیوں نہیں دیتے صحابہ نے کہا یا رسول اللہ ہم کیا کہیں، فرمایا کہو اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ۔ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ۔ تم جھوٹ بولتے ہو کہ ہبل کی شان بلند ہوئی۔ اللہ وحدہٗ لاشریک ہی معزز ہے اور اس کی شان بالا ہے۔ اور اس طرح آپؐ نے اپنے زندہ ہونے کی خبر دشمنوں کو پہنچا دی۔ اس دلیرانہ اور بہادرانہ جواب کا اثر کفار کے لشکر پر اتنا گہرا پڑا کہ باوجود اِس کے کہ اُن کی امیدیں اس جواب سے خاک میں مل گئیں اور باوجود اس کے کہ اُن کے سامنے مٹھی بھر زخمی مسلمان کھڑے ہوئے تھے جن پر حملہ کر کے اُن کو مار دینا مادی قوانین کے لحاظ سے بالکل ممکن تھا وہ دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے اور جس قدر فتح اُن کو نصیب ہوئی تھی اُسی کی خوشیاں مناتے ہوئے مکّہ کو واپس چلے گئے۔

اُحد کی جنگ میں بظاہر فتح کے بعد ایک شکست کا پہلو پیدا ہُوا مگر یہ جنگ درحقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک بہت بڑا نشان تھا۔ اس جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق مسلمانوں کو پہلے کامیابی نصیب ہوئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق آپ کے عزیز چچا حمزہؓ لڑائی میں مارے گئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق شروع حملہ میں کفار کے لشکر کا علمبردار مارا گیا۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق خود آپ بھی زخمی ہوئے اور بہت سے صحابہؓ شہید ہوئے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو ایسے اخلاص اور ایمان کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا جس کی مثال تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ چند واقعات تو اِس اخلاص اور ایمان کے مظاہرہ کے پہلے بیان ہو چکے ہیں ایک اور واقعہ بھی بیان کرنے کے قابل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے صحابہؓ کے دلوں میں کتنا پختہ ایمان پیدا کر دیا تھا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کچھ صحابہ کی معیّت میں پہاڑ کے دامن کی طرف چلے گئے اور دشمن پیچھے ہٹ گیا تو آپ نے بعض صحابہؓ کو اِس بات پر مامور فرمایا کہ وہ میدان میں جائیں اور زخمیوں کی خبر لیں۔ ایک صحابی میدان میں تلاش کرتے کرتے ایک زخمی انصاری کے پاس پہنچے۔ دیکھا تو اُن کی حالت خطرناک تھی اور وہ جان توڑ رہے تھے۔ یہ صحابی اُن کے پاس پہنچے اور اُنہیں السلام علیکم کہا انہوں نے کانپتا ہُوا ہاتھ مصافحہ کے لیے اُٹھایا اور اُن کا ہاتھ پکڑ کے کہا میں انتظار کر رہا تھا کہ کوئی بھائی مجھے مل جائے۔ اُنہوں نے اس صحابی سے پوچھا کہ آپ کی حالت تو خطرناک معلوم ہوتی ہے کیا کوئی پیغام ہے جو آپ اپنے رشتہ داروں کو دینا چاہتے ہیں؟ اُس مرنے والے صحابیؓ نے کہا ہاں ہاں میری طرف سے میرے رشتہ داروں کو سلام کہنا اور اُنہیں کہنا کہ میں تو مر رہا ہوں مگر اپنے پیچھے خدا تعالیٰ کی ایک مقدس امانت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تم میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اے میرے بھائیو اور رشتہ دارو! وہ خدا کا سچا رسول ہے میں اُمید کرتا ہوں کہ تم اُسکی حفاظت میں اپنی جانیں دینے سے دریغ نہیں کرو گے اور میری اس وصیت کو یاد رکھو گے (موطا اور زرقانی) مرنے والے انسان کے دل میں ہزاروں پیغام اپنے رشتہ داروں کو پہنچانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن یہ لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں اتنے بے نفس ہو چکے تھے کہ نہ انہیں اپنے بیٹے یاد تھے، نہ بیویاں یاد تھیں، نہ مال یاد تھا، نہ جائیدادیں یاد تھیں۔ انہیں صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود ہی یاد رہتا تھا وہ جانتے تھے کہ دنیا کی نجات اِس شخص کے ساتھ ہے۔ ہمارے مرنے کے بعد اگر ہماری اولادیں زندہ رہیں تو وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتیں، لیکن اگر اس نجات دہندہ کی حفاظت میں انہوں نے اپنی جانیں دیدیں تو گو ہمارے اپنے خاندان مٹ جائیں گے مگر دنیا زندہ ہو جائیگی۔ شیطان کے پنجہ میں پھنسا ہوا انسان پھر نجات پا جائیگا اور ہمارے خاندانوں کی زندگی سے ہزاروں گنے زیادہ قیمتی بنو آدم کی زندگی اور نجات ہے۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زخمیوں اور شہداء کو جمع کیا، زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی اور شہداء کے دفنانے کا انتظام کیا گیا۔ اس وقت آپ کو معلوم ہوا کہ ظالم کفار مکہ نے بعض مسلمان شہداء کے ناک کان بھی کاٹ دیئے ہیں چنانچہ یہ لوگ جن کے ناک کان کاٹے گئے تھے اُن میں خود آپؐ کے چچا حمزہؓ بھی تھے۔ آپ کو یہ نظارہ دیکھ کر افسوس ہوا اور آپ نے فرمایا کفار نے خود اپنے عمل سے اپنے لیے اُس بدلہ کو جائز بنا دیا ہے جس کو ہم ناجائز سمجھتے تھے۔ مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس وقت آپ کو وحی ہوئی کہ کفار جو کچھ کرتے ہیں ان کو کرنے دو۔ تم رحم اور انصاف کا دامن ہمیشہ تھامے رکھو۔

جنگِ اُحد سے واپسی اور اہلِ مدینہ کے جذباتِ فدائیت

جب اسلامی لشکر واپس مدینہ کی طرف لوٹا تو اُس وقت تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اور اسلامی لشکر کی پراگندگی کی خبر مدینہ پہنچ چکی تھی۔ مدینہ کی عورتیں اور بچے دیوانہ وار اُحد کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ اکثر کو تو راستہ میں خبر مل گئی اور وہ رُک گئے، مگر بنو دینار قبیلہ کی ایک عورت دیوانہ وار آگے بڑھتے ہوئے اُحد تک جا پہنچی۔ جب وہ دیوانہ وار اُحد کے میدان کی طرف جا رہی تھی اُس عورت کا خاوند اور بھائی اور باپ اُحد میں مارے گئے تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ ایک بیٹا بھی مارا گیا تھا۔ جب اُسے اسکے باپ مارے جانے کی خبر دی گئی تو اس نے کہا مجھے یہ بتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ چونکہ خبر دینے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف سے مطمئن تھے وہ باری باری اُسے اس کے بھائی اور خاوند اور بیٹے کی موت کی خبر دیتے چلے گئے مگر وہ یہی کہتی چلی جاتی تھی "مَا فَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ"۔ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کیا۔ بظاہر یہ فقرہ غلط معلوم ہوتا ہے اور اسی وجہ سے مورخوں نے لکھا ہے کہ اُسکا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقرہ غلط نہیں بلکہ عورتوں کے محاورہ کے مطابق بالکل درست ہے۔ عورت کے جذبات بہت تیز ہوتے ہیں اور وہ بسا اوقات مُردوں کو زندہ سمجھ کر کلام کرتی ہیں۔ جیسے بعض عورتوں کے خاوند یا بیٹے مر جاتے ہیں تو اُنکی موت پر اُن سے مخاطب ہو کر وہ اس قسم کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ کہ مجھے کس پر چھوڑ چلے ہو؟ یا بیٹا! اس بڑھاپے میں مجھ سے کیوں منہ موڑ لیا؟ یہ شدتِ غم میں فطرتِ انسانی کا ایک نہایت لطیف مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سُنکر اُس عورت کا حال ہوا۔ وہ آپکو فوت شدہ ماننے کے لیئے تیار نہیں تھی اور دوسری طرف اِس خبر کی تردید بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اِس لیے شدتِ غم میں یہ کہتی جاتی تھی اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کیا یعنی ایسا وفادار انسان ہمکو یہ صدمہ پہنچانے پر کیونکر راضی ہو گیا۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ اُسے اپنے باپ، بھائی اور خاوند کی کوئی پروا نہیں تو وہ اس کے سچے جذبات کو سمجھ گئے اور انہوں نے کہا۔ فلانے کی اماں! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو جس طرح تو چاہتی ہے خدا کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ اس پر اس نے کہا مجھے دکھاؤ وہ کہاں ہیں۔ لوگوں نے کہا۔ آگے چلی جاؤ وہ آگے کھڑے ہیں۔ وہ عورت دوڑ کر آپ تک پہنچی اور آپ کے دامن کو پکڑ کر بولی یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، جب آپ سلامت ہیں تو کوئی مرے مجھے پروا نہیں (بابی انت و امی یا رسول اللہ لا ابالی اذ سلمت من عطب)

مردوں نے جنگ میں وہ نمونہ ایمان کا دکھایا اور عورتوں نے یہ نمونہ اخلاص کا نمونہ دکھایا۔ جس کی مثال میں نے ابھی بیان کی ہے عیسائی دنیا مریم مگدلینی اور اس کی ساتھی عورتوں کی اس بہادری پر خوش ہے کہ وہ مسیح کی قبر پر صبح کے وقت دشمنوں سے چھپ کر پہنچی تھیں۔ میں اُن سے کہتا ہوں آؤ اور ذرا میرے محبوب کے مخلصوں اور فدائیوں کو دیکھو کہ کن حالتوں میں انہوں نے اُس کا ساتھ دیا اور کن حالتوں میں انہوں نے توحید کے جھنڈے کو بلند کیا۔

اس قسم کی فدائیت کی ایک اور مثال بھی تاریخوں میں ملتی ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہداء کو دفن کر کے مدینہ واپس گئے تو پھر عورتیں اور بچے شہر سے باہر استقبال کے لئے نکل آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کی باگ سعد بن معاذ مدینہ کے رئیس نے پکڑی ہوئی تھی اور فخر سے آگے آگے دوڑے جاتے تھے۔ شاید دنیا کو یہ کہہ رہے تھے کہ دیکھا ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیریت سے اپنے گھر واپس لے آئے۔ شہر کے پاس اُنہیں اپنی بڑھیا ماں جس کی نظر کمزور ہو چکی تھی آتی ہوئی ملی۔ اُحد میں اس کا ایک بیٹا عمرو بن معاذؓ بھی مارا گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر سعد بن معاذؓ نے کہا یا رسول اللہ! اُمّی۔ اے اللہ کے رسول میری ماں آرہی ہے۔ آپ نے فرمایا خدا تعالیٰ کی برکتوں کے ساتھ آئے۔ بڑھیا آگے بڑھی اور اپنی کمزور پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل نظر آجائے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ پہچان لیا اور خوش ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مائی مجھے تمہارے بیٹے کی شہادت پر تم سے ہمدردی ہے۔ اس پر نیک عورت نے کہا حضور جب میں نے آپکو سلامت دیکھ لیا تو سمجھو کہ میں نے مصیبت کو بھون کر کھا لیا "مصیبت کو بھون کر کھا لیا"۔ کیا عجیب محاورہ ہے۔ محبت کے کتنے گہرے جذبات پر دلالت کرتا ہے غم انسان کو کھا جاتا ہے۔ وہ عورت جس کے بڑھاپے میں اُسکا عصائے پیری ٹوٹ گیا کس بہادری سے کہتی ہے میرے بیٹے کے غم نے مجھے کیا کھانا ہے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو میں اس غم کو کھا جاؤنگی۔ میرے بیٹے کی موت مجھے مارنے کا موجب نہیں ہو گی بلکہ یہ خیال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اُس نے جان دی میری قوت کے بڑھانے کا موجب ہو گا۔ اے انصار! میری جان تم پر فدا ہو تم کتنا ثواب لے گئے۔

بہر حال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خیریت سے مدینہ پہنچے۔ گو اس لڑائی میں بہت سے مسلمان مارے بھی گئے اور بہت سے زخمی بھی ہوئے لیکن پھر بھی اُحد کی جنگ شکست نہیں کہلا سکتی۔ جو واقعات میں نے اوپر بیان کیے ہیں اُنکو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ایک بہت بڑی فتح تھی ایسی فتح کہ قیامت تک مسلمان اسکو یاد کر کے اپنے ایمان کو بڑھا سکتے ہیں اور بڑھاتے رہیں گے۔ مدینہ پہنچکر آپ نے پھر اپنا اصل کام یعنی تربیت اور تعلیم اور اصلاح نفس کا شروع کر دیا۔ مگر آپ یہ کام سہولت اور آسانی سے نہیں کر سکے۔ اُحد کے واقعہ کے بعد یہود میں اور بھی دلیری پیدا ہو گئی۔

اور منافقوں نے اور بھی سر اُٹھا شروع کر دیا۔ اور انہوں نے سمجھا شاید اسلام کو مٹا دینا انسانی طاقت کے اندر کی بات ہے۔ چنانچہ یہودیوں نے طرح طرح سے آپکو تکلیفیں دینی شروع کر دیں۔ گندے شعر بنا کر اُن میں آپ کی اور آپ کے خاندان کی ہتک کی جاتی تھی۔ ایک دفعہ آپ کو کسی جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے یہودیوں کے قلعہ میں جانا پڑا تو اُنہوں نے تجویز کی جہاں آپ بیٹھے تھے اُسکے اُوپر سے ایک بڑی سِل گرا کر آپکو شہید کر دیا جائے۔ مگر خدا تعالیٰ نے آپکو وقت پر بتا دیا اور آپ وہاں سے بغیر کچھ کہنے کے چلے آئے۔ بعد میں یہودیوں نے اپنے قصور کو تسلیم کر لیا۔ مسلمان عورتوں کی بازاروں میں بےحرمتی کی جاتی تھی۔ ایک دفعہ اس جھگڑے میں ایک مسلمان بھی مارا گیا۔ ایک دفعہ ایک مسلمان لڑکی کا سر یہودی نے پتھروں سے مار مار کر کچل دیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ ان اسباب کی وجہ سے یہودیوں کے ساتھ بھی مسلمانوں کو جنگ کرنی پڑی۔ مگر عرب اور یہود کے دستور کے مطابق مسلمانوں نے اُن کو مارا نہیں، بلکہ صرف مدینہ سے چلے جانے کی شرط پر انہیں چھوڑ دیا۔ چنانچہ ان دونوں قبیلوں میں سے ایک تو شام کی طرف ہجرت کر گیا اور دوسرے کا کچھ حصہ شام کو چلا گیا اور کچھ مدینہ سے شمال کی طرف خیبر نامی ایک شہر کی طرف۔ یہ شہر عرب میں یہود کا مرکز تھا اور زبردست قلعوں پر مشتمل تھا۔

شراب نوشی کی ممانعت کا حکم اور اس کا بے نظیر اثر

جنگِ اُحد اور اس کے بعد کی جنگ کے وقفہ کے درمیان دنیا نے اسلام کے اس اثر کی جو اس کا اپنے پیروؤں پر تھا ایک بیّن مثال دیکھی۔ ہماری مراد امتناعِ شراب سے ہے۔ اسلام سے پہلے اہلِ عرب کی حالت کو بیان کرتے ہوئے ہم نے بتلایا تھا کہ اہلِ عرب عادی شراب خور تھے۔ ہر معزز عرب خاندان میں دن میں پانچ دفعہ شراب پی جاتی تھی اور شراب کے نشہ میں مدہوش ہو جانا اُن کے لیے معمولی بات تھی اور اس میں وہ ذرا شرم محسوس نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ اس کو ایک اچھا کام سمجھتے تھے۔ جب کوئی مہمان آتا تو گھر کی مالکہ کا فرض ہوتا کہ وہ شراب کا دَور جاری کرے۔ اِس قسم کے لوگوں سے ایسی تباہ کُن عادت کو چھڑانا کوئی آسان بات نہ تھی، مگر ہجرت کے چوتھے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حکم نازل ہُوا کہ شراب حرام کی جاتی ہے۔ اِس حکم کا اعلان ہوتے ہی مسلمانوں نے شراب پینا بالکل ترک کر دیا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جب شراب کی حرمت کا الہام نازل ہُوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو بُلایا اور حکم دیا کہ اس نئے حکم کا اعلان مدینہ کی گلیوں میں کر دو۔ ایک انصاری کے گھر میں جو مدینہ کا مسلمان تھا اس وقت شراب کی مجلس ہو رہی تھی۔ بہت سے لوگ مدعو تھے اور شراب کا دَور چل رہا تھا۔ ایک بڑا مٹکا خالی ہو چکا تھا اور ایک دوسرا مٹکا شروع کیا جانے والا تھا۔ لوگ مدہوش ہو چکے تھے اور بہت سے اور مدہوش ہونے کے قریب تھے۔ اس حالت میں اُنہوں نے سُنا کہ کوئی شخص اعلان کر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت شراب پینا منع فرما دیا ہے۔ اُن میں سے ایک شخص اُٹھا اور بولا کہ یہ تو شراب کے امتناع کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ ٹھہرو معلوم کر لیں۔ اتنے میں ایک اور شخص اُٹھا اور اُس نے مٹکے کو جو شراب سے بھرا ہُوا تھا اپنی لاٹھی مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کہا پہلے حکم کی تعمیل کرو اور پھر دریافت کرو۔ یہ کافی ہے کہ ہم نے ایسا اعلان سُن لیا اور یہ مناسب نہیں

کہ ہم شراب پیتے جائیں اور تحقیقات کریں۔ بلکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ شراب کو گلیوں میں بہ جانے دیں اور پھر اعلان کے متعلق تحقیقات کریں۔ (بخاری کتاب الاشربہ)

اس مسلمان کا خیال درست تھا، کیونکہ اگر شراب کا پیا جانا ممنوع قرار دیا جا چکا تھا تو اس کے بعد اگر وہ شراب پینا جاری رکھتے تو ایک جرم کے مرتکب ہوتے اور اگر شراب پینا ممنوع نہیں قرار دیا گیا تھا تو شراب کا بہا دینا اتنا بڑا نقصان نہ تھا کہ اُسے برداشت نہ کیا جا سکتا۔ اس اعلان کے بعد شراب نوشی مسلمانوں سے بالکل دُور ہو گئی۔ اس انقلاب عظیم کو پیدا کرنے کے لیے کوئی خاص کوشش اور مجاہدہ کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایسے مسلمان جنہوں نے اس حکم کو سُنا اور جو فوری تعمیل اس کی ہوئی اس کو دیکھا، ستر اسّی سال تک زندہ رہے مگر اُن میں سے ایک مسلمان بھی ایسا نہیں جس نے اس حکم کے بعد اس کی خلاف ورزی کی ہو، اگر ایسا کوئی واقعہ ہُوا ہے تو وہ ایسے شخص کے متعلق ہے جس نے براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ نہ کیا تھا۔

جب ہم اس کا مقابلہ امریکہ کی تحریک امتناع شراب سے کرتے ہیں اور ان کوششوں کو دیکھتے ہیں جو اس حکم کو نافذ کرنے کے لیے کی گئیں یا جو سالہا سال تک یورپ میں کی گئیں، تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ ایک صورت میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محض ایک اعلان کافی تھا کہ اس تمدّنی عیب کو عرب کے لوگوں سے معدوم کر دے۔ مگر دوسری صورت میں امتناع شراب کے لیے قوانین بنائے گئے۔ پولیس۔ فوج اور ٹیکس کے محکموں کے کارکنوں نے مل کر شراب نوشی کی لعنت کو دُور کرنے کے لیے متحدہ طور پر کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے اور انہیں اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑا۔ شراب نوشی کی حبیت رہی اور شراب نوشی کو دور نہ کیا جا سکا۔ ہمارے اس زمانہ کو ایک ترقی کا زمانہ کہتے ہیں۔ مگر جب اس کا مقابلہ ابتدائے اسلام کے زمانہ سے کرتے ہیں تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ ان دونوں میں سے ترقی کا زمانہ کونسا ہے۔ ہمارا یہ زمانہ یا اسلام کا وہ زمانہ جس نے اس قدر بڑے تمدّنی انقلاب کو پیدا کیا؟

غزوۂ اُحد کے بعد کفار قبائل کے ناپاک منصوبے

اُحد کا واقعہ ایسی بات نہ تھی کہ آسانی سے بھُولا جا سکتا۔ مکّہ والوں نے خیال کیا تھا کہ یہ اُن کی اسلام کے خلاف پہلی فتح ہی اُنہوں نے اس کی خبر تمام عرب میں شائع کی اور عرب کے قبائل کو اسلام کے خلاف بھڑکانے اور یقین دلانے کا ذریعہ بنایا کہ مسلمان ناقابلِ تسخیر نہیں ہیں۔ اور اگر وہ ترقی کرتے رہے ہیں تو اس کی وجہ اُن کی طاقت نہیں تھی بلکہ عرب قبائل کی بے توجہی تھی۔ عرب متحدہ کوشش کریں تو مسلمانوں پر غالب آجانا کوئی مشکل امر نہیں۔ اس پروپیگنڈا کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں کے خلاف مخالفت زور پکڑتی گئی اور دیگر قبائل نے مسلمانوں کو تکلیف دینے میں مکّہ والوں سے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا شروع کیا۔ بعض نے کھُلم کھلا حملے شروع کر دیئے اور بعض نے خفیہ طور پر اُن کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔

ہجرت کے چوتھے سال عرب کے دو قبائل عضل اور قارہ نے اپنے نمائندے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج کر عرض کیا کہ ہمارے قبائل میں بہت سے آدمی اسلام کی طرف مائل ہیں اور درخواست کی کہ کچھ آدمی جو تعلیم اسلام سے پُوری طرح واقف ہوں، بھیج دیئے جائیں تاکہ وہ اُن کے درمیان رہ کر اُن کو اس نئے مذہب

کی تعلیم دیں۔ در اصل یہ ایک سازش تھی، جو بنولحیان نے جو اسلام کے پکّے دشمن تھے کی تھی۔ اور ان کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ نمائندے مسلمانوں کو لے کر آئیں گے تو وہ اُن کو قتل کر کے اپنے رئیس سفیان بن خالد کا بدلہ لیں گے۔ چنانچہ انہوں نے عضل اور قارۃ کے نمائندوں کو چند مسلمانوں کو لے آنے پر انعام کے بڑے بڑے وعدے دیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جب عضل اور قارۃ کے لوگوں نے آنحضرت صلعم کے پاس پہنچکر درخواست کی تو آپؐ نے اُن کی بات پر اعتبار کر کے دس مسلمانوں کو اُن کے ساتھ کر دیا۔ کہ اِن لوگوں کو اِسلام کے عقائد اور اصولوں کی تعلیم دیں۔ جب یہ جماعت بنولحیان کے علاقہ میں پہنچی تو عضل اور قارہ کے لوگوں نے بنولحیان کو اطلاع بھجوا دی اور اُن کو کہلا بھیجا کہ مسلمانوں کو یا تو گرفتار کر لیں یا موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ اس ناپاک منصوبے کے ماتحت بنولحیان کے دو سو مسلّح آدمی مسلمانوں کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے اور آخر مقام رجیع میں اُن کو آگھیرا۔ دس مسلمانوں اور دو سو دشمنوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ مسلمانوں کے دل نورِ ایمان سے پُر تھے اور دشمن اِس سے تہی تھے۔ دس مسلمان ایک ٹیلہ پر چڑھ گئے اور دو سو آدمیوں کو دعوتِ مبارزت دی۔ دشمن نے ایک فریب کر کے اُن کو گرفتار کرنا چاہا اور اُن سے کہا کہ اگر تم نیچے اُتر آؤ تو تمہیں کچھ نہ کہا جائیگا، مگر مسلمانوں کے امیر نے کہا کہ ہم کافروں کے عہد و پیمان کو کافی دیکھ چکے ہیں۔ اِس کے بعد اُنہوں نے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر کہا اے خدا تو ہماری حالت کو دیکھ رہا ہے۔ اپنے رسولؐ کو ہماری اس حالت سے اطلاع پہنچا دے۔ جب کفار نے دیکھا کہ مسلمانوں کی اس چھوٹی سی جماعت پر اُن کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو انہوں نے ان پر حملہ کر دیا اور مسلمان بغیر شکست کے خوف کے لڑتے چلے گئے، یہانتک کہ دس میں سے سات شہید ہو گئے۔ باقی تین جو بچ رہے تھے اُن کو پھر کفار نے وعدہ دیا کہ ہم تمہاری جان بچا لیں گے بشرطیکہ تم ٹیلے سے نیچے اُتر آؤ۔ اِن تینوں نے کفار کے اس وعدہ پر اعتبار کرتے ہوئے اپنے تئیں اُنکے حوالہ کر دیا۔ جونہی انہوں نے ایسا کیا کفار نے اُنہیں اپنی کمانوں کی تانتوں سے جکڑ کر باندھ لیا۔ اِس پر اُن تینوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ پہلی خلاف ورزی ہے جو تم اپنے عہد کی کر رہے ہو۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ تم اسکے بعد کیا کروگے۔ یہ کہہ کر اُس نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ کفار نے اُس کو مارنا اور گھسیٹنا شروع کر دیا۔ مگر آخر اُس کے مقابلے اور استقلال سے اِس قدر مایوس ہو گئے کہ انہوں نے اُس کو وہیں قتل کر دیا۔ باقی دو کو وہ ساتھ لے گئے اور بطور غلاموں کے قریش مکّہ کے پاس فروخت کر دیا۔ اِن میں سے ایک کا نام خبیبؓ تھا اور دوسرے کا زید، خبیبؓ کا خریدار اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے جسے خبیبؓ نے جنگِ بدر میں قتل کیا تھا خبیب کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن خبیبؓ نے اپنی ضرورت کے لیے اُسترا مانگا۔ اُسترا خبیبؓ کے ہاتھ میں تھا کہ گھر والوں کا ایک بچّہ کھیلتے ہوئے اُس کے پاس چلا گیا۔ خبیبؓ نے اِس بچّے کو اُٹھا کر اپنی ران پر بٹھا لیا۔ بچے کی ماں نے جب یہ دیکھا تو دہشت زدہ ہو گئی اور اُسے یقین ہو گیا کہ اب خبیبؓ بچّے کو قتل کر دے گا۔ کیونکہ وہ خبیبؓ کو چند دنوں میں قتل کرنے والے تھے۔ اور اُس وقت اُسترا اُس کے ہاتھ میں تھا۔ بچہ اُس کے اتنا قریب تھا کہ وہ اُسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ خبیبؓ نے اُس کے چہرے سے پریشانی کو بھانپ لیا اور کہا کہ کیا تم خیال کرتی ہو کہ میں تمہارے بچے کو قتل کرنے لگا ہوں۔ اِس خیال کو بھی کبھی دل میں نہ لاؤ۔ میں ایسا بُرا فعل نہیں کر سکتا۔ مسلمان

دھوکا باز نہیں ہوتے۔ وہ عورت خبیبؓ کے اِس دیانتدارانہ اور صحیح طریقِ عمل سے بہت متاثر ہوئی۔ اِس بات کو اُس نے ہمیشہ بعد میں یاد رکھا اور ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ مَیں نے خبیبؓ سا قیدی کوئی نہیں دیکھا۔

آخر کار مکّہ والے خبیبؓ کو ایک کھلے میدان میں لے گئے تا اُس کو قتل کر کے جشن منائیں۔ جب اُن کے قتل کا وقت آن پہنچا تو خبیبؓ نے کہا کہ مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو۔ قریش نے یہ بات مان لی اور خبیبؓ نے سب لوگوں کے سامنے اِس دُنیا میں آخری بار اپنے اللہ کی عبادت کی جب وہ نماز ختم کر چکے تو اُنہوں نے کہا کہ مَیں اپنی نماز جاری رکھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے ختم کر دی ہے کہ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ مَیں مرنے سے ڈرتا ہوں۔ پھر آرام سے اپنا سر قاتل کے سامنے رکھدیا اور ایسا کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے:۔

ولست اُبالی حین اُقتل مسلماً　　　علیٰ ای جنب کان للہ مصرعی

وذٰلک فی ذات الالٰہ وان یشاء　　　یبارك علیٰ اوصال شلوٍ ممزع

یعنی جبکہ میں مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے پروا نہیں ہے کہ مَیں کس پہلو پر قتل ہو کر گروں۔ یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور اگر میرا خدا چاہیگا تو میرے جسم کے پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکات نازل فرمائیگا۔

خبیبؓ نے ابھی یہ شعر ختم نہ کیے تھے کہ جلاد کی تلوار اُن کی گردن پر پڑی اور اُن کا سر خاک پر آ گرا۔ جو لوگ یہ جشن منانے کو جمع ہوئے تھے۔ اُن میں ایک شخص سعید بن عامر بھی تھا جو بعد میں مسلمان ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ جب کبھی خبیبؓ کے قتل کا ذکر سعید کے سامنے ہوتا تو اس کو غش آ جایا کرتا (ابن ہشام)

دوسرے قیدی زیدؓ کو بھی قتل کرنے کے لیے باہر لے جایا گیا۔ اس تماشہ کو دیکھنے والوں میں سے ابو سفیان رئیس مکّہ بھی تھا۔ وہ زیدؓ کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ محمدؐ تمہاری جگہ پر ہو اور تم اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے ہو۔ زیدؓ نے بڑے غصّہ سے جواب دیا کہ ابو سفیان! تم کیا کہتے ہو۔ خدا کی قسم میرے لیے مرنا اس سے بہتر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کو مدینہ کی گلیوں میں ایک کانٹا بھی چُبھ جائے۔ اس فدائیت سے ابو سفیان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اُس نے حیرت سے زیدؓ کی طرف دیکھا اور فوراً ہی دبی زبان میں کہا کہ خدا گواہ ہے کہ جس طرح محمدؐ کے ساتھی محمدؐ سے محبّت کرتے ہیں مَیں نے نہیں دیکھا کہ کوئی اور شخص کسی سے محبت کرتا ہو (ابن ہشام)

ستّر حفّاظِ قرآن کے قتل کا حادثہ

انہی ایام کے قریب قریب نجد کے کچھ لوگ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تا کہ اُن کے ساتھ چند مسلمانوں کو بھیج دیا جائے تا کہ وہ اُن کو اسلام سکھائیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کا اعتبار نہ کیا۔ مگر ابو براء نے جو اُس وقت مدینہ میں تھے کہا کہ میں اس قبیلہ کی طرف سے ضمانتی بنتا ہوں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلایا کہ وہ کوئی شرارت نہیں کریں گے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ستّر مسلمانوں کو جو حافظِ قرآن تھے اِس کام کے لیے انتخاب کیا۔ جب یہ جماعت بئر معونہ پر پہنچی تو اُن میں ایک شخص حرام بن ملحان قبیلہ عامر کے رئیس کے پاس گیا جو ابو براء کا بھتیجا تھا تا کہ اس کو اسلام کا پیغام دے۔ بظاہر قبیلہ والوں نے حرام کا اچھی طرح استقبال کیا مگر جس وقت وہ رئیس کے سامنے تقریر کر رہے تھے تو ایک آدمی چھپ کر پیچھے سے آیا اور

اُن پر نیزہ سے حملہ کیا۔ حرامؓ وہیں مارے گئے۔ جب نیزہ اُن کے گلے سے پار ہُوا تو وہ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے کہ اللہ اکبر۔ فزت برب الکعبۃ یعنی اللہ اکبر۔ کعبہ کے رب کی قسم میں اپنی مراد کو پہنچ گیا۔

اِس دھوکا بازی سے حرامؓ کے قتل کرنے کے بعد قبیلہ کے سرداروں نے اہلِ قبیلہ کو جوش دلایا کہ باقی جماعت معلّمین پر بھی حملہ کریں۔ مگر قبیلہ والوں نے کہا کہ ہمارے رئیس ابوبراء نے ضامن ہونا منظور کیا ہے ہم اس جماعت پر حملہ نہیں کرسکتے۔ اِس پر قبیلہ کے سرداروں نے اُن دو قبیلوں کی مدد کے ساتھ جو مسلمان معلّمین کو لانے کے لیے گئے تھے، جماعت معلّمین پر حملہ کر دیا۔ اُن کا یہ کہنا کہ ہم وعظ کرنے اور اسلام سکھانے آئے ہیں لڑنے نہیں آئے بالکل کارگر نہ ہُوا۔ اور اُنہوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ آخر تین آدمیوں کے سوا باقی سب شہید ہو گئے۔ اس جماعت میں سے ایک آدمی لنگڑا تھا اور لڑائی ہونے سے پہلے پہاڑی پر چڑھ گیا تھا اور دو اونٹوں کو چرانے جنگل میں گئے ہوئے تھے جنگل سے واپسی پر اُنہوں نے دیکھا کہ اُن کے چھیاسٹھ ساتھی میدان میں مرے پڑے ہیں۔ دو نے آپس میں مشورہ کیا ایک نے کہا ہمیں چاہیئے کہ اس کی جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دیں۔ دوسرے نے کہا جہاں ہماری جماعت کا سردار جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا امیر مقرر کیا تھا قتل کیا گیا ہے مَیں اُس جگہ کو چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ کہتے ہوئے وہ تن تنہا کفار پر حملہ آور ہوا اور لڑتا ہوا مارا گیا۔ دوسرے کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر بعد میں ایک قسم کی بنا پر جو قبیلہ کے ایک سردار نے کھائی ہوئی تھی اُسے چھوڑ دیا گیا۔ قتل ہونے والوں میں عامر بن فہیرہ بھی تھے جو حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اُن کا قاتل ایک شخص جبار بن سلمیٰ تھا جو بعد میں مسلمان ہوگیا۔ جبار کہا کرتا تھا کہ عامر کا قتل ہی میرے مسلمان ہونے کا موجب ہُوا تھا۔ جبار کہتا ہے جب میں عامر کو قتل کرنے لگا تو مَیں نے عامر کو یہ کہتے سُنا۔ فزت واللہ خدا کی قسم مَیں نے اپنی مراد کو پالیا۔ اس کے بعد مَیں نے ایک شخص سے پوچھا۔ جب مسلمان کو موت کا سامنا ہوتا ہے تو وہ ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟ اُس شخص نے جواب دیا کہ مسلمان اللہ کی راہ میں موت کو نعمت اور فتح سمجھتا ہے۔ جبار پر اس جواب کا ایسا اثر ہُوا کہ اُس نے اسلام کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا اور بالآخر مسلمان ہوگیا (اسد الغابہ وابن ہشام)

اِن دو اندوہناک واقعات کی خبر جس میں قریباً اسّی مسلمان ایک شرارت آمیز سازش کے نتیجے میں شہید ہو گئے فوراً مدینہ پہنچ گئی۔ مقتولین کوئی معمولی آدمی نہ تھے بلکہ حفاظِ قرآن تھے وہ کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ نہ اُنہوں نے کسی کو دُکھ دیا تھا۔ وہ کسی جنگ میں بھی شریک نہیں تھے۔ بلکہ اللہ اور مذہب کا جھوٹا واسطہ دیکر اُن کو دھوکے سے دشمن کے تصرف میں دیدیا گیا تھا۔ اِن واقعات سے بلاشک و شبہ ثابت ہوتا ہے کہ کفار کو اسلام سے سخت دشمنی تھی۔ اِس کے بالمقابل اسلام کے حق میں مسلمانوں کا جوش بھی نہایت گہرا اور پائدار تھا۔

غزوۂ بنی مصطلق

جنگِ اُحد کے بعد مکّہ میں سخت قحط پڑا۔ مکّہ والوں کو جو دشمنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی اور جو تدابیر وہ آپ کے برخلاف لوگوں کے درمیان نفرت پھیلانے کی ملک بھر میں کر رہے تھے، بالکل نظر انداز کر کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سخت مصیبت کے وقت میں مکّہ کے غرباء کی امداد کے لیے ایک رقم جمع کی، مگر

اِس خیر خواہی کا بھی اہلِ مکّہ پر کچھ اثر نہ ہُوا اور اُن کی دشمنی میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ وہ دشمنی میں اور بھی بڑھ گئے۔ ایسے قبائل بھی جو پہلے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کرتے تھے دشمن بن گئے۔ اِن قبائل میں سے ایک قبیلہ بنی مصطلق کا تھا۔ اُن کے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ اچھے تھے مگر اب اُنہوں نے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تیاری کا علم ہوا تو آپ نے حقیقتِ حال دریافت کرنے کے لیے کچھ آدمی بھیجے جنہوں نے واپس آکر اِن اطلاعات کی تصدیق کی۔ اِس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ خود جا کر اس نئے حملہ کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ آپ نے ایک فوج تیار کی اور اُسے لیکر بنو مصطلق کی طرف گئے۔ جب مسلمانوں کی فوج کا دشمن سے مقابلہ ہُوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوشش کی کہ دشمن بغیر لڑائی کے پیچھے ہٹ جانے پر آمادہ ہو جائے، مگر اُنہوں نے انکار کیا۔ اس پر جنگ ہوئی اور چند گھنٹوں کے اندر دشمن کو شکست ہو گئی۔

چونکہ کفارِ مکّہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے پر تُلے ہوئے تھے اور جو قبائل دوست تھے وہ بھی دشمن بن رہے تھے، اس لیے اُن منافقین نے بھی جو مسلمانوں کے درمیان موجود تھے اِس موقعہ پر یہ جرأت کی کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو کر جنگ میں حصّہ لیں۔ غالباً اُن کا خیال تھا کہ اس طرح اُنہیں مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا موقعہ مل سکیگا مگر بنو مصطلق کے ساتھ جو لڑائی ہوئی وہ چند گھنٹوں میں ختم ہو گئی۔ اِس لیے اِس لڑائی کے دوران میں منافقین کو کوئی شرارت کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ بنو مصطلق کے قصبہ میں کچھ دن قیام فرمائیں۔ آپکے قیام کے دوران میں ایک مکّہ کے رہنے والے مسلمان کا ایک مدینہ کے رہنے والے مسلمان سے کنوئیں سے پانی نکالنے کے متعلق جھگڑا ہو گیا۔ اتفاق سے یہ مکّہ والا آدمی ایک آزاد شدہ غلام تھا اُس نے مدینہ والے شخص کو مارا جس پر اُس نے اہلِ مدینہ کو جنہیں انصار کہتے تھے پکارا اور مکّہ والے نے مہاجرین کو پکارا۔ اس طرح جوش پھیل گیا کسی نے یہ دریافت کرنے کی کوشش نہ کی کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ دونوں طرف کے جوان آدمیوں نے تلواریں نکال لیں۔ عبد اللہ بن ابی بن سلول نے سمجھا کہ ایسا موقعہ خدا نے مہیا کر دیا ہے۔ اُس نے چاہا کہ آگ پر تیل ڈالے اور اہلِ مدینہ کو مخاطب کر کے کہا کہ اِن مہاجرین پر تمہاری مہربانی حد سے بڑھ گئی ہے اور تمہارے نیک سلوک سے اُن کے سر پھر گئے ہیں اور یہ دن بدن تمہارے سر چڑھتے جاتے ہیں۔ قریب تھا کہ اس تقریر کا وہی اثر ہوتا جو عبد اللہ چاہتا تھا اور جھگڑا شدت پکڑ جاتا۔ مگر ایسا نہ ہُوا عبد اللہ نے اپنی شر انگیز تقریر کا اندازہ لگانے میں غلطی کی تھی۔ اور یہ سمجھتے ہوئے کہ انصار پر اس کا اثر ہو گیا ہے۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم مدینہ میں واپس پہنچ لیں پھر جو معزز ترین انسان ہے وہ ذلیل ترین انسان کو باہر نکال دے گا۔ معزز ترین انسان سے اس کی مراد وہ خود تھا اور ارذل ترین سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ من ذالک) جونہی یہ بات اُس کے منہ سے نکلی مومنوں پر اُس کی حقیقت کھُل گئی اور اُنہوں نے کہا کہ یہ معمولی بات نہیں بلکہ یہ شیطان کا قول ہے جو ہمیں گمراہ کرنے کے لیے آیا ہے۔ ایک جوان آدمی اُٹھا اور اپنے چچا کے ذریعہ اس نے یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دی۔ آپ نے عبد اللہ بن ابی بن سلول اور اُسکے دوستوں کو بلایا اور پوچھا کیا بات ہوئی ہے؟ عبد اللہ نے اور اس کے دوستوں نے بالکل انکار کر دیا اور کہدیا کہ یہ واقعہ جو ہمارے ذمہ لگایا گیا ہے ہُوا ہی نہیں۔ آپ نے کچھ نہ کہا لیکن سچی بات پھیلنی شروع ہو گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد عبد اللہ بن ابی بن سلول کے بیٹے

عبداللہ نے بھی یہ بات سُنی۔ وہ فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور کہا۔ اے اللہ کے نبی! میرے باپ نے آپ کی ہتک کی ہے اُس کی سزا موت ہے اگر آپ یہی فیصلہ کریں تو مَیں پسند کرتا ہوں کہ آپ مجھے حکم دیں کہ مَیں اپنے باپ کو قتل کروں، اگر آپ کسی اَور کو حکم دینگے اور میرا باپ اس کے ہاتھوں مارا جائیگا تو ہوسکتا ہے کہ میں اُس آدمی کو قتل کر کے اپنے باپ کا بدلہ لوں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لُوں۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرا ہرگز ارادہ نہیں ہے میں تمہارے والد کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا سلوک کرونگا جب عبداللہ نے اپنے باپ کی بیوفائی اور درشت کلامی کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی اور مہربانی سے مقابلہ کیا تو اُس کا ایمان اور بڑھ گیا، اور اپنے باپ کے خلاف اُس کا غصہ بھی اُسی نسبت سے ترقی کر گیا جب لشکر مدینہ کے قریب پہنچا تو اُس نے آگے بڑھ کر اپنے باپ کا راستہ روک لیا! اور کہا مَیں تم کو مدینہ کے اندر داخل نہیں ہونے دونگا تاوقتیکہ تم وہ الفاظ واپس نہ لو جو تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف استعمال کیے ہیں، جس مُنہ سے یہ بات نکلی ہے کہ خدا کا نبی ذلیل ہے اور تم معزّز ہو اُسی مُنہ سے تم کو یہ بات کہنی ہوگی کہ خدا کا نبی معزّز ہے اور تم ذلیل ہو۔ جب تک تم یہ نہ کہو مَیں تمہیں ہرگز آگے نہ جانے دونگا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول حیران اور خوفزدہ ہو گیا اور کہنے لگا اے میرے بیٹے میں تمہارے ساتھ اتفاق کرتا ہوں، محمدؐ معزّز ہے اور مَیں ذلیل ہوں۔ نوجوان عبداللہ نے اِس پر اپنے باپ کو چھوڑ دیا۔ (ابن ہشام جلد ۲)

مدینہ پر سب عرب کی چڑھائی

غزوۂ خندق

اِس سے پہلے یہود کے دو قبیلوں کا ذکر کیا جا چکا ہے، جن کو لڑائی، فساد، قتل اور قتل کرنے کے منصوبوں کی وجہ سے مدینہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ اُن میں سے بنو نضیر کا کچھ حصّہ تو شام کی طرف ہجرت کر گیا تھا اور کچھ حصّہ مدینہ سے شمال کی طرف خیبرؔ نامی ایک شہر کی طرف ہجرت کر گیا تھا۔ خیبرؔ عرب میں یہود کا ایک بہت بڑا مرکز تھا اور ایک قلعہ بند شہر تھا۔ یہاں جا کر بنو نضیر نے مسلمانوں کے خلاف عربوں میں جوش پھیلانا شروع کیا۔ مکّہ والے تو پہلے ہی مخالف تھے، کسی مزید انگیخت کے محتاج نہ تھے۔ اِسی طرح غطفان نامی نجد کا قبیلہ جو عرب کے قبیلوں میں بہت بڑی حیثیت رکھتا تھا وہ بھی مکّہ والوں کی دوستی میں اسلام کی دشمنی پر آمادہ رہتا تھا۔ اب یہود نے قریش اور غطفان کو جوش دلانے کے علاوہ بنو سُلیم اور بنو اسد دو اَور زبردست قبیلوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف اُکسانا شروع کیا اور اسی طرح بنو سعد نامی قبیلہ جو یہود کا حلیف تھا اُس کو بھی کفارِ مکّہ کا ساتھ دینے کے لیے تیار کیا۔ ایک لمبی تیاری کے بعد عرب کے تمام زبردست قبائل کی ایک اتحادِ عام کی بنیاد رکھ دی گئی جس میں مکّہ کے لوگ بھی شامل تھے۔ مکّہ کے اِردگرد کے قبائل بھی تھے اور نجد اور مدینہ سے شمال کی طرف کے علاقوں کے قبائل بھی شامل تھے اور یہود بھی شامل تھے۔ اِن سب قبائل نے مل کر مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لیے ایک

زبردست لشکر تیار کیا۔ یہ ۵ ہجری آخر فروری کا واقعہ ہے۔ مختلف مؤرخوں نے اِس لشکر کا اندازہ دس ہزار سے چوبیس ہزار تک لگایا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ تمام عرب کے اجتماع کا نتیجہ صرف دس ہزار سپاہی نہیں ہو سکتا یقیناً چوبیس ہزار والا اندازہ زیادہ صحیح ہے اور اگر اور کچھ نہیں تو یہ لشکر اٹھارہ بیس ہزار کا تو ضرور ہوگا۔ مدینہ ایک معمولی قصبہ تھا اس قصبہ کے خلاف سارے عرب کی چڑھائی کوئی معمولی چڑھائی نہیں تھی۔ مدینہ کے مرد جمع کر کے (جن میں بوڑھے، جوان اور بچے بھی شامل ہوں) صرف تین ہزار آدمی نکل سکتے تھے اسکے برخلاف دشمن کی فوج بیس اور چوبیس ہزار کے درمیان تھی اور پھر وہ سب کے سب نوجی آدمی تھے جوان اور لڑنے کے قابل تھے۔ کیونکہ جب شہر میں رہ کر حفاظت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اُس میں بچے اور بوڑھے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر جب دُور دراز مقام پر لشکر چڑھائی کر کے جاتا ہے تو اُس میں صرف جوان اور مضبوط آدمی ہوتے ہیں پس یہ یقینی بات ہے کہ کفار کے لشکر میں بیس ہزار یا پچیس ہزار جتنے بھی آدمی تھے وہ سب کے سب مضبوط، جوان اور تجربہ کار سپاہی تھے۔ لیکن مدینہ کے کل مردوں کی تعداد بچوں اور اپاہجوں کو ملا کر بمشکل تین ہزار ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر مدینہ کے لشکر کی تعداد تین ہزار سمجھی جائے تو دشمن کی تعداد چالیس ہزار سمجھنی چاہیئے اور اگر دشمن کے لشکر کی تعداد بیس ہزار سمجھی جائے تو مدینہ کے سپاہیوں کی تعداد صرف ڈیڑھ ہزار فرض کرنی چاہیئے۔ جب اس لشکر کے جمع ہونے اور حملہ کی تیاریوں کی خبر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ اس موقعہ پر کیا کرنا چاہیئے۔ صحابہ میں سے سلمانؓ فارسی جو سب سے پہلے فارسی مسلمان تھے اُن سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمہارے ملک میں ایسے موقع پر کیا کیا کرتے ہیں۔ تو اُنہوں نے کہا یا رسول اللہ! جب شہر بے حفاظت ہو اور سپاہی تھوڑے ہوں تو ہمارے ملک کے لوگ خندق کھود کر اُس کے اندر محصور ہو جایا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی اس تجویز کو پسند فرمایا۔ مدینہ کے ایک طرف ٹیلے تھے دوسری طرف ایسے محلّے تھے جن کے مکانات ایک دوسرے سے پیوستہ تھے اور دشمن صرف چند گلیوں میں سے ہو کر آ سکتا تھا تیسری طرف کچھ مکانات تھے اور کچھ باغات اور کچھ فاصلہ پر یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے قلعے تھے۔ یہ قبیلہ چونکہ مسلمانوں سے اتحاد کا معاہدہ کر چکا تھا اِس طرف کو بھی محفوظ سمجھ لیا گیا تھا۔ چوتھی طرف کُھلا میدان تھا اور اس طرف سے زیادہ خطرہ ہو سکتا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ اِس کُھلے میدان کی طرف خندق بنا دی جائے تاکہ دشمن اچانک شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ چنانچہ آپ نے دس دس گز کا علاقہ دس دس آدمیوں کے سپرد کھودنے کے لیے کر دیا اور اس طرح قریباً میل لمبی خندق کُھدوائی۔ جب خندق کھودی جا رہی تھی تو زمین میں ایک ایسا پتھر نکلا جو کسی طرح لوگوں سے ٹوٹتا نہیں تھا۔ صحابہؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر دی تو آپ وہاں خود تشریف لے گئے۔ اپنے ہاتھ میں کدال پکڑا اور زور سے اُس پتھر پر مارا۔ کدال کے پڑنے سے اس پتھر میں سے روشنی نکلی اور آپ نے فرمایا۔ اللہ اکبر۔ پھر دوبارہ آپ نے کدال مارا تو پھر روشنی نکلی پھر آپ نے فرمایا۔ اللہ اکبر۔ پھر آپ نے تیسری دفعہ کدال مارا اور پھر پتھر سے روشنی نکلی اور ساتھ ہی پتھر ٹوٹ گیا۔ اس موقعہ پر پھر آپ نے فرمایا۔ اللہ اکبر۔ صحابہؓ نے آپ سے پوچھا۔ یا رسول اللہ! آپ نے تین دفعہ اللہ اکبر کیوں فرمایا؟ آپ نے فرمایا پتھر پر کدال پڑنے سے تین دفعہ جو روشنی نکلی تینوں دفعہ خدا نے مجھے اسلام کی آئندہ ترقیات کا

نقشہ دکھایا یہلی دفعہ کی روشنی میں مملکتِ قیصر کے شام کے محلّات دکھائے گئے اور اس کی کنجیاں مجھے دی گئیں، دوسری دفعہ کی روشنی میں مدائن کے سفید محلات مجھے دکھائے گئے اور مملکتِ فارس کی کنجیاں مجھے دی گئیں۔ تیسری دفعہ کی روشنی میں صنعاء کے دروازے مجھے دکھائے گئے اور مملکتِ یمن کی کنجیاں مجھے دی گئیں۔ پس تم خدا کے وعدوں پر یقین رکھو دشمن تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ یہ تھوڑے سے آدمی اتنی لمبی خندق فوجی اصول کے مطابق تو نہیں کھود سکتے تھے پس یہ خندق اتنا ہی فائدہ دے سکتی تھی کہ دشمن اچانک اندر نہ گھس آئے ورنہ اس خندق سے پار ہونا اُن کے لیے ناممکن نہیں تھا چنانچہ آئندہ جو واقعات بیان ہونگے اُن سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ دشمن نے بھی مدینہ کے حالات کو مدنظر رکھ کر اُسی طرف سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا ہُوا تھا چنانچہ دشمن کا لشکر جرّار اسی طرف سے مدینہ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ بھی کچھ لوگوں کو شہر کے دوسرے حصوں کی حفاظت کے لیے مقرر کر کے بقیہ آدمی جو بارہ سو کے قریب تھے اُن کو لیکر خندق کی حفاظت کے لیے تشریف لے گئے۔

غزوۂ خندق کے وقت اسلامی لشکر کی اصل تعداد کیا تھی

اِس موقعہ پر مسلمانوں کے لشکر کی تعداد کے بارہ میں مورخین میں سخت اختلاف ہے بعض لوگوں نے اس لشکر کی تعداد تین ہزار لکھی ہے۔ بعض نے بارہ تیرہ سو اور بعض نے سات سو۔ یہ اتنا بڑا اختلاف ہے کہ اس کی تاویل بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے اور مورخین اسے حل نہیں کر سکے لیکن مَیں نے اس کی حقیقت کو پالیا ہے اور وہ یہ کہ تینوں قسم کی روائتیں درست ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے جنگِ اُحد میں منافقین کے واپس آجانے کے بعد مسلمانوں کا لشکر صرف سات سو افراد پر مشتمل تھا جنگ احزاب اسکے صرف دو سال بعد ہوئی ہے اور اس عرصہ میں کوئی بڑا قبیلہ اسلام لا کر مدینہ میں آکر نہیں بسا پس سات سو آدمیوں کا یکدم تین ہزار ہو جانا قرین قیاس نہیں دوسری طرف یہ امر بھی قرینِ قیاس نہیں کہ اُحد کے دو سال بعد تک باوجود اسلام کی ترقی کے قابلِ جنگ مسلمان اتنے ہی رہے جتنے اُحد کے وقت تھے پس ان دونوں تنقیدوں کے بعد وہ روایت ہی درست معلوم ہوتی ہے کہ لڑنے کے قابل مسلمان جنگِ احزاب کے وقت کوئی بارہ سو تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر کسی نے تین ہزار اور کسی نے سات سو کیوں لکھا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روائتیں الگ الگ حالتوں اور نظریوں کے ماتحت بیان کی گئی ہیں۔ جنگِ احزاب کے تین حصّے تھے ایک حصّہ اس کا وہ تھا جب ابھی دشمن مدینہ کے سامنے نہ آیا تھا اور خندق کھودی جا رہی تھی۔ اس کام میں کم سے کم مٹی ڈھونے کی خدمت بچے بھی کر سکتے تھے اور بعض عورتیں بھی اس کام میں مدد دے سکتی تھیں۔ پس جب تک خندق کھودنے کا کام رہا مسلمان لشکر کی تعداد تین ہزار تھی مگر اُس میں بچے بھی شامل تھے۔ اور صحابیہ عورتوں کے جوش کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس تعداد میں کچھ عورتیں بھی شامل ہوں گی۔ جو خندق کھودنے کا کام تو نہیں کرتی ہونگی مگر اُوپر کے کاموں میں حصہ لیتی ہونگی۔ یہ میرا خیال ہی نہیں تاریخ سے بھی میرے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے جب خندق کھودنے کا وقت آیا سب لڑکے بھی جمع کر لیے گئے اور تمام مرد خواہ بڑے تھے خواہ بچے خندق کھودنے یا اُس میں مدد دینے کا کام کرتے تھے، پھر جب دشمن آگیا اور لڑائی شروع ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن تمام لڑکوں کو جو پندرہ سال سے چھوٹی عمر کے تھے چلے جانے کا

حکم دیا اور جو پندرہ سال کے ہو چکے تھے، اُنہیں اجازت دی کہ خواہ ٹھہریں خواہ چلے جائیں (السیرۃ الحلبیہ جلد دوم)
اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خندق کھودنے کے وقت مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اور جنگ کے وقت کم ہو گئی کیونکہ نابالغوں کو واپس چلے جانے کا حکم دیدیا گیا تھا پس جن روایتوں میں تین ہزار کا ذکر آیا ہے وہ خندق کھودنے کے وقت کی تعداد بتاتی ہیں۔ جس میں چھوٹے بچے بھی شامل تھے۔ اور جیسا کہ میں نے دوسری جنگوں پر قیاس کر کے نتیجہ نکالا ہے کچھ عورتیں بھی تھیں۔ لیکن بارہ سو کی تعداد اُس وقت کی ہے جب جنگ شروع ہو گئی اور صرف بالغ مرد رہ گئے۔ اب رہا یہ سوال کہ تیسری روایت جو سات سو سپاہی بتاتی ہے کیا وہ بھی درست ہے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت ابن اسحٰق مؤرخ نے بیان کی ہے جو بہت معتبر مؤرخ ہے۔ اور ابن حزم جیسے زبردست عالم نے اس کی بڑے زور سے تصدیق کی ہے پس اس کے بارہ میں بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ تاریخ کی مزید چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جنگ کے دَوران میں بنو قریظہ کفار کے لشکر سے مل گئے اور اُنہوں نے یہ ارادہ کیا کہ مدینہ پر اچانک حملہ کر دیں اور اُن کی نیتوں کا راز فاش ہو گیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی اس جہت کی حفاظت بھی ضروری سمجھی جس طرف بنو قریظہ تھے اور جس طرف کو پہلے اس خیال سے بے حفاظت چھوڑ دیا گیا تھا کہ بنو قریظہ ہمارے اتحادی ہیں یہ دشمن کو اس طرف سے نہ آنے دینگے چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنو قریظہ کے غدر کا حال معلوم ہُوا تو چونکہ مستورات کو بنو قریظہ کے اعتبار پر اس علاقہ میں رکھا گیا تھا جدھر بنو قریظہ کے قلعے تھے اور وہ بغیر حفاظت تھیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اب اُنکی حفاظت ضروری سمجھی اور دو لشکر مسلمانوں کے تیار کر کے عورتوں کے ٹھہرنے کے دونوں حصوں پر مقرر فرمایا مسلمہ ابن اسلم رضؓ کو دو سو صحابہ دیکر ایک جگہ مقرر کیا اور زید بن حارثہ رضؓ کو تین سو صحابہ دیکر دوسری جگہ مقرر کیا اور حکم دیا کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد تکبیر بلند آواز سے کہتے رہا کریں تا معلوم ہوتا رہے کہ عورتیں محفوظ ہیں۔ اِس روایت سے ہماری یہ مشکل کہ سات سو سپاہی جنگ خندق میں ابن اسحاق نے کیوں بتائے ہیں حل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بارہ سو سپاہیوں میں سے جب پانچسو سپاہی عورتوں کی حفاظت کیلئے بھجوا دیئے گئے تو بارہ سو کا لشکر صرف سات سو رہ گیا اور اس طرح جنگ خندق کے سپاہیوں کی تعداد کے متعلق جو شدید اختلاف تاریخوں میں پایا جاتا ہے وہ حل ہو گیا۔

خلاصہ یہ کہ اس خطرناک مصیبت کے وقت خندق کی حفاظت کیلئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف سات سو آدمی تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے خندق کھودی تھی لیکن پھر بھی اتنے بڑے لشکر کو خندق کے پار سے روکنا بھی اتنے تھوڑے آدمیوں کے لیے ناممکن تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسہ پر یہ قلیل لشکر ایمان اور یقین کے ساتھ خندق کے پیچھے دشمن کے جرّار لشکر کا انتظار کرنے لگا اور عورتیں اور بچّے دو الگ الگ جگہوں پر اکٹھے کر دیئے گئے۔ دشمن جب خندق تک پہنچا تو چونکہ یہ عرب کے لیے ایک بالکل نئی بات تھی اور اس قسم کی لڑائی کیلئے وہ تیار نہ تھے انہوں نے خندق کے سامنے اپنے خیمے لگا دیئے اور مدینہ میں داخل ہونیکی تدبیریں سوچنے لگے۔

بنو قریظہ کی غدّاری

چونکہ مدینہ کا ایک کافی حصّہ خندق سے محفوظ تھا اور دوسری طرف کچھ پہاڑی ٹیلے کچھ پختہ مکانات اور

کچھ باغات وغیرہ تھے، اِس لیے فوج یکدم حملہ نہیں کر سکتی تھی۔ پس انہوں نے مشورہ کرکے یہ تجویز کی کہ کسی طرح یہود کا تیسرا قبیلہ جو ابھی مدینہ میں باقی تھا اور جس کا نام بنو قریظہ تھا اُس کو اپنے ساتھ ملایا جائے اور اس ذریعہ سے مدینہ تک پہنچنے کا راستہ کھولا جائے۔ چنانچہ مشورہ کے بعد حیی ابن اخطب جو جلاوطن کردہ بنو نضیر کا سردار تھا اور جس کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے سارا عرب اکٹھا ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہُوا تھا اُسے کفار کی فوج کے کمانڈر ابوسفیان نے اِس بات پر مقرر کیا کہ جس طرح بھی ہو بنو قریظہ کو اپنے ساتھ شامل کرو۔ چنانچہ حیی ابن اخطب یہودیوں کے قلعوں کی طرف گیا، اور اُس نے بنو قریظہ کے سرداروں سے ملنا چاہا۔ پہلے تو انہوں نے ملنے سے انکار کیا، لیکن جب اُس نے اُن کو سمجھایا کہ اس وقت سارا عرب مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے آیا ہے اور یہ بستی سارے عرب کا مقابلہ کسی صورت میں نہیں کر سکتی۔ اِس وقت جو لشکر مسلمانوں کے مقابل پر کھڑا ہے اُسکو لشکر نہیں کہنا چاہیئے بلکہ ایک ٹھاٹھیں مارنے والا سمندر کہنا چاہیئے تو اِن باتوں سے اُس نے بنو قریظہ کو آخر غدّاری اور معاہدہ شکنی پر آمادہ کر دیا۔ اور یہ فیصلہ ہُوا کہ کفار کا لشکر سامنے کی طرف سے خندق پار ہونے کی کوشش کرے اور یہ کہ جب وہ خندق پار ہونے میں کامیاب ہو جائینگے تو بنو قریظہ مدینہ کی دوسری طرف سے مدینہ کے اس حصّہ پر حملہ کر دینگے جہاں عورتیں اور بچے ہیں اور جسے بنو قریظہ پر اعتبار کرکے بغیر حفاظت کے چھوڑ دیا گیا تھا اور اس طرح مسلمانوں کی مقابلہ کی طاقت بالکل کچلی جائے گی۔ اور ایک ہی دم میں مسلمان مرد، عورتیں اور بچے سب مار دیئے جائیں گے۔ یہ یقینی بات ہے کہ اِس تدبیر میں تھوڑی بہت کامیابی بھی کفار کو ہو جاتی تو مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ حفاظت کی باقی نہیں رہتی تھی۔ بنو قریظہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور اگر وہ کھلی جنگ میں شامل نہ بھی ہوتے تب بھی مسلمان یہ امید کرتے تھے کہ اُن کی طرف سے ہو کر مدینہ پر کوئی حملہ نہیں کر سکیگا۔ اسی وجہ سے اُن کی طرف کا حصّہ بالکل غیر محفوظ چھوڑ دیا گیا تھا۔ بنو قریظہ اور کفار نے بھی اس صورتِ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ جب بنو قریظہ کفار کے ساتھ مل گئے تو وہ کھلے بندوں کفار کی مدد نہ کریں تا ایسا نہ ہو کہ مسلمان مدینہ کی اُس طرف کی حفاظت کا بھی کوئی سامان کریں، جو بنو قریظہ کے علاقہ سے ملتی تھی۔ یہ تدبیر نہایت ہی خطرناک تھی۔ مسلمانوں کو غافل رکھتے ہوئے کسی ایسے وقت میں بنو قریظہ کا دشمن کے ساتھ جا ملنا جبکہ اسلامی فوج پر کفار کی فوج کا زبردست دھاوا ہو رہا ہو مدینہ کی اس طرف کی حفاظت کو جس طرف بنو قریظہ کے قلعے واقعہ تھے بالکل ناممکن بنا دیتا تھا۔ دو طرف سے مسلمانوں پر حملہ کر سکنے کا امکان پیدا ہو جانے کے بعد مکّہ کے لشکر نے خندق پر حملہ شروع کیا۔ پہلے چند دن تو اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ خندق پر سے کس طرح گذریں، لیکن دو چار دن کے بعد انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ تیر انداز اونچی جگہوں پر کھڑے ہو کر اُن مسلمان دستوں پر تیر اندازی شروع کر دیتے تھے جو خندق کی حفاظت کے لیے خندق کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بٹھائے گئے تھے۔ جب تیروں کی بوچھاڑ کی وجہ سے مسلمان پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جاتے تو اعلیٰ درجہ کے گھوڑ سوار خندق کو پھاندنے کی کوشش کرتے۔ خیال کیا گیا تھا کہ اِس قسم کے متواتر حملوں کے نتیجہ میں کوئی نہ کوئی جگہ ایسی نکل آئے گی کہ جہاں سے پیدل فوج زیادہ تعداد میں خندق پار ہو سکے گی یہ حملے اتنی کثرت کے ساتھ کیے جاتے تھے اور اِس طرح متواتر کیے جاتے تھے کہ بعض دفعہ مسلمانوں کو سانس

لینے کا بھی موقعہ نہیں ملتا تھا چنانچہ ایک دن حملہ اتنا شدید ہو گیا کہ مسلمانوں کی بعض نمازیں وقت پر ادا نہ ہو سکیں۔ جس کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اتنا صدمہ ہُوا کہ آپ نے فرمایا۔ خدا کفار کو سزا دے انہوں نے ہماری نمازیں ضائع کیں۔ گو یہ واقعہ دشمنوں کے حملوں کی شدّت کو ظاہر کرنے کے لیئے میں نے بیان کیا ہے، لیکن اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر ایک بہت بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ترین چیز آپ کے لیے خدا تعالیٰ کی عبادت تھی جبکہ دشمن چاروں طرف سے مدینہ کو گھیرے ہوئے تھا، جبکہ مدینہ کے مرد تو الگ رہے اُن عورتوں اور بچوں کی جانیں بھی خطرہ میں تھیں، جب ہر وقت مدینہ کے لوگوں کا دل دھڑک رہا تھا کہ دشمن کسی طرف سے مدینہ کے اندر گھُس نہ جائے۔ اُس وقت بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہی تھی کہ خدا تعالیٰ کی عبادت اپنے وقت پر عمدگی کے ساتھ ادا ہو جائے۔ مسلمانوں کی عبادت یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کی طرح ہفتہ میں کسی ایک دن نہیں ہُوا کرتی بلکہ مسلمانوں کی عبادت دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے۔ ایسے خطرناک وقت میں تو دن میں ایک دفعہ بھی عبادت ادا کرنا انسان کے لیئے مشکل ہو جاتا ہے کجا یہ کہ دن کے پانچ وقتوں میں عمدگی کے ساتھ اور جماعت کے ساتھ نماز کو ادا کیا جائے، مگر ان خطرناک ایام میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ پانچوں نمازیں اپنے وقت پر ادا کرتے تھے۔ اور اگر ایک دن دشمن کے شدید حملہ کی وجہ سے آپ اپنے ربّ کا نام اطمینان اور آرام سے اپنے وقت پر نہ لے سکے تو آپ کو شدید تکلیف پہنچی۔ اُس وقت سامنے سے دشمن حملہ کر رہا تھا اور پیچھے سے بنو قریظہ اس بات کی تاڑ میں تھے کہ کوئی موقعہ مل جائے تو بغیر مسلمانوں کے شبہات کو اُبھارنے کے وہ مدینہ کے اندر گھس کر عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیں۔ چنانچہ ایک دن بنو قریظہ نے ایک جاسوس بھیجا تاکہ وہ معلوم کرے کہ عورتیں اور بچے اکیلے ہی ہیں یا کافی تعداد سپاہیوں کی اُن کی حفاظت کے لیئے مقرر ہے۔ جس خاص احاطہ میں خاص خاص خاندانوں کو جنکو دشمن سے زیادہ خطرہ تھا جمع کر دیا گیا تھا اُس کے پاس اُس جاسوس نے آکر منڈلانا شروع کیا اور چاروں طرف دیکھنا شروع کیا کہ آیا مسلمان سپاہی اردگرد کہیں پوشیدہ تو نہیں بیٹھے ہوئے۔ وہ اِس تاڑ میں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے اُسے دیکھ لیا۔ اتفاقاً اس وقت صرف ایک ہی مسلمان مرد وہاں موجود تھا اور وہ بھی بیمار تھا۔ حضرت صفیہؓ نے اُسے کہا یہ آدمی دیر سے عورتوں کے علاقہ میں پھر رہا ہے اور جانے کا نام نہیں لیتا اور چاروں طرف دیکھتا پھرتا ہے پس یہ یقیناً جاسوس ہے تم اس کا مقابلہ کرو ایسا نہ ہو کہ دشمن پورے حالات معلوم کر کے اِدھر حملہ کر دے۔ اُس بیمار صحابی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تب حضرت صفیہؓ نے خود ایک بڑا بانس پکڑ کے اُس شخص کا مقابلہ کیا اور دوسری عورتوں کی مدد سے اُس کو مارنے میں کامیاب ہو گئیں۔ آخر تحقیقات سے معلوم ہُوا کہ وہ یہودی تھا اور بنو قریظہ کا جاسوس تھا تب تو مسلمان اور بھی زیادہ گھبرا گئے اور اُنہوں نے سمجھا کہ اب مدینہ کی یہ طرف بھی محفوظ نہیں۔ مگر سامنے کی طرف سے دشمن کا اتنا زور تھا کہ اب وہ اس طرف کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں کر سکتے تھے لیکن باوجود اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی حفاظت کو مقدّم سمجھا۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے بارہ سو سپاہیوں میں سے پانچسو کو عورتوں کی حفاظت کے لیے شہر میں مقرر کر دیا اور خندق کی حفاظت اور اٹھارہ بیس ہزار لشکر کے مقابلہ کے لیے صرف سات سو سپاہی رہ گئے۔ اس حالت میں بعض مسلمان گھبرا کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے

اور کہا یا رسول اللہ! حالات نہایت خطرناک ہو گئے ہیں۔ اب بظاہر مدینہ کے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی، آپ اس وقت خدا تعالیٰ سے خاص طور پر دعا کریں اور ہمیں بھی کوئی دعا سکھائیں جس کے پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کا فضل ہم پر نازل ہو۔ آپ نے فرمایا تم لوگ گھبراؤ نہیں، تم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرو کہ تمہاری کمزوریوں پر پردہ ڈالے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور تمہاری گھبراہٹ کو دور فرمائے اور پھر آپ نے خود بھی اس طرح دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ منزل الکتٰب سریع الحساب اھزم الاحزاب اللّٰھمّ اھزمھم وانصرنا علیھم وزلزلھم۔

اور اسی طرح یہ دعا فرمائی :۔ یاصریخ المکروبین یا مجیب المضطرین اکشف ھمّی وکربی فانک تریٰ مانزل بی و باصحابی۔ اے اللہ! جس نے قرآن کریم مجھ پر نازل کیا ہے جو بہت جلدی اپنے بندوں سے حساب لے سکتا ہے۔ یہ گروہ جو جمع ہو کر آئے ہیں ان کو شکست دے۔ اے اللہ! میں پھر عرض کرتا ہوں کہ تو انہیں شکست دے اور ہمیں ان پر غلبہ دے اور ان کے ارادوں کو متزلزل کر دے۔ اے دکھیوں کی دعا سننے والے! اے گھبراہٹ میں مبتلا لوگوں کی پکار کا جواب دینے والے۔ میرے غم اور میری فکر اور میری گھبراہٹ کو دور کر کیونکہ تو ان مصائب کو جانتا ہے جو مجھے اور میرے ساتھیوں کو در پیش ہیں۔

منافقوں اور مومنوں کی حالت کا بیان

اس موقعہ پر منافق تو اتنے گھبرا گئے کہ قومی حمیّت اور اپنے شہر اور اپنی عورتوں اور بچّوں کی حفاظت کا خیال بھی ان کے دلوں سے نکل گیا۔ مگر چونکہ اپنی قوم کے سامنے وہ ذلیل بھی نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے بہانے بہانے سے لشکر سے فرار کی صورت سوچی۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وَیَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْھُمُ النَّبِیَّ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ وَّمَا ھِیَ بِعَوْرَۃٍ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (سورۃ احزاب ع۲) یعنی ایک گروہ ان میں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے اجازت طلب کی کہ انہیں محاذِ جنگ سے پیچھے لوٹ آنے کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ انہوں نے کہا (اب یہودی بھی مخالف ہو گئے ہیں اور اس طرف سے مدینہ کے بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں) اور ہمارے گھر اس علاقہ کی طرف سے بے حفاظت کھڑے ہیں (پس ہمیں اجازت دیجئے کہ اپنے گھروں کی جا کر حفاظت کریں) لیکن ان کا یہ کہنا کہ ان کے گھر بے حفاظت کھڑے ہیں بالکل غلط ہے۔ وہ بے حفاظت نہیں ہیں (کیونکہ خدا تعالیٰ مدینہ کی حفاظت کے لیے کھڑا ہے) وہ تو صرف ڈر کے مارے میدانِ جنگ سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کا نقشہ قرآن کریم نے یوں کھینچا ہے :۔ اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا۔ ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا۔ وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اِلَّا غُرُوْرًا۔ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ یٰٓاَھْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمْ فَارْجِعُوْا (سورۃ احزاب ع۲) یعنی یاد تو کرو جب تم پر لشکر چڑھ کے آ گیا تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی۔ یعنی نیچے کی طرف سے کفار اور اوپر کی طرف سے یہود۔ جب کہ نظریں کج ہونے لگ گئیں اور دل اچھل اچھل کر گلے تک آنے لگے اور تم میں سے کئی خدا کی نسبت

بدظنیاں کرنے لگ گئے۔ اُس وقت مومنوں کے ایمان کا امتحان لیا گیا اور مومنوں کو سر سے پیر تک ہلا دیا گیا اور یاد کرو جبکہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض تھی، اُنہوں نے کہنا شروع کیا "اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے جھوٹے وعدے کیے تھے" اور یاد کرو جب اُن میں سے ایک گروہ اس حد تک پہنچ گیا کہ انہوں نے مومنوں سے بھی جا جا کر کہنا شروع کر دیا کہ اب کوئی چوکی یا قلعہ تمہیں بچا نہیں سکتا پس یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اور مومنوں کی نسبت فرماتا ہے وَلَمَّا رَاَی الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ (سورہ احزاب ع ۳) یعنی منافقوں اور کمزور ایمان والوں کے مقابلہ میں مومنوں کا یہ حال تھا کہ جب اُنہوں نے دشمن کا یہ لشکر جرار دیکھا تو انہوں نے کہا کہ اس لشکر کے متعلق تو اللہ اور اُسکے رسول نے پہلے سے ہی ہم کو خبر دے چھوڑی تھی۔ اس لشکر کا حملہ تو اللہ اور اس کے رسول کی صداقت کا ثبوت ہے اور یہ لشکر جرار اُن کے ایمان کو ہلا نہ سکا۔ بلکہ ایمان اور اطاعت میں مسلمان اور بھی زیادہ ہو گئے۔ مومنوں کا تو یہ حال ہے کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اُس کو وہ پورے طور پر نباہ رہے ہیں چنانچہ کچھ تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنی جانیں دیکر اپنے مقصد کو حاصل کر لیا اور بعض ایسے ہیں کہ گو اُن کو جانیں دینے کا موقعہ تو نہیں ملا مگر وہ ہر وقت اس بات کی انتظار میں رہتے ہیں کہ اُن کو خدا کے رستہ میں جان دینے کا موقعہ ملے تو وہ جان دیدیں اور شروع دن سے انہوں نے خدا تعالےٰ سے جو عہد باندھا تھا اس کو نباہ رہے ہیں۔

اِسلام میں مُردہ لاش کا احترام

دشمن جو خندق پر حملہ کر رہا تھا بعض وقت وہ اُس کے پھاندنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تھا، چنانچہ ایک دن کفار کے بعض بڑے بڑے جرنیل خندق پھاند کر دوسری طرف آنے میں کامیاب ہو گئے لیکن مسلمانوں نے ایسا جان توڑ کر حملہ کیا کہ سوائے واپس جانے کے اُن کیلئے کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ اُس وقت خندق پھاندتے ہوئے کفار کا ایک بہت بڑا رئیس نوفل نامی مارا گیا۔ یہ اتنا بڑا رئیس تھا کہ کفار نے یہ سمجھا کہ اگر اس کی لاش کی ہتک ہوئی تو عرب میں ہمارے لیے منہ دکھانے کی کوئی جگہ نہیں رہیگی چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ اس کی لاش واپس کر دیں تو وہ دس ہزار درہم آپ کو دینے کے لیے تیار ہیں۔

اُن لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ شاید جس طرح ہم نے مسلمان رؤسا بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے ناک اور کان اُحد کی جنگ میں کاٹ دیئے تھے اِس طرح شاید آج مسلمان ہمارے اس رئیس کے ناک کان کاٹ کر ہماری قوم کی بے عزتی کریں گے۔ مگر اسلام کے احکام تو بالکل اَور قسم کے ہیں۔ اسلام لاشوں کی بے حرمتی کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ کفار کا پیغام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا۔ اس لاش کو ہم نے کیا کرنا ہے یہ لاش ہمارے کس کام کی ہے کہ اس کے بدلہ میں ہم تم سے کوئی قیمت لیں۔ اپنی لاش بڑے شوق سے اُٹھا کر لے جاؤ۔ ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

اتحادی فوجوں کے مسلمانوں پر حملے

اُن دنوں جس جوش کے ساتھ کفار حملہ کرتے تھے میور اُس کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے :۔

"دوسرے دن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا کہ اتحادی فوجیں متفقہ طور پر اُن پر حملے کرنے کے لیے تیار کھڑی ہیں، اُن کے حملوں کو روکنے کے لیے بہت زیادہ ہوشیار اور ہر وقت چوکس رہنا ضروری تھا۔ کبھی وہ متفقہ حملہ کرتے کبھی ستونوں میں تقسیم ہو کر مختلف چوکیوں پر حملہ کرتے اور جب کسی چوکی کو کمزور پاتے تو اپنی ساری فوج اُس جگہ پر جمع کر لیتے اور بے پناہ تیر اندازی کے پردہ میں وہ خندق پار کرنے کی کوشش کرتے تھے یکے بعد دیگرے خالد اور عمرو جیسے مشہور لیڈروں کی ماتحتی میں فوج بہادرانہ حملہ شہر میں داخل ہونے کیلئے کرتی۔ ایک دفعہ تو خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خیمہ دشمن کی زد میں آگیا۔ لیکن مسلمانوں کے فدائیانہ مقابلہ اور تیروں کی بوچھاڑ نے حملہ آوروں کو پیچھے دھکیل دیا۔ یہ حملہ سارا دن جاری رہا اور چونکہ مسلمانوں کی فوج ساری ملکر بمشکل خندق کی حفاظت کر سکتی تھی کوئی آرام کا وقفہ مسلمانوں کو نہ ملا۔ رات پڑ گئی مگر رات کو بھی خالد کے ماتحت دستوں نے لڑائی کو جاری رکھا اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ رات کو بھی اپنی چوکیوں کی حفاظت پورے طور پر کریں لیکن دشمن کی یہ تمام کوششیں بیکار گئیں۔ خندق کو کبھی بھی دشمن کے کافی سپاہی پار نہ کر سکے۔"

لیکن باوجود اس کے کہ جنگ دو روز سے ہو رہی تھی سپاہی ایک دوسرے کے ساتھ گتھ جانے کا موقعہ نہیں پاتے تھے۔ اس لیے چوبیس گھنٹہ کی جنگ میں اتحادیوں کے صرف تین آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کے پانچ۔ اس حملہ میں سعد بن معاذؓ اوس قبیلہ کے رئیس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی صحابی مہلک طور پر زخمی ہوئے۔ ان حملوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک جگہ خندق کے کنارے ٹوٹ گئے اور اُس طرف سے حملہ کرنا بہت ممکن ہو گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جرأت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا یہ حال تھا کہ آپ سردی میں رات کو اُٹھ اُٹھ کر اُس جگہ جاتے اور اُس کا پہرہ دیتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ پہرہ دیتے ہوئے تھک جاتے اور سردی سے نڈھال ہو جاتے تو واپس آکر تھوڑی دیر میرے ساتھ لحاف میں لیٹ جاتے، مگر جسم کے گرم ہوتے ہی پھر اُس شگاف کی حفاظت کے لیے چلے جاتے۔ اس طرح متواتر جاگنے سے آپ ایک دن بالکل نڈھال ہو گئے۔ اور رات کے وقت فرمایا کاش اس وقت کوئی مخلص مسلمان ہوتا تو میں آرام سے سو جاتا۔ اتنے میں باہر سے سعد بن وقاص کی آواز آئی۔ آپ نے پوچھا کیوں آئے ہو۔ انہوں نے کہا آپ کا پہرہ دینے کو۔ آپ نے فرمایا مجھے پہرہ کی ضرورت نہیں تم فلاں جگہ جہاں خندق کا کنارہ ٹوٹ گیا ہے جاؤ اور اس کا پہرہ دو تا مسلمان محفوظ رہیں۔ چنانچہ سعدؓ اس جگہ کا پہرہ دینے چلے گئے اور آپ سو گئے (عجیب بات ہے کہ جب آپ شروع شروع میں مدینہ تشریف لائے تھے اور خطرہ بہت بڑھا ہُوا تھا تب بھی سعدؓ پہرہ دینے کے لیے تشریف لائے تھے) انہی ایام میں آپ نے ایکدن کچھ لوگوں کے اسلحہ کی آواز سنی اور پوچھا کہ کون ہے؟ تو عباد بن بشیر نے کہا میں ہوں۔ آپ نے فرمایا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ انہوں نے کہا ایک جماعت صحابہ کی ہے جو آپکے خیمہ کا پہرہ دینے کیلئے آئے ہیں آپ نے فرمایا اس وقت مشرکین خندق پھاندنے کی کوشش کر رہے ہیں وہاں جاؤ اور انکا مقابلہ کرو میرے خیمہ کو رہنے دو۔

بنو قریظہ کی مشرکوں سے ملکر حملہ کیلئے تیاری اور اُس میں ناکامی

جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے یہود نے مدینہ میں چوری چھپے داخل ہونے کی کوشش کی اور اس میں اُن کا جاسوس مارا گیا۔ جب یہود کو یہ معلوم ہُوا کہ ان کی سازش ظاہر ہو گئی ہے تو انہوں نے زیادہ دلیری سے عربوں کی مدد شروع کر دی۔

گو اجتماعی حملہ مدینہ کے پچھواڑے کی طرف سے نہیں کیا کیونکہ اُدھر میدان چھوٹا تھا اور مسلمانوں کی فوجوں کی موجودگی میں بڑا حملہ اس طرف سے نہیں ہو سکتا تھا لیکن کچھ دن بعد دونوں فریق نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک وقت مقررہ پر یہودیوں اور مشرکوں کے لشکر یکدم مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ مگر اُس وقت اللہ تعالیٰ کی تائید ایک عجیب طرح ظاہر ہوئی جس کی تفصیل یہ ہے:-

نعیم نامی ایک شخص غطفان کے قبیلہ کا دل میں مسلمان تھا۔ یہ شخص بھی کفار کے ساتھ آیا ہُوا تھا، لیکن اس بات کی انتظار میں تھا کہ اگر مجھے کوئی موقع ملے تو میں مسلمانوں کی مدد کروں۔ اکیلا انسان کر ہی کیا سکتا ہے۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ یہود بھی کفار سے مل گئے ہیں اور اب بظاہر مسلمانوں کی حفاظت کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ تو اِن حالات سے وہ اتنا متاثر ہُوا کہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ بہرحال مجھے اس فتنہ کے دُور کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ جب یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں فریق مل کر ایک دن حملہ کریں تو وہ بنو قریظہ کے پاس گیا اور اُن کے رؤوساء سے کہا کہ اگر عربوں کا لشکر بھاگ جائے تو بتاؤ مسلمان تمہارے ساتھ کیا کرینگے۔ تم مسلمانوں کے معاہد ہو اور معاہدہ کر کے اسکے توڑنے کے نتیجہ میں جو سزا تمکو ملیگی اُس کا قیاس کر لو۔ اُن کے دل کچھ ڈرے اور اُنہوں نے پوچھا پھر ہم کیا کریں۔ نعیم نے کہا جب عرب مشترکہ حملہ کیلئے تم سے خواہش کریں تو تم مشرکین سے مطالبہ کرو کہ اپنے ستّر آدمی ہمارے پاس یرغمال کے طور پر بھجدو، وہ ہمارے قلعوں کی حفاظت کرینگے اور ہم مدینہ کے پچھواڑے سے اُس پر حملہ کر دینگے۔ پھر وہ وہاں سے ہٹ کر مشرکین کے سرداروں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ یہود تو مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ اگر عین موقعہ پر یہ تم سے غدّاری کریں تو پھر کیا کرو گے۔ اگر یہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے اور اپنے جرم کو معاف کروانے کیلئے تم سے تمہارے آدمی بطور یرغمال مانگیں اور اُنکو مسلمانوں کے حوالہ کر دیں تو پھر تم کیا کرو گے۔ تمہیں چاہیئے کہ اُن کا امتحان لے لو، کہ آیا وہ پکّے بھی رہتے ہیں یا نہیں اور جلد ہی اُن کو اپنے ساتھ باقاعدہ حملہ کرنے کی دعوت دو۔ کفار کے سرداروں نے اس مشورہ کو صحیح سمجھتے ہوئے دوسرے دن یہود کو پیغام بھیجا کہ ہم ایک اجتماعی حملہ کرنا چاہتے ہیں تم بھی اپنی فوجوں سمیت کل حملہ کر دو۔ بنو قریظہ نے کہا کہ اوّل تو کل ہمارا سبت کا دن ہے اس لیے ہم اس دن لڑائی نہیں کر سکتے۔ دوسرے ہم مدینہ کے رہنے والے ہیں آپ لوگ باہر کے ہیں۔ اگر تم لوگ لڑائی چھوڑ کر چلے جاؤ تو ہمارا کیا بنیگا۔ اس لیے آپ لوگ ہمیں ستّر آدمی یرغمال کے طور پر دیں۔ تب ہم لڑائی میں شامل ہونگے۔ کفار کے دل میں چونکہ پہلے سے شبہ پیدا ہو چکا تھا اُنہوں نے اُن کے اس مطالبہ کو پورا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر تمہارا ہمارا ساتھ اتحاد سچّا تھا تو اس قسم کے مطالبہ کے کوئی معنے نہیں۔ اِس واقعہ سے اُدھر یہود کے دلوں میں شبہات پیدا ہونے لگے اُدھر کفار کے دلوں میں شبہات پیدا ہونے لگے اور جیسا کہ قاعدہ ہے جب شبہات دل میں پیدا ہو جاتے ہیں تو بہادری کی روح بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اِنہی شکوک و شبہات کو ساتھ لیے ہوئے کفار کا لشکر رات کو آرام کرنے کے لیے اپنے خیموں میں گیا، تو خدا تعالیٰ نے آسمانی نصرت کا ایک اور راستہ کھول دیا۔ رات کو ایک سخت آندھی چلی جس آندھی نے قناتوں کے پردے توڑ دیئے۔ چولھوں پر سے ہنڈیاں گرا دیں اور بعض قبائل کی آگیں بجھ گئیں۔ مشرکینِ عرب میں ایک رواج تھا کہ وہ ساری رات آگ جلائے رکھتے تھے اور اس کو وہ نیک شگون سمجھتے تھے۔ جس کی آگ بجھ جاتی تھی وہ خیال کرتا تھا کہ آج کا دن میرے لیے منحوس ہے اور وہ اپنے خیمے اُٹھا کر لڑائی کے میدان سے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ جن قبائل کی آگ بجھی اُنہوں نے اِس رواج کے مطابق اپنے خیمے اُٹھائے اور پیچھے کو چل پڑے تا کہ ایک دن

پیچھے انتظار کر کے پھر لشکر میں آ شامل ہوں لیکن چونکہ دن کے جھگڑوں کی وجہ سے سرداران لشکر کے دل میں شبہات پیدا ہو رہے تھے، جو قبائل پیچھے بیٹھے اُن کے ارد گرد کے قبائل نے سمجھا کہ شاید یہود نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر شبخون مار دیا ہے اور ہمارے آس پاس کے قبائل بھاگے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی جلدی جلدی اپنے ڈیرے سمیٹنے شروع کر دیئے۔ اور میدان سے بھاگنا شروع کیا۔ ابوسفیان اپنے خیمہ میں آرام سے لیٹا تھا کہ اس واقعہ کی خبر اُسے بھی پہنچی۔ وہ گھبرا کے اپنے بندھے ہوئے اُونٹ پر جا چڑھا اور اس کو ایڑیاں مارنی شروع کر دیں۔ آخر اُس کے دوستوں نے اس کو توجہ لائی کہ تُو یہ کیا حماقت کر رہا ہے۔ اس پر اُس کے اُونٹ کی رسّیاں کھولی گئیں اور وہ بھی اپنے ساتھیوں سمیت میدان سے بھاگ گیا۔

رات کے آخری ثلث میں وہ میدان جس میں بیس پچیس ہزار کے قریب کفار کے سپاہی خیمہ زن تھے وہ ایک جنگل کی طرح ویران ہو گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس وقت اللہ تعالیٰ نے الہام کے ذریعہ بتایا کہ تمہارے دشمن کو ہم نے بھگا دیا ہے۔ آپ نے حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے کسی شخص کو بھیجنا چاہا اور اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے صحابہؓ کو آواز دی۔ وہ سردی کے ایام تھے اور مسلمانوں کے پاس کپڑے بھی کافی نہ ہوتے تھے۔ سردی کے مارے زبانیں تک جمی جا رہی تھیں۔ بعض صحابہؓ کہتے ہیں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سُنی اور ہم جواب بھی دینا چاہتے تھے مگر ہم سے بولا نہیں گیا۔ صرف ایک حذیفہؓ تھے جنہوں نے کہا یا رسول اللہ کیا کام ہے۔ آپ نے فرمایا تم نہیں مجھے کوئی اور آدمی چاہیئے۔ پھر آپ نے فرمایا کوئی ہے مگر پھر بھی سردی کی شدت کی وجہ سے جو جاگ بھی رہے تھے وہ جواب نہ دے سکے۔ حذیفہؓ نے پھر کہا یا رسول اللہ میں موجود ہوں۔ آخر آپ نے حذیفہؓ کو یہ کہتے ہوئے بھجوایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ تمہارے دشمن کو ہم نے بھگا دیا ہے، جاؤ اور دیکھو کہ دشمن کا کیا حال ہے۔ حذیفہؓ خندق کے پاس گئے اور دیکھا کہ میدان کلّی طور پر دشمن کے سپاہیوں سے خالی تھا۔ واپس آئے اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کی اور بتایا کہ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ صبح مسلمان اپنے خیمے اکھیڑ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف آنے شروع ہوئے۔

بنو قریظہ کو اُن کی غدّاری کی سزا

بیس دنوں کے بعد مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اب بنو قریظہ کا معاملہ طے ہونے والا تھا۔ اُنکی غدّاری ایسی نہیں تھی کہ اُسکو نظر انداز کیا جاتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس آتے ہی اپنے صحابہؓ سے فرمایا گھروں میں آرام نہ کرو بلکہ شام سے پہلے پہلے بنو قریظہ کے قلعوں تک پہنچ جاؤ۔ اور پھر آپ نے حضرت علیؓ کو بنو قریظہ کے پاس بھجوایا کہ وہ اُن سے پوچھیں کہ انہوں نے معاہدہ کے خلاف یہ غدّاری کیوں کی۔ بجائے اسکے کہ بنو قریظہ شرمندہ ہوتے یا معافی مانگتے یا کوئی معذرت کرتے۔ اُنہوں نے حضرت علیؓ اور اُن کے ساتھیوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کی مستورات کو گالیاں دینی شروع کیں اور کہا ہم نہیں جانتے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کیا چیز ہیں۔ ہمارا اُن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں۔ حضرت علیؓ انکا یہ جواب لے کر واپس لوٹے تو اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ یہود کے قلعوں کی طرف جا رہے تھے چونکہ یہود بے نقط گالیاں دے رہے تھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں اور بیٹیوں کے متعلق بھی ناپاک کلمات بول رہے تھے

حضرت علیؓ نے یہ سمجھتے ہوئے کہ آپؐ کو اُن کلمات کے سننے سے تکلیف ہوگی، عرض کیا یارسول اللہ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں ہم لوگ اس لڑائی کے لیے کافی ہیں آپ واپس تشریف لے جائیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں سمجھتا ہوں کہ وہ گالیاں دے رہے ہیں اور تم یہ نہیں چاہتے کہ میرے کان میں وہ گالیاں پڑیں۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ بات تو یہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر کیا ہُوا اگر وہ گالیاں دیتے ہیں، موسیٰؑ نبی تو ان کا اپنا تھا اُس کو اس سے بھی زیادہ انہوں نے تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ یہ کہتے ہوئے آپ یہود کے قلعوں کی طرف چلے گئے۔ مگر یہود دروازے بند کر کے قلعہ بند ہو گئے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑائی شروع کر دی حتّٰی کہ انکی عورتیں بھی لڑائی میں شریک ہوئیں۔ چنانچہ قلعہ کی دیوار کے نیچے کچھ مسلمان بیٹھے تھے کہ ایک یہودی عورت نے اُوپر سے پتھر پھینک کر ایک مسلمان کو مار دیا۔ لیکن کچھ دن کے محاصرہ کے بعد یہود نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ لمبا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تب اُن کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خواہش کی کہ وہ ابولبابہ انصاری کو جو اُن کے دوست اور اَوس قبیلہ کے سردار تھے اُن کے پاس بھجوائیں۔ تا کہ وہ اُن سے مشورہ کر سکیں۔ آپ نے ابولبابہ کو بھجوا دیا۔ ان سے یہود نے یہ مشورہ پوچھا کہ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مطالبہ کو کہ فیصلہ میرے سپرد کرتے ہوئے تم ہتھیار پھینکدو، ہم یہ مان لیں؟۔ ابولبابہ نے مُنہ سے تو کہا ہاں! لیکن اپنے گلے پر اس طرح ہاتھ پھیرا جس طرح قتل کی علامت ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت تک اپنا کوئی فیصلہ ظاہر نہ کیا تھا مگر ابولبابہ اپنے دل میں یہ سمجھتے ہوئے کہ اُن کے اِس جرم کی سزا سوائے قتل کے اور کیا ہوگی بغیر سوچے سمجھے اشارہ کے ساتھ اُن کو ایک بات کہدی جو آخر اُن کی تباہی کا موجب ہوئی۔ چنانچہ یہود نے کہہ دیا کہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ مان لیتے تو دوسرے یہودی قبائل کی طرح اُن کو زیادہ سے زیادہ یہی سزا دی جاتی کہ اُن کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا جاتا، مگر اُن کی بدقسمتی تھی اُنہوں نے کہا ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ماننے کے لیے تیار نہیں، بلکہ ہم اپنے حلیف قبیلہ اَوس کے سردار سعد بن معاذؓ کا فیصلہ مانیں گے۔ جو فیصلہ وہ کرینگے ہمیں منظور ہوگا۔ لیکن اُس وقت یہود میں اختلاف ہو گیا۔ یہود میں سے بعض نے کہا کہ ہماری قوم نے غدّاری کی ہے اور مسلمانوں کے رویّہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا مذہب سچا ہے وہ لوگ اپنا مذہب ترک کر کے اسلام میں داخل ہو گئے۔ ایک شخص عمرو بن سعدی نے جو اس قوم کے سرداروں میں سے تھا اپنی قوم کو ملامت کی اور کہا تم نے غدّاری کی ہے کہ معاہدہ توڑا ہے اب یا مسلمان ہو جاؤ یا جزیہ پر راضی ہو جاؤ۔ یہود نے کہا نہ مسلمان ہونگے نہ جزیہ دینگے کہ اس سے قتل ہونا اچھا ہے۔ پھر اُن سے اُس نے کہا میں تم سے بَری ہوں اور یہ کہہ کر قلعہ سے نکل کر باہر چل دیا جب وہ قلعہ سے باہر نکل رہا تھا مسلمانوں کے ایک دستہ نے جس کے سردار محمد بن مسلمہؓ تھے اُسے دیکھ لیا اور اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اُس نے بتایا کہ میں فلاں ہوں اس پر محمد بن مسلمہؓ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ لَا تحرمنی اقالۃ عثرات الکرام۔ یعنی آپ سلامتی سے چلے جائیے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ الٰہی مجھے شریفوں کی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے نیک عمل سے کبھی محروم نہ کیجیو۔ یعنی یہ شخص چونکہ اپنے فعل پر اور اپنی قوم کے فعل پر پچھتاتا ہے تو ہمارا بھی اخلاقی فرض ہے کہ اُسے معاف کر دیں۔ اِس لیے میں نے اسے گرفتار نہیں کیا اور جانے دیا ہے۔ خدا تعالیٰ مجھے ہمیشہ ایسے ہی نیک کاموں کی توفیق بخشتا رہے۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہُوا تو آپ نے محمد بن مسلمہؓ کو سرزنش نہیں کی کہ کیوں اُس یہودی کو

چھوڑ دیا، بلکہ اُس کے فعل کو سراہا

بنو قریظہ کے اپنے مقرر کردہ حَکم سعدؓ کا فیصلہ تورات کے مطابق تھا

یہ اُوپر کے واقعات انفرادی تھے۔ بنو قریظہ بحیثیت قوم اپنی ضد پر قائم رہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ماننے سے انکار کرتے ہوئے سعدؓ کے فیصلہ پر اصرار کیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اُن کے اِس مطالبہ کو مان لیا۔ سعدؓ کو جو جنگ میں زخمی ہو چکے تھے اطلاع دی کہ تمہارا فیصلہ بنو قریظہ تسلیم کرتے ہیں آکر فیصلہ کرو۔ اِس تجویز کا اعلان ہوتے ہی اوس قبیلہ کے لوگ جو بنو قریظہ کے دیر سے حلیف چلے آئے تھے وہ سعدؓ کے پاس دوڑ کر گئے اور اُنہوں نے اصرار کرنا شروع کیا کہ چونکہ خزرج نے اپنے حلیف یہودیوں کو ہمیشہ سزا سے بچایا ہے آج تم بھی اپنے حلیف قبیلہ کے حق میں فیصلہ دینا۔

سعدؓ زخموں کی وجہ سے سواری پر سوار ہو کر بنو قریظہ کی طرف روانہ ہوئے اور ان کی قوم کے افراد اُن کے دائیں بائیں دوڑتے جاتے تھے اور سعدؓ سے اصرار کرتے جاتے تھے کہ دیکھنا بنو قریظہ کے خلاف فیصلہ نہ دینا۔ مگر سعدؓ نے صرف یہی جواب دیا کہ جس کے سپرد فیصلہ کیا جاتا ہے وہ امانتدار ہوتا ہے اُسے دیانت سے فیصلہ کرنا چاہیئے میں دیانت سے فیصلہ کرونگا جب سعدؓ یہود کے قلعہ کے پاس پہنچے جہاں ایکطرف بنو قریظہ قلعہ کی دیوار سے کھڑے سعدؓ کا انتظار کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمان بیٹھے تھے۔ تو سعدؓ نے پہلے اپنی قوم سے پوچھا کیا آپ لوگ وعدہ کرتے ہیں کہ جو میں فیصلہ کرونگا وہ آپ لوگ قبول کریں گے؟ اُنہوں نے کہا ہاں۔ پھر سعدؓ نے بنو قریظہ کو مخاطب کر کے کہا۔ کیا آپ لوگ وعدہ کرتے ہیں کہ جو فیصلہ میں کروں وہ آپ لوگ قبول کریں گے؟ اُنہوں نے کہا ہاں۔ پھر شرم سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے نیچی نگاہوں سے اس طرف اشارہ کیا جدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے اور کہا اِدھر بیٹھے ہوئے لوگ بھی یہ وعدہ کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں۔ اسکے بعد سعدؓ نے بائبل کے حکم کے مطابق فیصلہ سنایا۔ بائبل میں لکھا ہے:۔

"اور جب تُو کسی شہر کے پاس اُس کے لڑنے کے لیے آپہنچے تو پہلے اُس سے صلح کا پیغام کر۔ تب یُوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور اور دروازے تیرے لیے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری خراج گذار ہو گی۔ اور تیری خدمت کریگی۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تُو اُس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اُسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر۔ مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اُس شہر میں ہو اُس کا سارا لوٹ اپنے لیے لے۔ اور تو اپنے دشمنوں کی اُس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو۔ اسی طرح سے تو اُن سب شہروں سے جو تجھ سے بہت دُور ہیں اور ان قوموں کے شہروں میں سے نہیں ہیں۔ یہی حال کیجیو۔ لیکن اِن قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو۔ بلکہ تو اُن کو حرم کیجیو۔ حتّی اور اموری اور کنعانی اور فرزی اور حوی اور یبوسی کو جیسا کہ خداوند تیرے خدا نے تجھے حکم کیا ہے تاکہ وے اپنے سارے کریہہ کاموں کے مطابق جو اُنہوں نے اپنے معبودوں سے کیے تم کو عمل کرنا نہ سکھائیں اور کہ تم خداوند اپنے خدا کے گنہگار ہو جاؤ۔" (استثناء باب ۲۰ آیت ۱۰ تا ۱۸)

بائبل کے اِس فیصلہ سے ظاہر ہے کہ اگر یہودی جیت جاتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہار جاتے تو بائبل کے اس فیصلہ کے مطابق اوّل تو تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا جاتا۔ مرد بھی اور عورت بھی اور بچے بھی۔ اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے یہودیوں کا یہی ارادہ تھا کہ مردوں، عورتوں اور بچوں سب کو یکدم قتل کر دیا جائے۔ لیکن اگر وہ اُن سے بڑی سے بڑی رعایت کرتے تب بھی کتاب استثناء کے مذکورہ بالا فیصلہ کے مطابق وہ ان سے دُور کے ملکوں والی قوموں کا سا سلوک کرتے اور تمام مردوں کو قتل کر دیتے اور عورتوں اور لڑکوں اور سامانوں کو لُوٹ لیتے۔ سعدؓ نے جو بنو قریظہ کے حلیف تھے اور اُن کے دوستوں میں سے تھے جب دیکھا کہ یہود نے اسلامی شریعت کے مطابق جو یقیناً اُن کی جان کی حفاظت کرتی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا تو انہوں نے وہی فیصلہ یہود کے متعلق کیا جو موسیٰؑ نے استثناء میں پہلے سے ایسے مواقع کیلئے کر چھوڑا تھا۔ اور اس فیصلہ کی ذمہ واری محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر یا مسلمانوں پر نہیں، بلکہ موسیٰ پر اور تورات پر اور اُن یہودیوں پر ہے جنہوں نے غیر قوموں کے ساتھ ہزاروں سال اس طرح معاملہ کیا تھا۔ اور جن کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے رحم کے لیے بلایا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اور کہا ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں، ہم سعدؓ کی بات مانیں گے۔ جب سعدؓ نے موسیٰ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ دیا تو آج عیسائی دنیا شور مچاتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کیا۔ کیا عیسائی مصنّف اِس بات کو نہیں دیکھتے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی دوسرے موقعہ پر کیوں ظلم نہ کیا؟ سینکڑوں دفعہ دشمن نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے رحم پر اپنے آپ کو چھوڑا۔ اور ہر دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو معاف کر دیا۔ یہ ایک ہی موقع ہے کہ دشمن نے اصرار کیا کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو نہیں مانیں گے بلکہ فلاں دوسرے شخص کے فیصلہ کو مانیں گے اور اُس شخص نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اقرار لے لیا کہ جو میں فیصلہ کرونگا اُسے آپ مانیں گے۔ اس کے بعد اُس نے فیصلہ کیا بلکہ اُس نے فیصلہ نہیں کیا اُس نے موسیٰؑ کا فیصلہ دوہرا دیا جس کی اُمت میں سے ہونیکے یہود مدّعی تھے پس اگر کسی نے ظلم کیا تو یہود نے اپنی جانوں پر ظلم کیا جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اگر کسی نے ظلم کیا تو موسیٰؑ نے ظلم کیا جنہوں نے محصور دشمن کے متعلق تورات میں خدا سے حکم پا کر یہی تعلیم دی تھی۔ اگر یہ ظلم تھا تو ان عیسائی مصنّفوں کو چاہیئے کہ موسیٰ کو ظالم قرار دیں بلکہ موسیٰ کے خدا کو ظالم قرار دیں جس نے یہ تعلیم تورات میں دی ہے۔

احزاب کی جنگ کے خاتمہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آج سے مشرک ہم پر حملہ نہیں کرینگے اب اسلام خود جواب دے گا اور ان اقوام پر جنہوں نے ہم پر حملے کیے تھے اب ہم چڑھائی کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ احزاب کی جنگ میں بھلا کفار کا نقصان ہی کیا ہُوا تھا چند آدمی مارے گئے تھے وہ دوسرے سال پھر دوبارہ تیاری کر کے آسکتے تھے بیس ہزار کی جگہ وہ چالیس یا پچاس ہزار کا لشکر بھی لا سکتے تھے۔ بلکہ اگر وہ اور زیادہ انتظام کرتے تو لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر لانا بھی اُن کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ مگر اکیس۲۱ سال کی متواتر کوشش کے بعد کفار کے دلوں کو محسوس ہو گیا تھا کہ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔ اُن کے بُت جھوٹے ہیں اور دنیا کا پیدا کرنیوالا ایک ہی خدا ہے۔ اُن کے جسم صحیح سلامت تھے مگر اُنکے دل ٹوٹ چکے تھے بظاہر وہ اپنے بتوں کے آگے سجدہ کرتے ہوئے نظر آتے تھے مگر اُن کے دلوں میں سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔

مسلمانوں کے غلبہ کا آغاز

اِس جنگ سے فارغ ہونیکے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج سے کفار عرب ہم پر حملہ نہیں کرینگے یعنی مسلمانوں کا ابتلاء اپنی آخری انتہاء کو پہنچ گیا ہے اور اب اُن کے غلبہ کا زمانہ شروع ہونے والا ہے۔ اِس وقت تک جتنی جنگیں ہوئی تھیں وہ ساری کی ساری ایسی تھیں کہ یا تو کفار مدینہ پر چڑھ کے آئے تھے یا اُن کے حملوں کی تیاریوں کے روکنے کیلئے مسلمان مدینہ سے باہر نکلے تھے۔ لیکن کبھی مسلمانوں نے خود جنگ کو جاری رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ جنگی قوانین کے لحاظ سے جب ایک لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو اُس کا اختتام دو ہی طرح ہوتا ہے یا صلح ہو جاتی ہے یا ایک فریق ہتھیار ڈال دیتا ہے لیکن اسوقت تک ایک بھی موقعہ ایسا نہیں آیا جبکہ صلح ہوئی ہو یا کسی فریق نے ہتھیار ڈالے ہوں۔ پس گو پُرانے زمانہ کے دستور کے مطابق لڑائیوں میں وقفہ پڑ جاتا تھا لیکن جہاں تک جنگ کے جاری رہنے کا سوال تھا وہ متواتر جاری تھی اور ختم نہ ہوئی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کا حق تھا کہ وہ جب بھی چاہتے دشمن پر حملہ کر کے اُن کو مجبور کرتے کہ وہ ہتھیار ڈالیں لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ جب وقفہ پڑتا تھا تو مسلمان بھی خاموش ہو جاتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ممکن ہے کفار درمیان میں صلح کی طرح ڈالیں اور لڑائی بند ہو جائے۔ لیکن جب ایک لمبے عرصہ تک کفار کی طرف سے صلح کی تحریک نہ ہوئی اور نہ انہوں نے مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈالے بلکہ اپنی مخالفت اور جوش میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ تو اب وقت آ گیا کہ لڑائی کا دو ٹوک فیصلہ کیا جائے یا دونوں میں سے ایک فریق ہتھیار ڈال دے تاکہ ملک میں امن قائم ہو جائے۔ پس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے احزاب کی جنگ کے بعد فیصلہ کر لیا کہ اب ہم دونوں فیصلوں میں سے ایک فیصلہ کر کے چھوڑیں گے، یا تو ہماری اور کفار کی صلح ہو جائیگی یا ہم میں سے کوئی فریق ہتھیار ڈال دیگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہتھیار ڈال دینے کی صورت میں کفار ہی ہتھیار ڈال سکتے تھے کیونکہ اسلام کے غلبہ کے متعلق تو خدا تعالیٰ کی طرف سے خبر مل چکی تھی اور مکّی زندگی میں ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے غلبہ کا اعلان کر چکے تھے۔ باقی رہی صلح۔ صلح کے بارے میں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ صلح کی تحریک یا غالب کی طرف سے ہُوا کرتی ہے یا مغلوب کی طرف سے ہُوا کرتی ہے۔ مغلوب فریق جب صلح کی درخواست کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ ملک کا کچھ حصّہ یا اپنی آمدن کا کچھ حصّہ مستقل طور پر یا عارضی طور پر غالب فریق کو دیا کریگا یا بعض اور صورتوں میں اُس کی لگائی ہوئی قیود کو تسلیم کرے گا اور غالب فریق کی طرف سے جب صلح کی تجویز پیش ہوتی ہے تو اُسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم تمہیں بالکل کچلنا نہیں چاہتے۔ اگر تم بعض صورتوں میں ہماری اطاعت یا ہماری ماتحتی قبول کر لو تو ہم تمہاری آزادانہ حیثیت یا نیم آزادانہ حیثیت کو قائم رہنے دینگے۔ کفار مکّہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مقابلہ تھا اس میں بار بار کفار کو شکست ہوئی تھی۔ لیکن اس شکست کے محض اتنے معنے تھے کہ اُن کے حملے ناکام رہے تھے۔ حقیقی شکست وہ کہلاتی ہے جبکہ دفاع کی طاقت ٹوٹ جائے۔ حملہ ناکام ہونے کے معنے حقیقی شکست کے نہیں سمجھے جاتے۔ اِس کے معنے صرف اِتنے ہوتے ہیں کہ گو حملہ آور قوم کا حملہ ناکام رہا مگر پھر دوبارہ حملہ کر کے وہ اپنے مقصد کو پُورا کرلے گی۔ پس جنگی قانون کے لحاظ سے

مکّہ والے مغلوب نہیں ہوئے تھے، بلکہ اُن کی پوزیشن صرف یہ تھی کہ اب تک اُن کی جارحانہ کارروائیاں اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکی تھیں۔اس کے مقابلہ میں مسلمان جنگی لحاظ سے گو اُن کا دفاع نہیں ٹوٹا تھا مغلوب کہلانے کے مستحق تھے۔اس لیے کہ:

اوّل تو وہ بہت ہی چھوٹی اقلیّت میں تھے۔ دوم اُنہوں نے اس وقت تک کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کی تھی، یعنی کسی حملہ میں خود ابتداء نہیں کی تھی جس سے یہ سمجھا جائے کہ اب وہ اپنے آپ کو کفار کے اثر سے آزاد سمجھتے ہیں۔ان حالات میں مسلمانوں کی طرف سے صلح کی پیشکش کے صرف یہ معنے ہو سکتے تھے کہ وہ اب دفاع سے تنگ آگئے ہیں اور کچھ دے دلا کر اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر مسلمان صلح کی پیشکش کرتے تو اس کا نتیجہ نہایت ہی خطرناک ہوتا۔اور یہ امر اُن کی ہستی کے مٹا دینے کے مترادف ہوتا۔اپنی جارحانہ کارروائیوں میں ناکامی کی وجہ سے کفار عرب میں جو بے دلی پیدا ہو گئی تھی اس صلح کی پیشکش سے وہ فوراً ہی نئی اُمنگوں اور نئی آرزوؤں میں بدل جاتی اور یہ سمجھا جاتا کہ مسلمان باوجود مدینہ کو تباہی سے بچا لینے کے آخری کامیابی سے مایوس ہو چکے تھے۔پس صلح کی تحریک مسلمانوں کی طرف سے کسی صورت میں بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔اگر کوئی صلح کی تحریک کر سکتا تھا تو یا مکّہ والے کر سکتے تھے یا کوئی تیسری ثالث قوم کر سکتی تھی۔مگر عرب میں کوئی ثالث قوم باقی نہیں رہی تھی۔ایک طرف مدینہ تھا اور ایک طرف سارا عرب تھا۔پس عملی طور پر کفار ہی تھے جو اس تجویز کو پیش کر سکتے تھے۔مگر اُن کی طرف سے صلح کی کوئی تحریک نہیں ہو رہی تھی۔یہ حالات اگر سو سال تک بھی جاری رہتے تو قوانینِ جنگ کے ماتحت عرب کی خانہ جنگی جاری رہتی پس جبکہ مکّہ کے لوگوں کی طرف سے صلح کی تجویز پیش نہیں ہوئی تھی اور مدینہ کے لوگ کفار عرب کی ماتحتی ماننے کے لیے کسی صورت میں تیار نہیں تھے تو اب ایک ہی راستہ کھُلا رہ جاتا تھا کہ جب مدینہ نے عرب کے متحدہ حملہ کو بیکار کر دیا تو خود مدینہ کے لوگ باہر نکلیں اور کفار عرب کو مجبور کر دیں کہ یا وہ اُن کی ماتحتی قبول کر لیں یا اُن سے صلح کر لیں۔اور اسی راستہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔پس گو یہ راستہ بظاہر جنگ نظر آتا ہے لیکن درحقیقت صلح کے قیام کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ کھُلا نہ تھا۔اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے تو ممکن ہے جنگ سو سال تک لمبی چلی جاتی جیسا کہ ایسے ہی حالات میں پرانے زمانہ میں جنگیں سو سو سال تک جاری رہی ہیں۔خود عرب کی کئی جنگیں تیس تیس چالیس چالیس سال تک جاری رہی ہیں۔ان جنگوں کی طوالت کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جنگ کے ختم کرنے کے لیے کوئی ذریعہ اختیار نہیں کیا جاتا تھا اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں جنگ کے ختم کرنے کے دو ہی ذرائع ہوا کرتے ہیں۔یا ایسی جنگ لڑی جائے جو دو ٹوک فیصلہ کر دے اور دونوں فریق میں سے کسی ایک کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے اور یا باہمی صلح ہو جائے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیشک ایسا کر سکتے تھے کہ مدینہ میں بیٹھے رہتے اور خود حملہ نہ کرتے۔لیکن چونکہ کفار عرب جنگ کی طرح ڈال چکے تھے آپ کے خاموش بیٹھنے کے یہ معنے نہ ہوتے کہ جنگ ختم ہو گئی ہے بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہوتے کہ جنگ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھُلا رکھا گیا ہے۔کفار عرب جب چاہتے بغیر کسی اور محرک کے پیدا ہونے کے مدینہ پر حملہ کر دیتے اور اُس وقت کے دستور کے مطابق وہ حق پر سمجھے جاتے۔کیونکہ جنگ میں وقفہ پڑ جانا اُس زمانہ میں جنگ کے ختم ہو جانے کے مترادف نہیں سمجھا جاتا تھا۔بلکہ وقفہ بھی جنگ ہی میں شمار کیا جاتا تھا۔بعض لوگوں کے

دلوں میں اِس موقعہ پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا ایک سچے مذہب کے لیے لڑائی کرنا جائز ہے ؟

یہودیّت اور عیسائیت کی تعلیم دربارہ جنگ

مَیں اِس جگہ پر اِس سوال کا جواب بھی دے دینا ضروری سمجھتا ہوں، جہاں تک مذاہب کا سوال ہے لڑائی کے بارہ میں مختلف تعلیمیں ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم لڑائی کے بارہ میں اُوپر درج کر آیا ہوں۔ تورات کہتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ بزور کنعان میں گھس جائیں اور اُس جگہ کی قوموں کو شکست دیکر اس علاقہ میں اپنی قوم آباد کریں (استثناء باب ۲ آیت ۱۰-۱۸) مگر باوجود اس کے کہ موسیٰؑ نے یہ تعلیم دی اور باوجود اس کے کہ یوشعؑ، داؤدؑ اور دوسرے انبیاء نے اِس تعلیم پر متواتر عمل کیا، یہودی اور عیسائی اُن کو خدا کا نبی سمجھتے ہیں اور تورات کو خدا کی کتاب سمجھتے ہیں۔ موسوی سلسلہ کے آخر میں حضرت مسیحؑ ظاہر ہوئے اُن کی جنگ کے متعلق یہ تعلیم ہے کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے (متی باب ۵ آیت ۳۹) اس سے استنباط کرتے ہوئے عیسائی قوم یہ دعویٰ کرتی ہے کہ مسیحؑ نے لڑائی سے قوموں کو منع کیا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انجیل میں اس تعلیم کے خلاف اور تعلیمیں بھی آئی ہیں مثلاً انجیل میں لکھا ہے "یہ مت سمجھو کہ مَیں زمین پر صلح کروانے آیا ہوں، صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں" (متی باب ۱۰ آیت ۳۴) اسی طرح لکھا ہے "اُس نے اُنہیں کہا پر اب جس کے پاس بٹوا ہو لیوے اور اسی طرح جھولی بھی اور جس کے پاس تلوار نہیں اپنے کپڑے بیچ کر تلوار خریدے"۔ (لوقا باب ۲۲ آیت ۳۶) یہ آخری دو تعلیمیں پہلی تعلیم کے بالکل متضاد ہیں۔ اگر مسیحؑ جنگ کرانے کے لیے آیا تھا۔ تو پھر ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال پھیر دینے کے کیا معنے تھے ؟ پس یا تو یہ دونوں قسم کی تعلیمیں متضاد ہیں یا ان دونوں تعلیموں میں سے کسی ایک کو اس کے ظاہر سے پھرا کر اس کی کوئی تاویل کرنی پڑیگی مَیں اِس بحث میں نہیں پڑتا کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسری گال پھیر دینے کی تعلیم قابلِ عمل ہے یا نہیں۔ مَیں اِس جگہ پر صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اوّل عیسائی دنیا نے اپنی ساری تاریخ میں جنگ سے دریغ نہیں کیا جب عیسائیت شروع شروع میں روما میں غالب تھی تب بھی اُس نے غیر قوموں سے جنگیں کیں۔ دفاعی ہی نہیں بلکہ جارحانہ بھی۔ اور اب جبکہ عیسائیت دنیا میں غالب آگئی ہے اب بھی وہ جنگیں کرتی ہے۔ دفاعی ہی نہیں بلکہ جارحانہ بھی۔ صرف فرق یہ ہے کہ جنگ کرنے والوں میں سے جو فریق جیت جاتا ہے اُس کے متعلق کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ کرسچن سویلزیشن کا پابند تھا۔ کرسچن سویلزیشن اِس زمانہ میں صرف غالب اور فاتح کے طریق کا نام ہے ورنہ اس لفظ کے حقیقی معنے اب کوئی بھی باقی نہیں رہے۔ جب دو قومیں آپس میں لڑتی ہیں تو ہر قوم اس بات کی مدعی ہوتی ہے کہ وہ کرسچن سویلزیشن کی تائید کر رہی ہے اور جب کوئی قوم جیت جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس جیتی ہوئی قوم کا طریق کار کرسچن سویلزیشن ہے مگر بہرحال مسیح کے زمانہ سے آج تک عیسائی دنیا جنگ کرتی چلی آرہی ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ جنگ کرتی چلی جائیگی پس جہاں تک مسیحی دنیا کے فیصلہ کا تعلق ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "تم اپنے کپڑے بیچکر تلوار خریدو"۔ اور "مَیں صلح کرانے کے لیے نہیں بلکہ تلوار چلانے کے لیے آیا ہوں"۔ یہ اصل قانون ہے۔ اور "تو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا بھی پھیر دے"۔ یہ قانون یا تو ابتدائی عیسائی دنیا کی کمزوری کے وقت مصلحتاً اختیار کیا گیا تھا یا پھر عیسائی افراد کے باہمی تعلقات کی حد تک یہ قانون محدود ہے۔ حکومتوں اور قوموں پر یہ قانون چسپاں نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ مسیحؑ کی اصل تعلیم جنگ کی نہیں تھی بلکہ صلح ہی کی تھی۔ تب بھی اس تعلیم سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص اس تعلیم کے خلاف عمل

کرتا ہے وہ خدا کا برگزیدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عیسائی دنیا آج تک موسیٰؑ اور یوشعؑ اور داؤدؑ کو خدا کا برگزیدہ قرار دیتی ہے بلکہ خود عیسائیت کے زمانہ کے بعض قومی ہیرو جنہوں نے اپنی قوم کے لیے جان کو خطرہ میں ڈال کر دشمنوں سے جنگیں کی ہیں مختلف زمانہ کے پوپوں کے فتویٰ کے مطابق آج سینٹ کہلاتے ہیں۔

جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم

اسلام ان دونوں قسم کی تعلیموں کے درمیان درمیان تعلیم دیتا ہے یعنی نہ تو وہ موسیٰؑ کی طرح کہتا ہے کہ تُو جارحانہ طور پر کسی ملک میں گھس جا اور اس قوم کو تہ تیغ کر دے اور نہ وہ اس زمانہ کی بگڑی ہوئی مسیحیت کی طرح ببانگ بلند یہ کہتا ہے کہ ”اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُو اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے“۔ مگر اپنے ساتھیوں کے کان میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم اپنے کپڑے بیچکر بھی تلواریں خرید لو۔ بلکہ اسلام وہ تعلیم پیش کرتا ہے جو فطرت کے عین مطابق ہے اور جو امن اور صلح کے قیام کے لیے ایک ہی ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تُو کسی پر حملہ نہ کر لیکن اگر کوئی شخص تجھ پر حملہ کرے اور اس کا مقابلہ نہ کرنا فتنہ کے بڑھانے کا موجب نظر آئے اور راستی اور امن اس سے مٹتا ہو تب تُو اس کے حملہ کا جواب دے۔ یہی وہ تعلیم ہے جس سے دنیا میں امن اور صلح قائم ہو سکتی ہے۔ اس تعلیم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا۔ آپ مکّہ میں برابر تکلیفیں اُٹھاتے رہے، لیکن آپ نے لڑائی کی طرح نہ ڈالی جب مدینہ میں آپ ہجرت کر کے تشریف لے گئے اور دشمن نے وہاں بھی آپ کا پیچھا کیا تب خدا تعالیٰ نے آپکو حکم دیا کہ چونکہ دشمن جارحانہ کارروائی کر رہا ہے اور اسلام کو مٹانا چاہتا ہے اس لیے راستی اور صداقت کے قیام کے لیے آپ اس کا مقابلہ کریں۔ قرآن کریم میں جو متفرق احکام اس بارہ میں آئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيْزٌ ۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔ (سورۃ حج ع ۱۳) یعنی اس لیے کہ ان مسلمانوں پر ظلم کیا گیا اور ان مسلمانوں کو جن سے دشمن نے لڑائی شروع کر رکھی ہے، آج جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ ہاں ان مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی جاتی ہے جن کو اُن کے گھروں سے بغیر کسی جرم کے نکال دیا گیا۔ اُن کا صرف اتنا ہی جرم تھا (اگر یہ کوئی جرم ہے) کہ وہ یہ کہتے تھے کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اگر اللہ تعالےٰ بعض ظالم لوگوں کو دوسرے عادل لوگوں کے ذریعہ سے ظلم سے روکتا نہ رہے تو گرجے اور مناسٹریاں اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں خدا تعالیٰ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ظالموں کے ہاتھ سے تباہ ہو جائیں (پس دنیا میں مذہب کی آزادی قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ مظلوموں کو اور ایسی قوموں کو جن کے خلاف دشمن پہلے جنگ کا اعلان کر دیتا ہے جنگ کی اجازت دیتا ہے) اور یقیناً اللہ تعالیٰ انکی مدد کرتا ہے جو خدا تعالیٰ کے دین کی مدد کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یقیناً بڑی طاقت والا اور غالب ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اگر دنیا میں طاقت پکڑ جائیں تو خدا تعالیٰ کی

عبادتوں کو قائم کریں گے اور غریبوں کی خبرگیری کریں گے اور نیک و اعلیٰ اخلاق کی دنیا کو تعلیم دیں گے اور بُری باتوں سے دنیا کو روکیں گے۔ اور ہر جھگڑے کا انجام وہی ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔

اِن آیات میں جو مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دینے کے لیے نازل ہوئی ہیں بتایا گیا ہے کہ جنگ کی اجازت اسلامی تعلیم کی رُو سے اُسی صورت میں ہوتی ہے جب کوئی قوم دیر تک کسی دوسری قوم کے ظلموں کا تختۂ مشق بنی رہے اور ظالم قوم اس کے خلاف بلاوجہ جنگ کا اعلان کردے اور اس کے دین میں دخل اندازی کرے اور یہ کہ ایسی مظلوم قوم کا فرض ہوتا ہے کہ جب اُسے طاقت ملے تو وہ مذہبی آزادی دے اور اس بات کو ہمیشہ مدِّنظر رکھے کہ خدا تعالیٰ اُس کو غلبہ بخشے تو وہ تمام مذاہب کی حفاظت کرے اور اُن مقدّس جگہوں کے ادب اور احترام کا خیال رکھے اور اس غلبہ کو اپنی طاقت اور شوکت کا ذریعہ نہ بنائے۔ بلکہ غریبوں کی خبرگیری، ملک کی حالت کی درستی اور فساد اور شرارت کے مٹانے میں اپنی قوتیں صرف کرے۔ یہ کیسی مختصر اور جامع تعلیم ہے۔ اس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت کیوں دی گئی ہے۔ اور یہ کہ اگر اب وہ جنگ کریں گے تو وہ مجبوری کی وجہ سے ہوگی ورنہ جارحانہ جنگ اسلام میں منع ہے۔ اور پھر کس طرح شروع میں بھی یہ کہہ دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو غلبہ ضرور ملے گا۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اُن کو اپنے غلبہ کے ایام میں بجائے حکومت سے اپنی جیبیں بھرنے کے اور اپنی حالت سدھارنے کے غرباء کی خبرگیری اور امن کے قیام اور فساد کے دُور کرنے اور قوم اور ملک کو ترقی دینے کی کوشش کرنے کو اپنا مقصد بنانا چاہیئے۔

(۲) پھر فرماتا ہے:۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ (البقرہ ع ۲۴) یعنی اُن لوگوں سے جو تم سے جنگ کر رہے ہیں تم بھی محض اللہ کی خاطر جس میں تمہارے اپنے نفس کا غصہ اور نفس کی ملونی شامل نہ ہو جنگ کرو۔ اور یاد رکھو کہ جنگ میں بھی کوئی ظالمانہ فعل اختیار مت کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو بہر حال پسند نہیں کرتا۔ اور جہاں کہیں بھی تمہاری اور اُن کی جنگ کے ذریعہ سے مٹھ بھیڑ ہو جائے وہاں تم اُن سے جنگ کرو۔ اور یونہی اِکّا دُکّا ملنے والے پر حملہ مت کرو۔ اور چونکہ انہوں نے تمہیں لڑائی کے لیے نکلنے پر مجبور کیا ہے تم بھی اُنہیں اُن کے جواب میں لڑائی کا چیلنج دو اور یاد رکھو کہ قتل اور لڑائی کی نسبت دین کی وجہ سے کسی کو دُکھ میں ڈالنا زیادہ خطرناک گناہ ہے پس تم ایسا طریق مت اختیار کرو کیونکہ یہ بے دین لوگوں کا کام ہے۔ اور چاہیئے کہ تم مسجد حرام کے پاس اُن سے اُس وقت تک جنگ نہ کرو جب تک وہ جنگ کی ابتداء نہ کریں کیونکہ اس سے حج اور عمرہ کے راستہ میں رُوک پیدا ہوتی ہے۔ ہاں اگر وہ خود ایسی جنگ کی ابتداء کریں تو پھر تم مجبور ہو اور تمہیں جواب دینے کی اجازت ہے۔ جو لوگ عقل اور انصاف کے احکام کو رد کر دیتے ہیں اُن کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرنا پڑتا ہے لیکن اگر انہیں ہوش آجائے اور وہ اس بات سے رُک جائیں تو اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔ اِس لیے تم کو

بھی چاہیئے کہ ایسی صورت میں اپنے ہاتھوں کو روک لو اور اس خیال سے کہ یہ حملہ میں ابتداء کر چکے ہیں جوابی حملہ نہ کرو اور چونکہ وہ لڑائی شروع کر چکے ہیں تم بھی اس وقت تک لڑائی کو جاری رکھو جب تک کہ دین میں دخل اندازی کرنے کے طریق کو وہ نہ چھوڑیں اور تسلیم نہ کر لیں کہ دین کا معاملہ صرف اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس میں جبر کرنا کسی انسان کے لیے جائز نہیں اگر وہ یہ طریق اختیار کر لیں اور دین میں دخل اندازی سے باز آجائیں تو فوراً لڑائی بند کر دو۔ کیونکہ سزا صرف ظالموں کو دی جاتی ہے اور اگر وہ اس قسم کے ظلم سے باز آجائیں تو پھر اُن سے لڑائی کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔

اِن آیات میں بتایا گیا ہے کہ اوّل لڑائی صرف اللہ تعالےٰ کیلئے ہونی چاہیئے یعنی ذاتی لالچوں، ذاتی حرصوں، ملک کے فتح کرنے کی نیّت یا اپنے رسوخ کو بڑھانے کی نیّت سے لڑائی نہیں ہونی چاہیئے۔ دوم لڑائی صرف اسی سے جائز ہے جو پہلے حملہ کرتا ہے۔ سوم انہی سے تم کو جنگ کرنی جائز ہے جو تم سے لڑتے ہیں یعنی جو لوگ باقاعدہ سپاہی نہیں اور لڑائی میں عملاً حصّہ نہیں لیتے اُن کو مارنا یا اُن سے لڑائی کرنا جائز نہیں۔ چہارم باوجود دشمن کے حملہ میں ابتداء کرنے کے لڑائی کو اس حد تک محدود رکھنا چاہیئے جس حد تک دشمن نے محدود رکھا ہے اور اسے وسیع کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے نہ علاقہ کے لحاظ سے اور نہ ذرائع جنگ کے لحاظ سے۔ پنجم۔ جنگ صرف جنگی فوج کے ساتھ ہونی چاہیئے یہ نہیں کہ دشمن کے اِکّے دُکّے افراد کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ ششم۔ جنگ میں اس امر کو مدنظر رکھنا چاہیئے کہ مذہبی عبادتوں اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں روکیں پیدا نہ ہوں۔ اگر دشمن کسی ایسی جگہ پر جنگ کی طرح نہ ڈالے جہاں جنگ کرنے سے اُس کی مذہبی عبادتوں میں رخنہ ہوتا ہو تو مسلمانوں کو بھی اُس جگہ جنگ نہیں کرنی چاہیئے۔ ہفتم اگر دشمن خود مذہبی عبادتگاہوں کو لڑائی کا ذریعہ بنائے تو پھر مجبوری ہے ورنہ تم کو ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ عبادتگاہوں کے اردگرد بھی لڑائی نہیں ہونی چاہیئے۔ کجا یہ کہ عبادتگاہوں پر حملہ کیا جائے یا اُن کو مسمار کیا جائے یا اُن کو توڑا جائے ہاں اگر دشمن خود عبادتگاہوں کو لڑائی کا قلعہ بنالے تو پھر اُن کے نقصان کی ذمہ واری اُس پر ہے اس نقصان کی ذمہ واری مسلمانوں پر نہیں۔ ہشتم اگر دشمن مذہبی مقاموں میں لڑائی شروع کرنے کے بعد اُس کے خطرناک نتائج کو سمجھ جائے اور مذہبی مقام سے نکل کر دوسری جگہ کو میدانِ جنگ بنائے تو مسلمانوں کو اس بہانہ سے اُن کے مذہبی مقاموں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے کہ اس جگہ پر پہلے اُن کے دشمنوں نے لڑائی شروع کی تھی۔ بلکہ فوراً اُن مقامات کے ادب اور احترام کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے حملہ کا رُخ بھی بدل دینا چاہیئے۔ نہم لڑائی اُس وقت تک جاری رکھنی چاہیئے جب تک کہ مذہبی دست اندازی ختم ہو جائے اور دین کے معاملہ کو صرف ضمیر کا معاملہ قرار دیا جائے۔ سیاسی معاملوں کی طرح اس میں دخل اندازی نہ کی جائے۔ اگر دشمن اس بات کا اعلان کر دے اور اس پر عمل کرنا شروع کر دے تو خواہ وہ حملہ میں ابتداء کر چکا ہو اُس کے ساتھ لڑائی نہیں کرنی چاہیئے۔

(۳) فرماتا ہے:۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (انفال ع ۵)

یعنی اے محمد رسول اللہ! دشمن نے جنگیں شروع کیں اور تمہیں خدا تعالیٰ کے حکم سے اُن کا جواب دینا پڑا۔ مگر تُو اُن میں اعلان کر دے کہ اگر اب بھی وہ لڑائی سے باز آجائیں تو جو کچھ وہ پہلے کر چکے ہیں انہیں معاف کر دیا جائیگا۔ لیکن اگر وہ لڑائی سے باز نہ آئیں اور بار بار حملے کریں تو پہلے انبیاء کے دشمنوں کے انجام اُن کے سامنے ہیں انجام ان کا بھی وہی ہوگا۔ اور اے مسلمانو! تم اُس وقت تک جنگ کو جاری رکھو کہ مذہب کی خاطر دُکھ دینا مٹ جائے اور دین کو کلّی طور پر خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا ہے اور دین کے معاملہ میں دخل اندازی کرنا لوگ چھوڑ دیں۔ پھر اگر یہ لوگ ان باتوں سے باز آجائیں تو محض اس وجہ سے اُن سے جنگ نہ کرو کہ وہ ایک غلط دین کے پیرو ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کے عمل کو جانتا ہے وہ خود جیسا چاہیگا اُن سے معاملہ کریگا تمہیں اُن کے غلط دین کی وجہ سے اُن کے کاموں میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ اگر ہمارے اس صلح کے اعلان کے بعد بھی جو لوگ جنگ سے باز نہ آئیں اور لڑائی جاری رکھیں تو خوب سمجھ لو کہ باوجود اس کے کہ تم تھوڑے ہو تم ہی جیتو گے کیونکہ اللہ تمہارا ساتھی ہے اور خدا تعالیٰ سے بہتر ساتھی اور بہتر مددگار اور کون ہو سکتا ہے۔

یہ آیات قرآن مجید میں جنگِ بدر کے ذکر کے بعد آئی ہیں جو کفار عرب اور مسلمانوں کے درمیان سب سے پہلی باقاعدہ جنگ تھی۔ باوجود اس کے کہ کفار عرب نے بلا وجہ مسلمانوں پر حملہ کیا اور مدینہ کے ارد گرد فساد مچایا اور باوجود اس کے کہ مسلمان کامیاب ہوئے اور دشمن کے بڑے بڑے سردار مارے گئے قرآن کریم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہی اعلان کروایا ہے کہ اگر اب بھی تم لوگ باز آجاؤ تو ہم لڑائی کو جاری نہیں رکھیں گے۔ ہم تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ جبراً مذہب نہ بدلوائے جائیں اور دین کے معاملہ میں دخل نہ دیا جائے۔

(۴) فرماتا ہے:۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (انفال ع) یعنی اگر کسی وقت بھی کفار صلح کی طرف جھکیں تو تُو فوراً اُنکی بات مان لیجیو اور صلح کر لیجیو اور یہ وہم مت کیجیو کہ شاید وہ دھوکہ کر رہے ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکّل رکھیو۔ خدا تعالیٰ دعاؤں کو سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور اگر تیرا یہ خیال صحیح ہو کہ وہ دھوکہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ واقعہ میں تجھے دھوکہ دینے کا ارادہ بھی رکھتے ہوں تو بھی یاد رکھ کہ انکے دھوکا دینے سے کیا بنتا ہے۔ تجھے تو صرف اللہ کی مدد سے ہی کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ اسکی مدد تیرے لیے کافی ہے۔ گذشتہ زمانہ میں وہی اپنی براہِ راست مدد کے ذریعے اور مومنوں کی مدد کے ذریعہ تیرا ساتھ دیتا رہا ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب دشمن صلح کرنے پر آمادہ ہو تو مسلمانوں کو بہر حال اس سے صلح کر لینی چاہیئے۔ اگر صلح کے اصول کو وہ ظاہر میں تسلیم کرتا ہو تو صرف اِس بہانہ سے صلح کو ردّ نہیں کرنا چاہیئے کہ شاید دشمن کی نیّت بد ہو اور بعد میں طاقت پکڑ کے دوبارہ حملہ کرنا چاہتا ہو۔

اِن آیتوں میں درحقیقت صلح حدیبیہ کی پیشگوئی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب دشمن صلح کرنا چاہے گا۔ اُس وقت تم اس عذر سے کہ دشمن نے زیادتی کی ہے یا یہ کہ وہ بعد میں اس معاہدہ کو توڑ دینا چاہتا ہے صلح سے انکار نہ کرنا کیونکہ نیکی کا تقاضا بھی یہی ہے اور تمہارا فائدہ بھی اس میں ہے کہ تم صلح کی پیشکش کو تسلیم کرلو۔

(۵) فرماتا ہے:- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذَٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ○ (سورۃ نساء ع ۱۳) اے مومنو! جب تم خدا کی خاطر لڑائی کے لیے باہر نکلو تو اس بات کی اچھی طرح تحقیقات کر لیا کرو۔ کہ تمہارے دشمن پر حجت تمام ہو چکی ہے اور وہ بہر حال لڑائی پر آمادہ ہے اور اگر کوئی شخص یا جماعت تمہیں یہ کہے کہ میں تو صلح کرتا ہوں تو یہ مت کہو کہ تو دھوکہ دیتا ہے اور ہمیں امید نہیں کہ ہم تجھ سے امن میں رہینگے اگر تم ایسا کرو گے تو پھر تم خدا کی راہ میں لڑنے والے نہیں ہو گے بلکہ تم دنیا طلب قرار پاؤ گے۔ پس ایسا مت کرو کیونکہ جس طرح خدا کے پاس دین ہے اسی طرح خدا کے پاس دنیا کا بھی بہت سا سامان ہے۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی شخص کا مار دینا اصل مقصود نہیں۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ کل کو وہ ہدایت پا جائے۔ تم بھی تو پہلے دین اسلام سے باہر تھے پھر اللہ تعالیٰ نے احسان کر کے تمہیں اس دین کے اختیار کرنے کی توفیق دی۔ پس مارنے میں جلدی مت کیا کرو بلکہ حقیقتِ حال کی تحقیق کیا کرو۔ یاد رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب لڑائی شروع ہو جائے تب بھی اس بات کی اچھی طرح تحقیق کرنی چاہیئے کہ دشمن کا ارادہ جارحانہ لڑائی کا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ دشمن جارحانہ لڑائی کا ارادہ نہ کرتا ہو بلکہ وہ خود کسی خوف کے ماتحت فوجی تیاری کر رہا ہو۔ پس پہلے اچھی طرح تحقیقات کر لیا کرو کہ دشمن کا ارادہ جارحانہ جنگ کا تھا تب اُس کے سامنے مقابلہ کے لیے آؤ۔ اور اگر وہ یہ کہے کہ میرا ارادہ تو جنگ کرنے کا نہیں تھا میں تو صرف خوف کی وجہ سے تیاری کر رہا تھا تو تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ نہیں تمہاری جنگی تیاری بتاتی ہے کہ تم ہم پر حملہ کرنا چاہتے تھے ہم کس طرح سمجھیں کہ ہم تم سے مامون اور محفوظ ہیں۔ بلکہ اُس کی بات کو قبول کر لو اور یہ سمجھو کہ اگر پہلے اُس کا ایسا ارادہ بھی تھا تو ممکن ہے بعد میں اس میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہو۔ تم خود اس بات کے زندہ گواہ ہو کہ دلوں میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ تم پہلے اسلام کے دشمن تھے مگر اب تم اسلام کے سپاہی ہو۔

(۶) پھر دشمنوں سے عہد کے متعلق فرماتا ہے:- إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ○ (سورۃ توبہ ع) یعنی مشرکوں میں سے وہ جنہوں نے تم سے کوئی عہد کیا تھا اور پھر انہوں نے اُس عہد کو توڑا نہیں اور تمہارے خلاف دشمنوں کی مدد نہیں کی، عہد کی مدت تک تم بھی پابند ہو کہ معاہدہ کو قائم رکھو یہی تقویٰ کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔

(۷) ایسے دشمنوں کے متعلق جو برسرِ جنگ ہوں لیکن اُن میں سے کوئی شخص اسلام کی حقیقت معلوم کرنا چاہے فرماتا ہے:- وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ (سورۃ توبہ ع) یعنی اگر برسرِ جنگ مشرکوں میں سے کوئی شخص اس لیے پناہ مانگے کہ وہ تمہارے ملک میں آ کر اسلام کی تحقیقات کرنا چاہتا ہے تو اُس کو ضرور پناہ دو اتنے عرصہ تک کہ وہ اچھی طرح اسلام کی تحقیقات کر لے اور قرآن کریم کے مضامین سے واقف ہو جائے۔ پھر اس کو اپنی حفاظت میں اُس مقام تک پہنچا دو جہاں وہ جانا چاہتا ہے

اور جسے اپنے لیے امن کا مقام سمجھتا ہے۔

(۸) جنگی قیدیوں کے متعلق فرماتا ہے:۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (انفال ع۹) کسی نبی کی شان کے مطابق یہ بات نہیں کہ وہ اپنے دشمن کے قیدی بنالے۔ سوائے اس کے کہ باقاعدہ جنگ میں قیدی پکڑے جائیں یعنی یہ رواج جو اس زمانہ تک بلکہ اس کے بعد بھی صدیوں تک دنیا میں قائم رہا ہے کہ اپنے دشمن کے آدمیوں کو بغیر جنگ کے ہی پکڑ کر قید کر لینا جائز سمجھا جاتا تھا اُسے اسلام پسند نہیں کرتا۔ وہی لوگ جنگی قیدی کہلا سکتے ہیں جو میدان جنگ میں شامل ہوں اور لڑائی کے بعد قید کیے جائیں۔

(۹) پھر اُن قیدیوں کے متعلق فرماتا ہے:۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (سورۃ محمد ع۱) یعنی جب جنگی قیدی پکڑے جائیں تو یا تو احسان کر کے اُنہیں چھوڑ دو یا اُن کا بدلہ لے کے اُن کو آزاد کر دو۔

(۱۰) اگر کوئی قیدی ایسے ہوں جن کا بدلہ دینے والا کوئی نہ ہو یا اُن کے رشتہ دار اُن کے اموال پر قابض ہونے کے لیے یہ چاہتے ہوں کہ وہ قید ہی رہیں تو اچھا ہے تو اُن کے متعلق فرماتا ہے:۔ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ (سورۃ نور ع۴) یعنی تمہارے جنگی قیدیوں میں سے ایسے لوگ جن کو نہ تم احسان کر کے چھوڑ سکتے ہو اور نہ اُن کی قوم نے اُن کا فدیہ دے کر اُنہیں آزاد کروایا ہے۔ اگر وہ تم سے یہ مطالبہ کریں کہ ہمیں آزاد کر دیا جائے ہم اپنے پیشہ اور ہنر کے ذریعہ سے روپیہ کما کر اپنے حصّہ کا جرمانہ ادا کر دینگے۔ تو اگر وہ اس قابل ہیں کہ آزادانہ روزی کما سکیں تو تم ضرور اُنہیں آزاد کر دو۔ بلکہ اُن کی اس کوشش میں خود بھی حصّہ دار بنو اور خدا نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اُس میں سے کچھ روپیہ اُن کے آزاد کرنے میں صرف کر دو یعنی اُن کے حصّہ کا جو جنگی خرچ بنتا ہے یا اس میں سے کچھ مالک چھوڑ دے یا دوسرے مسلمان مل کر اُس قیدی کی مالی امداد کریں اور اُسے آزاد کرائیں۔

یہ وہ حالات ہیں جن میں اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے اور یہ وہ قواعد ہیں جن کے ماتحت اسلام جنگ کی اجازت دیتا تھا۔

چنانچہ قرآن کریم کی اِن آیات کی روشنی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مزید تعلیمات مسلمانوں کو دیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ کسی صورت میں مسلمانوں کو مُثلہ کرنے کی اجازت نہیں، یعنی مسلمانوں کو مقتولین جنگ کی ہتک کرنے یا اُن کے اعضاء کاٹنے کی اجازت نہیں ہے (مسلم)

۲۔ مسلمانوں کو کبھی جنگ میں دھوکہ بازی نہیں کرنی چاہیئے (مسلم)

۳۔ کسی بچّے کو نہیں مارنا چاہیئے اور نہ کسی عورت کو۔ (مسلم)

۴۔ پادریوں، پنڈتوں اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کو قتل نہیں کرنا چاہیئے (طحاوی)

۵۔ بڈھے کو نہیں مارنا چاہیئے، بچّے کو نہیں مارنا چاہیئے، عورت کو نہیں مارنا چاہیئے اور ہمیشہ صلح اور احسان کو مدِّ نظر رکھنا چاہیئے۔ (ابوداؤد)

۶۔ جب لڑائی کیلئے مسلمان جائیں تو اپنے دشمنوں کے ملک میں ڈر اور خوف پیدا نہ کریں اور عوام الناس پر سختی نہ کریں (مسلم)

۷ - جب لڑائی کے لیئے نکلیں تو ایسی جگہ پر پڑاؤ نہ ڈالیں کہ لوگوں کے لیئے تکلیف کا موجب ہو اور کوچ کے وقت ایسی طرز پر نہ چلیں کہ لوگوں کے لیئے رستہ چلنا مشکل ہو جائے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا سختی سے حکم دیا ہے کہ فرمایا جو شخص اِن احکام کے خلاف کریگا اُس کی لڑائی اُس کے نفس کے لیئے ہو گی خدا کے لیئے نہیں ہو گی۔ (ابو داؤد)

۸ - لڑائی میں دشمن کے مُنہ پر زخم نہ لگائیں (بخاری و مسلم)

۹ - لڑائی کے وقت کوشش کرنی چاہیئے کہ دشمن کو کم سے کم نقصان پہنچے۔ (ابو داؤد)

۱۰ - جو قیدی پکڑے جائیں اُن میں سے جو قریبی رشتہ دار ہوں اُن کو ایک دوسرے سے جدا نہ کیا جائے (ابو داؤد)

۱۱ - قیدیوں کے آرام کا اپنے آرام سے زیادہ خیال رکھا جائے (ترمذی ابواب السیر)

۱۲ - غیر ملکی سفیروں کا ادب اور احترام کیا جائے۔ وہ غلطی بھی کریں تو اُن سے چشم پوشی کی جائے (ابو داؤد کتاب الجہاد)

۱۳ - اگر کوئی شخص جنگی قیدی کے ساتھ سختی کر بیٹھے تو اس قیدی کو بلا معاوضہ آزاد کر دیا جائے۔

۱۴ - جس شخص کے پاس کوئی جنگی قیدی رکھا جائے وہ اُسے وہی کھلائے جو خود کھائے اور اُسے وہی پہنائے جو خود پہنے (بخاری)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہی احکام کی روشنی میں مزید یہ حکم جاری فرمایا کہ عمارتوں کو گراؤ مت اور پھلدار درختوں کو کاٹو مت (موطاء امام مالک)

اِن احکام سے پتہ لگ سکتا ہے کہ اسلام نے جنگ کے روکنے کیلئے کیسی تدابیر اختیار کی ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس عمدگی کے ساتھ اِن تعلیمات کو جامہ پہنایا اور مسلمانوں کو ان پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ نہ موسیٰ کی تعلیم اس زمانہ میں عدل کی تعلیم کہلا سکتی ہے نہ وہ اِس زمانہ میں قابلِ عمل ہے اور نہ مسیح کی تعلیم اس زمانہ میں قابلِ عمل کہلا سکتی ہے اور نہ کبھی عیسائی دنیا نے اِس پر عمل کیا ہے اسلام ہی کی تعلیم ہے جو قابلِ عمل ہے اور جس پر عمل کر کے دنیا میں امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔

بیشک اِس زمانہ میں مسٹر گاندھی نے دنیا کے سامنے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ جنگ کے وقت بھی جنگ نہیں کرنی چاہیئے لیکن جس تعلیم کو مسٹر گاندھی پیش کر رہے ہیں اُس پر دنیا میں کبھی عمل نہیں ہُوا کہ ہم اسکی بُرائی اور خوبی کا اندازہ کر سکیں۔ مسٹر گاندھی کی زندگی میں ہی کانگریس کو حکومت مل گئی ہے اور کانگریسی حکومت نے فوجوں کو ہٹایا نہیں بلکہ وہ یہ تجویزیں کر رہی ہے کہ آئی۔ این۔ اے کے وہ افسر جو برطانوی گورنمنٹ نے ہٹا دئے تھے اُنکو دوبارہ فوج میں ملازم رکھا جائے بلکہ کانگریسی حکومت کے ہندوستان میں قائم ہونیکے سات دن کے اندر وزیرستان کے علاقہ میں نہتے آدمیوں پر ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے بم گرائے گئے ہیں۔ خود گاندھی جی تشدد کرنیوالوں کی تائید میں اور انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ دینے کے حق میں گورنمنٹ پر ہمیشہ زور دیتے رہے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ گاندھی جی نہ اُنکے پیرو اس تعلیم پر عمل کر سکتے ہیں اور نہ کوئی ایسی معقول صورت دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ قوموں اور ملکوں کی جنگ میں اس تعلیم پر کس طرح کامیاب طور پر عمل کیا جا سکتا ہے بلکہ مُنہ سے اِس تعلیم کا وعظ کرتے ہوئے اُسکے خلاف عمل کرنا بتاتا ہے کہ اِس تعلیم پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ پس اِس وقت تک دنیا کا تجربہ ہے اور عقل جس حد تک انسان کی راہنمائی کرتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی طریقہ صحیح تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ اللّٰھم صلّ علیٰ محمدٍ وعلیٰ اٰلِ محمدٍ کما صلّیتَ علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰلِ ابراھیم اِنّکَ حمیدٌ مجید +

کفار کیطرف سے جنگِ خندق کے بعد مسلمانوں پر حملے

احزاب سے واپس لوٹنے کے بعد گو کفار کی ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں اور اُن کے حوصلے پست ہو گئے تھے، بلکن یہ احساس اُن کا باقی تھا کہ ہم اکثریت میں ہیں اور مسلمان تھوڑے ہیں اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ جہاں جہاں بھی ہو گا ہم مسلمانوں کو اِکّا دُکّا پکڑ کر مار سکیں گے اور اِس طرح اپنی ذلّت کا بدلہ لے سکیں گے۔ چنانچہ احزاب کی شکست کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مدینہ کے اردگرد کے قبائل نے مسلمانوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ فزارہ قوم کے کچھ سواروں نے مدینہ کے قریب چھاپہ مارا اور مسلمانوں کے اُونٹ جو وہاں چر رہے تھے اُن کے چرواہے کو قتل کیا اُس کی بیوی کو قید کر لیا اور اونٹوں سمیت بھاگ گئے۔ قیدی عورت تو کسی نہ کسی طرح بھاگ آئی لیکن اونٹوں کا ایک حصّہ لیکر بھاگ جانے میں دشمن کامیاب ہو گیا۔ اسکے ایک مہینہ بعد شمال کی طرف غطفان قبیلہ کے لوگوں نے مسلمانوں کے اونٹوں کے گلّوں کو لُوٹنے کی کوشش کی۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن مسلمہؓ کو دس سواروں سمیت حالات کے معلوم کرنے اور گلّوں کی حفاظت کرنے کیلئے بھجوایا۔ مگر دشمن نے موقعہ پا کر اُنہیں قتل کر دیا۔ محمد بن مسلمہ کو بھی وہ اپنی طرف سے قتل کر کے پھینک گئے تھے لیکن اصل میں وہ بیہوش تھے دشمن کے چلے جانے کے بعد وہ ہوش میں آئے اور مدینہ پہنچکر ان حالات کی اطلاع دی اور بتایا کہ میرے سب ساتھی مارے گئے اور صرف میں بچا ہوں۔ کچھ دنوں کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سفیر جو رومی حکومت کی طرف سے بھجوایا گیا تھا اُس پر جرہم قوم نے حملہ کیا اور اُسے لُوٹ لیا۔ اس کے ایک مہینہ بعد بنو فزارہ نے مسلمانوں کے ایک قافلہ پر حملہ کیا اور اسے لُوٹ لیا۔ غالباً یہ حملہ کسی مذہبی عداوت کیوجہ سے نہیں تھا۔ کیونکہ بنو فزارہ ڈاکوؤں کا ایک قبیلہ تھا جو ہر قوم کے آدمیوں کو لُوٹتے اور قتل کرتے رہتے تھے۔ اس زمانہ میں خیبر کے یہودی بھی جو جنگِ احزاب کا موجب ہوئے تھے اپنی شکست کا بدلہ لینے کیلئے اِدھر اُدھر کے قبائل کو بھڑکاتے رہے اور رومی حکومت کے سرحدی علاقوں کے افسروں اور قبائل کو بھی مسلمانوں کے خلاف جوش دلاتے رہے۔ غرض کفارِ عرب کو مدینہ پر حملہ کرنے کی تو ہمّت نہ رہی تھی لیکن وہ یہود کے ساتھ ملکر سارے عرب میں مسلمانوں کیلئے مصیبتوں اور لُوٹ مار کے سامان پیدا کر رہے تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی تک کفار کے ساتھ آخری لڑائی لڑنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور آپ اس انتظار میں تھے کہ اگر صلح کے ساتھ یہ خانہ جنگی ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔

پندرہ سَو صحابہؓ کے ساتھ آنحضرت صلعم کی مکّہ کو روانگی

اس عرصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رؤیا دیکھی جس کا قرآن کریم میں ان الفاظ میں ذکر آتا ہے:۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (سورہ فتح ع ۳) یعنی ضرور تم اللہ تعالےٰ کی مشیّت کے ماتحت مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے۔ تم میں سے بعضوں کے سر منڈے ہوئے ہونگے اور بعضوں کے بال کٹے ہوئے ہوں گے (حج کے وقت سر منڈانا اور بال کٹانا ضروری ہوتا ہے) تم کسی سے نہ ڈر رہے ہو گے۔ اللہ تعالیٰ جانتا

ہے جو تم نہیں جانتے۔ اِس وجہ سے اُس نے اِس خواب کے پُورا ہونے سے پہلے ایک اور فتح مقرر کردی ہے جو خواب والی فتح کا پیش خیمہ ہوگی۔ اس رؤیا میں درحقیقت صلح اور امن کے ساتھ مکّہ کو فتح کرنے کی خبر دی گئی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کی تعبیر یہی سمجھی کہ شاید ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خانہ کعبہ کا طواف کرنیکا حکم دیا گیا ہے۔ اور چونکہ اس غلط فہمی سے اِس قسم کی بنیاد پڑنے والی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اِس غلطی پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ نہ کیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے صحابہ میں اس بات کا اعلان کیا اور اُنہیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی تلقین کی۔ مگر فرمایا ہم صرف طواف کی نیت سے جا رہے ہیں کسی قسم کا مظاہرہ یا کوئی ایسی بات نہ کیجائے جو دشمن کی ناراضگی کا موجب ہو۔ چنانچہ آخر فروری ۶۲۸ء میں پندرہ سو زائرین کے ساتھ آپ مکّہ کی طرف رَوانہ ہوئے (ایک سال بعد کل پندرہ سو آدمیوں کا آپکے ساتھ جانا بتاتا ہے کہ اس سے ایک سال پہلے جنگِ احزاب کے موقعہ پر اس تعداد سے کم ہی سپاہی ہونگے۔ کیونکہ ایک سال میں مسلمان بڑھے تھے گھٹے نہ تھے پس جنگِ احزاب میں لڑنے والوں کی تعداد جن مؤرخوں نے تین ہزار لکھی ہے یہ غلطی کی ہے۔ درست یہی ہے کہ اُس وقت بارہ سو سپاہی تھے) حج کے قافلہ کے آگے بیس سوار کچھ فاصلہ پر اس لیے چلتے تھے تاکہ اگر دشمن مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہے تو اُن کو وقت پر اطلاع مل جائے جب مکّہ والوں کو آپکے اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو باوجود اس کے کہ اُن کا اپنا مذہب بھی یہی تھا کہ طواف کعبہ میں کسی کے لیے روک نہیں ڈالنی چاہیئے اور باوجود اسکے کہ مسلمانوں نے وضاحت سے اعلان کردیا تھا کہ وہ صرف اور صرف طواف کعبہ کے لیے جا رہے ہیں کسی قسم کی مخالفت یا جھگڑنے کے لیے نہیں جا رہے مکّہ والوں نے مکّہ کو ایک قلعہ کی صورت میں تبدیل کردیا۔ اور ارد گرد کے قبائل کو بھی اپنی مدد کے لیے بلوایا۔ جب آپ مکّہ کے قریب پہنچے تو آپ کو یہ اطلاع ملی کہ قریش نے چیتوں کی کھالیں پہن لی ہیں اور اپنی بیویوں اور بچّوں کو ساتھ لے لیا ہے اور یہ قسمیں کھائی ہیں کہ وہ آپ کو گذرنے نہیں دینگے۔ یہ عرب کا رواج تھا کہ جب قوم موت کا فیصلہ کرلیتی تھی تو اُس کے سردار چیتے کی کھالیں پہن لیتے تھے جس کے معنے یہ ہوتے تھے کہ اب عقل کا وقت نہیں رہا۔ اب دلیری اور جرأت سے ہم جان دے دیں گے۔ اس اطلاع کے ملنے کے تھوڑی دیر بعد ہی مکّہ کی فوج کا ہراول دستہ مسلمانوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اب اِس مقام سے صرف اِسی صورت میں آگے بڑھا جا سکتا تھا کہ تلوار کے زور سے دشمن کو زیر کیا جاتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ فیصلہ کرکے آئے تھے کہ بہرحال ہم نہیں لڑیں گے۔ آپ نے ایک ہوشیار راہبر جو جنگل کے راستوں سے واقف تھا اُسے اِس بات پر مقرر کیا کہ وہ جنگل کے اندر سے مسلمان زائرین کو لے کر مکّہ تک پہنچا دے۔ یہ راہبر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو لیکر حدیبیہ کے مقام پر جو مکّہ کے قریب تھا جا پہنچا۔ یہاں آپ کی اُونٹنی کھڑی ہوگئی اور اُس نے آگے چلنے سے انکار کردیا۔ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ کی اُونٹنی تھک گئی ہے۔ آپ اس کی جگہ دوسری اونٹنی پر بیٹھ جائیں۔ مگر آپ نے فرمایا نہیں نہیں یہ تھکی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا منشاء یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں ٹھہر جائیں۔ اور یہیں ٹھہر کر مکّہ والوں سے درخواست کرونگا کہ وہ ہمیں حج کی اجازت دیدیں۔ اور خواہ کوئی شرط بھی وہ کریں مَیں اُسے منظور کروں گا۔ اُس وقت تک مکّہ کی فوج مکّہ سے دُور فاصلہ پر کھڑی تھی اور مسلمانوں کا انتظار کر رہی تھی۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو بغیر مقابلہ کے ملک میں داخل ہو سکتے تھے۔ لیکن چونکہ

آپ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ پہلے آپ یہی کوشش کریں گے کہ ملک والوں کی اجازت کے ساتھ طواف کریں اور اُسی صورت میں مقابلہ کریں گے کہ مکّہ والے خود لڑائی شروع کر کے لڑنے پر مجبور کریں۔ اِس لیے باوجود مکّہ کی سڑک کے کُھلا ہونیکے آپؐ نے حدیبیہ پر ڈیرہ ڈال دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر کہ آپ حدیبیہ پر ڈیرے ڈالے پڑے ہیں مکّہ کے لشکر کو بھی جا پہنچی اور اُس نے جلدی سے پیچھے ہٹ کر مکّہ کے قریب صفیں بنا لیں۔ سب سے پہلے بدیل نامی ایک سردار آپ سے بات کرنے کے لیے بھیجا گیا جب وہ آپکی خدمت میں حاضر ہُوا تو آپ نے فرمایا میں تو صرف طواف کرنے کے لیے آیا ہوں۔ ہاں مکّہ والے اگر ہمیں مجبور کریں تو ہمیں لڑنا پڑیگا۔ اِس کے بعد مکّہ کے کمانڈر ابوسفیان کا داماد عُروہ آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور اس نے نہایت گستاخانہ طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا کہ یہ اوباشوں کا گروہ آپ اپنے ساتھ لیکر آئے ہیں مکّہ والے اِنہیں کسی صورت میں بھی اپنے شہر میں داخل ہونے نہیں دینگے۔ اِسی طرح یکے بعد دیگرے پیغامبر آتے رہے۔ آخر مکّہ والوں نے کہلا بھیجا کہ خواہ کچھ ہو جائے اِس سال تو ہم آپکو طواف نہیں کرنے دینگے کیونکہ اس میں ہماری ہتک ہے۔ ہاں اگر آپ اگلے سال آئیں تو ہم آپ کو اجازت دے دیں گے۔ بعض اردگرد کے قبائل کے لوگوں نے مکّہ والوں سے اصرار کیا کہ یہ لوگ صرف طواف کے لیے آئے ہیں آپ ان کو کیوں روکتے ہیں۔ مگر مکّہ کے لوگ اپنی ضد پر قائم رہے۔ اس پر بیرونی قبائل کے لوگوں نے مکّہ والوں سے کہا کہ آپ لوگوں کا یہ طریق بتاتا ہے کہ آپ کو شرارت مدِّنظر ہے صلح مدِّنظر نہیں۔ اِس لیے ہم لوگ آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ اِس پر مکّہ کے لوگ ڈر گئے اور اُنہوں نے اِس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کی کوشش کریں گے۔ جب اِس امر کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے حضرت عثمانؓ کو جو بعد میں آپؐ کے تیسرے خلیفہ ہوئے مکّہ والوں سے بات چیت کرنے کے لیے بھیجا۔ جب حضرت عثمانؓ مکّہ پہنچے تو چونکہ مکّہ میں اُن کی بڑی وسیع رشتہ داری تھی اُن کے رشتہ دار اُن کے گرد اکٹھے ہو گئے اور اُن سے کہا کہ آپ طواف کر لیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگلے سال آکر طواف کریں۔ مگر عثمانؓ نے کہا میں آپ اپنے آقا کے بغیر طواف نہیں کر سکتا۔ چونکہ رؤساء مکّہ سے آپکی گفتگو لمبی ہو گئی۔ مکّہ میں بعض نے شرارت سے یہ خبر پھیلا دی کہ عثمانؓ کو قتل کر دیا گیا ہے اور یہ خبر پھیلتے پھیلتے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک بھی جا پہنچی۔ اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جمع کیا اور فرمایا سفیر کی جان ہر قوم میں محفوظ ہوتی ہے۔ تم نے سُنا ہے کہ عثمانؓ کو مکّہ والوں نے مار دیا ہے۔ اگر یہ خبر درست نکلی تو ہم بزور مکّہ میں داخل ہونگے (یعنی ہمارا پہلا ارادہ کہ صلح کے ساتھ مکّہ میں داخل ہونگے جن حالات کے ماتحت تھا وہ چونکہ تبدیل ہو جائیں گے اس لیے ہم اس ارادہ کے پابند نہ رہیں گے) جو لوگ یہ عہد کرنے کے لیے تیار ہوں کہ اگر ہمیں آگے بڑھنا پڑا تو یا ہم فتح کر کے لوٹیں گے یا ایک ایک کر کے میدان میں مارے جائینگے وہ اس عہد پر میری بیعت کریں۔ آپ کا یہ اعلان کرنا تھا کہ پندرہ سو زائر جو آپ کے ساتھ آیا تھا یکدم پندرہ سو سپاہی کی شکل میں بدل گیا اور دیوانہ وار ایک دوسرے پر پھاندتے ہوئے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر دوسروں سے پہلے بیعت کرنے کی کوشش کی۔ یہ بیعت تمام اسلامی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور درخت کا عہد نامہ کہلاتی ہے کیونکہ جس وقت یہ بیعت لی گئی اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے جب تک اِس بیعت میں شامل ہونے والا آخری آدمی بھی دنیا میں زندہ رہا وہ فخر سے اس بیعت کا ذکر کیا کرتا تھا۔ کیونکہ پندرہ سو آدمیوں میں سے ایک شخص نے بھی اِس عہد کے کرنے سے دریغ نہ کیا۔ کہ اگر دشمن نے اسلامی سفیر کو مار دیا ہے تو آج دو صورتوں میں سے ایک ضرور پیدا کر کے چھوڑیں گے یا وہ شام سے پہلے پہلے مکّہ کو فتح کر کے چھوڑینگے یا شام سے پہلے پہلے میدانِ جنگ میں مارے جائیں گے، لیکن ابھی بیعت سے مسلمان فارغ ہی ہوئے تھے کہ حضرت عثمان رضؓ واپس آگئے اور انہوں نے بتایا کہ مکّہ والے اِس سال تو عمرہ کی اجازت نہیں دے سکتے مگر آئندہ سال اجازت دینے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ اس بارہ میں معاہدہ کرنے کے لیے اُنہوں نے اپنے نمائندے مقرر کر دیئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے آنے کے تھوڑی دیر بعد مکّہ کا ایک رئیس سہیل نامی معاہدہ کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور یہ معاہدہ لکھا گیا۔

شرائط صلح حدیبیہ

”خدا کے نام پر یہ شرائط صلح محمد ابن عبداللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اور سہیل ابن عمرو (قائم مقام حکومتِ مکّہ کے درمیان طے پائی ہیں۔ جنگ دس سال کے لیے بند کی جاتی ہے۔ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ملنا چاہیے یا اُن کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہے، وہ ایسا کرسکتا ہے اور جو شخص قریش کے ساتھ ملنا چاہے یا معاہدہ کرنا چاہے وہ بھی ایسا کرسکتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا جس کا باپ زندہ ہو یا ابھی چھوٹی عمر کا ہو وہ اپنے باپ یا متوّلی کی مرضی کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جائے تو اُس کے باپ یا متوّلی کے پاس واپس کر دیا جائیگا لیکن اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں میں سے کوئی قریش کیطرف جائے تو اُسے واپس نہیں کیا جائیگا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سال مکّہ میں داخل ہوئے بغیر واپس چلے جائینگے لیکن اگلے سال محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور انکے ساتھی مکّہ میں آسکتے ہیں اور تین دن وہاں ٹھہر کر کعبہ کا طواف کرسکتے ہیں اس عرصہ میں قریش شہر سے باہر پہاڑی پر چلے جائیں گے لیکن یہ شرط ہوگی کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کے ساتھی مکہ میں داخل ہوں تو اُن کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو سوائے اُس ہتھیار کے جو ہر مسافر اپنے پاس رکھتا ہے یعنی نیام میں ڈالی ہوئی تلوار۔“

اِس معاہدہ کے وقت دو عجیب باتیں ہوئیں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے شرائط طے کرنے کے بعد معاہدہ لکھوانا شروع کیا تو آپ نے فرمایا ”خدا کے نام سے جو بے انتہاء کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنے والا ہے“ سہیل نے اس پر اعتراض کیا اور کہا خدا کو تو ہم جانتے ہیں لیکن یہ ”بے انتہاء کرم کرنے والا اور بار بار رحم کرنیوالا“ ہم نہیں جانتے کون ہے۔ یہ معاہدہ ہمارے اور آپ کے درمیان ہے اور اس میں دونوں کے مذاہب کا احترام ضروری ہے۔ اس پر آپ نے اُسکی بات کو قبول کر لیا اور صرف اتنا ہی لکھوایا کہ ”خدا کے نام پر ہم یہ معاہدہ کرتے ہیں“۔ پھر آپنے یہ لکھوایا کہ یہ شرائط صلح مکّہ والوں اور محمد رسول اللہ کے درمیان ہیں۔ اس پر پھر سہیل نے اعتراض کیا اور کہا کہ اگر ہم آپ کو خدا کا رسول مانتے تو آپ کے ساتھ لڑتے کیوں۔ آپ نے اُس کے اس اعتراض کو بھی قبول کر لیا اور بجائے محمدؐ اور رسول کے ”محمدؐ بن عبداللہ“ لکھوایا۔ چونکہ آپ مکہ والوں کی ہر بات مانتے چلے جاتے تھے، صحابہ رضؓ کے دل میں بے انتہاء رنج اور افسوس پیدا ہُوا اور غصہ سے اُن کا خون کھولنے لگا یہان تک کہ حضرت عمر رضؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ! کیا ہم سچے نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں! پھر انہوں نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کو خدا نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم خانہ کعبہ کا طواف کرینگے؟ آپ نے فرمایا ہاں! اس پر حضرت عمرؓ نے کہا پھر آپ نے یہ معاہدہ آج کیوں کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عمر! خدا تعالیٰ نے مجھے یہ تو فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف امن سے کرینگے مگر یہ تو نہیں فرمایا تھا کہ ہم اسی سال کرینگے یہ تو میرا اپنا اجتہاد تھا۔ اسی طرح بعض دوسرے صحابہؓ نے یہ اعتراض کیا کہ یہ کیوں اقرار کر لیا گیا ہے کہ اگر مکہ کے لوگوں میں سے کوئی نوجوان مسلمان ہُوا تو اُسکے باپ یا ولی کی طرف واپس کر دیا جائیگا لیکن جو مسلمان مکہ والوں کی طرف جائیگا اُسے مکہ والے واپس کرنے پر مجبور نہ ہونگے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں کونسے حرج کی بات ہے ہر شخص جو مسلمان ہوتا ہے وہ اسلام کو سچا سمجھ کر مسلمان ہوتا ہے رسمی اور رواجی طور پر مسلمان نہیں ہوتا۔ ایسا شخص جہاں بھی رہیگا وہ اسلام کی تبلیغ کریگا اور اسلام کی اشاعت کا موجب ہوگا لیکن جو شخص اسلام سے مرتد ہوتا ہے ہم نے اُسے اپنے اندر رکھ کر کرنا کیا ہے۔ جو شخص ہمارے مذہب کو جھوٹا سمجھ بیٹھا ہے وہ ہمارے لیے کس فائدہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ آپؐ کا یہ جواب اُن غلطی خوردہ مسلمانوں کا بھی جواب ہے، جو کہتے ہیں کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ اگر اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر اصرار کرتے کہ ہر مرتد واپس کیا جائے تاکہ اُسکو اُس کے جرم کی سزا دیجائے۔ جس وقت یہ معاہدہ لکھ کر ختم ہُوا اور اس پر دستخط کر دئے گئے اُسی وقت اللہ تعالیٰ نے اس معاہدہ کی صحت کے پرکھنے کا سامان پیدا کر دیا۔ سہیل جو مکہ والوں کی طرف سے معاہدہ کر رہا تھا اس کا اپنا بیٹا رسیوں سے جکڑا ہُوا اور زخموں سے چُور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر گرا اور کہا یا رسول اللہ! میں دل سے مسلمان ہوں اور اسلام کیوجہ سے میرا باپ مجھے یہ تکلیفیں دے رہا ہے۔ میرا باپ یہاں آیا تو میں موقع پا کر آپکے پاس پہنچا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی جواب نہ دیا تھا کہ اُسکے باپ نے کہا معاہدہ ہو چکا ہے اور اس نوجوان کو واپس میرے ساتھ جانا ہوگا۔ ابو جندل کی حالت اُسوقت مسلمانوں کے سامنے تھی وہ اپنے ایک بھائی کو جو اپنے باپ کے ہاتھوں سے اِسقدر ظلم برداشت کر رہا تھا واپس جاتا دیکھ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے تلواریں میانوں سے نکال لیں اور اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ وہ مر جائیں گے مگر اپنے بھائی کو اس تکلیف کے مقام پر پھر جانے نہیں دیں گے۔ خود ابو جندل نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ میری حالت کو دیکھتے ہیں کیا آپ اس بات کو گوارا کرینگے کہ پھر مجھے اِن ظالموں کے سپرد کر دیں تاکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ مجھ پر ظلم توڑیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کے رسول معاہدے نہیں توڑا کرتے۔ ابو جندل! ہم معاہدہ کر چکے ہیں۔ تم اب صبر سے کام لو اور خدا پر توکل کرو، وہ تمہارے لیے اور تمہارے جیسے اور نوجوانوں کیلئے خود ہی بچنے کی کوئی راہ پیدا کر دیگا۔ اس معاہدے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ تشریف لے گئے۔ جب آپ مدینہ پہنچے تو مکہ کا ایک اور نوجوان ابونصیرؓ آپ کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہُوا مدینہ پہنچا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے بھی معاہدہ کے مطابق واپس جانے پر مجبور کیا مگر راستہ میں اُس کی اپنے پکڑنے والوں سے لڑائی ہو گئی اور اپنے ایک محافظ کو قتل کر کے وہ بھاگ گیا۔ مکہ والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر شکایت کی تو آپ نے فرمایا ہم نے تمہارا آدمی تمہارے حوالے کر دیا تھا ہم اس بات کے ذمہ وار نہیں کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو ہم اُس کو

پکڑ کر دوبارہ تمہارے سپرد کر دیں۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد ایک عورت بھاگ کر مدینہ پہنچی۔ اس کے رشتہ داروں نے مدینہ پہنچ کر اُسے واپس بھجوانے کا مطالبہ کیا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معاہدہ میں مردوں کی شرط ہے عورتوں کی شرط نہیں اس لیے ہم عورت کو واپس نہیں کریں گے۔

بادشاہوں کے نام خطوط

مدینہ تشریف لے آنے کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ کیا کہ آپ اپنی تبلیغ کو دنیا کے کناروں تک پہنچائیں جب آپ نے اپنے اِس ارادہ کا صحابہؓ سے ذکر کیا، تو بعض صحابہ نے جو بادشاہی درباروں سے واقف تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! بادشاہ بغیر مُہر کے خط نہیں لیتے۔ اِس پر آپ نے ایک مُہر بنوائی جس پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ کُھدوائے اور اللہ تعالیٰ کے ادب کے طور پر آپ نے سب سے اوپر "اللہ" کا لفظ لکھوایا۔ نیچے "رسول" کا اور پھر نیچے "محمد" کا۔

محرم ۶۲۸ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خط لے کر مختلف صحابہ مختلف ممالک کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک خط قیصر روما کے نام تھا اور ایک خط ایران کے بادشاہ کی طرف تھا۔ ایک خط مصر کے بادشاہ کی طرف تھا جو قیصر کے ماتحت تھا۔ ایک خط نجاشی کی طرف تھا جو حبشہ کا بادشاہ تھا۔ اسی طرح بعض اور بادشاہوں کی طرف آپ نے خطوط لکھے۔

قیصر روم ہرقل کے نام خط

قیصر روما کا خط دحیہ کلبیؓ صحابی کے ہاتھ بھیجا گیا۔ اور آپ نے اُسے ہدایت کی تھی کہ پہلے وہ بصرہ کے گورنر کے پاس جائے جو نسلاً عرب تھا۔ اور اس کی معرفت قیصر کو خط پہنچائے۔ جب دحیہ کلبیؓ گورنر بصرہ کے پاس خط لیکر پہنچے تو اتفاقاً انہی دنوں قیصر شام کے دَورہ پر آیا ہُوا تھا۔ چنانچہ گورنر بصرہ نے دحیہؓ کو اُس کے پاس بھجوا دیا۔ جب دحیہ گورنر بصرہ کی معرفت قیصر کے پاس پہنچے تو دربار کے افسروں نے اُن سے کہا کہ قیصر کی خدمت میں حاضر ہونیوالے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ قیصر کو سجدہ کرے۔ دحیہؓ نے انکار کیا اور کہا کہ ہم مسلمان کسی انسان کو سجدہ نہیں کرتے۔ چنانچہ بغیر سجدہ کرنے کے آپ اُس کے سامنے گئے اور خط پیش کیا۔ بادشاہ نے ترجمان سے خط پڑھوایا اور پھر حکم دیا کہ کوئی عرب کا قافلہ آیا ہو تو اُن لوگوں کو پیش کرو۔ تاکہ میں اس شخص کے حالات اُن سے دریافت کروں۔ اتفاقاً ابو سفیان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ اُس وقت وہاں آیا ہُوا تھا۔ دربار کے افسر ابو سفیان کو بادشاہ کی خدمت میں لے گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ابو سفیان کو سب سے آگے کھڑا کیا جائے اور اُس کے ساتھیوں کو اُس کے پیچھے کھڑا کیا جائے اور ہدایت کی کہ اگر ابو سفیان کسی بات میں جھوٹ بولے تو اس کے ساتھی اس کی فوراً تردید کریں۔ پھر اس نے ابو سفیان سے سوال کیا۔ کہ

سوال: یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور جس کا خط میرے پاس آیا ہے کیا تم اُسکو جانتے ہو اسکا خاندان کیسا ہے؟

جواب: ابو سفیان نے کہا۔ وہ اچھے خاندان کا ہے اور میرے رشتہ داروں میں سے ہے۔

سوال : پھر اُس نے پوچھا۔ کیا ایسا دعویٰ عرب میں پہلے بھی کسی شخص نے کیا ہے؟

جواب : تو ابوسفیان نے جواب دیا۔ نہیں۔

سوال : پھر اُس نے پوچھا۔ کیا تم دعویٰ سے پہلے اُس پر جھوٹ کا الزام لگایا کرتے تھے؟

جواب : ابوسفیان نے کہا۔ نہیں۔

سوال : پھر اُس نے پوچھا۔ کیا اُس کے باپ دادوں میں سے کوئی بادشاہ بھی ہُوا ہے؟

جواب : ابوسفیان نے کہا۔ نہیں۔

سوال : پھر بادشاہ نے پوچھا۔ اُس کی عقل اور اس کی رائے کیسی ہے؟

جواب : ابوسفیان نے جواب دیا۔ ہم نے اُس کی عقل اور رائے میں کبھی کوئی عیب نہیں دیکھا۔

سوال : پھر قیصر نے پوچھا۔ کیا بڑے بڑے جابر اور قوت والے لوگ اسکی جماعت میں داخل ہوتے ہیں یا غریب اور مسکین لوگ؟

جواب : ابوسفیان نے جواب دیا۔ غریب اور مسکین اور نوجوان لوگ۔

سوال : پھر اُس نے پوچھا۔ کیا وہ بڑھتے ہیں یا گھٹتے ہیں؟

جواب : ابوسفیان نے جواب دیا۔ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

سوال : پھر قیصر نے پوچھا۔ کیا اُن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اُس کے دین کو بُرا سمجھ کے مرتد ہوئے ہوں۔

جواب : ابوسفیان نے کہا۔ نہیں۔

سوال : پھر اُس نے پوچھا۔ کیا اُس نے کبھی اپنے عہد کو توڑا بھی ہے؟

جواب : ابوسفیان نے جوابدیا۔ آج تک تو نہیں۔ مگر اب ہمنے ایک نیا عہد باندھا ہے دیکھیں اب وہ اُس کے متعلق کیا کرتا ہے۔

سوال : پھر اُس نے پوچھا۔ کیا تمہارے اور اُس کے درمیان کبھی جنگ بھی ہوئی ہے؟

جواب : ابوسفیان نے جواب دیا۔ ہاں۔

سوال : اِس پر بادشاہ نے پوچھا۔ پھر اُن لڑائیوں کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

جواب : ابوسفیان نے جوابدیا۔ گھاٹ کے ڈولوں والا حال ہے۔ کبھی ہمارے ہاتھ میں ڈول ہوتا ہے کبھی اُسکے ہاتھ میں ڈول ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ بدر کی لڑائی ہوئی اور میں اس میں شامل نہیں تھا اِس لیے وہ غالب آگیا تھا۔ اور دوسری دفعہ اُحد میں لڑائی ہوئی اس وقت میں کمانڈر تھا ہم نے اُن کے خوب پیٹ کاٹے اور اُن کے کان کاٹے اور ان کے ناک کاٹے۔

سوال : پھر قیصر نے پوچھا۔ وہ تمہیں کیا حکم دیتا ہے؟

جواب : ابوسفیان نے کہا۔ وہ کہتا ہے ایک خدا کی پرستش کرو اور اُسکے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ اور ہمارے باپ دادا جن بتوں کی پوجا کرتے تھے وہ اُنکی پوجا سے روکتا ہے اور ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم خدا کی عبادتیں کریں اور سچ بولا کریں اور بُرے اور گندے کاموں

سے بچا کریں اور ہمیں یہ کہتا ہے کہ ہم مروّت اور وفائے عہد سے کام لیا کریں اور امانتوں کو ادا کیا کریں۔

قیصر روم کا نتیجہ کہ آنحضرت صلعم صادق نبی ہیں

اِس پر قیصر نے کہا سُنو مَیں نے تم سے یہ سوال کیا تھا کہ اُسکی نسب کیسی ہے تو تم نے کہا وہ خاندانی لحاظ سے اچھا ہے۔ اور انبیاء ہمیشہ ایسے ہی ہُوا کرتے ہیں۔ پھر مَیں نے تم سے پوچھا کہ کیا اس سے پہلے بھی کسی شخص نے ایسا دعویٰ کیا ہے تو تم نے کہا نہیں۔ یہ سوال مَیں نے اِس لیے کیا تھا کہ اگر قریب زمانہ میں اُس سے پہلے کسی شخص نے ایسا دعویٰ کیا ہوتا تو مَیں سمجھتا کہ یہ بھی اسکی نقل کر رہا ہے۔ اور پھر مَیں نے تم سے پوچھا کہ اِس دعویٰ سے پہلے اُس پر جھوٹ کا بھی الزام لگایا گیا ہے اور تم نے کہا نہیں تو مَیں نے سمجھ لیا کہ جو شخص انسانوں کے متعلق جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا تعالیٰ کے متعلق بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ پھر مَیں نے تم سے پوچھا کہ کیا اُسکے باپ دادوں میں سے کوئی بادشاہ بھی تھا۔ تو تم نے کہا نہیں۔ تو مَیں نے سمجھ لیا کہ اسکے دعویٰ کی یہ وجہ نہیں کہ اِس بہانہ سے اپنے باپ دادا کا ملک واپس لینا چاہتا ہے۔ پھر مَیں نے تم سے پوچھا کہ کیا جابر اور زبردست لوگ اُسکی جماعت میں داخل ہوتے ہیں یا کمزور اور مسکین طبع لوگ۔ تو تم نے جواب دیا کہ کمزور اور مسکین طبع لوگ۔ تو مَیں نے سوچا کہ تمام انبیاء کی جماعت میں اکثر مسکین طبع اور غریب ہی داخل ہوا کرتے ہیں نہ کہ جابر اور متکبّر لوگ۔ پھر مَیں نے تم سے پوچھا کہ کیا وہ بڑھتے ہیں یا گھٹتے ہیں۔ تو تم نے کہا وہ بڑھتے ہیں۔ اور یہی حالت نبیوں کی جماعت کی ہُوا کرتی ہے جبتک وہ کمال کو نہیں پہنچ جاتی اُس وقت تک وہ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پھر مَیں نے تم سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص اُسکے دین کو ناپسند کر کے بھی مرتد ہوتا ہے تو تم نے کہا نہیں۔ اور ایسا ہی انبیاء کی جماعت کا حال ہوتا ہے کسی اور وجہ سے کوئی شخص نکلے تو نکلے، دین کو بُرا سمجھ کر نہیں نکلتا۔ پھر مَیں نے تم سے پوچھا کہ کیا تمہارے درمیان کبھی لڑائی بھی ہوئی ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ تو تم نے کہا لڑائی ہمارے درمیان گھاٹ کے ڈول کی طرح ہے۔ اور نبیوں کا یہی حال ہے شروع شروع میں اُن کی جماعتوں پر مصیبتیں آتی ہیں لیکن آخر وہی جیتتے ہیں۔ پھر مَیں نے تجھ سے پوچھا۔ وہ تمہیں کیا تعلیم دیتا ہے۔ تو تم نے جواب دیا کہ وہ نماز کی اور سچائی کی اور پاکدامنی اور وفائے عہد کی اور امانت دار ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اسی طرح مَیں نے تجھ سے پوچھا کہ کیا وہ دھوکہ بازی بھی کرتا ہے۔ تو تم نے کہا نہیں۔ اور یہ طور و طریق تو ہمیشہ نیک لوگوں کے ہی ہُوا کرتے ہیں۔ پس مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ نبوّت کے دعویٰ میں سچا ہے۔ اور میرا خود یہ خیال تھا کہ اِس زمانہ میں "وہ نبی" آنے والا ہے، مگر میرا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ عربوں میں پیدا ہونے والا ہے۔ اور جو جواب تو نے مجھے دیئے ہیں اگر وہ سچّے ہیں تو پھر مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ اِن ممالک پر ضرور قابض ہو جائیگا (بخاری) اُسکی اِن باتوں پر اُسکے درباریوں میں جوش پیدا ہو گیا اور اُنہوں نے کہا تم مسیحی ہوتے ہوئے ایک غیر قوم کے آدمی کی صداقت کا اقرار کر رہے ہو اور دربار میں احتجاج کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اِس پر دربار کے افسروں نے جلدی سے ابوسفیان اور اسکے ساتھیوں کو دربار سے باہر نکال دیا۔

آنحضرت صلعم کے خط بنام ہرقل کا مضمون

یہ خط جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قیصر کے نام لکھا تھا اس کی عبارت یہ تھی:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمدٍ عبد اللہ ورسولہ الی ھرقل عظیم الرّوم - سَلامٌ علٰی مَنِ

اتبع الھدٰی ۔ امّابعد فانّی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتک اللّٰہ اجرک مرّتین فان تولّیت فانّما علیک اثم الیریسیین یٰاھل الکتٰب تعالوا اِلٰی کلمۃٍ سواءٍ بیننا وبینکم الّا نعبد الّا اللّٰہ وَلانشرک بہٖ شیئًا ولا نتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللّٰہ فان تولّوا فقولوا اشھدوا بانّا مسلمون ۔ (زرقانی)

یعنی یہ خط محمدؐ اللہ کے بندے اور اُس کے رسول کی طرف سے بادشاہ ہرقل کی طرف لکھا جاتا ہے ۔ جو شخص بھی خدا کی ہدایت کے پیچھے چلے اُس پر خدا کی سلامتیاں نازل ہوں ۔ اسکے بعد اے بادشاہ میں تجھے اسلام کی دعوت پیش کرتا ہوں (یعنی خدائے واحد اور اس کے رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی) اے بادشاہ! تو مسلمان ہو جا ۔ تو خدا تجھے تمام فتنوں سے بچا لیگا ۔ اور تجھے دوہرا اجر دیگا ۔ (یعنی عیسٰیؑ پر ایمان لانے کا بھی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا بھی) لیکن اگر تو نے اس بات کے ماننے سے انکار کر دیا تو صرف تیری ہی جان کا گناہ تجھ پر نہیں ہوگا بلکہ تیری رعایا کے ایمان نہ لانیکا گناہ بھی تجھ پر ہوگا ۔ آخر میں قرآن شریف کی آیت درج تھی جس کے معنے یہ ہیں کہ اے اہلِ کتاب آؤ اِس بات پر تو اکٹھے ہو جائیں جو تمہارے اور ہمارے درمیان مشترک ہے یعنی ہم خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اُس کا شریک نہ بنائیں اور اللہ تعالیٰ کے سِوا ہم کسی بندے کو بھی اتنی عزت نہ دیں کہ وہ خدائی صفات سے متصّف کیا جانے لگے ۔ اگر اہل کتاب اس دعوتِ اتحاد کو قبول نہ کریں ۔ تو اے محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھیو! ان سے کہدو کہ ہم تو خدا تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں ۔

بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب یہ خط بادشاہ کے سامنے پیش ہُوا، تو درباریوں میں سے بعض نے کہا کہ اس خط کو پھاڑ کر پھینک دینا چاہیئے ۔ کیونکہ اس میں بادشاہ کی ہتک کی گئی ہے اور خط کے اوپر بادشاہ روم نہیں لکھا گیا بلکہ صاحب الروم یعنی روم کا والی لکھا ہے مگر بادشاہ نے کہا یہ عقل کے خلاف ہے کہ خط پڑھنے سے پہلے پھاڑ دیا جائے اور یہ جو اُس نے مجھے روم کا والی لکھا ہے یہ درست ہے، آخر مالک تو خدا ہی ہے میں والی ہی ہوں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا روم کے بادشاہ نے جو طریق اختیار کیا ہے اسکی وجہ سے اسکی حکومت بچالی جائیگی اور اسکی اولاد دیر تک حکومت کرتی رہیگی ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ بعد کی جنگوں میں گو بہت سا ملک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری پیشگوئی کے ماتحت روم کے بادشاہ کے ہاتھ سے چھینا گیا مگر اس واقعہ کے چھ سو سال بعد تک اس کے خاندان کی حکومت قسطنطنیہ میں قائم رہی ۔ روم کی حکومت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط بہت دیر تک محفوظ رہا ۔ چنانچہ بادشاہ منصور قلادون کے بعض سفیر ایک دفعہ بادشاہ روم کے پاس گئے تو بادشاہ نے اُن کو دکھانے کے لیے ایک صندوقچہ منگوایا اور کہا میرے ایک دادا کے نام تمہارے رسول کا ایک خط آیا تھا جو آج تک ہمارے پاس محفوظ ہے ۔

فارس کے بادشاہ کے نام خط

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خط فارس کے بادشاہ کیطرف لکھا تھا وہ عبداللہ بن حذافہ کی معرفت بھجوایا گیا تھا اسکے الفاظ یہ تھے :-

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ۔ من محمّدٍ رسول اللّٰہ الٰی کسریٰ عظیم الفارس ۔ سلام علٰی من اتّبع الھدٰی ۔ واٰمن باللّٰہ ورسولہٖ ۔ واشھد ان لا الٰہ الّا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ۔ واَنّ محمّدًا عبدہٗ ورسولہٗ ادعوک بدعایۃ اللّٰہ فانّی انا رسول اللّٰہ اِلٰی

الناس كافة لانذر من كان حيًّا ويحق القول على الكافرين اسلم تسلم فان ابيت فعليك اثم المجوس۔ (زرقانی و تاریخ الخمیس)

یعنی اللہ کا نام لیکر جو بے انتہاء کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنے والا ہے یہ خط محمد رسول اللہ نے کسریٰ فارس کے سردار کی طرف لکھا ہے۔ جو شخص کامل ہدایت کی اتباع کرے اور اللہ پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ تعٰ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد اُسکے بندے اور رسول ہیں اُس پر خدا کی سلامتی ہو۔ اے بادشاہ میں تجھے خدا کے حکم کے ماتحت اسلام کی طرف بُلاتا ہوں کیونکہ میں تمام انسانوں کی طرف خدا کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ ہر زندہ شخص کو میں ہوشیار کردوں اور کافروں پر حجت تمام کردوں تو اسلام کو قبول کر، تا تُو ہر ایک فتنہ سے محفوظ رہے اگر تو اس دعوت سے انکار کریگا تو سب مجوس کا گناہ تیرے ہی سر پر ہوگا۔

عبداللہ بن حذافہؓ کہتے ہیں کہ جب میں کسریٰ کے دربار میں پہنچا، تو میں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی جو دی گئی۔ جب میں نے بڑھکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خط کسریٰ کے ہاتھوں میں دیا تو اُس نے ترجمان کو پڑھکر سُنانے کا حکم دیا۔ جب ترجمان نے اس کا ترجمہ پڑھ کر سُنایا تو کسریٰ نے غصہ سے خط پھاڑ دیا۔ جب عبداللہ بن حذافہ نے یہ خبر آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی تو آپ نے فرمایا کسریٰ نے جو کچھ ہمارے خط کے ساتھ کیا خدا تعالیٰ اسکی بادشاہت کے ساتھ بھی ایسا ہی کریگا۔ کسریٰ کی اس حرکت کا باعث یہ تھا کہ عرب کے یہودیوں نے اُن یہودیوں کے ذریعہ سے جو روم کی حکومت سے بھاگ کر ایران کی حکومت میں چلے گئے تھے اور بوجہ رومی حکومت کے خلاف سازشوں میں کسریٰ کا ساتھ دینے کے کسریٰ کے بہت مُنہ چڑھے ہوئے تھے کسریٰ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہت بھڑکا رکھا تھا۔ جو شکائتیں وہ کر رہے تھے اُس خط نے کسریٰ کے خیال میں اُن کی تصدیق کردی اور اس نے سمجھا کہ یہ شخص میری حکومت پر نظر رکھتا ہے چنانچہ اس خط کے معاً بعد کسریٰ نے اپنے یمن کے گورنر کو ایک چٹھی لکھی جس کا مضمون یہ تھا کہ قریش میں سے ایک شخص نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے اور اپنے دعووں میں بہت بڑھتا چلا جاتا ہے تو فوراً اُس کی طرف دو آدمی بھیج جو اسکو پکڑ کر میری خدمت میں حاضر کریں۔ اس پر باذان نے جو اس وقت کسریٰ کی طرف سے یمن کا گورنر تھا ایک فوجی افسر اور ایک سوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھجوائے اور ایک خط بھی آپکی طرف لکھا کہ آپ اس خط کے ملتے ہی فوراً ان لوگوں کے ساتھ کسریٰ کے دربار میں حاضر ہو جائیں۔ وہ افسر پہلے مکّہ کیطرف گیا۔ طائف کے قریب پہنچکر اسے معلوم ہوا کہ آپ مدینہ میں رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ وہاں سے مدینہ گیا۔ مدینہ پہنچکر اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کسریٰ نے باذان گورنر یمن کو حکم دیا ہے کہ آپ کو پکڑ کر اس کی خدمت میں حاضر کیا جائے۔ اگر آپ اس حکم کا انکار کرینگے تو وہ آپکو بھی ہلاک کردیگا اور آپکی قوم کو بھی ہلاک کردیگا اور آپکے ملک کو برباد کردیگا۔ اس لیے آپ ضرور ہمارے ساتھ چلیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی بات سنکر فرمایا۔ اچھا کل پھر تم مجھے ملنا۔ رات کو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور خدائے ذوالجلال نے آپکو خبر دی کہ کسریٰ کی گستاخی کی سزا میں ہم نے اُس کے بیٹے کو اُس پر مسلّط کردیا ہے چنانچہ وہ اسی سال جمادی الاولیٰ کی دسویں تاریخ پیر کے دن اسکو قتل کردیگا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا آج کی رات اُس نے اُسے قتل کردیا ہے۔ ممکن ہے وہ رات وہی دس جمادی الاولیٰ کی رات ہو جب صبح ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن دونوں کو بلایا اور اُن کو اس پیشگوئی کی خبر دی۔ پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے باذان کی طرف خط لکھا کہ خدا تعالےٰ

نے مجھے خبر دی ہے کہ کسریٰ فلاں تاریخ فلاں مہینے قتل کردیا جائیگا جب یہ خط یمن کے گورنر کو پہنچا تو اُس نے کہا اگر یہ سچا نبی ہے تو ایسا ہی ہو جائیگا۔ ورنہ اِس کی اور اس کے ملک کی خیر نہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایران کا ایک جہاز یمن کی بندرگاہ پر آکر ٹھہرا اور گورنر کو ایران کے بادشاہ کا ایک خط دیا جس کی مُہر کو دیکھتے ہوئے یمن کے گورنر نے کہا۔ مدینہ کے نبی نے سچ کہا تھا۔ ایران کی بادشاہت بدل گئی اور اِس خط پر ایک اور بادشاہ کی مہر ہے جب اُس نے خط کھولا تو اُس میں یہ لکھا ہُوا تھا۔ کہ باذان گورنر یمن کی طرف ایران کے کسریٰ شیرویہ کی طرف سے یہ خط لکھا جاتا ہے۔ مَیں نے اپنے باپ سابق کسریٰ کو قتل کردیا ہے اِس لیے کہ اُس نے ملک میں خونریزی کا دروازہ کھول دیا تھا اور ملک کے شرفاء کو قتل کرتا تھا اور رعایا پر ظلم کرتا تھا۔ جب میرا یہ خط تم تک پہنچے تو فوراً تمام افسروں سے میری اطاعت کا اقرار لو! اور اس سے پہلے میرے باپ نے جو عرب کے ایک نبی کی گرفتاری کا حکم تم کو بھجوایا تھا اسکو منسوخ سمجھو (طبری جلد ۳ صفحہ ۲۰۷، ۱۵۷۴ و سیرۃ النبی لابن ہشام) یہ خط پڑھ کر باذان اتنا متاثر ہُوا کہ اُسی وقت وہ اور اُس کے کئی ساتھی اسلام لے آئے اور اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسلام کی اطلاع دیدی۔

نجاشی شاہِ حبشہ کے نام خط

تیسرا خط آپ نے نجاشی کے نام لکھا جو عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھجوایا تھا اس کی عبارت یہ تھی:۔

بسم الله الرحمٰن الرحیم۔ من محمّد رسول الله الیٰ النجاشی ملك الحبشة سلم انت فانی احمد الیك الله الّذی لا اله اِلّا هو الملك القدّوس السلام المؤمن المهیمن۔ واشهد انّ عیسی ابن مریم روح الله وكلمته القاها الیٰ مریم البتول وانّی ادعوك الی الله وحدهٗ لاشریك لهٗ والموالاة علیٰ طاعته وان تتبعنی وتؤمن بالّذی جاءنی فانّی رسول الله وانّی ادعوك وجنودك اِلی الله عزّ و جلّ وقد بلّغت ونصحت فاقبلوا نصیحتی وسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ (زرقانی)

یعنی اللہ کا نام لیکر جو بے انتہاء کرم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ محمد رسول اللہ نجاشی حبشہ کے بادشاہ کی طرف یہ خط لکھتے ہیں۔ اے بادشاہ! تجھ پر خدا کی سلامتی نازل ہو رہی ہے (چونکہ اس بادشاہ نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔ اس لیے آپ نے اُس کو خبر دی کہ تیرا یہ فعل خدا کے نزدیک مقبول ہُوا ہے اور تُو خدا کی حفاظت میں ہے) مَیں اُس خدا کی حمد تیرے سامنے بیان کرتا ہوں جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں جو حقیقی بادشاہ ہے جو تمام پاکیزگیوں کا جامع ہے جو ہر عیب سے پاک ہے اور ہر نقص سے پاک کرنے والا ہے جو اپنے بندوں کے لیے امن کے سامان پیدا کرتا ہے اور اپنی مخلوق کی حفاظت کرتا ہے۔ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم اللہ تعالیٰ کے کلام کو دنیا میں پھیلانے والے تھے اور خدا تعالیٰ کے اُن وعدوں کو پُورا کرنے والے تھے جو خدا تعالیٰ نے مریمؑ سے جس نے اپنی زندگی خدا کے لیے وقف کردی تھی پہلے سے کیے ہوئے تھے۔ اور مَیں تجھے خدائے وحدہٗ لاشریک سے تعلق پیدا کرنے اور اس کی اطاعت پر باہمی معاہدہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اور تجھے اس بات کی بھی دعوت دیتا ہوں کہ تو میری اتباع کرے اور اُس خدا پر ایمان لائے جس نے مجھے ظاہر کیا ہے کیونکہ مَیں اُس کا رسول ہوں اور مَیں

تجھے دعوت دیتا ہوں اور تیرے لشکروں کو بھی خدائے عزّ وجلّ کے دین میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں نے اپنی ذمہ داری کو ادا کر دیا ہے اور خدا کا پیغام تجھ تک پہنچا دیا ہے اور اخلاص سے تم پر حقیقت کھول دی ہے پس میرے اخلاص کی قدر کرو اور ہر شخص جو خدا تعالےٰ کی ہدایت کی اتباع کرتا ہے اُس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی نازل ہوتی ہے۔

جب یہ خط نجاشی کو پہنچا تو اُس نے بڑے ادب سے اِس خط کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور تخت سے نیچے اُتر کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ ہاتھی دانت کا ایک ڈبہ لاؤ۔ چنانچہ ایک ڈبہ لایا گیا۔ اُس نے وہ خط ادب کے ساتھ اُس ڈبہ میں رکھ دیا اور کہا جب تک یہ خط حبشہ میں محفوظ رہیگا حبشہ کی حکومت بھی محفوظ رہیگی۔ چنانچہ نجاشی کا یہ خیال درست ثابت ہُوا۔ ایک ہزار سال تک اسلام ساری دنیا پر سمندر کی لہروں کی طرح اُٹھتا ہُوا پھیلتا چلا گیا۔ لیکن حبشہ کے دائیں سے بھی اسلامی لشکر نکل گئے اور حبشہ کے بائیں سے بھی اسلامی لشکر نکل گئے۔ مگر اس احسان کی وجہ سے جو حبشہ کے بادشاہ نے ابتدائی اسلامی مہاجرین کے ساتھ کیا تھا اور اس احترام کی وجہ سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کا نجاشی نے کیا تھا انہوں نے حبشہ کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ قیصر جیسے بادشاہ کی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کسریٰ جیسے بادشاہ کی حکومت کا نام و نشان مٹ گیا۔ چین اور ہندوستان کی شہنشاہیاں تہ و بالا کر دی گئیں۔ مگر حبشہ کی ایک چھوٹی سی حکومت محفوظ رکھی گئی۔ اس لیے کہ اُس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی ساتھیوں کے ساتھ ایک احسان اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کا ادب اور احترام کیا تھا۔ یہ تو وہ سلوک تھا جو ایک ادنیٰ سے احسان کے بدلہ میں حبشہ والوں سے مسلمانوں نے کیا۔ مگر عیسائی اقوام نے جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا بھی پھیر دینے کی مدّعی ہیں اپنے مہذب اور رحیم طریقہ بادشاہ حبشہ اور اُسکی قوم کے ساتھ جو سلوک اِن دنوں کیا ہے وہ بھی دنیا کے سامنے ظاہر ہے کس طرح حبشہ کے شہروں کو بمباری سے اُڑا دیا گیا اور بادشاہ اور اُس کی محترم ملکہ اور اُس کے بچوں کو اپنا ملک چھوڑ کر غیر ملکوں میں سالہا سال پناہ لینی پڑی۔ کیا حبشہ سے یہ دو قسم کا سلوک ایک مسلمانوں کا اور ایک عیسائیوں کا اُس قوت قدسیّہ کو ثابت نہیں کرتا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھی۔ اور جو آج تک بھی کہ مسلمان بہت کچھ دین سے دُور جا چکے ہیں اُن کے خیالات کو نیکی اور احسان مندی کی طرف مائل رکھتی ہے۔

مقوقس شاہِ مصر کے نام خط

چوتھا خط آپ نے مقوقس بادشاہ مصر کی طرف لکھا تھا۔ اور یہ خط حاطب ابن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی معرفت آپ نے بھجوایا۔ اِس خط کا مضمون یہ تھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمّد رسول اللہ اِلی المقوقس عظیم القبط سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔ امّا بعد فانّی ادعوك بدعایة الاسلام اسلم تسلم یؤتك اللہ اجرك مرّتین فان تولّیت فانّما علیك اثم القبط۔ یا اھل الکتٰب تعالوا اِلیٰ کلمةٍ سواءٍ بیننا و بینکم الّا نعبد الّا اللہ ولا نشرك بہ شیئًا ولا یتّخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللہ فاِن تولّوا فقولوا اشھدوا بانّا مسلمون۔ (السیرة الحلبیة جلد ۳ صفحہ ۲۷۵)

یہ خط بعینہٖ وہی ہے جو روم کے بادشاہ کو لکھا گیا تھا، صرف یہ فرق ہے کہ اُس میں یہ لکھا تھا کہ اگر تم نہ مانے تو رومی رعایا کے گناہوں کا بوجھ بھی تم پر ہوگا اور اس میں یہ تھا کہ قبطیوں کے گناہوں کا بوجھ تم پر ہوگا جب حاطبؓ مصر پہنچے تو اس وقت مقوقس اپنے دارالحکومت میں نہیں تھا بلکہ اسکندریہ میں تھا۔ حاطبؓ اسکندریہ گئے جہاں بادشاہ نے سمندر کے کنارے ایک مجلس لگائی ہوئی تھی۔ حاطبؓ ایک کشتی میں سوار ہو کر اُس مقام تک گئے۔ اور چونکہ اردگرد پہرہ تھا انہوں نے دُور سے خط کو بلند کر کے آوازیں دینی شروع کیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اِس شخص کو لایا جائے اور اُسکی خدمت میں پیش کیا جائے۔ بادشاہ نے خط پڑھا اور حاطبؓ سے کہا اگر یہ سچا نبی ہے تو اپنے دشمنوں کے خلاف دعا کیوں نہیں کرتا؟ حاطبؓ نے کہا کہ تم عیسیٰ بن مریم پر تو ایمان لاتے ہو۔ یہ کیا بات ہے کہ عیسیٰؑ کو اُن کی قوم نے دُکھ دیا لیکن عیسیٰؑ نے یہ دعا نہ کی کہ وہ ہلاک ہو جائیں۔ بادشاہ نے سنکر کہا کہ تم ایک عقلمند کی طرف سے ایک عقلمند سفیر ہو اور تم نے خوب جواب دیا ہے۔ اِس پر حاطبؓ نے کہا اے بادشاہ تجھ سے پہلے ایک بادشاہ تھا جو کہا کرتا تھا کہ مَیں بڑا ربّ ہوں یعنی فرعون۔ آخر خدا نے اُس پر عذاب نازل کیا پس تو تکبّر نہ کر اور خدا کے اس نبی پر ایمان لے آ۔ اور خدا کی قسم موسیٰؑ نے عیسیٰؑ کے متعلق ایسی خبریں نہیں دیں جیسی عیسیٰؑ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دی ہیں۔ اور ہم تمہیں اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بلاتے ہیں جس طرح تم لوگ یہودیوں کو عیسیٰؑ کی طرف بلاتے ہو۔ اور ہر نبی کی ایک اُمّت ہوتی ہے اور اُس کا فرض ہوتا ہے کہ اُس کی اطاعت کرے۔ پس جبکہ تم نے اِس نبی کا زمانہ پایا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اسکو قبول کرو۔ اور ہمارا دین تم کو مسیح کی اتباع سے روکتا نہیں۔ بلکہ ہم تو دوسروں کو بھی حکم دیتے ہیں کہ وہ مسیح پر ایمان لائیں۔ اِس پر مقوقس نے کہا میں نے اُس نبی کے حالات سُنے ہیں اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ کسی بُری بات کا حکم نہیں دیتا اور کسی اچھی بات سے روکتا نہیں اور مَیں نے معلوم کیا ہے کہ وہ شخص ساحروں اور کاہنوں کی طرح نہیں ہے۔ اور مَیں نے بعض اس کی پیشگوئیاں سُنی ہیں جو پوری ہوئی ہیں۔ پھر اس نے ایک ڈبیہ ہاتھی دانت کی منگوائی اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط رکھدیا اور اُس پر مُہر لگا دی اور اپنی ایک لونڈی کے سپرد کر دیا۔ اور پھر اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام یہ خط لکھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد ابن عبداللہ کی طرف مقوقس قبط کا بادشاہ خط لکھتا ہے کہ آپ پر سلامتی ہو۔ اِس کے بعد میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے آپکا خط پڑھا ہے اور جو کچھ اس میں آپ نے ذکر کیا ہے اور جن باتوں کی طرف بُلایا ہے اُن پر غور کیا ہے اور مجھے معلوم ہُوا ہے کہ اسرائیلی پیشگوئیوں کے مطابق ایک نبی کا آنا ابھی باقی ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ وہ شام سے ظاہر ہوگا۔ مَیں نے آپ کے سفیر کو بڑی عزّت سے ٹھہرایا ہے اور ایک ہزار پونڈ اور پانچ جوڑے خلعت کے طور پر اُسے دیئے ہیں اور مَیں دو مصری لڑکیاں آپ کے لیے تحفہ کے طور پر بھجوا رہا ہوں۔ قبطی قوم کے نزدیک اِن لڑکیوں کی بڑی عزّت ہے اور ان میں سے ایک کا نام ماریہ ہے اور ایک کا نام سیرین ہے۔ اور مصری کپڑے کے اعلیٰ درجہ کے بیس جوڑے بھی آپ کی خدمت میں بھجوا رہا ہوں اور اسی طرح ایک خچر آپ کی سواری کے لیے بھجوا رہا ہوں۔ اور آخر میں پھر دعا کرتا ہوں کہ خدا کی آپ پر سلامتی ہو (زرقانی وطبری) اِس خط سے معلوم

ہوتا ہے کہ گو مقوقس نے آپ کے خط سے ادب اور احترام کا معاملہ کیا مگر وہ اسلام نہیں لایا۔

رئیسِ بحرین کے نام خط

پانچواں خط آپ نے منذر تیمی کی طرف جو بحرین کا رئیس تھا بھجوایا تھا۔ یہ خط علاء ابن حضرمی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھجوایا گیا تھا۔ اس خط کی عبارت محفوظ نہیں۔ یہ خط جب اُس کے پاس پہنچا تو وہ ایمان لے آیا اور اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا کہ مَیں اور میرے بہت سے ساتھی آپ پر ایمان لے آئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اسلام میں داخل نہیں ہوئے اور میرے ملک میں کچھ یہودی اور مجوسی بھی رہتے ہیں آپ اُن کے بارہ میں مجھے حکم دیں کہ میں اُن سے کیا سلوک کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خط لکھا جس کی عبارت یہ تھی کہ ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ تم نے اسلام قبول کر لیا ہے جو پیغامبر میری طرف سے آئیں تم اُن کے احکام کی اتباع کیا کرو۔ کیونکہ جو اُن کی اتباع کریگا وہ میری اتباع کریگا جو میرا سفیر تمہاری طرف گیا تھا اُس نے تمہاری بہت تعریف کی ہے اور ظاہر کیا ہے کہ تم نے اسلام قبول کر لیا ہے اور مَیں نے خدا تعالیٰ سے تمہاری قوم کے بارہ میں دُعا کی ہے۔ پس مسلمانوں میں اسلامی طور و طریق جاری کرو۔ اور اُن کے اموال کی حفاظت کرو اور چار بیویوں سے زیادہ کسی کو اپنے گھر میں رکھنے کی اجازت نہ دو۔ اور مسلمان ہونے والوں سے جو گناہ پہلے ہو چکے ہیں وہ اُنہیں معاف کیے جائیں اور جب تک تم نیکی پر قائم رہو گے تمہیں اپنی حکومت سے معزول نہیں کیا جائیگا اور جو لوگ یہودی یا مجوس ہیں ان پر صرف ایک ٹیکس مقرر ہے اور کوئی مطالبہ اُن سے نہ کرنا اور اپنے ملک کے لوگوں کی نسبت یہ خیال کرو کہ جن لوگوں کے پاس زمین گذارہ کیلئے نہیں ہے اُنہیں سے ہر شخص کو چار درہم اور لباس گذارہ کیلئے دیا جائے (زرقانی و تاریخ الخمیس)

اِس کے علاوہ آپ نے عمّان کے بادشاہ اور یمامہ کے سردار اور غسّان کے بادشاہ اور یمن کے قبیلہ بنی نہد کے سردار اور یمن کے قبیلہ ہمدان کے سردار اور بنی علیم کے سردار اور حضرمی قبیلہ کے سردار کی طرف بھی خطوط لکھے جن میں سے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے۔ اِن خطوط کا لکھنا بتاتا ہے کہ آپ خدا تعالیٰ پر کیسا کامل یقین رکھتے تھے اور کس طرح شروع سے ہی آپ کو یقین تھا کہ آپ کسی ایک قوم کی طرف نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے بلکہ آپ ساری اقوام کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن بادشاہوں اور رئیسوں کو خط لکھے گئے تھے اِن میں سے بعض اسلام لے آئے۔ بعضوں نے ادب اور احترام کے ساتھ خط تو قبول کر لیے لیکن اسلام نہ لائے۔ بعضوں نے معمولی شرافت دکھائی اور بعضوں نے خود پسندی اور کبر کا نمونہ دکھایا۔ لیکن اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں اور دنیا کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اُن میں سے ہر بادشاہ اور قوم کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا گیا جیسا اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوں کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔

قلعہ خیبر کی تسخیر

جیسا کہ اُوپر بیان جا چکا ہے یہودی اور کفارِ عرب مسلمانوں کے خلاف اِرد گرد کے قبائل کو ابھار رہے تھے۔ اور اب یہ دیکھ کر کہ عرب میں اتنی سکت باقی نہیں رہی کہ وہ مسلمانوں کو تباہ کر سکیں یا مدینہ پر جا کر حملہ کر سکیں۔ یہودیوں نے ایک طرف تو رومی حکومت کی جنوبی سرحد پر رہنے والے عرب قبائل کو جو مذہباً عیسائی تھے، اُکسانا شروع کیا اور

دُوسری طرف انہوں نے اپنے اِن ہم مذہبوں کو جو عراق میں رہتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چٹھیاں لکھنی شروع کیں تاکہ وہ کسریٰ کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکائیں۔ میں یہ بھی اوپر لکھ چکا ہوں کہ اس شرارت کے نتیجہ میں کسریٰ مسلمانوں کے خلاف سخت بھڑک گیا تھا اور اُس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے لیے یمن کے گورنر کو حکم بھی دیدیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ رکھا اور کسریٰ اور یہودیوں کی تدبیر کو ناکام کردیا۔ ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل نہ ہوتا تو جہاں تک مادی سامانوں کا تعلق ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف کسریٰ اور دوسری طرف قیصر کے لشکروں کا کیا مقابلہ کرسکتے تھے۔ خدا ہی تھا جس نے کسریٰ کو ماردیا اور اُس کے بیٹے سے یہ حکم جاری کروایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں کوئی کارروائی نہ کی جائے اور اس نشان کو دیکھ کر یمن کے حکام اسلام لے آئے اور یمن کا صوبہ بغیر لشکر کشی کے اسلامی حکومت میں داخل ہوگیا۔ یہ صورتِ حالات جو یہود نے پیدا کردی تھی اس بات کی متقاضی تھی کہ یہود کو مدینہ سے اور بھی پرے دھکیل دیا جائے کیونکہ اگر وہ مدینہ کے قریب رہتے تو یقیناً اور بھی زیادہ خونریزیوں اور فسادوں اور سازشوں کے مرتکب ہوتے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ سے واپس آنے کے قریباً پانچ ماہ بعد یہ فیصلہ کیا کہ یہودیوں کو خیبر سے جو مدینہ سے صرف چند منزل کے فاصلہ پر تھا اور جہاں سے مدینہ کے خلاف آسانی سے سازش کی جاسکتی تھی نکال دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے سولہ سو صحابہؓ کے ساتھ اگست ۶۲۸ء میں خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ خیبر ایک قلعہ بند شہر تھا اور اس کے چاروں طرف چٹانوں کے اوپر قلعے بنے ہوئے تھے۔ ایسے مضبوط شہر کو اتنے تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ فتح کرلینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی چوکیاں تو چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد فتح ہوگئیں۔ لیکن جب یہودی سمٹ سمٹا کر شہر کے مرکزی قلعہ میں آگئے۔ تو اُس کے فتح کرنے کی تمام تدابیر بیکار جانے لگیں۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے بتایا کہ اس شہر کی فتح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مقدر ہے۔ آپ نے صبح کے وقت یہ اعلان کیا کہ میں اسلام کا سیاہ جھنڈا آج اُس کے ہاتھ میں دُونگا جسکو خدا اور اُس کا رسول اور مسلمان پیار کرتے ہیں خدا تعالےٰ نے اِس قلعہ کی فتح اُس کے ہاتھ پر مقدّر کی ہے۔ اِس کے بعد دوسری صبح آپ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور جھنڈا اُن کے سپرد کیا جنہوں نے صحابہؓ کی فوج کو ساتھ لیکر قلعہ پر حملہ کیا۔ باوجود اس کے کہ یہودی قلعہ بند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اس دن ایسی قوت بخشی کہ شام سے پہلے پہلے قلعہ فتح ہوگیا۔ اور اس بات پر صلح ہوئی کہ تمام یہودی اور اُن کے بیوی بچے خیبر چھوڑ کر مدینہ سے دُور چلے جائیں اور ان کے تمام اموال مسلمانوں کے حق میں ضبط ہونگے اور یہ کہ جو شخص اس معاملہ میں جھوٹ سے کام لیگا اور کوئی مال یا جنس چھپا کر رکھے گا وہ اس معاہدہ کی حفاظت میں نہیں آئیگا اور غداری کی سزا کا مستحق ہوگا۔

تین عجیب واقعات

اِس جنگ میں تین عجیب واقعات پیش آئے کہ اُن میں سے ایک تو خدا تعالےٰ کے ایک نشان پر دلالت کرتا ہے اور دو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ عالیہ پر۔ نشان تو یہ ہے کہ اس جنگ کے بعد جب خیبر کے رئیس کنانہ کی بیوی صفیہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں تو آپ نے دیکھا کہ ان کے چہرہ پر کچھ لمبے لمبے نشان

ہیں۔ آپ نے فرمایا صفیہؓ! تمہارے یہ نشان کیسے ہیں؟ اُنہوں نے کہا یا رسول اللہ! ایک دن میں نے ایک خواب دیکھی کہ چاند گر کر میری جھولی میں آپڑا ہے۔ مَیں نے دوسرے دن یہ خواب اپنے خاوند کو سُنائی۔ میرے خاوند نے کہا یہ عجیب خواب ہے۔ تمہارا باپ بڑا عالم آدمی ہے اُس کو چل کر یہ خواب سنانی چاہیئے۔ چنانچہ مَیں نے اپنے باپ سے اس خواب کا ذکر کیا تو خواب سُنتے ہی اُس نے زور سے میرے مُنہ پر تھپّڑ مارا اور کہا نالائق کیا تو عرب کے بادشاہ سے شادی کرنا چاہتی ہے! یہ اس نے اِس لیے کہا کہ عرب کا قومی نشان چاند تھا۔ اگر کوئی خواب میں یہ دیکھتا کہ چاند اس کی جھولی میں آپڑا ہے تو اُس کی تعبیر یہ کی جاتی تھی کہ عرب کے بادشاہ کے ساتھ اس کا تعلق ہو گیا ہے اور اگر کوئی خواب میں دیکھتا کہ چاند پھٹ گیا ہے یا گر گیا ہے تو اُس کی تعبیر یہ کی جاتی تھی کہ عرب کی حکومت میں تفرقہ پڑ گیا ہے یا وہ تباہ ہو گئی ہے۔

یہ خواب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا ایک نشان ہے اور اس بات کا بھی نشان ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو غیب کی خبریں دیتا رہتا ہے۔ گو مومنوں کو زیادہ اور غیر مومنوں کو کم۔ حضرت صفیہؓ ابھی یہودی ہی تھیں کہ اُنکو خدا تعالیٰ نے یہ مصفّٰی غیب عطا فرمایا جس کے مطابق اُن کا خاوند معاہدہ کی خلاف ورزی کی سزا میں مارا گیا اور وہ باوجود اس کے کہ ایک صحابی کی قید میں گئی تھیں بعض لوگوں کے اصرار پر بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں اور اس طرح وہ غیب پُورا ہوا جو خدا تعالیٰ نے اُنہیں بتایا تھا۔

دوسرا قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ خیبر کے محاصرہ کے دِنوں میں ایک یہودی رئیس کا گلّہ بان جو اس کی بکریاں چرایا کرتا تھا مسلمان ہو گیا۔ مسلمان ہونے کے بعد اُس نے کہا یا رسول اللہ! مَیں اب اِن لوگوں میں تو جا نہیں سکتا اور یہ بکریاں اُس یہودی کی میرے پاس امانت ہیں اب مَیں اِن کو کیا کروں؟ آپ نے فرمایا بکریوں کا منہ قلعہ کی طرف کر دو اور اُن کو دھکیل دو۔ خدا تعالیٰ ان کو ان کے مالک کے پاس پہنچا دیگا۔ چنانچہ اس نے اِسی طرح کیا اور بکریاں قلعہ کے پاس چلی گئیں جہاں سے قلعہ والوں نے ان کو اندر داخل کر لیا۔ اس واقعہ سے پتہ لگتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس تشدّد سے امانت کے اصول پر عمل کرتے تھے اور کرواتے تھے۔ لڑنیوالوں کے اموال آج بھی جنگ میں حلال سمجھے جاتے ہیں کیا ایسا واقعہ آجکل کے زمانہ میں جو مہذب زمانہ کہلاتا ہے کبھی ہوا ہے کہ دُشمن فوج کے جانور ہاتھ آگئے ہوں تو اُنکو دُشمن فوج کی طرف واپس کر دیا گیا ہو؟ باوجود اسکے کہ وہ بکریاں ایک لڑنیوالے دُشمن کا مال تھیں! اور باوجود اسکے کہ اُنکے قلعے میں واپس چلے جانیکے نتیجہ میں دشمن کیلئے مہینوں کی غذا کا سامان ہو جاتا تھا جسکے بھروسہ پر وہ ایک لمبے عرصہ تک محاصرہ کو جاری رکھ سکتا تھا۔ آپ نے اُن بکریوں کو قلعہ میں واپس کروا دیا تا ایسا نہ ہو کہ اُس مسلمان کی امانت میں فرق آئے جس کے سپرد وہ بکریاں تھیں۔

تیسرا واقعہ یہ ہُوا کہ ایک یہودی عورت نے صحابہؓ سے پوچھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جانور کے کس حِصّہ کا گوشت زیادہ پسند ہے۔ صحابہؓ نے بتایا کہ آپ کو دست کا گوشت زیادہ پسند ہے۔ اِس پر اس نے بکرا ذبح کیا اور پتھروں پر اس کے کباب بنائے اور پھر اس گوشت میں زہر ملا دیا۔ خصوصاً بازوؤں میں جن کے متعلق اُسے بتایا گیا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بہاں کا گوشت زیادہ پسند کرتے ہیں۔

سورج ڈوبنے کے بعد جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شام کی نماز پڑھ کر اپنے ڈیرے کی طرف واپس آرہے تھے،

تو آپ نے دیکھا کہ آپ کے خیمے کے پاس ایک عورت بیٹھی ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ بی بی تمہارا کیا کام ہے ؟ اُس نے کہا اے ابوالقاسمؐ میں آپ کے لیے ایک تحفہ لائی ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ساتھی صحابیؓ کو فرمایا جو چیز یہ دیتی ہے اس سے لے لو اِس کے بعد آپ کھانے کے لیے بیٹھے تو کھانے پر وہ بھنا ہُوا بکرا بھی رکھا گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس میں سے ایک لقمہ کھایا اور آپ کے ایک صحابی بشیر ابن البراء بن المعرور نے بھی ایک لقمہ کھایا۔ اتنے میں باقی صحابہؓ نے بھی گوشت کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو آپ نے فرمایا مت کھاؤ کیونکہ اس ہاتھ نے مجھے خبر دی ہے کہ گوشت میں زہر ملا ہُوا ہے (اس کے یہ معنے نہیں کہ آپکو اس بارہ میں کوئی الہام ہوا تھا۔ بلکہ یہ عرب کا محاورہ ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کا گوشت چکھ کر مجھے معلوم ہُوا ہے کہ اس میں زہر ملا ہُوا ہے چنانچہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ایک دیوار کے متعلق آتا ہے کہ وہ گرنا چاہتی تھی جس کے محض یہ معنے ہیں کہ اُس میں گرنے کے آثار پیدا ہو چکے تھے پس اس جگہ پر بھی یہ مراد نہیں کہ آپ نے فرمایا وہ دست بولا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا گوشت چکھنے پر مجھے معلوم ہُوا ہے۔ چنانچہ اگلا فقرہ اِن معنوں کی وضاحت کر دیتا ہے) اِس پر بشیرؓ نے کہا کہ جس خدا نے آپ کو عزّت دی ہے اُس کی قسم کھا کر مَیں کہتا ہوں کہ مجھے بھی اس لقمہ میں زہر معلوم ہُوا ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ مَیں اُسکو پھینک دوں لیکن میں نے سمجھا کہ اگر مَیں نے ایسا کیا تو شاید آپ کی طبیعت پر یہ گراں نہ گذرے اور آپ کا کھانا خراب نہ ہو جائے اور جب آپ نے وہ لقمہ نگلا تو مَیں نے بھی آپ کے تتبع میں وہ نگل لیا۔ گو میرا دل یہ کہہ رہا تھا کہ چونکہ مجھے شبہ ہے کہ اس میں زہر ہے۔ اس لیے کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ لقمہ نہ نگلیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد بشیرؓ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اور بعض روایتوں میں تو یہ ہے کہ وہ وہیں خیبر میں فوت ہو گئے۔ اور بعض میں یہ ہے کہ اس کے بعد کچھ عرصہ بیمار رہے اور اس کے بعد فوت ہو گئے۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ گوشت اُس کا ایک کتّے کے آگے ڈلوایا جس کے کھانے سے وہ مر گیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس عورت کو بلایا اور فرمایا تم نے اِس بکری میں زہر ملایا ہے۔ اُس نے کہا آپ کو کس نے بتایا ہے آپ کے ہاتھ میں اُس وقت بکری کا دست تھا۔ آپ نے فرمایا اس ہاتھ نے مجھے بتایا ہے۔ اِس پر اُس عورت نے سمجھ لیا کہ آپ پر یہ راز کھُل گیا ہے اور اس نے اقرار کیا کہ اُس نے زہر ملایا ہے۔ اس پر آپ نے اُس سے پوچھا کہ اس ناپسندیدہ فعل پر تم کو کس بات نے آمادہ کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میری قوم سے آپ کی لڑائی ہوئی تھی اور میرے رشتہ دار اس لڑائی میں مارے گئے تھے۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اُن کو زہر دے دوں۔ اگر اُن کا کاروبار انسانی کاروبار ہو گا تو ہمیں اُن سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ اور اگر یہ واقعہ میں نبی ہوں گے، تو خدا تعالیٰ اُن کو خود بچا لیگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی یہ بات سُنکر اُسے معاف فرما دیا اور اس کی سزا جو یقیناً قتل تھی نہ دی۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کس طرح اپنے مارنے والوں اور اپنے دوستوں کے مارنے والوں کو بخشدیا کرتے تھے۔ اور در حقیقت اُسی وقت آپ سزا دیا کرتے تھے جب کسی شخص کا زندہ رہنا آئندہ بہت سے فتنوں کا موجب ہو سکتا تھا۔

طوافِ کعبہ

ہجرت کے ساتویں سال فروری ۶۲۹ءؔ میں معاہدہ کی رُو سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طواف کے لیے جانا تھا۔

چنانچہ جب وہ وقت آیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قریباً دو ہزار آدمیوں سمیت طواف کعبہ کے لیے روانہ ہوئے جب آپ مرّ الظہران تک پہنچے جو مکّہ سے ایک پڑاؤ پر ہے تو معاہدہ کے مطابق آپ نے تمام بھاری ہتھیار اور زرہیں وہاں جمع کر دیں اور خود اپنے صحابہؓ سمیت معاہدہ کے مطابق صرف نیام بند تلواروں کے ساتھ حرم میں داخل ہوئے۔ سات سالہ جلا وطنی کے بعد مہاجرین کا مکّہ میں داخل ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھا۔ اُن کے دل ایک طرف اُن لمبے مظالم کی یاد کر کے خون بہا رہے تھے جو مکّہ میں اُن پر کیے جاتے تھے اور دوسری طرف خدا تعالےٰ کے اِس فضل کو دیکھ کر کہ پھر خدا تعالیٰ نے اُنہیں کعبہ کے طواف کا موقعہ نصیب کیا ہے وہ خوش بھی ہو رہے تھے۔ مکّہ کے لوگ مکّہ سے نکل کر پہاڑ کی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کو دیکھ رہے تھے مسلمانوں کا دل چاہتا تھا کہ آج وہ اُن پر ظاہر کر دیں کہ خدا تعالیٰ نے انہیں پھر مکّہ میں داخل ہونے کی توفیق بخشی یا نہیں۔ چنانچہ عبداللہ بن رواحہؓ نے اِس موقعہ پر جنگی گیت گانے شروع کیے۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں روک دیا اور فرمایا۔ ایسے شعر نہ پڑھو۔ بلکہ یُوں کہو کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں، وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کی مدد کی اور مومنوں کو ذلّت کے گڑھے سے نکال کر اونچا کیا۔ صرف خدا ہی ہے جس نے دشمنوں کو اُن کے سامنے سے بھگا دیا۔ طواف کعبہ اور سعی بین الصفاء والمروہ سے فراغت کے بعد آپ اور صحابہؓ سمیت تین دن تک مکّہ میں ٹھہرے۔ حضرت عباسؓ کی سالی میمونہ جو دیر سے بیوہ ہو چکی تھیں مکّہ میں تھیں حضرت عباسؓ نے خواہش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے شادی کر لیں اور آپ نے اسے منظور فرما لیا۔ چوتھے دن مکّہ والوں نے مطالبہ کیا کہ آپ حسب معاہدہ مکّہ سے نکل جائیں۔ اور آپ نے فوراً تمام صحابہؓ کو حکم دیا کہ فوراً مکّہ چھوڑ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ مکّہ والوں کے احساسات کا خیال کر کے نئی بیاہی ہوئی میمونہؓ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا کہ وہ بعد میں اسباب کی سواریوں کے ساتھ آ جائیں اور خود اپنی سواری دوڑا کر حرم کی حدود سے باہر نکل گئے اور وہیں شام کے وقت آپکی بیوی میمونہؓ کو پہنچا یا گیا اور پہلی رات وہیں جنگل میں میمونہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوئیں۔

آنحضرت صلعم کے تعدّد ازواج پر اعتراض کا جواب

یہ واقعہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو ایسی مختصر سیرت میں بیان کیا جاتا جس قسم کی سیرت میں اس وقت لکھ رہا ہوں۔ لیکن اس واقعہ کا ایک ایسا پہلو ہے جو مجھے مجبور کرتا ہے کہ اس معمولی سے واقعہ کو اس جگہ لکھ دُوں اور وہ یہ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُن کی کئی بیویاں تھیں اور یہ کہ آپ کا یہ فعل نعوذ باللہ من ذالک عیّاشی پر مبنی تھا۔ مگر جب ہم اس تعلق کو دیکھتے ہیں جو آپ کی بیویوں کو آپ کے ساتھ تھا تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ آپ کا تعلق ایسا پاکیزہ، ایسا بے لوث اور ایسا روحانی تھا کہ کسی ایک بیوی والے مرد کا تعلق بھی اپنی بیوی سے ایسا نہیں ہوتا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اپنی بیویوں سے عیاشی کا ہوتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے تھا کہ آپ کی بیویوں کے دل کسی روحانی جذبہ سے متاثر نہ ہوتے۔ مگر آپ کی بیویوں کے دل میں آپ کی جو محبت تھی اور آپ سے جو نیک اثر انہوں نے لیا تھا وہ بہت سے ایسے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی بیویوں کے متعلق تاریخ سے ثابت ہیں۔ مثلاً یہی واقعہ کتنا چھوٹا سا تھا کہ میمونہؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلی دفعہ حرم سے باہر ایک خیمہ میں ملیں۔ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اُن سے تعلق کوئی جسمانی تعلق ہوتا، اور اگر

آپ بعض بیویوں کو بعض پر ترجیح دینے والے ہوتے تو میمونہؓ اس واقعہ کو اپنی زندگی کا کوئی اچھا واقعہ نہ سمجھتیں بلکہ کوشش کرتیں کہ یہ واقعہ اُن کی یاد سے بھول جائے۔ لیکن میمونہؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پچاس سال زندہ رہیں اور اسّی سال کی ہو کر فوت ہوئیں۔ مگر اس برکت والے تعلق کو وہ ساری عمر بھلا نہ سکیں۔ اسّی سال کی عمر میں جب جوانی کے جذبات سب سرد ہو چکے ہوتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس سال بعد جو عرصہ ایک مستقل عمر کہلانے کا مستحق ہے میمونہؓ فوت ہوئیں۔ اور اس وقت انہوں نے اپنے اردگرد کے لوگوں سے درخواست کی کہ جب مَیں مر جاؤں تو مکّہ کے باہر ایک منزل کے فاصلہ پر اس جگہ جس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ تھا اور جس جگہ پہلی دفعہ مجھے آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا میری قبر بنائی جائے اور اُس میں مجھے دفن کیا جائے۔ دنیا میں سچے نوادر بھی ہوتے ہیں اور قصّے کہانیاں بھی۔ مگر سچّے نوادر میں سے بھی اور قصّے کہانیوں میں سے بھی کیا کوئی واقعہ اس گہری محبت سے زیادہ پُر تاثیر پیش کیا جا سکتا ہے؟

خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا قبولِ اسلام

زیارتِ کعبہ سے واپسی کے بعد جلد ہی دو ایسے آدمی اسلام میں داخل ہوئے جو اسلامی جنگوں کے شروع سے لیکر اس وقت تک کفار کے زبردست جرنیلوں میں شامل تھے اور جو اسلام لانیکے بعد اسلام کے ایسے مشہور جرنیل ثابت ہوئے کہ تاریخ اسلام میں سے ان لوگوں کا نام مٹایا نہیں جا سکتا۔ یعنی خالد بن ولیدؓ جس نے بعد میں روما کی حکومت کی بنیادیں ہلا دیں اور علاقہ کے بعد علاقہ فتح کر کے اسلامی حکومت میں داخل کیا۔ اور عمرو بن العاص جنہوں نے مصر کو فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیا۔

جنگ موتہ

جب آپ زیارتِ کعبہ سے واپس آئے تو آپ کو اطلاعات ملنی شروع ہوئیں کہ شام کی سرحد پر عیسائی عرب قبائل یہودیوں اور کفار کے اُکسانے پر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے پندرہ آدمیوں کی ایک پارٹی اس غرض کے لیے شام کی سرحد پر بھجوائی کہ وہ تحقیقات کریں کہ یہ افواہیں کہاں تک صحیح ہیں۔ جب یہ لوگ شامی سرحد پر پہنچے تو وہاں دیکھا کہ ایک لشکر جمع ہو رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ لوگ واپس آ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دیتے تبلیغ کا جوش جو اس زمانہ میں مومن کی سچی علامت ہوا کرتا تھا ان پر غالب آگیا اور دلیری سے آگے بڑھکر اُنہوں نے اُن لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کر دی۔ جو لوگ دشمنوں کے اُکسائے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن پر حملہ کر کے اُسے فتح کرنا چاہتے تھے وہ ان لوگوں کی توحید کی تعلیم سے بھلا کہاں متاثر ہو سکتے تھے۔ جونہی اِن لوگوں نے اُن کو اسلام کی تعلیم سُنانی شروع کی۔ چاروں طرف سے سپاہیوں نے کمانیں سنبھال لیں اور اُن پر تیر برسانے شروع کر دیئے جب مسلمانوں نے دیکھا کہ ہماری تبلیغ کا جواب بجائے دلائل اور براہین پیش کرنے کے یہ لوگ تیر پھینک رہے ہیں، تو وہ بھاگے نہیں اور اس سینکڑوں ورہزاروں کے مجمع سے انہوں نے اپنی جانیں نہیں بچائیں۔ بلکہ سچے مسلمانوں کے طور پر وہ پندرہ آدمی اِن سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کے مقابلہ پر ڈٹ گئے اور سارے کے سارے وہیں مر کر ڈھیر ہو گئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ایک اور لشکر بھجکر ان لوگوں کو سزا دیں جنہوں نے ایسا ظالمانہ فعل کیا تھا۔ اتنے میں آپ کو اطلاع ملی کہ وہ لشکر جو وہاں جمع ہو رہے تھے پراگندہ ہو گئے ہیں اور آپ نے کچھ مدت کے لیے اس ارادہ کو ملتوی کر دیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی دوران میں غسان قبیلہ کے رئیس کو جو رومی حکومت کی طرف سے بصرہ کا حاکم تھا یا خود قیصر روما کو ایک خط لکھا۔ غالباً اس خط میں مذکورہ بالا واقعہ کی شکایت ہو گی کہ بعض شامی قبائل اسلامی علاقہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور یہ کہ انہوں نے بلا وجہ پندرہ مسلمانوں کو قتل کر دیا ہے۔ یہ خط الحرث نامی ایک صحابی کے ہاتھ بھجوایا گیا تھا۔ وہ شام کی طرف جاتے ہوئے موتہ نامی ایک مقام پر ٹھہرے جہاں غسان قبیلہ کا ایک رئیس سرجیل نامی جو قیصر کے مقرر کردہ حکام میں سے تھا انہیں ملا۔ اور اس نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو شاید تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغامبر ہو؟ انہوں نے کہا ہاں۔ اس پر اس نے انکو گرفتار کر لیا اور رسیوں سے باندھ کر مار مار کر انہیں مار دیا۔ گو تاریخ میں اس کی تشریح نہیں آتی لیکن یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جس لشکر نے پہلے پندرہ صحابیوں کو مارا تھا یہ شخص اسکے لیڈروں میں سے ہو گا۔ چنانچہ اس کا یہ سوال کرنا کہ شاید تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغامبروں میں سے ہو بتاتا ہے کہ اس کو خوف تھا کہ محمد رسول اللہ قیصر کے پاس شکایت کرینگے کہ تمہارے علاقہ کے لوگ ہمارے علاقہ کے لوگوں پر حملہ کرتے ہیں اور وہ ڈرتا ہو گا کہ شاید بادشاہ اس کی وجہ سے ہم سے باز پرس نہ کرے پس اس نے اپنی خیر اسی میں سمجھی کہ پیغامبر کو مار دے تا کہ نہ پیغام پہنچے اور نہ کوئی تحقیقات ہو۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اس کے ان بدارادوں کو پورا نہ ہونے دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حرث رضؓ کے مارے جانے کی خبر کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گئی اور آپ نے اس پہلے واقعہ اور اس واقعہ کی سزا دینے کے لیے تین ہزار کا لشکر تیار کر کے زید بن حارثہ رضؓ (جو آپکے آزاد کردہ غلام تھے اور جن کا آپ کی مکی زندگی میں ذکر آ چکا ہے) کی ماتحتی میں شام کی طرف بھجوایا اور حکم دیا کہ زید بن حارثہ رضؓ فوج کے کمانڈر رہوں گے۔ اور اگر وہ مارے گئے تو جعفر بن ابی طالب کمانڈر رہوں گے اور اگر وہ مارے گئے تو عبداللہ بن رواحہ کمانڈر ہونگے۔ اور اگر وہ بھی مارے جائیں تو مسلمان اپنے میں سے کسی کو منتخب کر کے اپنا افسر بنا لیں۔ اس وقت ایک یہودی آپ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا اے ابو القاسم! اگر آپ سچے ہیں تو یہ تینوں آدمی ضرور مارے جائیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں کو پورا کر دیا کرتا ہے۔ پھر وہ زیدؓ کی طرف مخاطب ہوا اور کہا میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے نبی ہیں تو تم کبھی زندہ واپس نہیں آؤ گے۔ زیدؓ نے اسکو جواب میں کہا میں واپس آؤں یا نہ آؤں مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے نبی ہیں۔ دوسرے دن صبح کے وقت یہ لشکر روانہ ہوا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اس کو چھوڑنے کے لیے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کی افسری کے بغیر اتنا بڑا لشکر کسی جرنیل کے ماتحت کسی اہم کام کے لیے نہیں گیا تھا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس لشکر کے ساتھ ساتھ چلتے جاتے تھے اور انہیں نصیحتیں کرتے جاتے تھے۔ آخر مدینہ کے باہر اس مقام پر جا کر جہاں سے آپ مدینہ میں داخل ہوئے تھے اور جس جگہ پر عام طور پر مدینہ والے اپنے مسافروں کو رخصت کیا کرتے تھے، آپ کھڑے ہو گئے اور کہا میں تم کو اللہ کے تقوی کی نصیحت

کرتا ہوں اور تمہارے ساتھ جتنے مسلمان ہیں اُن سے نیک سلوک کرنے کی۔ تم اللہ کا نام لیکر جنگ پر جاؤ اور تمہارے اور خدا کے دشمن جو شام میں ہیں اُن سے جا کر لڑائی کرو۔ جب تم شام میں پہنچو گے تو وہاں تمہیں ایسے لوگ ملیں گے جو عبادتگاہوں میں بیٹھ کر خدا کا نام لیتے ہیں تم اُن سے کسی قسم کا تعرض نہ کرنا اور نہ انہیں تکلیف پہنچانا۔ اور نہ دشمن کے ملک میں کسی عورت کو مارنا اور نہ کسی بچے کو مارنا اور نہ کسی اندھے کو مارنا اور نہ کسی بڈھے کو مارنا۔ نہ کوئی درخت کاٹنا نہ عمارت گرانا۔ یہ نصیحت کر کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وہاں سے واپس لوٹے اور اسلامی لشکر شام کی طرف روانہ ہوا۔ یہ پہلا لشکر تھا جو اسلام کی طرف سے عیسائیت کے مقابلہ کیلئے نکلا جب یہ لشکر شام کی سرحد پر پہنچا تو اُسے معلوم ہُوا کہ قیصر بھی اس طرف آیا ہُوا ہے اور ایک لاکھ رومی سپاہی اسکے ساتھ ہیں اور ایک لاکھ کے قریب عرب کے عیسائی قبائل کے سپاہی بھی اُس کے ساتھ ہیں۔ اِس پر مسلمانوں نے چاہا کہ وہ راستہ میں ڈیرہ ڈالدیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دیں۔ تا کہ اگر آپ نے کوئی اور مدد بھیجنی ہو تو مدد بھیجدیں اور اگر کوئی حکم دینا ہو تو اُس سے اطلاع دیں جب یہ مشورہ ہو رہا تھا، عبداللہ بن رواحہؓ جوش سے کھڑے ہو گئے اور کہا اے قوم! تم اپنے گھروں سے خدا کے راستہ میں شہید ہونیکے لیے نکلے تھے اور جس چیز کے لیے تم نکلے تھے اب اُس سے گھبرا رہے ہو۔ اور ہم لوگوں سے اپنی تعداد اور اپنی قوت اور اپنی کثرت کی وجہ سے تو لڑائیاں نہیں کرتے رہے۔ ہم تو اس دین کی مدد کے لیے دشمنوں سے لڑتے رہے ہیں۔ جو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمارے لیئے نازل کیا ہے۔ اگر دشمن زیادہ ہے تو ہُوا کیا۔ آخر دو نیکیوں میں سے ہم کو ایک ضرور ملیگی۔ یا ہم غالب آجائیں گے یا ہم خدا کی راہ میں شہید ہو جائیں گے۔ لوگوں نے اُن کی یہ بات سُن کے کہا ابن رواحہؓ بالکل سچ کہتے ہیں اور فوراً کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ جب وہ آگے بڑھے تو رومی لشکر اُنہیں اپنی طرف بڑھتا ہُوا نظر آیا تو مسلمانوں نے موتہ کے مقام پر اپنی فوج کی صف بندی کرلی اور لڑائی شروع ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں زید بن حارثہ جو مسلمانوں کے کمانڈر تھے مارے گئے تب اسلامی فوج کا جھنڈا جعفر بن ابی طالبؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فوج کی کمان سنبھال لی۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ دشمن کی فوج کا ریلا بڑھتا چلا جاتا ہے اور مسلمان اپنی تعداد کی قلت کی وجہ سے اُن کے دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتے تو آپ جوش سے گھوڑے سے کُود پڑے اور اپنے گھوڑے کی ٹانگیں کاٹ دیں جس کے معنے یہ تھے کہ کم سے کم مَیں تو اس میدان سے بھاگنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ مَیں موت کو پسند کرونگا مگر بھاگنے کو پسند نہیں کرونگا۔ یہ ایک عربی رواج تھا۔ وہ گھوڑے کی ٹانگیں اس لیے کاٹ دیتے تھے تا کہ وہ بغیر سوار کے اِدھر اُدھر بھاگ کر لشکر میں تباہی نہ مچائے۔ تھوڑی دیر کی لڑائی میں آپ کا دایاں بازو کاٹا گیا۔ تب آپ نے بائیں ہاتھ سے جھنڈا پکڑ لیا۔ پھر آپ کا بایاں ہاتھ بھی کاٹا گیا۔ تو آپ نے دونوں ہاتھوں کے ٹنڈوں سے جھنڈے کو اپنے سینہ سے لگا لیا اور میدان میں کھڑے رہے یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے۔ تب عبداللہ بن رواحہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ماتحت جھنڈے کو پکڑ لیا اور وہ بھی دشمن سے لڑتے لڑتے مارے گئے۔ اُس وقت مسلمانوں کے لیے کوئی موقعہ نہ تھا کہ وہ مشورہ کر کے کسی کو اپنا سردار مقرر کرتے اور قریب تھا کہ دشمن کے لشکر کی کثرت کی وجہ سے مسلمان میدان چھوڑ جاتے کہ خالد بن ولید نے ایک دوست کی تحریک پر جھنڈا پکڑ لیا اور شام تک دشمن کا مقابلہ کرتے رہے۔

دوسرے دن پھر خالد اپنے تھکے ہوئے اور زخم خوردہ لشکر کو لیکر دشمن کے مقابلہ کے لیے نکلے اور انہوں نے یہ ہوشیاری کی کہ لشکر کے اگلے حصّہ کو پیچھے کر دیا اور پچھلے حصّہ کو آگے کر دیا۔ اور دائیں کو بائیں اور بائیں کو دائیں اور اس طرح نعرے لگائے کہ دشمن سمجھا کہ مسلمانوں کو اور مدد پہنچ گئی ہے اس پر دشمن پیچھے ہٹ گیا اور خالدؓ اسلامی لشکر کو بچا کر واپس لوٹ آئے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اِس واقعہ کی خبر اُسی دن وحی کے ذریعہ سے دیدی اور آپ نے اعلان کر کے سب مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا۔ جب آپ ممبر پر چڑھے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اے لوگو! میں تم کو اس جنگ میں جانے والے لشکر کے متعلق خبر دیتا ہوں۔ وہ لشکر یہاں سے جا کر دشمن کے مقابلہ میں کھڑا ہوا۔ اور لڑائی شروع ہونے پر پہلے زیدؓ مارے گئے۔ پس تم لوگ زیدؓ کے لیے دُعا کرو۔ پھر جھنڈے کو جعفرؓ نے پکڑ لیا اور دشمن پر حملہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ بھی مارے گئے۔ پس تم اُس کے لیے بھی دعا کرو۔ پھر جھنڈے کو عبداللہ بن رواحہؓ نے پکڑ لیا اور خوب دلیری سے لشکر کو لڑایا مگر آخر وہ بھی شہید ہو گئے۔ پس تم اُن کے لیے بھی دعا کرو۔ پھر جھنڈے کو خالد بن ولیدؓ نے پکڑ لیا۔ اُس کو میں نے کمانڈر مقرر نہیں کیا تھا مگر اُس نے اپنے آپ کو آپ ہی کمانڈر مقرر کر لیا۔ لیکن وہ خدا تعالےٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے پس وہ خدا تعالےٰ کی مدد سے اسلامی لشکر کو بحفاظت واپس لیکر لوٹا۔ آپ کی اِس تقریر کی وجہ سے خالدؓ کا نام مسلمانوں میں خدا کی تلواروں میں سے ایک تلوار مشہور ہو گیا۔ چونکہ خالد آخر میں ایمان لائے تھے بعض صحابہ اُن کو مذاقاً یا کسی جھگڑے کے موقعہ پر طعنہ دے دیا کرتے تھے ایک دفعہ کسی ایسی ہی بات پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے اُن کی تکرار ہو گئی۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خالد کی شکایت کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خالد! تم اِس شخص کو جو کہ بدر کے وقت سے اسلام کی خدمت کر رہا ہے کیوں دُکھ دیتے ہو اگر تم اُحد کے برابر بھی سونا خرچ کرو تو اُسکے برابر خدا تعالیٰ سے انعام حاصل نہیں کر سکتے۔ اس پر خالدؓ نے کہا یا رسول اللہ! یہ مجھے طعنہ دیتے ہیں تو پھر میں بھی جواب دیدیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ خالد کو تکلیف نہ دیا کرو۔ یہ اللہ تعالےٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے جو خدا تعالیٰ نے کفار کی ہلاکت کیلئے کھینچی ہے۔ یہ پیشگوئی چند سالوں بعد حرف بحرف پوری ہوئی۔ جب خالد اپنے لشکر کو واپس لائے تو مدینہ کے صحابہؓ جو ساتھ نہ گئے تھے انہوں نے اس لشکر کے سپاہیوں کو بھگوڑے کہنا شروع کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ تم کو وہیں لڑ کر مر جانا چاہیئے تھا واپس نہیں آنا چاہیئے تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بھگوڑے نہیں بار بار لوٹ کر دشمن پر حملہ کرنے والے سپاہی ہیں۔ اِس طرح آپ نے اُن آئندہ جنگوں کی پیشگوئی فرمائی جو مسلمانوں کو شام کے ساتھ پیش آنے والی تھیں۔

فتح مکّہ

آٹھویں سنہ ہجری کے رمضان کے مہینہ مطابق دسمبر ۶۲۹ء میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُس آخری جنگ کے لیے نکلے جس نے عرب میں اسلام کو قائم کر دیا۔ یہ واقعہ یُوں ہُوا کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر یہ فیصلہ ہُوا تھا کہ عرب قبائل میں سے جو چاہیں مکّہ والوں سے مل جائیں اور جو چاہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل جائیں اور یہ کہ دس سال تک

دونوں فریق کو ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کی اجازت نہیں ہوگی۔سوائے اِس کے کہ ایک دوسرے پر حملہ کر کے معاہدہ کو توڑ دے اِس معاہدہ کے ماتحت عرب کا قبیلہ بنو بکر مکّہ والوں کے ساتھ تھا اور خزاعہ قبیلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل گیا۔کفارِ عرب معاہدہ کی پابندی کا کم ہی خیال رکھتے تھے خصوصاً مسلمانوں کے مقابلہ میں۔چنانچہ بنو بکر کو چونکہ خزاعہ قبیلہ کے ساتھ پُرانا اختلاف تھا۔صلح حدیبیہ پر کچھ عرصہ گذرنے کے بعد اُنہوں نے مکّہ والوں سے مشورہ کیا کہ خزاعہ تو معاہدہ کی وجہ سے بالکل مطمئن ہیں اب موقعہ ہے کہ ہم لوگ اُن سے بدلہ لیں۔چنانچہ مکّہ کے قریش اور بنو بکر نے ملکر رات کو بنی خزاعہ پر چھاپا مارا اور ان کے بہت سے آدمی مار دیئے۔خزاعہ کو جب معلوم ہُوا کہ قریش نے بنو بکر سے مِلکر یہ حملہ کیا ہے تو انہوں نے فوراً چالیس آدمی تیز اونٹوں پر چڑھا کر مدینہ میں اس بدعہدی کی اطلاع دینے کے لیے روانہ کیے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ باہمی معاہدہ کی رُو سے اب آپ کا فرض ہے کہ ہمارا بدلہ لیں اور مکّہ پر چڑھائی کریں۔جب یہ قافلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا تمہارا دُکھ میرا دُکھ ہے میں اپنے معاہدہ پر قائم ہوں۔یہ بادل جو سامنے برس رہا ہے (اُس وقت بارش ہو رہی تھی) جس طرح اس میں سے بارش گر رہی ہے اِسی طرح جلدی ہی تمہاری مدد کے لیے اسلامی فوجیں پہنچ جائینگی۔جب مکّہ والوں کو اس وفد کا علم ہُوا تو وہ بہت گھبرائے اور اُنہوں نے ابوسفیان کو مدینہ روانہ کیا، تاکہ وہ کسی طرح مسلمانوں کو حملہ سے باز رکھے۔ابوسفیان نے مدینہ پہنچکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زور دینا شروع کیا کہ چونکہ صلح حدیبیہ کے وقت میں موجود نہیں تھا اس لیے نئے سرے سے معاہدہ کیا جائے۔لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسکی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔کیونکہ جواب دینے سے راز ظاہر ہو جاتا تھا۔ابوسفیان نے مایوسی کی حالت میں گھبرا کر مسجد میں کھڑے ہو کر اعلان کیا۔اے لوگو! میں مکّہ والوں کی طرف سے نئے سرے سے آپ لوگوں کے لیے امن کا اعلان کرتا ہوں۔یہ بات سُنکر مسلمان اُس کی بیوقوفی پر ہنس پڑے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ابوسفیان! یہ بات تم یکطرفہ کہہ رہے ہو ہم نے کوئی ایسا معاہدہ تم سے نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی دوران میں چاروں طرف مسلمان قبائل کیطرف پیغامبر بھجوا دیئے اور جب یہ اطلاعیں آچکیں کہ مسلمان قبائل تیار ہو چکے ہیں اور مکّہ کی طرف کوچ کرتے ہوئے رستہ میں ملتے جائینگے تو آپ نے مدینہ کے لوگوں کو مسلّح ہونیکا حکم دیا۔جنوری کی پہلی تاریخ کو یہ لشکر مدینہ سے روانہ ہُوا اور راستہ میں چاروں طرف مسلمان قبائل آآکر ملنے شروع ہوئے چند ہی منزلیں طے کرنیکے بعد جب یہ لشکر فاران کے جنگل میں داخل ہُوا تو اُس کی تعداد سلیمانؑ نبی کی پیشگوئی کے مطابق دس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔اِدھر تو یہ لشکر مکّہ کی طرف مارچ کرتا چلا جا رہا تھا اور اُدھر مکّہ والے اس خاموشی کی وجہ سے جو فضا پر طاری تھی زیادہ سے زیادہ خوف زدہ ہوتے جاتے تھے۔آخر اُنہوں نے مشورہ کر کے ابوسفیان کو پھر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مکّہ سے باہر نکل کر پتہ تو لے کہ مسلمان کیا کرنا چاہتے ہیں۔مکّہ سے ایک منزل باہر نکلنے پر ہی ابوسفیان نے رات کے وقت جنگل کو آگ سے روشن پایا۔رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیدیا تھا کہ تمام خیموں کے آگے آگ جلائی جائے۔جنگل میں دس ہزار اشخاص کے لیے خیموں کے آگے بھڑکتی ہوئی آگ ایک ہیبت ناک نظارہ پیش کر رہی تھی۔ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا یہ کیا ہے کیا آسمان سے کوئی لشکر اُترا ہے۔کیونکہ عرب کی کسی قوم کا

لشکر اتنا بڑا نہیں ہے۔ اُس کے ساتھیوں نے مختلف قبائل کے نام لیے۔ لیکن اُس نے کہا نہیں نہیں، عرب کی کسی قوم کا لشکر بھی اتنا بڑا نہیں۔ ابھی وہ یہ بات کر ہی رہا تھا کہ اندھیرے میں سے آواز آئی ابو حنظلہ! (یہ ابوسفیان کی کنیت تھی) ابوسفیان نے کہا۔ عباس! تم یہاں کہاں؟ اُنہوں نے جواب دیا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا لشکر سامنے پڑا ہے اور اگر تم لوگوں نے جلدی کوئی تدبیر نہ کی تو شکست اور ذلّت تمہارے لیے مقدّر ہو چکی ہے۔ چونکہ وہ ابوسفیان کے پُرانے دوست تھے یہ بات کرنے کے بعد انہوں نے ابوسفیان سے اصرار کیا کہ وہ اُن کے ساتھ سواری پر بیٹھ جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو۔ چنانچہ اُنہوں نے اُس کا ہاتھ کھینچکر اُونٹ پر اپنے ساتھ بٹھالیا اور اُونٹ کو ایڑی لگا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پہنچے۔ حضرت عباس ڈرتے تھے کہ حضرت عمرؓ جو اُن کے ساتھ پہرہ پر مقرر تھے کہیں اُس کو قتل نہ کر دیں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی فرما چکے تھے کہ اگر ابوسفیان تم میں سے کسی کو ملے تو اُسے قتل نہ کرنا۔ جب اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ابوسفیان کو حاضر کیا تو یہ سارا نظارہ ابوسفیان کے دل میں ایک عظیم الشان تغیّر پیدا کر چکا تھا۔ ابوسفیان نے دیکھا کہ چند ہی سال پہلے ہمنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ایک ساتھی کے ساتھ مکّہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن ابھی سات ہی سال گذرے ہیں کہ وہ دس ہزار قدوسیوں سمیت مکّہ پر بلا ظلم اور بلا تعدی کے جائز طور پر حملہ آور ہُوا ہے اور مکّہ والوں میں طاقت نہیں کہ اس کو روک سکیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مجلس تک پہنچتے ہوئے کچھ ان خیالات کی وجہ سے اور کچھ دہشت اور خوف کی وجہ سے ابوسفیان مبہوت سا ہو چکا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی حالت کو دیکھا تو فرمایا۔ عباس! ابوسفیان کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور رات اپنے پاس رکھو صبح اسے میرے پاس لانا۔ چنانچہ رات ابوسفیان حضرت عباسؓ کے ساتھ رہا۔ جب صبح اُسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تو فجر کی نماز کا وقت تھا۔ مکّہ کے لوگ صبح اُٹھ کر نماز پڑھنے کو کیا جانتے تھے۔ اُس نے اِدھر اُدھر مسلمانوں کو پانی کے بھرے ہوئے لوٹے لیکر دوڑتے دیکھا اور اُسے نظر آیا کہ کوئی وضو کر رہا ہے کوئی صف بندی کر رہا ہے تو ابوسفیان نے گھبراہٹ میں سمجھا کہ شاید میرے لیے کوئی نئی قسم کا عذاب تجویز ہُوا ہے۔ چنانچہ اُس نے گھبرا کر حضرت عباسؓ سے پوچھا کہ یہ لوگ صبح صبح یہ کیا کر رہے ہیں۔ حضرت عباسؓ نے کہا تمہارے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں یہ لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں۔ اس کے بعد ابوسفیان نے دیکھا کہ ہزاروں ہزار مسلمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو گئے ہیں اور جب آپ رکوع کرتے ہیں تو سب کے سب رکوع کرتے ہیں اور جب آپ سجدہ کرتے ہیں تو سب کے سب سجدہ کرتے ہیں۔ حضرت عباسؓ چونکہ پہرہ پر ہونے کی وجہ سے نماز میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ابوسفیان نے اُن سے پوچھا اب یہ کیا کر رہے ہیں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ جو کچھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں وہی کچھ یہ لوگ کرنے لگ جاتے ہیں۔ عباس نے کہا تم کن خیالات میں پڑے ہو، یہ نماز ادا ہو رہی ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان کو حکم دیں کہ کھانا پینا چھوڑ دو تو یہ لوگ کھانا اور پینا بھی چھوڑ دیں۔ ابوسفیان نے کہا۔ مَیں نے کسریٰ کا دربار بھی دیکھا ہے اور قیصر کا بھی دربار دیکھا ہے لیکن مَیں نے کسی جماعت کو اُس کا اتنا فدائی نہیں دیکھا جتنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جماعت اُس کی فدائی ہے۔ پھر عباسؓ نے کہا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے آج یہ درخواست کرو کہ اپنی قوم سے عفو کا معاملہ کریں۔ جب نماز ختم ہو چکی تو حضرت عباسؓ ابوسفیان کو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ ابوسفیان کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تجھ پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ؟ ابوسفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ نہایت ہی حلیم، نہایت ہی شریف اور نہایت ہی صلہ رحمی کرنیوالے انسان ہیں۔ میں اب یہ بات تو سمجھ چکا ہوں کہ اگر خدا کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو کچھ تو ہماری مدد کرتا۔ اسکے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوسفیان کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم سمجھ لو کہ میں اللہ کا رسول ہوں ؟ ابوسفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اس بارہ میں ابھی میرے دل میں کچھ شبہات ہیں۔ مگر ابوسفیان کے تردّد کے باوجود اُس کے دونوں ساتھی جو اُس کے ساتھ ہی مکّہ سے باہر مسلمانوں کے لشکر کی خبر لینے کے لیے آئے تھے اور جن میں سے ایک حکیم بن حزام تھے وہ مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد ابوسفیان بھی اسلام لے آیا، مگر اُس کا دل غالباً فتح مکّہ کے بعد پوری طرح کھلا۔ ایمان لانے کے بعد حکیم بن حزام نے کہا۔ یا رسول اللہ! کیا یہ لشکر آپ اپنی قوم کو ہلاک کرنے کے لیے اُٹھا لائے ہیں ؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان لوگوں نے ظلم کیا۔ اِن لوگوں نے گناہ کیا اور تم لوگوں نے حدیبیہ میں باندھے ہوئے عہد کو توڑ دیا اور خزاعہ کے خلاف ظالمانہ جنگ کی اُس مقدس مقام پر جنگ کی جس کو خدا نے امن عطا فرمایا ہوا تھا۔ حکیم نے کہا یا رسول اللہ ٹھیک ہے آپ کی قوم نے بیشک ایسا ہی کیا ہے لیکن آپ کو تو چاہیئے تھا کہ بجائے مکّہ پر حملہ کرنے کے ہوازن قوم پر حملہ کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ قوم بھی ظالم ہے۔ لیکن میں خدا سے امید کرتا ہوں کہ وہ مکّہ کی فتح اور اسلام کا غلبہ اور ہوازن کی شکست یہ ساری باتیں ہی میرے ہاتھ پر پوری کرے گا۔ اس کے بعد ابوسفیان نے کہا یا رسول اللہ! اگر مکّہ کے لوگ تلوار نہ اُٹھائیں تو کیا وہ امن میں ہوں گے ؟ آپ نے فرمایا ہاں! ہر شخص جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اُسے امن دیا جائے گا۔ حضرت عباسؓ نے کہا یا رسول اللہ ابوسفیان فخر پسند آدمی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میری عزت کا بھی کوئی سامان کیا جائے۔ آپ نے فرمایا بہت اچھا جو شخص ابوسفیان کے گھر میں گھس جائے اُس کو بھی امن دیا جائے گا۔ جو مسجد کعبہ میں گھس جائے اُس کو بھی امن دیا جائے گا۔ جو اپنے ہتھیار پھینکدے اُس کو بھی امن دیا جائیگا۔ جو اپنا دروازہ بند کرکے بیٹھ رہے اس کو بھی امن دیا جائے گا۔ جو حکیم بن حزام کے گھر میں گھس جائے اُس کو بھی امن دیا جائے گا۔ اِس کے بعد ابی رویحہؓ جن کو آپ نے بلالؓ حبشی غلام کا بھائی بنایا ہوا تھا اُن کے متعلق آپ نے فرمایا۔ ہم اس وقت ابی رویحہؓ کو اپنا جھنڈا دیتے ہیں جو شخص ابی رویحہؓ کے جھنڈے کے نیچے کھڑا ہو گا ہم اُس کو بھی کچھ نہ کہیں گے۔ اور بلالؓ کو کہا تم ساتھ ساتھ یہ اعلان کرتے جاؤ کہ جو شخص ابی رویحہؓ کے جھنڈے کے نیچے آجائیگا اُس کو امن دیا جائے گا۔ اِس حکم میں کیا ہی لطیف حکمت تھی۔ مکّہ کے لوگ بلالؓ کے پیروں میں رسّی ڈالکر اُس کو گلیوں میں کھینچا کرتے تھے۔ مکّہ کی گلیاں مکّہ کے میدان بلالؓ کے لیے امن کی جگہ نہیں تھے بلکہ عذاب اور تذلیل اور تضحیک کی جگہ تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سمجھا کہ بلالؓ کا دل آج انتقام کی طرف بار بار مائل ہوتا ہو گا اِس وفادار ساتھی کا انتقام لینا بھی نہایت ضروری ہے۔ مگر یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا انتقام اسلام کی شان کے مطابق ہو۔ پس آپ نے بلالؓ کا انتقام اس طرح نہ لیا کہ تلوار کے ساتھ اُس کے دشمنوں کی گردنیں کاٹ

دی جائیں بلکہ اُس کے بھائی کے ہاتھ میں ایک بڑا جھنڈا دیکر کھڑا کر دیا اور بلالؓ کو اس غرض کیلئے مقرر کر دیا کہ وہ اعلان کرے کہ جو کوئی میرے بھائی کے جھنڈے کے نیچے آ کر کھڑا ہو گا اُسے امن دیا جائیگا۔ کیسا شاندار یہ انتقام تھا۔ کیسا حسین یہ انتقام تھا جب بلالؓ بلند آواز سے یہ اعلان کرتا ہو گا اے مکہ والو! آؤ میرے بھائی کے جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو جاؤ تمہیں امن دیا جائیگا تو اس کا دل خود ہی انتقام کے جذبات سے خالی ہوتا جاتا ہو گا اور اُس نے محسوس کر لیا ہو گا کہ جو انتقام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے تجویز کیا ہے اِس سے زیادہ شاندار اور اس سے زیادہ حسین انتقام میرے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

جب لشکر مکہ کی طرف بڑھا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ کسی سڑک کے کونے پر ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں کو لیکر کھڑے ہو جاؤ تاکہ وہ اسلامی لشکر اور اس کی فدائیت کو دیکھ سکیں۔ حضرت عباسؓ نے ایسا ہی کیا اور ایک کے بعد ایک کر کے ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں کے سامنے عرب کے وہ قبائل گذرنے شروع ہوئے جن کی امداد پر مکہ بھروسہ کر رہا تھا، مگر آج وہ کفر کا جھنڈا نہیں لہرا رہے تھے آج وہ اسلام کا جھنڈا لہرا رہے تھے اور اُنکی زبان پر خدائے قادر کی توحید کا اعلان تھا۔ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جان لینے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہے تھے جیسا کہ مکہ والے امید کرتے تھے بلکہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کیلئے تیار تھے اور اُن کی انتہائی خواہش یہی تھی کہ خدائے واحد کی توحید اور اُس کی تبلیغ کو دنیا میں قائم کر دیں۔ لشکر کے بعد لشکر گذر رہا تھا کہ اتنے میں اشجع قبیلے کا لشکر گذرا۔ اسلام کی محبت اور اس کے لیے قربان ہونے کا جوش اُن کے چہروں سے عیاں اور اُن کے نعروں سے ظاہر تھا۔ ابوسفیان نے کہا۔ عباس! یہ کون ہیں؟ عباسؓ نے کہا یہ اشجع قبیلہ ہے۔ ابوسفیان نے حیرت سے عباسؓ کا مُنہ دیکھا اور کہا سارے عرب میں ان سے زیادہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ عباسؓ نے کہا یہ خدا کا فضل ہے جب اُس نے چاہا اُن کے دلوں میں اسلام کی محبت داخل ہو گئی۔ سب سے آخر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مہاجرینؓ انصار کا لشکر لیکر گذرے۔ یہ دو ہزار کی تعداد میں تھے اور سر سے پاؤں تک زرہ بکتروں میں چھپے ہوئے تھے حضرت عمرؓ اُن کی صفوں کو درست کرتے چلے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ قدموں کو سنبھال کر چلو تاکہ صفوں کا فاصلہ ٹھیک رہے۔ اِن پُرانے فدا کارانِ اسلام کا جوش اور اُن کا عزم اور اُن کا ولولہ اُن کے چہروں سے پھوٹ پھوٹ پڑتا تھا۔ ابوسفیان نے اُن کو دیکھا تو اُس کا دل دہل گیا۔ اُس نے پوچھا عباس یہ کون لوگ ہیں؟ اُنہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار و مہاجرین کے لشکر میں جا رہے ہیں۔ ابوسفیان نے جواب دیا اس لشکر کا مقابلہ کرنے کی دنیا میں کس کو طاقت ہے۔ پھر وہ حضرت عباسؓ سے مخاطب ہوا اور کہا عباس! تمہارے بھائی کا بیٹا آج دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ ہو گیا ہے عباسؓ نے کہا اب بھی تیرے دل کی آنکھیں نہیں کھلیں یہ بادشاہت نہیں یہ تو نبوت ہے۔ ابوسفیان نے کہا ہاں ہاں اچھا پھر نبوت ہی سہی۔ جس وقت یہ لشکر ابوسفیان کے سامنے سے گذر رہا تھا انصار کے کمانڈر سعد بن عبادہؓ نے ابوسفیان کو دیکھ کر کہا آج خدا نے ہمارے لیے مکہ میں داخل ہونا تلوار کے زور سے حلال کر دیا ہے۔ آج قریشی قوم کو ذلیل کر دیا جائے گا۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابوسفیان کے پاس سے گذرے تو اُس نے بلند آواز سے کہا یا رسول اللہ!

کیا آپ نے اپنی قوم کے قتل کی اجازت دیدی ہے؟ ابھی ابھی انصار کے سردار سعدؓ اور اُن کے ساتھی ایسا ویسا کہہ رہے تھے۔ انہوں نے آپ سے یہ کہا ہے آج لڑائی ہو گی اور مکّہ کی حرمت آج ہم کو لڑائی سے باز نہیں رکھ سکے گی اور قریش کو ہم ذلیل کر کے چھوڑینگے یارسول اللہ آپ تو دنیا میں سب سے زیادہ نیک، سب سے زیادہ رحیم اور سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے انسان ہیں۔ کیا آج اپنی قوم کے ظلموں کو بھول نہ جائیں گے؟ ابوسفیان کی یہ شکایت سنکر وہ مہاجرین جن کو مکّہ کی گلیوں میں پیٹا اور مارا جاتا تھا، جن کو گھروں اور جائیدادوں سے بیدخل کیا جاتا تھا اُن کے دلوں میں بھی مکّہ کے لوگوں کی نسبت رحم پیدا ہو گیا تھا۔ اور اُنہوں نے کہا یارسول اللہ انصار نے مکّہ والوں کے مظالم کی جو کہانیاں سُنی ہوئی ہیں آج اُن کی وجہ سے ہم نہیں جانتے کہ وہ قریش کے ساتھ کیا معاملہ کریں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوسفیان! سعدؓ نے غلط کہا ہے آج رحم کا دن ہے۔ آج اللہ تعالیٰ قریش اور خانہ کعبہ کو عزت بخشنے والا ہے۔ پھر آپ نے ایک آدمی کو سعدؓ کی طرف بھجوایا اور فرمایا اپنا جھنڈا اپنے بیٹے قیس کو دیدو کہ وہ تمہاری جگہ انصار کے لشکر کا کمانڈر ہوگا۔ اس طرح آپ نے مکّہ والوں کا دل بھی رکھ لیا اور انصار کے دلوں کو بھی صدمہ پہنچنے سے محفوظ رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیسؓ کے اوپر پورا اعتبار بھی تھا۔ کیونکہ قیسؓ نہایت ہی شریف طبیعت کے نوجوان تھے۔ ایسے شریف کہ تاریخ میں لکھا ہے کہ اُن کی وفات کے قریب جب بعض لوگ اُن کی عیادت کے لیے آئے اور بعض عیادت کے لیے نہ آئے تو اُنہوں نے اپنے دوستوں سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ بعض جو میرے واقف ہیں میری عیادت کے لیے نہیں آئے۔ اُن کے دوستوں نے کہا، آپ بڑے مخیّر آدمی ہیں۔ آپ ہر شخص کو اُس کی تکلیف کے وقت قرضہ دے دیتے ہیں۔ شہر کے بہت سے لوگ آپ کے مقروض ہیں اور وہ اِس لیے آپ کی عیادت کے لیے نہیں آئے کہ شاید آپ کو ضرورت ہو اور آپ اُن سے روپیہ مانگ بیٹھیں۔ آپ نے فرمایا اوہو! میرے دوستوں کو بلا وجہ تکلیف ہوئی۔ میری طرف سے تمام شہر میں منادی کردو کہ ہر شخص جس کے اوپر قیس کا قرضہ ہے وہ اُسے معاف ہے۔ اِس پر اس قدر لوگ اُن کی عیادت کے لیے آئے کہ اُنکے مکان کی سیڑھیاں ٹوٹ گئیں۔ جب لشکر گذر چکا تو عباسؓ نے ابوسفیان سے کہا۔ اب اپنی سواری دوڑا کر مکّہ پہنچو اور اُن لوگوں کو اطلاع دے دو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آ گئے ہیں اور اُنہوں نے اس اس شکل میں مکّہ کے لوگوں کو امان دی ہے۔ جب ابوسفیان اپنے دل میں خوش تھا کہ مَیں نے مکّہ کے لوگوں کی نجات کا رستہ نکال لیا ہے اسکی بیوی ہند جو ابتدائے اسلام سے مسلمانوں سے بغض اور کینہ رکھنے کی لوگوں کو تعلیم دیتی چلی آئی تھی اور باوجود کافر ہونے کے فی الحقیقت ایک بہادر عورت تھی اُس نے آگے بڑھ کر اپنے خاوند کی داڑھی پکڑ لی۔ اور مکہ والوں کو آوازیں دینی شروع کیں کہ "اِس بڈھے احمق کو قتل کردو کہ بجائے اس کے کہ تم کو یہ نصیحت کرے کہ جاؤ اور اپنی جانوں اور اپنے شہر کی عزت کے لیے لڑتے ہوئے مارے جاؤ۔ یہ تمہیں امن کا اعلان کر رہا ہے۔ ابوسفیان نے اس کی حرکت کو دیکھ کر کہا۔ بے وقوف یہ ان باتوں کا وقت نہیں جا اور اپنے گھر میں چھپ جاؤ۔ میں اُس لشکر کو دیکھ کر آیا ہوں جس لشکر کے مقابلہ کی طاقت سارے عرب میں نہیں ہے۔ پھر ابوسفیان نے بلند آواز سے امان کی شرائط کو بیان کرنا شروع کیا اور لوگ بے تحاشا اُن گھروں اور اُن جگہوں

کی طرف دوڑ پڑے، جن کے متعلق امان کا اعلان کیا گیا تھا۔ صرف گیارہ مرد اور چار عورتیں ایسی تھیں، جن کی نسبت شدید ظالمانہ قتل اور فساد ثابت تھے، گویا وہ جنگی مجرم تھے اور اُن کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ اُن کو قتل کیا جائے، کیونکہ وہ صرف کفر یا لڑائی کے مجرم نہیں بلکہ جنگی مجرم ہیں۔

اِس موقعہ پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولیدؓ کو بڑی سختی سے حکم دے دیا تھا کہ جب تک کوئی شخص لڑے نہیں تم نے لڑنا نہیں۔ لیکن جس جس طرف سے خالدؓ شہر میں داخل ہوئے اُس طرف امن کا اعلان ابھی نہیں پہنچا تھا۔ اس علاقہ کی فوج نے خالد کا مقابلہ کیا اور ۲۴ آدمی مارے گئے۔ چونکہ خالدؓ کی طبیعت بڑی جوشیلی تھی کسی نے دوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچا دی اور عرض کیا کہ خالدؓ کو روکا جائے ورنہ وہ سارے مکہ والوں کو قتل کر دیگا۔ آپ نے فوراً خالد کو بلوایا اور فرمایا کیا میں نے تم کو لڑائی سے منع نہیں کیا تھا؟ خالدؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ نے منع فرمایا تھا لیکن اِن لوگوں نے پہلے ہم پر حملہ کیا اور تیر اندازی شروع کر دی میں کچھ دیر تک رُکا اور میں نے اُن کو کہا کہ ہم تم پر حملہ نہیں کرنا چاہتے تم ایسا مت کرو۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ کسی طرح باز نہیں آتے تو پھر میں اُن سے لڑا اور خدا نے ان کو چاروں طرف پراگندہ کر دیا۔ بہرحال اِس خفیف سے واقعہ کے سوا اور کوئی واقعہ نہ ہوا۔ اور مکہ پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبضہ ہو گیا۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے آپ سے لوگوں نے پوچھا۔ یا رسول اللہ کیا آپ اپنے گھر میں ٹھہریں گے؟ آپ نے فرمایا کیا عقیل نے (یہ آپکے چچا زاد بھائی تھے) ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا بھی ہے؟ یعنی میری ہجرت کے بعد میرے رشتہ داروں نے میری ساری جائیداد بیچ باچ کر کھالی ہے۔ اب مکہ میں میرے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا ہم خیف بنی کنانہ میں ٹھہریں گے۔ یہ مکہ کا ایک میدان تھا جہاں قریش اور کنانہ قبیلہ نے ملکر قسمیں کھائی تھیں کہ جب تک بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر ہمارے حوالہ نہ کر دیں اور ان کا ساتھ نہ چھوڑ دیں ہم اُن سے نہ شادی بیاہ کریں گے، نہ خرید و فروخت کرینگے اس عہد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چچا ابوطالب اور آپکی جماعت کے تمام افراد وادی ابوطالب میں پناہ گزین ہوئے تھے اور تین سال کی شدید تکلیفوں کے بعد خدا تعالیٰ نے انہیں نجات دلائی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انتخاب کیسا لطیف تھا۔ مکہ والوں نے اِسی مقام پر قسمیں کھائی تھیں کہ جبتک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے سپرد نہ کر دیئے جائیں ہم آپ کے قبیلہ سے صلح نہیں کرینگے۔ آج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُسی میدان میں جا کر اُترے اور گویا مکہ والوں سے یہ کہا کہ جہاں تم چاہتے تھے میں وہاں آ گیا ہوں مگر بتاؤ تو سہی کیا تم میں طاقت ہے کہ آج مجھے اپنے ظلموں کا نشانہ بنا سکو۔ وہی مقام جہاں تم مجھے ذلیل اور مقہور شکل میں دیکھنا چاہتے تھے اور خواہش رکھتے تھے کہ میری قوم مجھے پکڑ کر اِس جگہ پر تمہارے سپرد کر دے وہاں میں ایسی شکل میں آیا ہوں کہ میری قوم ہی نہیں سارا عرب بھی میرے ساتھ ہے اور میری قوم نے مجھے تمہارے سپرد نہیں کیا بلکہ میری قوم نے تمہیں میرے سپرد کر دیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ یہ دن بھی پیر کا دن تھا۔ وہی دن جس دن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غار ثور سے نکل کر صرف ابوبکرؓ کی معیت میں مدینہ کی طرف ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے۔ وہی دن جس میں آپ نے حسرت کے ساتھ ثور کی پہاڑی پر سے مکہ

کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ اے مکہ! تو مجھے دنیا کی ساری بستیوں سے زیادہ پیارا ہے لیکن تیرے باشندے مجھے اس جگہ پر رہنے نہیں دیتے۔ مکہ میں داخل ہوتے وقت حضرت ابوبکرؓ آپ کی اونٹنی کی رکاب پکڑے ہوئے آپ کے ساتھ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے اور سورۂ فتح جس میں مکہ کی فتح کی خبر دی گئی تھی وہ بھی پڑھتے جاتے تھے۔ آپ سیدھے خانہ کعبہ میں آئے اور اونٹنی پر چڑھے چڑھے سات دفعہ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ اُس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک سوٹی تھی۔ آپ خانہ کعبہ کے گرد جس گھر کو ابراہیمؑ اور اُسکے بیٹے اسمٰعیل نے خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا تھا اور جس کو بعد میں اُن کی گمراہ اولاد نے بتوں کا مخزن بنا کر رکھ دیا تھا گھومے اور وہ تین سو ساٹھ بُت جو اس جگہ پر رکھے ہوئے تھے اُن میں سے ایک ایک بُت پر آپ سوٹی مارتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ یہ وہ آیت ہے جو ہجرت سے پہلے سورۂ بنی اسرائیل میں آپ پر نازل ہوئی تھی اور جس میں ہجرت اور پھر فتح مکہ کی خبر دی گئی تھی۔ یوروپین مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ہجرت سے پہلے کی سورۃ ہے اس سورۃ میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْــرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ سورہ بنی اسرائیل ع ۹ یعنی تو کہہ دے میرے رب! مجھے اس شہر یعنی مکہ میں نیک طور پر داخل کیجیو۔ یعنی ہجرت کے بعد فتح اور غلبہ دے کر اور اس شہر سے خیریت سے ہی نکالیو یعنی ہجرت کے وقت۔ اور خود اپنے پاس سے مجھے غلبہ اور مدد کے سامان بھجوائیو۔ اور یہ بھی کہو کہ حق آگیا ہے اور باطل یعنی شرک شکست کھا کے بھاگ گیا ہے اور باطل یعنی شرک کے لیے شکست کھا کر بھاگنا تو ہمیشہ کے لیے مقدر تھا۔ اس پیشگوئی کے لفظاً لفظاً پورا ہونے اور حضرت ابوبکرؓ کے اس کو تلاوت کرتے وقت مسلمانوں اور کفار کے دلوں میں جو جذبات پیدا ہوئے ہوں گے وہ لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتے۔ غرض اُس دن ابراہیمؑ کا مقام پھر خدائے واحد کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور بُت ہمیشہ کے لیے توڑے گئے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہُبل نامی بُت کے اوپر اپنی چھڑی ماری اور وہ اپنے مقام سے گر کر ٹوٹ گیا تو حضرت زبیرؓ نے ابوسفیان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا ابوسفیان یاد ہے اُحد کے دن جب مسلمان زخموں سے چور ایک طرف کھڑے ہوئے تھے تم نے اپنے غرور میں یہ اعلان کیا تھا اعلُ ھبلُ۔ اعلُ ھبلُ ہُبل کی شان بلند ہو، ہبل کی شان بلند ہو۔ اور یہ کہ ہبل نے ہی تم کو اُحد کے دن مسلمانوں پر فتح دی تھی۔ آج دیکھتے ہو وہ سامنے ہبل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔ ابوسفیان نے کہا زبیرؓ! یہ باتیں جانے بھی دو۔ آج ہم کو اچھی طرح نظر آرہا ہے کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا کے سوا کوئی اور خدا بھی ہوتا تو آج جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اس طرح کبھی نہ ہوتا۔ پھر آپؐ نے خانہ کعبہ کے اندر جو تصویریں حضرت ابراہیمؑ وغیرہ کی بنی ہوئی تھیں اُن کے مٹانے کا حکم دیا اور خانہ کعبہ میں خدا تعالیٰ کے وعدوں کے پورا ہونے کے شکریہ میں دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر باہر تشریف لائے اور باہر آکر بھی دو رکعت نماز پڑھی۔ خانہ کعبہ کی تصویروں کو مٹانے کیلئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو مقرر فرمایا تھا انہوں نے اس خیال سے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو ہم بھی نبی مانتے ہیں حضرت ابراہیم کی تصویر کو نہ مٹایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُس تصویر کو قائم دیکھا تو فرمایا عمر! تم نے یہ کیا کیا۔

کیا خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (سورۂ آل عمران ع۱۵) یعنی ابراہیم نہ یہودی تھا نہ نصرانی بلکہ وہ خدا تعالیٰ کا کامل فرمانبردار اور خدا تعالیٰ کی ساری صداقتوں کو ماننے والا اور خدا کا موحد بندہ تھا۔ چنانچہ آپ کے حکم سے اِس تصویر کو بھی مٹا دیا گیا۔ خدا تعالیٰ کے نشانات دیکھ کر مسلمانوں کے دل اُس دن ایمان سے اِتنے پُر ہو رہے تھے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پر اُن کا یقین اس طرح بڑھ رہا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب زمزم کے چشمہ سے (جو اسمٰعیلؑ ابن ابراہیمؑ کے لیے خدا تعالیٰ نے بطور نشان پھاڑا تھا) پانی پینے کے لیے منگوایا اور اُس میں کچھ پانی پی کے باقی پانی سے آپ نے وضو فرمایا تو آپ کے جسم میں سے کوئی قطرہ زمین پر نہیں گر سکتا تھا۔ مسلمان فوراً اُس کو اُچک لے جاتے اور تبرّک کے طور پر اپنے جسم کے اُوپر مل لیتے تھے اور مشرک کہہ رہے تھے ہم نے کوئی بادشاہ دنیا میں ایسا نہیں دیکھا جس کے ساتھ اُس کے لوگوں کو اتنی محبّت ہو۔ جب آپ اِن باتوں سے فارغ ہوئے اور مکّہ والے آپ کی خدمت میں حاضر کیے گئے، تو آپ نے فرمایا۔ اے مکّہ کے لوگو! تم نے دیکھ لیا کہ خدا تعالیٰ کے نشانات کس طرح لفظ بلفظ پورے ہوئے ہیں اب بتاؤ کہ تمہارے اُن ظلموں اور اُن شرارتوں کا کیا بدلہ دیا جائے جو تم نے خدائے واحد کی عبادت کرنے والے غریب بندوں پر کیے تھے۔ مکہ کے لوگوں نے کہا ہم آپ سے اُسی سلوک کی اُمید رکھتے ہیں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ یہ خدا کی قدرت تھی کہ مکّہ والوں کے مُنہ سے وہی الفاظ نکلے جن کی پیشگوئی خدا تعالیٰ نے سورۂ یوسف میں پہلے سے کی ہوئی تھی اور فتح مکّہ سے دس سال پہلے بتا دیا تھا کہ تو مکّہ والوں سے ویسا ہی سلوک کرے گا جیسا یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ پس جب مکّہ والوں کے مُنہ سے اِس بات کی تصدیق ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوسفؑ کے مثیل تھے اور یوسف کی طرح اللہ تعالےٰ نے اُن کو اپنے بھائیوں پر فتح دی تھی تو آپ نے بھی اعلان فرما دیا کہ تَاللّٰهِ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ خدا کی قسم! آج تمہیں کسی قسم کا عذاب نہیں دیا جائے گا۔ اور نہ ہی کسی قسم کی سرزنش کی جائے گی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زیارت کعبہ کی متعلقہ عبادتوں میں مصروف تھے اور اپنی قوم کے ساتھ بخشش اور رحمت کا معاملہ کر رہے تھے تو انصار کے دل اندر ہی اندر بیٹھے جا رہے تھے اور وہ ایک دوسرے سے اشاروں میں کہہ رہے تھے شاید آج ہم خدا کے رسول کو اپنے سے جدا کر رہے ہیں کیونکہ ان کا شہر خدا تعالیٰ نے اُن کے ہاتھ پر فتح کر دیا ہے اور اُنکا قبیلہ اُن پر ایمان لے آیا ہے۔ اِس وقت اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ سے انصار کے اِن شبہات کی خبر دیدی۔ آپ نے سر اُٹھایا، انصار کی طرف دیکھا اور فرمایا اے انصار تم سمجھتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر کی محبّت ستاتی ہو گی اور اپنی قوم کی محبت اُس کے دل میں گدگدیاں لیتی ہو گی۔ انصار نے کہا یا رسول اللہ یہ درست ہے ہمارے دل میں ایسا خیال گذرا تھا۔ آپ نے فرمایا تمہیں پتہ ہے میرا نام کیا ہے؟ مطلب یہ کہ مَیں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہلاتا ہوں پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں کو جنہوں نے دینِ اسلام کی کمزوری کے وقت میں اپنی جانیں قربان کیں چھوڑ کر کسی اور جگہ چلا جاؤں۔ پھر فرمایا اے انصار! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں مَیں نے خدا کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑا تھا اور اسکے بعد اب مَیں اپنے وطن میں واپس نہیں آسکتا۔ میری زندگی تمہاری زندگی سے ہے اور میری موت تمہاری موت سے وابستہ ہے

مدینہ کے لوگ آپ کی یہ باتیں سنکر اور آپ کی محبّت اور آپ کی وفا کو دیکھ کر روتے ہوئے آگے بڑھے اور کہا یا رسول اللہ! خدا کی قسم ہم نے خدا اور اس کے رسولؐ پر بدظنّی کی۔ بات یہ ہے کہ ہمارے دل اس خیال کو برداشت نہیں کر سکے کہ خدا کا رسول ہمیں اور ہمارے شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ آپ نے فرمایا اللہ اور اس کا رسول تم لوگوں کو بَری سمجھتے ہیں اور تمہارے اخلاص کی تصدیق کرتے ہیں۔ جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مدینہ کے لوگوں میں یہ پیار اور محبّت کی باتیں ہو رہی ہونگی اگر مکّہ کے لوگوں کی آنکھوں نے آنسو نہیں بہائے ہونگے تو اُن کے دل یقیناً آنسو بہا رہے ہونگے کہ وہ قیمتی ہیرا جس سے بڑھ کر کوئی قیمتی چیز اس دنیا میں پیدا نہیں ہوئی خدا نے اُن کو دیا تھا مگر اُنہوں نے اُس کو اپنے گھروں سے نکال کر پھینک دیا۔ اور اب کے وہ خدا کے فضل اور اس کی مدد کے ساتھ دوبارہ مکّہ میں آیا تھا وہ اپنے وفائے عہد کی وجہ سے اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے مکّہ کو چھوڑ کر مدینہ واپس جا رہا ہے۔

جن لوگوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا تھا کہ اُنکے بعض ظالمانہ قتلوں اور ظلموں کی وجہ سے اُنکو قتل کیا جائے اُن میں سے اکثر کو بعض مسلمانوں کی سفارش پر آپ نے چھوڑ دیا۔ انہی لوگوں میں سے ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا۔ عکرمہ کی بیوی دل سے مسلمان تھی اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ عکرمہ کو بھی آپ معاف فرما دیں۔ آپ نے فرمایا ہاں ہاں ہم اُسے معاف کرتے ہیں۔ عکرمہ بھاگ کر حبشہ کی طرف جا رہے تھے کہ بیوی اپنے خاوند کی محبّت میں پیچھے پیچھے اس کی تلاش میں گئی۔ جب وہ ینبوع کے بندر پر کشتی میں بیٹھے ہوئے عرب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے پر تیار تھے۔ کہ پراگندہ سر اور پریشان حال بیوی گھبرائی ہوئی پہنچی اور کہا اے میرے چچا کے بیٹے! (عرب عورتیں اپنے خاوندوں کو چچا کا بیٹا کہا کرتی تھیں) اتنے شریف اور اتنے رحمدل انسان کو چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو۔ عکرمہ نے حیرت سے اپنی بیوی سے پوچھا کیا میری اِن ساری دشمنیوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے معاف کر دینگے؟ عکرمہ کی بیوی نے کہا ہاں ہاں! مَیں نے اُن سے عہد لے لیا ہے اور اُنہوں نے تم کو معاف کر دیا ہے جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو عرض کیا یا رسول اللہ میری بیوی کہتی ہے کہ آپ نے میرے جیسے انسان کو بھی معاف کر دیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا تمہاری بیوی ٹھیک کہتی ہے ہم نے تم کو معاف کر دیا ہے۔ عکرمہ نے کہا جو شخص اتنے شدید دشمنوں کو معاف کر سکتا ہے وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور مَیں گواہی دیتا ہوں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم اُس کے بندے اور اُس کے رسول ہو۔ اور پھر شرم سے اپنا سر جھکا لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی حیا کی حالت کو دیکھ کر اُس کے دل کی تسلّی کے لیے فرمایا۔ عکرمہ! ہم نے تمہیں صرف معاف ہی نہیں کیا بلکہ اس سے زائد یہ بات بھی ہے کہ اگر آج کوئی ایسی چیز مجھ سے مانگو جس کے دینے کی مجھ میں طاقت ہو تو مَیں وہ بھی تمہیں دیدونگا۔ عکرمہ نے کہا یا رسول اللہ! اُور اس سے زیادہ میری خواہش کیا ہو سکتی ہے کہ آپ خدا تعالیٰ سے یہ دُعا کریں کہ مَیں نے جو آپ کی دشمنیاں کی ہیں وہ مجھے معاف کر دے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اے میرے اللہ! وہ تمام دشمنیاں جو عکرمہ نے مجھ سے کی ہیں اسے معاف کر دے۔ اور وہ تمام گالیاں جو اُس کے مُنہ سے نکلی ہیں وہ اسے بخش دے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے اور اپنی چادر اُتار کر اُس کے اُوپر ڈال دی اور فرمایا جو اللہ پر ایمان لاتے ہوئے ہمارے پاس آتا ہے ہمارا گھر اُس کا گھر ہے اور ہماری جگہ اُس کی جگہ ہے۔

عکرمہ کے ایمان لانے سے وہ پیشگوئی پوری ہوئی جو سالہا سال پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے بیان فرمائی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا۔ مَیں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گویا میں جنّت میں ہوں، وہاں مَیں نے انگور کا ایک خوشہ دیکھا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کے لیے ہے ؟ تو کسی جواب دینے والے نے کہا ابوجہل کے لیے۔ یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوئی اور مَیں نے کہا جنّت میں تو سوائے مومن کے اور کوئی داخل نہیں ہوتا پھر جنّت میں ابوجہل کے لیے انگور کیسے مہیّا کیے گئے ہیں۔ جب عکرمہ ایمان لایا تو آپ نے فرمایا وہ خوشہ عکرمہ کا تھا، خدا نے بیٹے کی جگہ باپ کا نام ظاہر کیا جیسا کہ خوابوں میں اکثر ہو جایا کرتا ہے۔

وہ لوگ جن کے قتل کا حکم دیا گیا تھا اُن میں وہ شخص بھی تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت زینبؓ کی ہلاکت کا موجب ہوا تھا اُس شخص کا نام ہبار تھا۔ اُس نے حضرت زینبؓ کے اُونٹ کا تنگ کاٹ دیا تھا اور حضرت زینبؓ اونٹ سے نیچے جا پڑی تھیں جس کی وجہ سے اُن کا حمل ضائع ہو گیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ فوت ہو گئیں۔ علاوہ اور جرائم کے یہ جرم بھی اُسکو قتل کا مستحق بناتا تھا۔ یہ شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے کہا اے اللہ کے نبی! میں آپ سے بھاگ کر ایران کی طرف چلا گیا تھا پھر میں نے خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعہ سے ہمارے شرک کے خیالات کو دُور کیا ہے اور ہمیں روحانی ہلاکت سے بچایا ہے مَیں غیر لوگوں میں جانے کی بجائے کیوں نہ اُس کے پاس جاؤں اور اپنے گناہوں کا اقرار کر کے اُس سے معافی مانگوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ ہبار! جب خدا نے تمہارے دل میں اسلام کی محبت پیدا کر دی ہے تو مَیں تمہارے گناہوں کو کیوں نہ معاف کروں۔ جاؤ مَیں نے تمہیں معاف کیا اسلام نے تمہارے سب پہلے قصور مٹا دیئے ہیں۔

اِس جگہ اتنی گنجائش نہیں کہ مَیں اس مضمون کو لمبا کروں۔ ورنہ اُن خطرناک مجرموں میں سے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی معذرت پر معاف فرما دیا اکثر کے واقعات ایسے دردناک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم کو اتنا ظاہر کرنے والے ہیں کہ ایک سنگدل انسان بھی اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غزوۂ حُنین

چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکّہ میں داخلہ اچانک ہُوا۔ اِس لیے مکّہ سے ذرا فاصلے پر جو قبائل رہتے تھے خصوصاً وہ جو جنوب کی طرف رہتے تھے انہیں مکّہ پر حملہ کی خبر اُسی وقت ہوئی جب آپ مکّہ میں داخل ہو چکے تھے۔ اس خبر کے سنتے ہی انہوں نے اپنی فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کی تیاری کرنے لگے۔ ہوازن اور ثقیف دو عرب قبیلے اپنے آپکو خاص طور پر بہادر خیال کرتے تھے۔ اُنہوں نے فوراً آپس میں مشورہ کر کے اپنے لیے ایک سردار چُن لیا اور مالک بن عوف نامی ایک شخص کو اپنا رئیس مقرر کر لیا۔ اِس کے بعد انہوں نے اردگرد کے قبائل کو دعوت دی کہ وہ بھی اُن کے ساتھ آ کر شامل ہو جائیں۔ انہی قبائل میں

بنو سعد بن بکیر بھی تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دائی حلیمہ اسی قبیلہ میں سے تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچپن کی عمر اسی قبیلہ میں گذاری تھی۔ یہ لوگ جمع ہو کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور انہوں نے اپنے ساتھ اپنے مال اور اپنی بیویوں اور اپنی اولادوں کو بھی لے لیا۔ جب اُن کے سرداروں سے پوچھا گیا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا اس لیے تا سپاہیوں کو یہ خیال رہے کہ اگر ہم بھاگے تو ہماری بیویاں اور ہماری اولادیں قید ہو جائینگی اور ہمارے مال لُوٹے جائینگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے پختہ ارادہ کے ساتھ مسلمانوں کو تباہ کرنے کیلئے نکلے تھے۔ آخر یہ لشکر وادی روطاس میں آکر اترا جو جنگ کی ضرورتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی وادی تھی، کیونکہ اس میں پناہ کی جگہیں بھی تھیں اور جانوروں کے لیے چارہ اور انسانوں کے لیے پانی بھی موجود تھا اور گھوڑے دوڑانے کیلئے زمین بھی بہت ہی مناسب تھی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے عبداللہ بن ابی حدود رضؓ نامی ایک صحابی کو حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ عبداللہ نے آکر اطلاع دی کہ واقعہ میں اُن کا لشکر جمع ہے اور وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں۔ چونکہ یہ قوم بڑی تیرانداز تھی اور جس جگہ پر انہوں نے ڈیرہ ڈالا تھا وہ مقام ایسا تھا کہ صرف ایک محدود جگہ پر لڑائی کی جا سکتی تھی اور اُس جگہ پر بھی حملہ آور بڑی صفائی کے ساتھ تیروں کا نشانہ بنتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے سردار صفوان سے جو بہت بڑے مالدار اور تاجر تھے اس جنگ کے لیے ہتھیار اور کچھ روپیہ مانگا۔ صفوان نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اپنی حکومت کے زور پر آپ میرا مال چھیننا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں ہم چھیننا نہیں چاہتے بلکہ تم سے عاریتہً مانگتے ہیں اور اس کی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔ اس پر اُس نے کہا تب کوئی حرج نہیں آپ مجھ سے یہ چیزیں لے لیں۔ اور اُس نے سو زرہیں اور اُنکے ساتھ مناسب ہتھیار عاریتہً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیئے اور اس کے علاوہ تین ہزار روپیہ قرض دیا۔ اسی طرح آپ نے اپنے چچازاد بھائی نوفل بن حارث سے تین ہزار نیزہ عاریتہً لیا۔ جب یہ لشکر ہوازن کی طرف چلا تو مکہ والوں نے خواہش کی کہ گو ہم مسلمان نہیں ہیں لیکن اب چونکہ ہم اسلامی حکومت میں شامل ہو چکے ہیں ہم کو بھی لڑائی میں شامل ہونے کا موقعہ دیا جائے۔ چنانچہ دو ہزار آدمی مکہ سے آپ کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستہ میں عرب کی ایک مشہور زیارت گاہ پڑتی تھی جس کو ذات انواط کہتے تھے۔ یہ ایک پرانا بیری کا درخت تھا جس کو عرب کے لوگ متبرک سمجھتے تھے۔ اور جب عرب کے بہادر لوگ کوئی ہتھیار خریدتے تو پہلے ذات انواط میں جاکر لٹکاتے تھے تاکہ اُس کو برکت حاصل ہو جائے۔ جب صحابہؓ اُس کے پاس سے گذرے تو بعض نے کہا، یا رسول اللہ! ہمارے لیے بھی آپ ایک ذات انواط مقرر فرمائیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ بڑا ہے۔ یہ تو وہی موسیٰ کی قوم والی بات ہوئی کہ جب وہ کنعان کی طرف روانہ ہوئے اور کنعان کے قبائل کو انہوں نے بُت پوجتے دیکھا تو موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر کہا یَا مُوسَى اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (سورۂ اعراف ع۱۶) اے موسیٰ! جس طرح اِن کے معبود ہیں ہمارے لیے بھی کوئی معبود تجویز کر دیجیے۔ فرمایا یہ تو جہالت کی باتیں ہیں میں ڈرتا ہوں کہ اس قسم کے وہموں کی وجہ سے کہیں تم میں سے بھی ایک گروہ ایسی ہی حرکتیں نہ کرنے لگ جائے۔

ہوازن اور اُن کے مددگار قبائل نے ایک کمین گاہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے بنا چھوڑی تھی جیسے آج کل

لڑائی کے میدان میں مخفی خندقیں ہوتی ہیں۔ جب اسلامی لشکر حنین مقام پر پہنچا تو وہ اُن کے سامنے چھوٹی چھوٹی منڈیریں بنا کر اُن کے پیچھے بیٹھ گئے اور بیچ میں سے ایک تنگ راستہ مسلمانوں کیلئے چھوڑ دیا۔ اکثر سپاہی تو اُن ٹیلوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے اور کچھ سپاہی اونٹوں وغیرہ کے سامنے صف بند ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مسلمانوں نے یہ سمجھ کر کہ لشکر وہی ہے جو سامنے کھڑا ہے آگے بڑھ کر اُس پر حملہ کر دیا۔ جب مسلمان کافی آگے بڑھ چکے اور کمین گاہ کے سپاہیوں نے سمجھا کہ اب ہم اچھی طرح حملہ کر سکتے ہیں تو اگلی کھڑی فوج نے سامنے سے حملہ کر دیا اور پہلوؤں سے تیر اندازوں نے بے تحاشا تیر برسانے شروع کر دیئے۔ مکہ کے لوگ جو یہ سمجھ کر ساتھ شامل ہوئے تھے کہ آج ہم کو بھی بہادری دکھانے کا موقعہ ملیگا اِس دو طرفہ حملہ کی برداشت نہ کر سکے اور واپس مکہ کی طرف بھاگے۔ مسلمان گو اِس قسم کی تکالیف اُٹھانیکے عادی تھے مگر جب دو ہزار گھوڑے اور اُونٹ اُن کی صفوں میں سے بے تحاشا بھاگتے ہوئے نکلے تو اُنکے گھوڑے اور اونٹ بھی ڈر گئے اور سارے کا سارا لشکر بے تحاشا پیچھے کی طرف دوڑ پڑا۔ تین طرف کے حملہ میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ بارہ صحابی کھڑے رہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ سارے صحابہؓ بھاگ گئے تھے بلکہ سو کے قریب اور آدمی بھی میدان میں کھڑے رہے تھے مگر وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فاصلہ پر تھے۔ آپ کے گرد صرف ایک دو درجن کے قریب آدمی رہ گئے۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں اور میرے ساتھی بے تحاشا زور لگاتے تھے کہ کسی طرح ہماری سواریاں میدانِ جنگ کی طرف آئیں لیکن دو ہزار اونٹوں کے دوڑنے کی وجہ سے ہماری سواریاں ایسی ڈر گئی تھیں کہ ہمارے ہاتھ باگیں موڑتے موڑتے زخمی ہو گئے مگر اونٹ اور گھوڑے واپس لوٹنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ بعض دفعہ ہم باگیں اس زور سے کھینچتے تھے کہ مرکب کا سر اُسکی پیٹھ کو لگ جاتا تھا۔ مگر پھر جب ایڑی دیکر ہم اُس کو پیچھے کی طرف موڑتے تو وہ بجائے پیچھے لوٹنے کے جانور اور بھی تیزی کے ساتھ آگے کی طرف بھاگ پڑتا۔ ہمارا دل دھڑک رہا تھا کہ پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہوگا مگر ہم بالکل بے بس تھے۔ ادھر تو صحابہ کی یہ حالت تھی اور اُدھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صرف چند آدمیوں کے ساتھ میدان جنگ میں کھڑے تھے۔ دائیں اور بائیں اور سامنے تینوں طرف سے تیر پڑ رہے تھے اور پیچھے کی طرف صرف ایک تنگ راستہ تھا۔ جس میں سے ایک وقت میں چند آدمی ہی گذر سکتے تھے مگر پھر بھی سوائے اُس راستہ کے اور کوئی نجات کی راہ نہیں تھی۔ اس وقت حضرت ابو بکرؓ نے اپنی سواری سے اُتر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خچر کی باگ پکڑ لی اور عرض کیا یا رسول اللہ! تھوڑی دیر کے لیے پیچھے ہٹ آئیں یہانتک کہ اسلامی لشکر جمع ہو جائے۔ آپ نے فرمایا ابو بکر میری خچر کی باگ چھوڑ دو۔ اور پھر خچر کو ایڑی لگاتے ہوئے آپ نے اُس تنگ راستہ پر آگے بڑھنا شروع کیا جس کے دائیں بائیں کمین گاہوں میں بیٹھے ہوئے سپاہی تیر اندازی کر رہے تھے۔ اور فرمایا

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب

یُں خدا کا نبی ہوں میں جھوٹا نہیں ہوں۔ مگر یہ بھی یاد رکھو کہ اِس وقت خطرہ کے مقام پر کھڑے ہوتے ہوئے بھی جو میں دشمن کے حملہ سے محفوظ ہوں تو اس کے یہ معنے نہیں کہ میرے اندر خدائی کا کوئی مادہ پایا جاتا ہے۔ بلکہ میں انسان ہی ہوں اور عبد المطلب کا پوتا ہوں۔ پھر آپ نے حضرت عباسؓ کو جن کی آواز بہت بلند تھی آگے بلایا اور فرمایا۔ عباسؓ! بلند آواز سے پکار کر کہو کہ اے وہ صحابہ! جنہوں نے حدیبیہ کے دن درخت کے نیچے بیعت کی تھی۔ اور

اے وہ لوگو جو سورۂ بقرہ کے زمانہ سے مسلمان ہو! خدا کا رسول تم کو بلاتا ہے۔ حضرت عباسؓ نے نہایت ہی بلند آواز سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام سنایا، تو اُس وقت صحابہؓ کی جو حالت ہوئی اس کا اندازہ صرف اُنہی کی زبان سے حالات سنکر لگایا جا سکتا ہے۔ وہی صحابی جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اُونٹوں اور گھوڑوں کو واپس کرنے کی کشمکش میں تھے کہ عباسؓ کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ اُس وقت ہمیں یُوں معلوم ہوا کہ ہم اس دنیا میں نہیں بلکہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہیں اور اُس کے فرشتے ہمکو حساب دینے کے لیئے بلا رہے ہیں۔ تب ہم میں سے بعض نے اپنی تلواریں اور اپنی ڈھالیں اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور اونٹوں سے کُود گئے اور ڈرے ہوئے اُونٹوں کو اُنہوں نے خالی چھوڑ دیا کہ وہ جدھر چاہیں چلے جائیں اور بعض نے اپنی تلواروں سے اپنے اونٹوں کی گردنیں کاٹ دیں اور خود پیدل دوڑ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف چل پڑے۔ وہ صحابی کہتے ہیں اس دن انصار اس طرح دوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جا رہے تھے جس طرح اونٹنیاں اور گائیں اپنے بچے کے چیخنے کی آواز کو سنکر اس کی طرف دوڑ پڑتی ہیں اور تھوڑی دیر میں صحابہ اور خصوصاً انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور دشمن کو شکست ہو گئی۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ کا یہ نشان ہے کہ وہ شخص جو چند ہی دن پہلے آپ کی جان کا دشمن تھا اور آپ کے مقابلہ پر کفار کے لشکروں کی کمان کیا کرتا تھا یعنی ابوسفیان وہ آج حنین کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب کفار کے اونٹ پیچھے کی طرف دوڑے تو ابوسفیان جو نہایت ہی زیرک اور ہوشیار آدمی تھا اُس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میرا گھوڑا ابھی بدک جائے گا فوراً اپنے گھوڑے سے چھلانگ لگا دی اور پیدل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خچر کی رکاب پکڑے ہوئے آپ کے ساتھ چل پڑا۔ ابوسفیان کا بیان ہے کہ اُس وقت کھچی ہوئی تلوار میرے ہاتھ میں تھی اور مجھے اللہ ہی کی قسم ہے جو دلوں کے راز جانتا ہے کہ میں اس وقت عزم صمیم کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خچر کے ساتھ پہلو میں کھڑا تھا کہ کوئی شخص مجھے مارے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اُس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مجھے حیرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے (شاید آپ سوچ رہے تھے کہ آج سے صرف دس پندرہ دن پہلے یہ شخص میرے قتل کے لیے اپنی فوج کو لیکر مکہ سے نکلنے والا تھا، لیکن چند ہی دنوں میں خدا تعالیٰ نے اُس کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ یہ مکہ کا کمانڈر ایک عام سپاہی کی حیثیت میں میری خچر کی رکاب پکڑے کھڑا ہے اور اس کا چہرہ بتا رہا ہے کہ یہ آج اپنی موت سے اپنے گناہوں کا ازالہ کرے گا) عباسؓ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حیرت سے ابوسفیان کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو کہا یا رسول اللہ! یہ ابوسفیان آپکے چچا کا بیٹا اور آپ کا بھائی ہے آج تو آپ اس سے خوش ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس کی وہ تمام دشمنیاں معاف کرے جو کہ اس نے مجھ سے کی ہیں۔ ابوسفیان کہتے ہیں اُس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میری طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا اے بھائی! تب میں نے جوشِ محبت سے آپ کے اُس پیر کو جو خچر کی رکاب میں تھا چُوم لیا۔

فتح مکہ کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جنگی سامان جو آپ نے عاریۃً لیا تھا اُس کے مالکوں کو واپس کیا اور ساتھ اُس کے بہت سا انعام واکرام بھی دیا تو اُن لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ شخص اس زمانہ کے

عام انسانوں جیسا نہیں، چنانچہ صفوانؓ اُسی وقت اسلام لے آئے۔

اِس جنگ کا ایک اور عجیب واقعہ بھی تاریخوں میں آتا ہے۔ شیبہ نامی ایک شخص جو مکّہ کے رہنے والے تھے اور جو خانہ کعبہ کی خدمت کے لیے متقرر تھے وہ کہتے ہیں مَیں بھی اس لڑائی میں شامل ہُوا، مگر میری نیّت یہ تھی کہ جس وقت لشکر آپس میں ملیں گے تو مَیں موقعہ پاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کردونگا۔ اور مَیں نے دل میں کہا عرب اور غیر عرب تو الگ رہے اگر ساری دنیا بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ کے مذہب میں داخل ہوگئی تو مَیں تو نہیں ہونے کا جب لڑائی تیزی پر ہوئی اور ادھر کے آدمی اُدھر کے آدمیوں میں مل گئے تو مَیں نے تلوار کھینچی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب ہونا شروع ہُوا۔ اُس وقت مجھے یُوں معلوم ہُوا کہ میرے اور آپ کے درمیان آگ کا ایک شعلہ اُٹھ رہا ہے جو قریب ہے کہ مجھے بھسم کردے۔ اِس وقت مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سُنائی دی کہ شیبہ! میرے قریب ہو جاؤ۔ مَیں جب آپ کے قریب گیا آپ نے میرے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور کہا اے خدا شیبہ کو شیطانی خیالوں سے نجات دے۔ شیبہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پھیرنے کے ساتھ ہی میرے دل سے ساری دشمنیاں اور عداوتیں اُڑ گئیں۔ اور اُس وقت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو اپنی آنکھوں سے اور اپنے کانوں سے اور اپنے دل سے زیادہ عزیز ہو گئے۔ پھر آپ نے فرمایا شیبہ! آگے بڑھو اور لڑو۔ تب مَیں آگے بڑھا اور اُس وقت میرے دل میں سوائے اس کے کوئی خواہش نہیں تھی کہ مَیں اپنی جان قربان کرکے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بچاؤں۔ اگر اُس وقت میرا باپ زندہ ہوتا اور میرے سامنے آجاتا تو مَیں اپنی تلوار اس کے سینہ میں بھونک دینے سے ایک ذرّہ دریغ نہ کرتا۔

اس کے بعد آپ طائف کیطرف روانہ ہوئے وہی شہر جسکے باشندوں نے پتھراؤ کرتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر سے نکالدیا تھا۔ اِس شہر کا آپنے کچھ عرصہ تک محاصرہ کیا۔ لیکن پھر آپکو بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ محاصرہ کرکے وقت ضائع کرنیکی ضرورت نہیں سارے عرب میں اب یہ شہر کر ہی کیا سکتا ہے چنانچہ آپ محاصرہ چھوڑ کر چلے آئے اور کچھ عرصہ کے بعد طائف کے لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔

فتح مکّہ اور حنین کے بعد

اِن جنگوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اموال جو مغلوب دشمنوں کے جرمانوں اور میدانِ جنگ میں چھوڑی ہوئی چیزوں سے جمع ہوئے تھے حسب دستور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلامی لشکر میں تقسیم کرنے تھے۔ لیکن اس موقعہ پر آپ نے بجائے ان اموال کو مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے مکّہ اور اردگرد کے لوگوں میں تقسیم کردیا۔ ان لوگوں کے اندر ابھی ایمان تو پیدا نہیں ہوا تھا۔ بہت سے تو ابھی کافر ہی تھے اور جو مسلمان تھے وہ بھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے یہ اُن کے لیے بالکل نئی چیز تھی کہ ایک قوم اپنا مال دوسرے لوگوں میں بانٹ رہی ہے۔ اِس مال کی تقسیم سے بجائے اُنکے دل میں نیکی اور تقویٰ پیدا ہونیکے اُن کے دلوں میں حرص اور بھی بڑھ گئی۔ انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد جمگھٹا ڈال لیا اور مزید مطالبات کے ساتھ آپ کو تنگ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ دھکیلتے ہوئے وہ آپ کو ایک درخت تک لے گئے اور ایک شخص نے تو آپ کی چادر جو آپ کے کندھوں پر رکھی ہوئی تھی

پکڑ کر اس طرح مروڑنی شروع کی کہ آپ کا سانس رُکنے لگا۔ آپ نے فرمایا اے لوگو! اگر میرے پاس کچھ اور ہوتا تو مَیں وہ بھی تمہیں دے دیتا تم مجھے کبھی بخیل یا بُزدل نہیں پاؤ گے۔ پھر آپ اپنی اونٹنی کے پاس گئے اور اُس کا ایک بال توڑا اور اُسے اونچا کیا اور فرمایا اے لوگو! مجھے تمہارے مالوں میں سے اِس بال کے برابر بھی ضرورت نہیں سوائے اُس پانچویں حصّہ کے جو عرب کے قانون کے مطابق حکومت کا حصّہ ہے اور وہ پانچواں حصّہ بھی مَیں اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتا بلکہ وہ بھی تمہیں لوگوں کے کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے اور یاد رکھو کہ خیانت کرنے والا انسان قیامت کے دن خدا کے حضور اُس خیانت کی وجہ سے ذلیل ہو گا۔

لوگ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بادشاہت کے خواہشمند تھے۔ کیا بادشاہوں اور عوام کا ایسا ہی تعلق ہُوا کرتا ہے؟ کیا کسی کی طاقت ہوتی ہے کہ بادشاہ کو اس طرح دھکیلتا ہُوا لے جائے اور اُسکے گلے میں پٹکہ ڈالکر اُسکو گھونٹے؟ اللہ کے رسولوں کے سوا یہ نمونہ کون دکھا سکتا ہے۔ مگر باوجود اس طرح تمام اموال غرباء میں تقسیم کرنیکے پھر بھی ایسے سنگدل لوگ موجود تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم کو انصاف کی تقسیم نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ذوالخویصرہ نامی ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اُس نے کہا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ نے آج کیا ہے وہ مَیں نے دیکھا ہے آپنے فرمایا تم نے کیا دیکھا؟ اُس نے کہا مَیں نے یہ دیکھا ہے کہ آپنے آج ظلم کیا ہے اور انصاف سے کام نہیں لیا۔ آپنے فرمایا تم پر افسوس! اگر مَیں نے عدل نہیں کیا تو پھر اور کون انسان دُنیا میں عدل کریگا۔ اُسوقت صحابہؓ جوش میں کھڑے ہو گئے اور جب یہ شخص مسجد سے اُٹھ کر گیا۔ تو اُن میں سے بعض نے کہا یا رسول اللہ یہ شخص واجب القتل ہے کیا آپ ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم اسے مار دیں۔ آپنے فرمایا اگر یہ شخص قانون کی پابندی کرتا ہے تو ہم اس کو کس طرح مار سکتے ہیں۔ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! ایک شخص ظاہر کچھ اور کرتا ہے اور اُسکے دل میں کچھ اور ہوتا ہے کیا ایسا شخص سزا کا مستحق نہیں؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے خدا نے یہ حکم نہیں دیا کہ مَیں لوگوں سے اُنکے دلوں کے خیالات کے مطابق معاملہ کروں۔ مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ مَیں لوگوں سے اُن کے ظاہر کے مطابق معاملہ کروں۔ پھر آپنے فرمایا یہ اور اُس کے ساتھی ایک دن اسلام سے بغاوت کرینگے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں یہ شخص اور اُسکے قبیلہ کے لوگ اُن باغیوں کے سردار تھے جنھوں نے حضرت علیؓ سے بغاوت کی اور خوارج کے نام سے آج تک مشہور ہیں۔

ہوازن سے فارغ ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے۔ یہ مدینہ والوں کے لیے پھر ایک نیا خوشی کا دن تھا۔ ایک دفعہ خدا کا رسول مکّہ کے لوگوں کے ظلم سے تنگ آکر مدینہ کی طرف روانہ ہُوا تھا آج خدا کا رسول مکّہ فتح کرنے کے بعد اپنی خوشی سے اور اپنے عہد کو نبھانے کے لیے دوبارہ مدینہ میں داخل ہو رہا تھا۔

غزوۂ تبوک

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکّہ فتح کیا تو ابو عامر مدنی جو خزرج قبیلہ میں سے تھا اور یہودیوں اور عیسائیوں سے میل ملاقات کی وجہ سے ذکر و وظائف کرنے کا عادی تھا اور اِس کی وجہ سے لوگ اِس کو راہب کہتے تھے۔ مگر وہ مذہباً عیسائی نہیں تھا۔ یہ شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں پہنچ جانے کے بعد مکّہ کی طرف بھاگ گیا تھا۔

جیساکہ پہلے لکھا جا چکا ہے، جب مکہ بھی فتح ہوگیا تو اُس شخص نے سوچا کہ اب مجھے اسلام کے خلاف شورش پیدا کرنے کے لیے کوئی اور تدبیر کرنی چاہیئے۔ آخر اُس نے اپنا نام اور طرز بدلی اور مدینہ کے پاس قبا نامی گاؤں میں جا کر رہنا شروع کیا۔ سالہا سال باہر رہنے کی وجہ سے اور کچھ شکل اور لباس میں تبدیلی کر لینے کی وجہ سے مدینہ کے لوگوں نے عام طور پر اس کو نہ پہچانا۔ صرف وہی منافق اُسکو جانتے تھے جن کے ساتھ اُس نے اپنا تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اس نے مدینہ کے منافقوں کے ساتھ ملکر یہ تجویز کی کہ مَیں شام میں جا کر عیسائی حکومت اور عرب عیسائی قبائل کو بھڑکاتا ہوں اور اُن کو مدینہ پر حملہ کرنے کی تحریک کرتا ہوں۔ ادھر تم یہ مشہور کرنا شروع کر دو کہ شامی فوجیں مدینہ پر حملہ کر رہی ہیں۔ اگر میری سکیم کامیاب ہو گئی تو پھر بھی اُن دونوں کی مٹھ بھیڑ ہو جائیگی۔ اور اگر میری سکیم کامیاب نہ ہوئی تو ان افواہوں کی وجہ سے مسلمان شاید شام پر جا کر خود حملہ کر دیں اور اس طرح قیصر کی حکومت اور ان میں لڑائی شروع ہو جائیگی اور ہمارا کام بن جائیگا۔ چنانچہ یہ تحریک کر کے یہ شخص شام کی طرف گیا اور مدینہ کے منافقوں نے روزانہ مدینہ میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کر دیں کہ فلاں قافلہ ہمیں ملا تھا اور اُس نے بتایا تھا کہ شامی لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ دوسرے دن پھر کہدیتے تھے کہ فلاں قافلہ کے لوگ ہمیں ملے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ مدینہ پر شامی لشکر چڑھائی کرنے والا ہے۔ یہ خبریں اتنی شدّت سے پھیلنی شروع ہوئیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ آپ اسلامی لشکر لے کر خود شامی لشکروں کے مقابلہ کے لیے جائیں۔ یہ وقت مسلمانوں کے لیے نہایت ہی تکلیف کا تھا۔ قحط کا سال تھا۔ پچھلے موسم میں غلّہ اور پھل کم پیدا ہُوا تھا اور اس موسم کی اجناس ابھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ ستمبر کا آخر یا اکتوبر کا شروع تھا، جب آپ اِس مہم کے لیے روانہ ہوئے۔ منافق تو جانتے تھے کہ یہ سب شرارت ہے اور یہ کہ اُنہوں نے یہ سب چالاکی اِس لیے کی ہے کہ اگر اسلامی لشکر حملہ آور نہ ہُوا تو مسلمان خود شامیوں سے جا لڑیں اور اس طرح تباہ ہو جائیں۔ موتہ کی جنگ کے حالات اُن کے سامنے تھے اُس وقت مسلمانوں کو اتنے بڑے لشکر کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ وہ بہت کچھ نقصان اُٹھا کر بمشکل بچے تھے۔ اب وہ ایک دوسری موتہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نعوذ باللہ شہید ہو جائیں۔ اِس لیے ایک طرف تو منافق لوگوں میں روزانہ یہ خبریں پھیلاتے تھے کہ فلاں ذریعہ سے ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ دشمن حملہ کر رہا ہے۔ فلاں ذریعہ سے معلوم ہُوا ہے کہ شامی فوجیں آ رہی ہیں اور دوسری طرف لوگوں کو ڈرا رہے تھے کہ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ آسان نہیں تمہیں جنگ کے لیے نہیں جانا چاہیئے۔ اِن کارروائیوں سے اُن کی غرض یہ تھی کہ مسلمان شام پر حملہ کرنے کے لیے جائیں تو سہی، لیکن جتنی کم تعداد میں ہو سکے جائیں تاکہ اُن کی شکست زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے۔ مگر مسلمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان پر کہ ہم شام کی طرف جانے والے ہیں اخلاص اور جوش سے بڑھ بڑھ کر قربانیاں کر رہے تھے۔ غریب مسلمانوں کے پاس جنگ کے سامان تھے کہاں؟ حکومت کا خزانہ بھی خالی تھا۔ اُنکے آسودہ حال بھائی ہی اُن کی مدد کیلئے آ سکتے تھے۔ چنانچہ ہر شخص قربانی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا حضرت عثمانؓ نے اُس دن اپنے روپے کا اکثر حصّہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا جو ایک ہزار سونے کا دینار تھا یعنی قریباً ۲۵ ہزار روپیہ۔ اِسی طرح اور صحابہؓ نے اپنی اپنی توفیق کے مطابق چندے دیئے اور غریب مسلمانوں کے لیے

سواریاں یا تلواریں یا نیزے مہیا کیے گئے۔ صحابہؓ میں قربانی کا اس قدر جوش تھا کہ یمن کے کچھ لوگ جو اسلام لاکر مدینہ میں ہجرت کر آئے تھے اور بہت ہی غربت کی حالت میں تھے اُن کے کچھ افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا، یا رسول اللہ! ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلیئے۔ ہم کچھ اور نہیں چاہتے ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں وہاں تک پہنچنے کا سامان مل جائے قرآن کریم میں اِن لوگوں کا ذکر اِن الفاظ میں آتا ہے وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ (سورۃ توبہ ع ۱۲) یعنی اس جنگ میں شریک ہونیکا اِن لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جو تیرے پاس اسلیے آئے تھے کہ تو اُن کیلئے ایسا سامان مہیا کردے کہ جسکے ذریعہ سے وہ وہاں پہنچ سکیں۔ مگر تو نے اُنہیں کہا کہ میرے پاس تو تمہیں وہاں پہنچانے کا کوئی سامان نہیں۔ تب وہ تیری مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے اور اُنکی آنکھوں سے اِس غم میں آنسو بہتے تھے کہ افسوس اُن کے پاس کوئی مال نہیں جس کو خرچ کرکے وہ آج اسلامی خدمت کرسکیں۔ ابوموسیٰؓ اِن لوگوں کے سردار تھے جب اُن سے پوچھا گیا کہ آپ نے اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا مانگا تھا؟ تو انہوں نے کہا خدا کی قسم! ہم نے اُونٹ نہیں مانگے، ہم نے گھوڑے نہیں مانگے۔ ہم نے صرف یہ کہا تھا کہ ہم ننگے پاؤں ہیں اور اتنا لمبا سفر پیدل نہیں چل سکتے اگر ہم کو صرف جوتیوں کے جوڑے مل جائیں تو ہم جوتیاں پہن کر ہی بھاگتے ہوئے اپنے بھائیوں کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہونیکے لیے پہنچ جائیں گے۔ چونکہ لشکر نے شام کی طرف جانا تھا اور موتہ کی جنگ کا نظارہ مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس لیے ہر مسلمان کے دل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جان کی حفاظت کا خیال سب خیالوں پر مقدم تھا۔ عورتیں تک بھی اس خطرہ کو محسوس کر رہی تھیں اور اپنے خاوندوں اور اپنے بیٹوں کو جنگ پر جانے کی تلقین کر رہی تھیں۔ اس اخلاص اور اس جوش کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک صحابی جو کسی کام کے لیے باہر گئے ہوئے تھے اس وقت واپس لوٹے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لشکر سمیت مدینہ سے روانہ ہوچکے تھے۔ ایک عرصہ کی جدائی کے بعد جب وہ اس خیال سے اپنے گھر میں داخل ہوئے کہ اپنی محبوبہ بیوی کو جاکر دیکھیں گے اور خوش ہونگے۔ تو اُنہوں نے اپنی بیوی کو صحن میں بیٹھے ہوئے دیکھا اور محبت سے بغل گیر ہونے اور اسے پیار کرنے کے لیئے تیزی سے اُسکی طرف آگے بڑھے۔ جب وہ بیوی کے قریب گئے تو اُن کی بیوی نے دونوں ہاتھوں سے اُنکو دھکا دیکر پیچھے ہٹا دیا۔ اس صحابی نے حیرت سے اپنی بیوی کا مُنہ دیکھا اور پوچھا۔ اتنی مدّت کے بعد ملنے پر آخر یہ سلوک کیوں؟ بیوی نے کہا کیا تم کو شرم نہیں آتی خدا کا رسول اس خطرہ کی جگہ پر جارہا ہے اور تم اپنی بیوی سے پیار کرنیکی جرأت کرتے ہو! پہلے جاؤ اور اپنا فرض ادا کرو اسکے بعد یہ باتیں دیکھی جائینگی وہ صحابی فوراً گھر سے باہر نکل گئے اپنی سواری پر زین کسی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تین منزل پر جاکر مل گئے۔

کفار تو یہ سمجھتے تھے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اِن افواہوں کی بنا پر بے سوچے سمجھے شامی لشکروں پر جا پڑیں گے۔ مگر رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم تو اسلامی اخلاق کے تابع تھے۔ جب آپ شام کے قریب تبوک مقام پر پہنچے تو آپ نے اِدھر اُدھر آدمی بھیجے تاکہ وہ معلوم کریں کہ حقیقت کیا ہے۔ اور یہ سب سفراء متفقہ طور پر یہ خبریں لائے کہ کوئی شامی لشکر اس وقت جمع نہیں ہو رہا۔ اِس پر کچھ دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وہاں ٹھہرے اور اردگرد کے بعض قبائل سے معاہدات کرکے بغیر لڑائی کے واپس آگئے۔

یہ کُل سفر آپ کا دو واڑھائی مہینے کا تھا جب مدینہ کے منافقوں کو معلوم ہُوا کہ لڑائی بھڑائی تو کچھ نہیں ہوئی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خیریت سے واپس آرہے ہیں۔ تو انہوں نے سمجھ لیا کہ ہماری منافقانہ چالوں کا راز اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر ہوگیا ہے اور غالباً اب ہم سزا سے نہیں بچیں گے۔ تب اُنہوں نے مدینہ سے کچھ فاصلہ پر چند آدمی ایک ایسے رستہ پر بٹھادئے جو نہایت تنگ تھا اور جس پر صرف ایک ایک سوار گذر سکتا تھا جب آپ اس جگہ کے قریب پہنچے تو آپ کو اللہ تعالیٰ نے وحی سے بتادیا کہ آگے دشمن راستہ کے دونوں طرف چھپا بیٹھا ہے۔ آپ نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ جاؤ اور وہاں جاکر دیکھو۔ وہ سواری کو تیز کرکے وہاں پہنچے تو اُنہوں نے وہاں چند آدمی چھپے ہوئے دیکھے جو اس طرح چھپے بیٹھے تھے جیسا کہ حملہ کرنے والے بیٹھا کرتے ہیں۔ اُن کے پہنچنے پر وہ وہاں سے بھاگ گئے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کا تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

جب آپ مدینہ پہنچے تو منافقوں نے جو اس جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے قسم قسم کی معذرتیں کرنی شروع کردیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو قبول کرلیا لیکن اب وقت آگیا تھا کہ منافقوں کی حقیقت کو مسلمانوں پر آشکار کردیا جاتا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے وحی سے حکم دیا کہ قبا کی وہ مسجد جو منافقوں نے اس لیے بنائی تھی کہ نماز کے بہانے سے وہاں جمع ہوا کریں گے اور منافقانہ مشورے کیا کرینگے، وہ گرادی جائے اور ان کو مجبور کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی دوسری مسجدوں میں نماز پڑھا کریں، مگر باوجود اتنی بڑی شرارت کے اُن کو کوئی بدنی یا مالی سزا نہ دی گئی۔

تبوک سے واپسی کے بعد طائف کے لوگوں نے بھی آکر اطاعت قبول کرلی اور اس کے بعد عرب کے متفرق قبائل نے باری باری آکر اسلامی حکومت میں داخلہ کی اجازت چاہی اور تھوڑے ہی عرصہ میں سارے عرب پر اسلامی جھنڈا لہرانے لگ گیا۔

حجۃ الوداع اور آنحضرت صلعم کا ایک خطبہ

نویں سال ہجری میں آپ نے مکہ کا حج فرمایا اور اُس دن آپ پر قرآن شریف کی یہ مشہور آیت نازل ہوئی کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (سورۃ مائدہ ع۱) یعنی آج مَیں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کردیا ہے اور جتنے روحانی انعامات خدا تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوسکتے ہیں وہ سب مَیں نے تمہاری اُمّت کو بخش دئے ہیں اور اس بات کا فیصلہ کردیا ہے کہ تمہارا دین خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مبنی ہو۔

اِس آیت کو آپ نے مزدلفہ کے میدان میں جبکہ حج کے لیے لوگ جمع ہوتے ہیں سب لوگوں کے سامنے باآواز بلند پڑھ کر سنایا۔ مزدلفہ سے لوٹنے پر حج کے قواعد کے مطابق آپ مِنیٰ میں ٹھہرے اور گیارھویں ذوالحجہ کو آپ نے تمام مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہوکر ایک تقریر کی جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"اے لوگو! میری بات کو اچھی طرح سُنو کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اس سال کے بعد کبھی بھی مَیں تم لوگوں کے درمیان اِس میدان میں کھڑے ہو کر کوئی تقریر کروں گا۔ تمہاری جانوں اور تمہارے مالوں کو خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے کے حملہ سے قیامت تک کے لیے محفوظ قرار دیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہر شخص کے لیے وراثت میں اس کا حصّہ مقرر کر دیا ہے۔ کوئی وصیّت ایسی جائز نہیں جو دوسرے وارث کے حق کو نقصان پہنچائے۔ جو بچّہ جسکے گھر میں پیدا ہو وہ اس کا سمجھا جائیگا اور اگر کوئی بدکاری کی بناء پر اُس بچے کا دعویٰ کریگا تو وہ خود شرعی سزا کا مستحق ہوگا۔ جو شخص کسی کے باپ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے یا کسی کو جھوٹے طور پر اپنا آقا قرار دیتا ہے خدا اور اس کے فرشتوں اور بنی نوع انسان کی لعنت اُس پر ہے۔ اے لوگو! تمہارے کچھ حق تمہاری بیویوں پر ہیں اور تمہاری بیویوں کے کچھ حق تم پر ہیں۔ اُن پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ عفّت کی زندگی بسر کریں اور ایسی کمینگی کا طریق اختیار نہ کریں جس سے خاوندوں کی قوم میں بے عزّتی ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو تم (جیسا کہ قرآن کریم کی ہدایت ہے کہ باقاعدہ تحقیق اور عدالتی فیصلہ کے بعد ایسا کیا جا سکتا ہے) اُنہیں سزا دے سکتے ہو مگر اس میں بھی سختی نہ کرنا۔ لیکن اگر وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتیں جو خاندان اور خاوند کی عزت کو بٹہ لگانیوالی ہو تو تمہارا کام ہے کہ تم اپنی حیثیت کے مطابق اُنکی خوراک اور لباس وغیرہ کا انتظام کرو۔ اور یاد رکھو کہ ہمیشہ اپنی بیویوں سے اچھا سلوک کرنا کیونکہ خدا تعالےٰ نے اُن کی نگہداشت تمہارے سپرد کی ہے۔ عورت کمزور وجود ہوتی ہے اور وہ اپنے حقوق کی خود حفاظت نہیں کر سکتی۔ تم نے جب اُن کے ساتھ شادی کی تو خدا تعالیٰ کو اُن کے حقوق کا ضامن بنایا تھا اور خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت تم اُن کو اپنے گھروں میں لائے تھے (پس خدا تعالیٰ کی ضمانت کی تحقیر نہ کرنا۔ اور عورتوں کے حقوق کے ادا کرنے کا ہمیشہ خیال رکھنا) اے لوگو! تمہارے ہاتھوں میں ابھی کچھ جنگی قیدی بھی باقی ہیں۔ مَیں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اُن کو وہی کچھ کھلانا جو تم خود کھاتے ہو اور اُن کو وہی کچھ پہنانا جو تم خود پہنتے ہو۔ اگر اُن سے کوئی ایسا قصور ہو جائے جو تم معاف نہیں کر سکتے تو اُن کو کسی اور کے پاس فروخت کر دو۔ کیونکہ وہ خدا کے بندے ہیں اور اُن کو تکلیف دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ اے لوگو! جو کچھ مَیں تمہیں کہتا ہوں سُنو اور اچھی طرح اُسکو یاد رکھو۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ تم سب ایک ہی درجہ کے ہو۔ تم تمام انسان خواہ کسی قوم اور کسی حیثیت کے ہو انسان ہونے کے لحاظ سے ایک درجہ رکھتے ہو۔ یہ کہتے ہوئے آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں ملا دیں اور کہا جس طرح اِن دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں برابر ہیں اسی طرح تم بنی نوع انسان آپس میں برابر ہو۔ تمہیں ایک دوسرے پر فضیلت اور درجہ ظاہر کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تم آپس میں بھائیوں کی طرح ہو۔ پھر فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے آج کونسا مہینہ ہے؟ کیا تمہیں معلوم ہے یہ علاقہ کونسا ہے؟ کیا تمہیں معلوم ہے یہ دن کونسا ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں! یہ مقدس مہینہ ہے، یہ مقدس علاقہ ہے اور یہ حج کا دن ہے۔ ہر جواب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے جس طرح یہ مہینہ مقدس ہے، جس طرح یہ علاقہ مقدس ہے جس طرح یہ دن مقدس ہے اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی جان اور اس کے مال کو مقدس قرار دیا ہے اور کسی کی جان اور کسی کے مال پر حملہ کرنا ایسا ہی ناجائز ہے جیسے کہ اس مہینے اور اس علاقہ اور اس دن کی ہتک کرنا۔ یہ حکم آج کے لیے نہیں، کل کے لیے نہیں بلکہ اُس دن تک کیلئے ہے کہ تم خدا سے جا کر ملو۔

پھر فرمایا۔ یہ باتیں جو میں تمہیں آج کہتا ہوں اِن کو دنیا کے کناروں تک پہنچادو کیونکہ ممکن ہے کہ جو لوگ آج مجھ سے سُن رہے ہیں اُن کی نسبت وہ لوگ اِن پر زیادہ عمل کریں جو مجھ سے نہیں سن رہے۔"

یہ مختصر خطبہ بتاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بنی نوع انسان کی بہتری اور اُنکا امن کیسا مدنظر تھا! اور عورتوں اور کمزوروں کے حقوق کا آپ کو کیسا خیال تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم محسوس کر رہے تھے کہ اب موت قریب آرہی ہے شاید اللہ تعالیٰ آپکو بتا چکا تھا کہ اب آپکی زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ آپنے نہ چاہا کہ وہ عورتیں جو انسانی پیدائش کے شروع سے مردوں کی غلام قرار دی جاتی تھیں اُنکے حقوق کو محفوظ کرنے کا حکم دینے سے پہلے آپ اِس دنیا سے گذر جائیں۔ وہ جنگی قیدی جنکو لوگ غلام کا نام دیا کرتے تھے اور طرح طرح کے مظالم اُن پر کیا کرتے تھے آپنے نہ چاہا کہ اُنکے حقوق کو محفوظ کر دینے سے پہلے آپ اس دنیا سے گذر جائیں۔ وہ بنی نوع انسان کی باہمی فرق اور امتیاز جو انسانوں میں سے بعض کو تو آسمان پر چڑھا دیتا تھا اور بعض کو تحت الثریٰ میں گرا دیتا تھا جو قوموں قوموں اور ملکوں ملکوں کے درمیان تفرقہ اور لڑائی پیدا کرنے اور اُس کو جاری رکھنے کا موجب ہوتا تھا آپنے نہ چاہا کہ جبتک اس تفرقہ اور امتیاز کو آپ مٹا نہ دیں اِس دنیا سے گذر جائیں۔ وہ ایک دوسرے کے حقوق پر چھاپے مارنا اور ایک دوسرے کی جان اور مال کو اپنے لیے جائز سمجھنا جو ہمیشہ ہی بداخلاقی کے زمانہ میں انسان کی سب سے بڑی لعنت ہوتا ہے آپنے نہ چاہا کہ جب تک اِس رُوح کو کُچل نہ دیں اور جب تک بنی نوع انسان کی جانوں اور اُنکے مالوں کو وہی تقدس اور وہی حُرمت نہ بخشدیں جو خدا تعالیٰ کے مقدس مہینوں اور خدا تعالیٰ کے مقدس اور بابرکت مقاموں کو حاصل ہے آپ اس دنیا سے گذر جائیں۔ کیا عورتوں کی ہمدردی، ماتحت لوگوں کی ہمدردی، بنی نوع انسان میں امن اور آرام کے قیام کی خواہش اور بنی نوع انسان میں مساوات کے قیام کی خواہش اتنی شدید دنیا کے کسی اور انسان میں پائی جاتی ہے؟ کیا آدمؑ سے لیکر آج تک کسی انسان نے بھی بنی نوع انسان کی ہمدردی کا ایسا جذبہ اور ایسا جوش دکھایا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں آج تک عورت اپنی جائیداد کی مالک ہے جبکہ یورپ نے اس درجہ کو اسلام کے تیرہ سو سال بعد حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونیوالا ہر شخص دوسرے کے برابر ہو جاتا ہے خواہ وہ کیسی ہی ادنیٰ اور ذلیل سمجھی جانے والی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ حُرّیت اور مساوات کا جذبہ صرف اور صرف اسلام نے ہی دنیا میں قائم کیا ہے اور ایسے رنگ میں قائم کیا ہے کہ آج تک بھی دنیا کی دوسری قومیں اسکی مثال پیش نہیں کر سکتیں۔ ہماری مسجد میں ایک بادشاہ اور ایک معزز ترین مذہبی پیشوا اور ایک عامی برابر ہیں اُن میں کوئی فرق اور امتیاز قائم نہیں کر سکتا جبکہ دوسرے مذاہب کے معبد بڑوں اور چھوٹوں کے امتیاز کو اب تک ظاہر کرتے چلے آتے ہیں۔ گو وہ قومیں شاید حُریت اور مساوات کا دعویٰ مسلمانوں سے بھی زیادہ بلند آواز سے کر رہی ہیں۔

آنحضرت صلعم کی وفات

جب اِس سفر سے آپ واپس آرہے تھے، تو راستہ میں پھر آپ نے اپنے صحابہ کو اپنی وفات کی خبر دی۔ آپ نے فرمایا اے لوگو! میں تمہاری طرح کا ایک آدمی ہوں قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغامبر میری طرف آئے۔

اور مجھے اس کا جواب دینا پڑے۔ پھر فرمایا اے لوگو! مجھے میرے مہربان اور خبردار آقا نے خبر دی ہے کہ نبی اپنے سے پہلے نبی کی نصف عمر پاتا ہے (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر ۱۲۰ سال کے قریب تھی اور اس سے آپ نے استدلال کیا کہ میری عمر ساٹھ سال کے قریب ہو گی۔ چونکہ اس وقت آپکی عمر باسٹھ تریسٹھ سال کی تھی آپ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ میری عمر اب ختم ہونیوالی معلوم ہوتی ہے۔ اس حدیث کے یہ معنے نہیں کہ ہر نبی اپنے سے پہلے آنیوالے نبی سے آدھی عمر پاتا ہے بلکہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر اور اپنی عمر کا مقابلہ کیا ہے) اور مجھے خیال ہے کہ اب جلدی مجھے بلایا جائیگا اور مَیں فوت ہو جاؤنگا۔ اے میرے صحابہؓ! مجھ سے بھی خدا کے سامنے سوال کیا جائیگا اور تم سے بھی سوال کیا جائیگا تم اسوقت کیا کہو گے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم کہیں گے کہ آپ نے خوب اچھی طرح اسلام کی تبلیغ کی اور آپ نے اپنی زندگی کو کلّی طور پر خدا کے دین کی خدمت کے لیے لگا دیا اور آپ نے بنی نوع انسان کی خیر خواہی کو کمال تک پہنچا دیا۔ اللہ آپ کو ہماری طرف سے بہتر سے بہتر بدلہ دے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ ایک ہی ہے اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اُس کے بندے اور رسول ہیں اور کہ جنت بھی حق ہے اور دوزخ بھی حق ہے اور یہ کہ موت بھی ہر انسان کو ضرور آنی ہے اور موت کے بعد زندگی بھی ہر انسان کو ضرور ملیگی اور یہ کہ قیامت بھی ضرور آنیوالی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام بنی نوع انسان کو قبروں میں سے دوبارہ زندہ کر کے اکٹھا کرے گا۔ انہوں نے کہا ہاں یا رسول اللہ! ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس پر آپ نے خدا تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اے اللہ! تو بھی گواہ رہ کہ مَیں نے انہیں اصول اسلام پہنچا دیئے ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس حج سے واپس آنے کے بعد برابر مسلمانوں کے اخلاق اور اُن کے اعمال کی اصلاح میں مشغول رہے اور مسلمانوں کو اپنی وفات کے دن کی امید کے لیے تیار کرتے رہے۔ ایک دن آپ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ آج مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہُوا ہے کہ اُس دن کو یاد کرو جب خدا تعالیٰ کی نصرتیں اور اُسکی طرف سے فتوحات گذشتہ زمانہ سے بھی زیادہ زور سے آئینگی اور ہر قوم و ملّت کے لوگ اسلام میں فوج در فوج داخل ہونے شروع ہونگے۔ پس اے محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم)! اب تم خدا تعالےٰ کی تعریف میں لگ جاؤ اور اس سے دعا کرو کہ وہ دین کی بنیاد جو تم نے قائم کی ہے اُس میں سے ہر قسم کے رخنوں کو خدا تعالےٰ دور کر دے۔ اگر تم یہ دعائیں کرو گے تو خدا تعالیٰ ضرور تمہاری دعاؤں کو سُنیگا۔ اسی طرح آپ نے فرمایا خدا تعالیٰ نے اپنے ایک بندے سے کہا کہ خواہ تم ہمارے پاس آجاؤ اور خواہ تم دنیا کی اصلاح کا کام بھی کچھ اور مدّت کرو اور خدا کے اس بندے نے اُس کے جواب میں کہا کہ مجھے آپ کے پاس آنا زیادہ پسند ہے۔ جب آپؐ نے یہ بات مجلس میں سُنائی تو حضرت ابوبکرؓ رو پڑے۔ صحابہؓ کو تعجب ہُوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو اسلام کی فتوحات کی خبر سُنا رہے ہیں اور ابوبکرؓ رو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں مَیں نے کہا اِس بڈھے کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ خوشی کی خبر پر روتا ہے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے کہ ابوبکرؓ ہی آپ کی بات کو صحیح سمجھا ہے اور اس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس سورت میں میری وفات کی خبر ہے۔ آپ نے فرمایا ابوبکرؓ مجھ کو بہت ہی پیارا ہے۔ اگر ہر دوسرے وجود سے پیار کرنا صرف خدا کی ذات سے مخصوص نہ ہوتا تو میں ابوبکرؓ سے ایسا ہی پیار کرتا۔ اے لوگو! مسجد میں

جتنے لوگوں کے دروازے کھلتے ہیں آج سے سب دروازے بند کر دیئے جائیں صرف ابوبکرؓ کا دروازہ کھلا رہے۔ اس میں یہ پیشگوئی تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوں گے اور نماز پڑھانے کے لیے انہیں مسجد میں اس راستہ سے آنا پڑیگا۔ اس واقعہ کے مدتوں بعد جب حضرت عمرؓ خلیفہ تھے ایک دفعہ آپ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے فرمایا بتاؤ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ والی سورۃ میں سے کیا مضمون نکلتا ہے؟ گویا اس مضمون کے متعلق آپ نے اپنے ہم مجلسوں کا امتحان لیا جس کے سمجھنے سے وہ اس سورۃ کے نزول کے وقت قاصر رہے تھے۔ ابن عباسؓ جو اس واقعہ کے وقت دس گیارہ برس کے تھے اُس وقت کوئی ۱۷۔۱۸ سال کے نوجوان تھے۔ باقی صحابہ تو نہ بتا سکے۔ ابن عباسؓ نے کہا اے امیر المومنین! اس سورۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے۔ کیونکہ نبی جب اپنا کام کر لیتا ہے تو پھر دنیا میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا سچ ہے، میں تمہاری ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ جب یہ سورۃ نازل ہوئی ابوبکرؓ نے اس کا مفہوم سمجھا مگر ہم نہ سمجھ سکے۔

آخر وہ دن آگیا جو ہر انسان پر آتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنا کام دنیا میں ختم کر چکے۔ خدا کی وحی تمام و کمال نازل ہو چکی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ سے ایک نئی قوم اور ایک نئے آسمان اور نئی زمین کی بنیاد ڈال دی گئی۔ بونے والے نے زمین میں ہل چلایا، پانی دیا اور بیج بویا اور فصل تیار کی۔ اب فصل کے کاٹنے کا کام اس کے ذمہ نہ تھا۔ وہ ایک مزدور کی حیثیت سے آیا اور ایک مزدور ہی کی حیثیت سے اُسے اِس دنیا سے جانا تھا۔ کیونکہ اُس کا انعام اس دنیا کی چیزیں نہیں تھیں بلکہ اُس کا انعام اپنے پیدا کرنیوالے اور اپنے بھیجنے والے کی رضاء تھی۔ جب فصل کٹنے پر آتی تو اُس نے اپنے رب سے یہی خواہش کی کہ وہ اب اُسے دنیا سے اُٹھالے اور یہ فصل بعد میں دوسرے لوگ کاٹیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے کچھ دن تو تکلیف اُٹھا کر مسجد میں نماز پڑھانے کے لیے آتے رہے۔ آخر یہ طاقت بھی نہ رہی کہ آپ مسجد میں آسکتے۔ صحابہؓ کبھی خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ آپ فوت ہو جائینگے۔ مگر آپ بار بار اپنی وفات کے قرب کی خبر دیتے۔ ایک دن صحابہ کی مجلس لگی ہوئی تھی کہ آپ نے فرمایا اگر کسی شخص سے غلطی ہو جائے تو بہتر یہی ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اس کا ازالہ کر دے تا کہ خدا کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔ اگر میرے ہاتھ سے نادانستہ طور پر کسی کا حق مارا گیا ہو تو وہ مجھ سے اپنا حق مانگ لے۔ اگر بے جانے بوجھے مجھ سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو آج وہ مجھ سے بدلہ لے لے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ خدا تعالیٰ کے سامنے میں شرمندہ ہوں۔ دوسرے صحابہ پر تو یہ بات سُن کر رقت طاری ہو گئی اور اُن کے دل میں یہی خیال گذرنے لگے کہ کس طرح تکلیف اُٹھا کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے آرام کی صورت پیدا کرتے رہے ہیں کس طرح آپ بھوکا رہ کر اُن کو کھلاتے رہے ہیں۔ اپنے کپڑوں کو پیوند لگا کر اُن کو کپڑے پہناتے رہے ہیں پھر بھی دوسروں کے حقوق کا آپ کو اتنا خیال ہے کہ آپ اُن سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر بے جانے بوجھے مجھ سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو آج مجھ سے بدلہ لے لے۔ مگر ایک صحابی آگے بڑھے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے آپ سے ایک دفعہ تکلیف پہنچی تھی۔ جنگ کی صفیں تیار ہو رہی تھیں کہ آپ صف میں سے ہو کر آگے بڑھے اُس وقت آپکی کہنی میرے جسم کو لگ گئی۔ چونکہ آپ نے فرمایا ہے کہ بے جانے بوجھے بھی اگر کسی کو نقصان پہنچا ہو تو مجھ سے بدلہ لے لے۔ تو میں چاہتا ہوں کہ اِس وقت آپ سے اُس تکلیف کا بدلہ لے لوں۔ وہ صحابہؓ جو غم کے سمندر میں ڈوب

رہے تھے یکدم اُن کی حالت میں تغیر پیدا ہُوا۔ ان کی آنکھوں میں سے خون ٹپکنے لگا اور ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ یہ شخص جس نے ایسے موقعہ پر بجائے نصیحت حاصل کرنے کے اِس قسم کی بات چھیڑ دی ہے سخت سے سخت سزا کا مستحق ہے مگر اس صحابی نے پروانہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ٹھیک کہتے ہو تمہارا حق ہے کہ بدلہ لو۔ اور آپ نے کروٹ بدلی اور اپنی پیٹھ اس کی طرف کر دی اور فرمایا لو میرے کہنی مار لو۔ اُس صحابیؓ نے کہا یا رسول اللہ! جب میرے کہنی لگی تھی اس وقت میرا جسم ننگا تھا کیونکہ میرے پاس کرتہ نہ تھا کہ مَیں اسے پہنتا۔ آپ نے فرمایا میرا کُرتہ اُٹھا دو اور ننگے جسم پر کہنی مار کر اپنا بدلہ لے لو۔ اُس صحابیؓ نے آپکا کرتا اُٹھایا اور کانپتے ہونٹوں اور آنسو بہاتی ہوئی آنکھوں سے جھک کر آپ کی کمر کو بوسہ دیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کیا؟ اُس نے جواب میں کہا یا رسول اللہ! جب آپ فرماتے ہیں کہ آپ کی موت قریب ہے تو آپ کو چھُونے اور آپ کو پیار کرنے کے مواقع ہمیں کب تک ملیں گے۔ بیشک جنگ کے موقعہ پر مجھے آپ کی کہنی لگی تھی، لیکن کس کے دل میں اُس کہنی لگنے کا بدلہ لینے کا خیال بھی آسکتا ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آج مجھ سے بدلہ لے لو تو چلو اس بہانہ سے میں آپ کو پیار ہی کر لوں، وہی صحابہؓ جن کے دل غصّہ سے خون ہو رہے تھے اِس بات کو سنکر اُنہی کے دل اس حسرت سے بھر گئے کہ کاش یہ موقعہ ہم کو نصیب ہوتا!

مرض بڑھتا گیا، موت قریب آتی گئی۔ مدینہ کا سورج باوجود پہلے کی سی آب و تاب سے چمکنے کے صحابہ کی نظروں میں اب زرد ہونے لگا۔ دن چڑھتے تھے مگر ان کی آنکھوں پر تاریکی کے پردے پڑتے چلے جاتے تھے آخر وہ وقت آگیا جب کہ خدا کے رسول کی رُوح دنیا کو چھوڑ کر اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں حاضر ہونے والی تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سانس تیز ہونے لگ گیا اور سانس لینے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا میرا سر اُٹھا کر اپنے سینہ کے ساتھ رکھ لو، کیونکہ لیٹے لیٹے سانس نہیں لیا جاتا۔ حضرت عائشہ رضؓ نے آپکا سر اُٹھا کر اپنے سینہ سے لگا لیا اور آپکو سہارا دیکر بیٹھ گئیں۔ موت کی تکلیف آپ پر طاری تھی۔ آپ گھبراہٹ سے بیٹھے بیٹھے کبھی اس پہلو پر جھکتے تھے اور کبھی اُس پہلو پر۔ اور فرماتے تھے۔ خدا بُرا کرے یہود اور نصارٰی کا کہ انہوں نے اپنے نبیوں کے مرنے کے بعد ان کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔ یہ آپ کی آخری نصیحت تھی اپنی امت کے لیے کہ گو تم مجھے تمام نبیوں سے زیادہ شاندار دیکھو گے اور سب سے زیادہ کامیاب پاؤ گے، مگر دیکھنا میرے بندے ہونے کو کبھی نہ بھُول جانا۔ خدا کا مقام خدا ہی کو دیتے رہنا اور میری قبر کو ایک قبر سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھنا۔ باقی اُمتیں اپنے نبیوں کی قبروں کو بیشک مسجدیں بنا لیں، وہاں بیٹھ کر چلّے کیا کریں اور اُن پر چڑھاوے چڑھائیں یا نذریں دیں مگر تمہارا یہ کام نہیں ہونا چاہیئے۔ تم خدائے واحد کی پرستش کو قائم کرنے کے لیے کھڑے کیے گئے ہو۔ یہ کہتے کہتے آپ کی آنکھیں چڑھ گئیں اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے اِلَی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی۔ اِلَی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی مَیں عرش معلّٰی پر بیٹھنے والے اپنے مہربان دوست کی طرف جاتا ہوں۔ مَیں عرش معلّٰی پر بیٹھنے والے اپنے مہربان دوست کی طرف جاتا ہوں یہ کہتے کہتے آپ کی روح اس جسم سے جدا ہو گئی۔

آنحضرت صلعم کی وفات پر صحابہؓ کی حالت

جب یہ خبر مسجد میں صحابہ کو ملی جن میں سے اکثر اپنے کام کاج چھوڑ کر مسجد میں آپکی صحت کی خوشخبری سُننے کے انتظار میں تھے تو اُن پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا حضرت ابوبکرؓ اس وقت تھوڑی دیر کیلئے کسی کام کے لیے باہر گئے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ مسجد میں تھے جب انہوں نے لوگوں کو یہ بات کرتے سُنا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں تو انہوں نے نیام سے تلوار نکالی اور کہا خدا کی قسم! جو شخص یہ کہیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں میں اُس کا سر اُڑا دونگا۔ ابھی تک منافق دنیا میں باقی ہیں اس لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہو سکتے۔ اگر انکی روح جسم سے جدا ہو گئی ہے تو وہ صرف موسیٰؑ کی طرح خدا کی ملاقات کے لیے گئی ہے اور پھر واپس آ جائیگی اور دنیا سے منافقوں کا قلع قمع کریگی۔ یہ کہا اور ننگی تلوار لیکر اس رنج دہ خبر کے صدمہ سے مجنونوں کی طرح اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے تھے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں تو میں اُسے قتل کر دُونگا۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم نے حضرت عمرؓ کو اس طرح ٹہلتے ہوئے دیکھا تو ہمارے دلوں کو بھی ڈھارس بندھی اور ہم نے کہا عمرؓ سچ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے ضرور اس بارہ میں لوگوں کو غلطی لگی ہے اور عمرؓ کے قول کے ساتھ ہم نے اپنے دلوں کو تسلی دینی شروع کی۔ اتنے میں بعض لوگوں نے دوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کو صورتِ حالات سے اطلاع دی۔ اُن سے اطلاع پاکر حضرت ابوبکرؓ بھی مسجد میں پہنچ گئے، مگر کسی سے بات نہ کی سیدھے گھر میں گھس گئے اور جا کر حضرت عائشہؓ سے پوچھا کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہاں! آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے آپ کے مُنہ پر سے کپڑا اُٹھایا آپ کے ماتھے کو بوسہ دیا اور رنج و محبت کے چمکتے ہوئے آنسو آپ کی آنکھوں سے گرے اور آپ نے فرمایا خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں وارد نہیں کریگا۔ یعنی یہ نہیں ہوگا کہ ایک تو آپ جسمانی طور پر فوت ہو جائیں اور دوسری موت آپ پر یہ وارد ہو کہ آپ کی جماعت غلط عقائد اور غلط خیالوں میں مبتلا ہو جائے۔ یہ کہہ کر آپ باہر آئے اور صفوں کو چیرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ منبر کی طرف بڑھے۔ جب آپ منبر پر کھڑے ہوئے تو حضرت عمرؓ بھی تلوار کھینچ کر آپ کے پاس کھڑے ہو گئے اس نیت سے کہ اگر ابوبکرؓ نے یہ کہا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں تو میں اُن کو قتل کر دونگا۔ جب آپ بولنے لگے تو حضرت عمرؓ نے آپ کا کپڑا کھینچا اور آپ کو خاموش کرنا چاہا۔ مگر آپ نے کپڑے کو جھٹک کر اُن کے ہاتھ سے کھینچ لیا اور پھر قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران ع ۱۵) یعنی اے لوگو! محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صرف اللہ تعالیٰ کے ایک رسول تھے اُن سے پہلے اور بہت سے رسول گذرے ہیں اور سب کے سب فوت ہو چکے ہیں کیا اگر وہ مر جائیں یا مارے جائیں تو تم لوگ اپنے دین کو چھوڑ کر پھر جاؤ گے۔ دین خدا کا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو نہیں۔ یہ آیت اُحد کے وقت نازل ہوئی تھی جبکہ بعض لوگ یہ سُنکر کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں دل چھوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس آیت کے پڑھنے کے بعد آپ نے فرمایا اے لوگو! مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ۔ جو تم میں سے اللہ تعالیٰ کی عبادت

کرتا تھا اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اس پر کبھی موت وارد نہیں ہو سکتی۔ وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ۔ اور جو کوئی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو اُسکو میں بتا دیتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہو چکے ہیں۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ جس وقت ابو بکرؓ نے مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ الآیۃ والی آیت پڑھنی شروع کی تو میرے ہوش درست ہونے شروع ہوئے اِس آیت کے ختم کرنے تک میری رُوحانی آنکھیں کھل گئیں اور میں نے سمجھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ میں فوت ہو گئے ہیں تب میرے گھٹنے کانپ گئے اور میں نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا۔ وہ شخص جو تلوار سے ابو بکرؓ کو مارنا چاہتا تھا وہ ابو بکرؓ کے صداقت بھرے لفظوں کے ساتھ خود قتل ہو گیا۔ صحابہؓ کہتے ہیں اس وقت ہمیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صدمہ میں یہ آیت ہمیں بھول ہی گئی تھی۔ اُس وقت حسّان بن ثابت نے جو مدینہ کے ایک بہت بڑے شاعر تھے یہ شعر کہا ؎

كنت السواد لناظری فعمی علی الناظر

من شاء بعدك فلیمت فعلیك كنت اُحاذر

اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم! تُو تو میری آنکھوں کی پتلی تھا آج تیرے مرنے سے میری آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ اب تیرے مرنے کے بعد کوئی مرے میرا باپ مرے، میرا بھائی مرے، میرا بیٹا مرے، میری بیوی مرے۔ مجھے ان میں سے کسی کی موت کی پروا نہیں میں تو تیری ہی موت سے ڈرا کرتا تھا۔ یہ شعر ہر مسلمان کی دل کی آواز تھا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک مدینہ کی گلیوں میں مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مسلمان بچّے یہی شعر پڑھتے پھرتے تھے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم! تُو تو ہماری آنکھوں کی پتلی تھا تیرے مرنے سے ہم تو اندھے ہو گئے۔ اب ہمارا کوئی عزیز اور قریبی رشتہ دار مرے ہمیں پروا نہیں۔ ہمیں تو تیری ہی موت کا خوف تھا۔

سیرت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے بعد اب میں آپ کے اخلاق کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے اخلاقِ حسنہ کے متعلق مجموعی شہادت وہ ہے جو آپ کی قوم نے دی کہ آپ کی نبوّت کے دعویٰ سے پہلے آپ کی قوم نے آپ کا نام امین اور صدّیق رکھا۔ (سیرت ابن ہشام)

دنیا میں ایسے لوگ بہت ہوتے ہیں جنکی نسبت بددیانتی کا ثبوت نہیں ملتا۔ ایسے لوگ بھی بہت ہوتے ہیں جن کو کسی کڑی آزمایش میں سے گذرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ ہاں معمولی آزمائشوں سے وہ گذرتے ہیں اور انکی امانت قائم رہتی ہے لیکن اس کے باوجود اُن کی قوم اُن کو کوئی خاص نام نہیں دیتی۔ اس لیے کہ خاص نام اُسی وقت دیئے جاتے ہیں جب کوئی شخص کسی خاص صفت میں دوسرے تمام لوگوں پر فوقیت لے جاتا ہے۔ لڑائی میں شامل ہونیوالا ہر سپاہی اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتا ہے لیکن نہ انگریزی قوم ہر سپاہی کو وکٹوریہ کراس دیتی ہے نہ جرمن قوم ہر سپاہی کو آئرن کراس دیتی ہے۔ فرانس میں علمی مشغلہ رکھنے والے لوگ لاکھوں ہیں لیکن ہر شخص کو لیجن آف آنر (LEGION OF HONOUR) کا فیتہ نہیں ملتا۔ پس محض کسی شخص کا امانت دار اور صادق ہونا اس کی عظمت پر

خاص روشنی نہیں ڈالتا، لیکن کسی شخص کو ساری قوم کا امین اور صدیق کا خطاب دے دینا یہ ایک غیر معمولی بات ہے اگر مکہ کے لوگ ہر نسل کے لوگوں میں سے کسی کو امین اور صدیق کا خطاب دیا کرتے تب بھی امین اور صدیق کا خطاب پانیوالا بہت بڑا آدمی سمجھا جاتا، لیکن عرب کی تاریخ بتاتی ہے کہ عرب لوگ ہر نسل میں کبھی کسی آدمی کو یہ خطاب نہیں دیا کرتے تھے۔ بلکہ عرب کی سینکڑوں سال کی تاریخ میں صرف ایک ہی مثال محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ملتی ہے کہ آپ کو اہل عرب نے امین اور صدیق کا خطاب دیا پس عرب کی سینکڑوں سال کی تاریخ میں قوم کا ایک ہی شخص کو امین اور صدیق کا خطاب دینا بتاتا ہے کہ اُسکی امانت اور اس کا صدق دونوں اتنے اعلیٰ درجہ کے تھے کہ اُن کی مثال عربوں کے علم میں کسی اور شخص میں نہیں پائی جاتی تھی۔ عرب اپنی باریک بینی کی وجہ سے دنیا میں ممتاز تھے پس جس چیز کو وہ نادر قرار دیں وہ یقیناً دنیا میں نادر ہی سمجھے جانے کے قابل تھی۔

پھر ایک اجماعی شہادت آپ کے اخلاق پر حضرت خدیجہؓ نے آپ کی بعثت کے وقت دی جس کا میں آنحضرت صلعم کے سوانح میں ذکر کر چکا ہوں۔ اب میں چند مثالیں آپ کے اخلاق کی تشریح کے لیے اس جگہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ کے اخلاق کے مخفی گوشوں پر بھی اس کتاب کے قارئین کی نظر پڑ سکے۔

آنحضرت صلعم کی ظاہری و باطنی صفائی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ نہ آپ کبھی بد کلامی کرتے تھے اور نہ فضول قسمیں کھایا کرتے تھے (بخاری کتاب الادب) عرب میں رہتے ہوئے اس قسم کے اخلاق ایک غیر معمولی چیز تھے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ عرب لوگ عادتاً فحش کلامی کرتے تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عرب لوگ عادتاً قسمیں کھایا کرتے تھے اور آج تک بھی عرب میں قسم کا رواج کثرت سے پایا جاتا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کا اتنا ادب کرتے تھے کہ اس کا بے موقعہ نام لینا آپ کبھی پسند نہ کرتے تھے۔ صفائی کا آپ کو خاص طور پر خیال رہتا تھا۔ آپ ہمیشہ مسواک کرتے تھے اور اس بارہ میں اتنا زور دیتے تھے کہ بعض دفعہ فرماتے۔ اگر میں اس بات سے نہ ڈروں کہ مسلمان تکلیف میں پڑ جائیں گے تو مَیں ہر نماز سے پہلے مسواک کرنے کا حکم دیدوں (مشکوٰۃ کتاب الطہارۃ)

کھانا کھانے سے پہلے بھی آپ ہاتھ دھوتے تھے۔ اور کھانا کھانے کے بعد بھی آپ ہاتھ دھوتے اور کلّی کرتے تھے بلکہ ہر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد کلّی کرتے اور آپ پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد بغیر کلّی کیے کے نماز پڑھنے کو ناپسند فرماتے تھے (بخاری کتاب الاطعمۃ)

مساجد جو مسلمانوں کے جمع ہونے کی واحد جگہ ہیں۔ اُن کی صفائی کا آپ خاص طور پر خیال رکھتے تھے اور آپ مسلمانوں کو اس بات کی تحریک کرتے رہتے تھے کہ خاص طور پر اجتماع کے دنوں میں مسجدوں کی صفائی کا خیال رکھا کریں اور ان میں خوشبو جلایا کریں تاکہ ہوا صاف ہو جائے (مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ) اسی طرح آپ ہمیشہ صحابہ کو نصیحت کرتے رہتے تھے کہ اجتماع کے موقعہ پر بدبودار چیزیں کھا کر مسجد میں نہ آیا کریں (بخاری کتاب الاطعمۃ) سڑکوں کی صفائی کا آپ خاص طور پر وعظ فرماتے تھے۔ اگر سڑک پر جھاڑیاں یا پتھر اور کوئی گندی چیز پڑی ہوتی تو آپ خود اُس کو اُٹھا کر سڑک سے ایک طرف کر دیتے اور فرماتے کہ جو شخص سڑکوں کی صفائی کا خیال رکھتا ہے، خدا اُس پر خوش ہوتا اور اُسے ثواب عطا فرماتا ہے (مسلم کتاب البرّ والصلۃ)

اسی طرح آپ فرماتے تھے۔ رستہ کو روکنا نہیں چاہیئے۔ رستوں پر بیٹھنا یا اُن میں کوئی ایسی چیز ڈال دینا جس سے مسافروں کو تکلیف ہو، یا رستہ میں قضائے حاجت وغیرہ کرنا یہ خدا تعالیٰ کو نا پسند ہیں (مشکوٰۃ کتاب الطہارۃ)

پانی کی صفائی کا بھی آپ کو خاص خیال تھا آپ ہمیشہ اپنے صحابہ کو یہ نصیحت فرماتے تھے کہ کھڑے پانی میں کسی قسم کا گند نہیں ڈالنا چاہیئے۔ اسی طرح کھڑے پانی میں بول و براز کرنے سے بھی آپ سختی سے روکتے تھے (بخاری کتاب الوضوء)

کھانے پینے میں سادگی اور تقویٰ

کھانے پینے میں آپ سادگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ کھانے میں کبھی نمک زیادہ ہو جائے یا کم ہو یا کھانا خراب پکا ہو، تو آپ کبھی اظہار ناراضگی نہیں فرماتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا آپ ایسا کھانا کھا کر پکانیوالے کو دلشکنی سے بچانے کی کوشش کرتے تھے لیکن اگر بالکل ہی ناقابل برداشت ہوتا تو آپ صرف ہاتھ کھینچ لیتے تھے اور یہ ظاہر نہیں کرتے تھے کہ مجھے اس کھانے سے تکلیف پہنچتی ہے (بخاری کتاب الاطعمۃ عن ابی ہریرہؓ)۔ جب آپ کھانا کھانے لگتے تو کھانے کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھتے اور فرماتے مجھے یہ متکبرانہ رویّہ پسند نہیں کہ بعض لوگ ٹیک لگا کر کھانا کھاتے ہیں گویا وہ کھانے سے مستغنی ہیں (بخاری کتاب الاطعمۃ) جب آپ کے پاس کوئی چیز آتی تو اپنے صحابہؓ میں بانٹ کر کھاتے۔ چنانچہ آپ کے پاس ایک دفعہ کچھ کھجوریں آئیں آپ نے صحابہ کا اندازہ لگایا تو سات سات کھجوریں فی کس آتی تھیں۔ اس پر آپ نے سات سات کھجوریں تمام صحابہ میں بانٹ دیں۔ (بخاری کتاب الاطعمۃ عن ابی ہریرہؓ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جَو کی روٹی بھی کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی (بخاری کتاب الاطعمۃ) ایک دفعہ آپ رستہ میں سے گذر رہے تھے کہ آپ نے دیکھا ایک بکری بھون کر لوگوں نے رکھی ہوئی ہے اور دعوت منا رہے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اُن لوگوں نے آپکو بھی دعوت دی مگر آپ نے انکار کر دیا (بخاری کتاب الاطعمۃ) اسکی یہ وجہ نہیں تھی کہ آپ بھونا ہُوا گوشت کھانا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ آپکو اس قسم کا تکلف پسند نہیں تھا کہ پاس ہی غرباء تو بھوکے پھر رہے ہوں اور انکی آنکھوں کے سامنے لوگ بکرے بھون بھون کر کھا رہے ہوں۔ ورنہ دوسری احادیث سے ثابت ہے کہ آپ بھنا ہُوا گوشت بھی کھایا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضؓ سے بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی تین دن متواتر پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور یہی حالت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات تک رہی (بخاری کتاب الاطعمۃ)

کھانے کے متعلق آپ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے کہ کوئی شخص بغیر بلائے کسی دعوت کے موقعہ پر دوسرے کے گھر کھانا کھانے کیلئے نہ چلا جائے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آپکی دعوت کی اور یہ بھی درخواست کی کہ آپ چار آدمی اپنے ساتھ اور بھی لیتے آئیں۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُس کے گھر کے دروازہ پر پہنچے تو آپ کو معلوم ہُوا کہ ایک پانچواں شخص بھی آپکے ساتھ ہے۔ جب گھر والا باہر نکلا تو آپ نے اُس سے کہا۔ آپ نے ہمیں پانچ آدمیوں کو دعوت کے لیے بلایا تھا۔ آپ چاہیں تو اس کو بھی اجازت دیدیں اور چاہیں تو اسکو رخصت کر دیں۔ گھر والے نے کہا نہیں میں ان کی بھی دعوت کرتا ہوں۔ یہ بھی اندر آ جائیں (بخاری کتاب الاطعمۃ)

جب آپ کھانا کھاتے تو ہمیشہ بسم اللہ کہکر کھانا شروع کیا کرتے تھے۔ اور جب کھانا کھا کر فارغ ہوتے

تو اِن الفاظ میں خدا تعالیٰ کی تعریف فرماتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُبَارَکًا فِیْہِ غَیْرَ مَکْفِیٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًی عَنْہُ رَبَّنَا یعنی سب تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے ہمیں کھانا عطا کیا بہت بہت تعریف ہر قسم کی ملونی سے خالی تعریف بڑھتی رہنے والی تعریف۔ ایسی تعریف نہیں جسے کر کے انسان سمجھے کہ بس میں تعریف کافی کر چکا۔ بلکہ یہ سمجھے کہ میں نے تعریف کرنیکا حق ادا نہیں کیا اور کبھی تعریف بس نہ کرے اور کبھی میرے دل میں یہ خیال نہ گذرے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی ایسا کام بھی ہے جس کی تعریف کی ضرورت نہیں یا جو تعریف کا مستحق نہیں۔ اے ہمارے رب ہمیں ایسا ہی بنا دے۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آپ کبھی ان الفاظ میں دعا کرتے تھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَفَانَا وَاَرْوَانَا غَیْرَ مَکْفِیٍّ وَلَا مَکْفُوْرٍ (بخاری کتاب الاطعمۃ) یعنی سب تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے ہماری بھوک اور پیاس دُور کی۔ ہمارا دل اس کی تعریف سے کبھی نہ بھرے اور ہم اس کی کبھی ناشکری نہ کریں۔

آپ ہمیشہ اپنے صحابہ کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ پیٹ بھرنے سے پہلے کھانا چھوڑ دو۔ اور فرماتے تھے ایک انسان کا کھانا دو انسانوں کے لیے کافی ہونا چاہیئے (بخاری کتاب الاطعمۃ) جب کبھی آپ کے گھر میں کوئی اچھی چیز پکتی تو آپ ہمیشہ اپنے گھر والوں کو نصیحت کرتے تھے کہ اپنے ہمسایوں کا بھی خیال رکھو (مسلم کتاب البر والصلۃ) اسی طرح اپنے ہمسایوں کے گھروں میں آپ اکثر ہدیہ بھجواتے رہتے تھے۔ (بخاری کتاب الادب) آپ اپنے مسکین صحابہؓ کی شکلوں سے ہمیشہ یہ معلوم کرتے رہتے تھے کہ ان میں سے کوئی بھوکا تو نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ وہ کئی دن فاقہ سے رہے۔ ایک دن جب سات وقت فاقہ سے گذر گئے تو وہ بے تاب ہو کر مسجد کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ وہاں سے گذرے تو اُنہوں نے اُن سے ایک ایسی آیت کا مطلب پوچھا جس میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے حضرت ابوبکرؓ نے اُن کی بات سے یہ سمجھا کہ شاید اس آیت کے معنے ان کو معلوم نہیں اور وہ اس آیت کے معنے بیان کر کے آگے چل دئے۔ حضرت ابوہریرہؓ جب لوگوں کے سامنے یہ روایت بیان کرتے تو غصہ سے کہا کرتے۔ کہ کیا ابوبکر مجھ سے زیادہ قرآن جانتا تھا۔ میں نے تو اس لیے آیت پوچھی تھی کہ اُن کو اس آیت کے مضمون کا خیال آجائے اور مجھے کھانا کھلا دیں۔ اتنے میں حضرت عمرؓ وہاں سے گذرے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں مَیں نے اُن سے بھی اِس آیت کا مفہوم پوچھا۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس آیت کا مطلب بیان کر دیا اور آگے چل دیئے۔ صحابہؓ سوال کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ جب ابوہریرہؓ نے دیکھا کہ بے مانگے کھانا ملنے کی کوئی صورت نہیں تو وہ کہتے ہیں میں بالکل نڈھال ہو کر گرنے لگا کیونکہ اب زیادہ صبر کی مجھ میں طاقت نہیں تھی مگر مَیں نے ابھی دروازہ سے منہ نہیں موڑا تھا کہ میرے کان میں ایک نہایت ہی محبت بھری آواز آئی اور کوئی مجھے بلا رہا تھا۔ ابوہریرہ! ابوہریرہ! مَیں نے منہ موڑا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کی کھڑکی کھولے کھڑے تھے اور مسکرا رہے تھے اور مجھے دیکھ کر آپ نے فرمایا ابوہریرہؓ بھوکے ہو؟ میں نے کہا ہاں یا رسول اللہ بھوکا ہوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہمارے گھر میں بھی کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ ابھی ایک شخص نے دُودھ کا پیالہ بھجوایا ہے۔ تم مسجد میں جاؤ اور دیکھو کہ شاید ہماری تمہاری طرح کے کوئی اور بھی مسلمان ہوں جن کو کھانے کی احتیاج ہو۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں میں نے دل میں کہا میں تو اتنا بھوکا

ہوں کہ اکیلا ہی اِس پیالے کو پی جاؤنگا۔ اب جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اور آدمی بھی بُلانے کو کہا ہے تو پھر میرا حصّہ تو بہت تھوڑا رہ جائیگا۔ مگر بہر حال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا مسجد کے اندر گئے تو دیکھا کہ چھ آدمی اور بیٹھے ہیں۔ اُنھوں نے اُن کو بھی ساتھ لیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ کے پاس آئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دودھ کا پیالہ اُن نئے آنیوالے چھ آدمیوں میں سے کسی کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا اِس کو پی جاؤ۔ جب اُس نے دُودھ پی کر پیالہ مُنہ سے الگ کیا تو آپ نے اصرار کیا کہ پھر پیو۔ تیسری دفعہ اصرار کر کے اُس کو دُودھ پلایا۔ اس طرح چھئوں آدمیوں کو آپ نے باری باری دودھ پلایا حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں ہر بار میں کہتا تھا کہ اب میں مرا۔ میرا حصّہ کیا بچے گا۔ لیکن جب وہ چھئوں پی چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پیالہ میرے ہاتھ میں دیا میں نے دیکھا کہ ابھی پیالہ میں بہت دُودھ پڑا تھا۔ جب میں نے دودھ پیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھی اصرار کر کے تین دفعہ دُودھ پلایا۔ پھر میرا بچا ہُوا دُودھ خود پیا اور خدا تعالیٰ کا شکر کرتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ (بخاری کتاب الرقاق)

شاید رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہؓ کو سب سے آخر میں دودھ یہی سبق دینے کے لیے دیا تھا کہ اُنہیں خدا تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے فاقہ سے بیٹھ رہنا چاہیئے تھا اور اشارۃً بھی سوال نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

آپ ہمیشہ دائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے اور پانی بھی دائیں ہاتھ سے پیتے تھے۔ پانی پیتے وقت درمیان میں تین دفعہ سانس لیتے تھے۔ اس میں ایک طبّی حکمت ہے پانی اگر یکدم پیا جائے تو زیادہ پیا جاتا ہے اور اس سے معدہ خراب ہو جاتا ہے کھانے کے متعلق آپ کا اصول یہ تھا کہ جو چیزیں پاکیزہ اور طیّب ہوں وہ کھائیں۔ مگر ایسی طرز پر نہیں کہ غریبوں کا حق مارا جائے یا انسان کو تعیّش کی عادت پڑ جائے۔ چنانچہ عام طور پر جیسا کہ بتایا جا چکا ہے آپ کی خوراک نہایت سادہ تھی۔ لیکن اگر کوئی شخص کوئی اچھی چیز بطور تحفہ لے آتا تھا تو آپ اُس کے کھانے سے انکار نہ کرتے۔ مگر یُوں اپنے کھانے پینے کے لیے اچھے کھانے کی تلاش آپ کبھی نہیں کرتے تھے۔ شہد آپ کو پسند تھا اسی طرح کھجور بھی۔ آپ فرماتے تھے کھجور اور مومن کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ کھجور کے پتے بھی اور اُسکا چھلکا بھی اور اس کا کچّا پھل بھی اور اس کا پکّا پھل بھی اور اسکی گٹھلی بھی سب کے سب کارآمد ہیں اسکی کوئی چیز بھی بیکار نہیں۔ مومن کامل بھی ایسا ہی ہوتا ہے اُس کا کوئی کام بھی لغو نہیں ہوتا بلکہ اُسکا ہر کام بنی نوع انسان کے نفع کے لیے ہوتا ہے۔

لباس اور زیور میں سادگی اور تقویٰ

لباس کے متعلق بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہایت سادگی کو پسند فرماتے تھے آپ کا عام لباس کرتہ اور تہ بند یا کرتہ اور پاجامہ ہوتا تھا۔ آپ اپنا تہ بند یا پاجامہ ٹخنوں سے اُوپر اور گھٹنوں سے نیچے رکھتے تھے۔ گھٹنوں یا گھٹنوں سے اوپر جسم کے ننگے ہو جانے کو آپ پسند نہیں فرماتے تھے۔ سوائے مجبوری کے ایسا کپڑا جس پر تصویریں ہوں آپ پسند نہیں فرماتے تھے۔ نہ انسانی لباس میں اور نہ پردوں وغیرہ کی صورت میں خصوصاً بڑی تصویریں جو کہ شرک کے آثار میں سے ہیں اُن کی آپ کبھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے گھر میں ایسا کپڑا لٹکا ہُوا تھا۔ آپ نے دیکھا تو اُسے اُتروا دیا۔ ہاں چھوٹی چھوٹی تصاویر جس کپڑے پر بنی ہوئی ہوں۔

اُس کپڑے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کیونکہ اُن سے شرک کے خیالات کی طرف اشارہ نہیں ہوتا۔ آپ ریشمی کپڑا کبھی نہیں پہنتے تھے نہ دوسرے مردوں کو ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت دیتے تھے۔ بادشاہوں کو خط لکھنے کے وقت آپ نے ایک مُہر والی انگوٹھی اپنے لیے بنوائی تھی مگر آپ نے ارشاد فرمایا کہ سونے کی انگوٹھی نہ ہو بلکہ چاندی کی ہو۔ کیونکہ سونا خدا تعالیٰ نے میری اُمّت کے مردوں کے لیے پہننا منع فرمایا ہے۔ عورتوں کو بیشک ریشمی کپڑے اور زیور پہننے کی اجازت تھی۔ اس بارہ میں آپ نصیحت کرتے رہتے تھے کہ غلو نہ کیا جائے۔ ایک دفعہ غرباء کے لیے آپ نے چندہ کیا۔ ایک عورت نے ایک کڑا اُتار کر آپ کے آگے رکھ دیا۔ آپ نے فرمایا کیا دوسرا ہاتھ دوزخ سے بچنے کا مستحق نہیں۔ اُس عورت نے دوسرا کڑا اُتار کر بھی غرباء کے لیے دے دیا۔ آپ کی بیویوں کے زیورات نہ ہونے کے برابر تھے صحابیات بھی آپ کی تعلیم پر عمل کر کے زیور بنانے سے احتراز کرتی تھیں۔ آپ قرآنی تعلیم کے مطابق فرماتے تھے کہ مال کا جمع کر رکھنا غریبوں کے حقوق تلف کر دینا ہے اِس لیے سونے چاندی کو کسی صورت میں گھروں میں جمع کر لینا قوم کی اقتصادی حالت کو تباہ کرنیوالا ہے اور گناہ ہے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے آپ کو تحریک کی کہ اب بڑے بڑے بادشاہوں کی طرف سے سفیر آنے لگ گئے ہیں آپ ایک قیمتی جبّہ لے لیں اور ایسے موقعوں پر استعمال فرمایا کریں۔ آپ حضرت عمرؓ کی اس بات کو سنکر بہت خفا ہوئے اور فرمایا خدا تعالیٰ نے مجھے اِن باتوں کے لیے پیدا نہیں کیا یہ مداہنت کی باتیں ہیں۔ ہمارا جیسا لباس ہے ہم اس کے ساتھ دنیا کو ملیں گے۔ ایک دفعہ آپ کے پاس ایک ریشمی جبہ لایا گیا۔ تو آپ نے حضرت عمرؓ کو تحفہ کے طور پر دے دیا۔ دوسرے دن آپ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ اُس کو پہنے پھر رہے ہیں۔ آپ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا جب حضرت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ ہی نے تو تحفہ دیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا ہر چیز اپنے ہی استعمال کے لیے تو نہیں ہوتی۔ یعنی یہ جبّہ چونکہ ریشم کا تھا آپ کو چاہیئے تھا کہ یہ اپنی بیوی کو دے دیتے یا اپنی بیٹی کو دیدیتے یا کسی اور استعمال میں لے آتے۔ اس کو اپنے لباس کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں تھا۔

بستر میں سادگی

آپ کا بستر بھی نہایت سادہ ہوتا تھا۔ بالعموم ایک چمڑا یا اُونٹ کے بالوں کا ایک کپڑا ہوتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہمارا بستر اتنا چھوٹا تھا کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رات کو عبادت کے لیے اُٹھتے، تو میں ایک طرف ہو کر لیٹ جاتی تھی اور بوجہ اسکے کہ بستر چھوٹا ہوتا تھا جب آپ عبادت کیلئے کھڑے ہوجاتے تو میں ٹانگیں لمبی کر لیا کرتی اور جب آپ سجدہ کرتے تو میں ٹانگیں سمیٹ لیا کرتی۔

مکان اور رہائش میں سادگی

رہائشی مکان کے متعلق بھی آپ سادگی کو پسند کرتے تھے۔ بالعموم آپ کے گھروں میں ایک ایک کمرہ ہوتا تھا اور چھوٹا سا صحن۔ اِس کمرہ میں ایک رسّی بندھی ہوئی ہوتی تھی جس پر کپڑا ڈال کر ملاقات کے وقت میں آپ اپنے ملنے والوں سے علیحدہ بیٹھ کر گفتگو کر لیا کرتے تھے۔ چارپائی آپ استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ زمین پر ہی بستر بچھا کر سوتے تھے۔ آپ کی رہائش کی سادگی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ حضرت عائشہؓ نے آپ کی وفات کے بعد فرمایا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہمیں کئی دفعہ صرف پانی اور کھجور پر ہی گذارہ کرنا پڑتا تھا۔

یہاں تک کہ جس دن آپ کی وفات ہوئی اُس دن بھی ہمارے گھر میں سوائے کھجور اور پانی کے کھانے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔

خدا تعالےٰ سے محبّت اور اُس کی عبادت

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی عشقِ الہٰی میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے باوجود بہت بڑی جماعتی ذمہ واری کے دن اور رات آپ عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ نصف رات گذرنے پر آپ خدا تعالیٰ کی عبادت کیلئے کھڑے ہوجاتے اور صبح تک عبادت کرتے چلے جاتے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ آپکے پاؤں سُوج جاتے تھے اور آپ کے دیکھنے والوں کو آپ کی حالت پر رحم آتا تھا۔ حضرت عائشہ رضؓ کہتی ہیں ایک دفعہ میں نے ایسے ہی موقعہ پر کہا یارسول اللہ! آپ تو خدا تعالیٰ کے پہلے ہی مقرب ہیں آپ اپنے نفس کو اتنی تکلیف کیوں دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اے عائشہ! اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا۔ جب یہ بات سچی ہے کہ خدا تعالیٰ کا مَیں مقرب ہوں اور خدا تعالیٰ نے اپنا فضل کر کے مجھے اپنا قرب عطا فرمایا ہے تو کیا میرا یہ فرض نہیں کہ جتنا ہو سکے میں اُس کا شکریہ ادا کروں۔ کیونکہ آخر شکر احسان کے مقابل پر ہی ہوا کرتا ہے۔

آپ کوئی بڑا کام بغیر اذنِ الہٰی کے نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ باوجود مکہ کے لوگوں کے شدید ظلموں کے آپ نے مکّہ اُسوقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی نازل نہ ہوئی اور وحی کے ذریعہ سے آپکو مکہ چھوڑنے کا حکم نہ دیا گیا۔ اہلِ مکّہ کے ظلموں کی شدّت کو دیکھ کر آپنے جب صحابہؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دی۔ اور انہوں نے آپ سے خواہش ظاہر کی کہ آپ بھی اُن کے ساتھ چلیں، تو آپنے فرمایا مجھے ابھی خدا تعالیٰ کی طرف سے اذن نہیں ملا ظلم اور تکلیف کے وقت جب لوگ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو اپنے اردگرد اکٹھا کر لیتے ہیں آپنے اپنی جماعت کو حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے جانے کی ہدایت کی اور خود اکیلے مکّہ میں رہ گئے۔ اِس لیے کہ آپ کے خدا نے آپ کو ابھی ہجرت کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

خدا کا کلام آپ سنتے، تو بے اختیار ہو کر آپ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے خصوصاً وہ آیات جن میں آپ کو اپنی ذمہ واریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن شریف کی کچھ آیات مجھے پڑھ کر سناؤ۔ مَیں نے اِس کے جواب میں کہا۔ یارسول اللہ! قرآن تو آپ پر نازل ہُوا ہے مَیں آپ کو کیا سناؤں؟ آپ نے فرمایا مَیں پسند کرتا ہوں کہ دوسرے لوگوں سے بھی قرآن پڑھوا کر سُنوں۔ اِس پر مَیں نے سورۂ نساء پڑھ کر سُنانی شروع کی جب پڑھتے پڑھتے میں اِس آیت پر پہنچا، کہ فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا۔ یعنی اُس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر قوم میں سے اُس کے نبی کو اُس کی قوم کے سامنے کھڑا کر کے اس قوم کا حساب لیں گے اور تجھ کو بھی تیری قوم کے سامنے کھڑا کر کے اُس کا حساب لیں گے۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بس کرو۔ بس کرو"۔ مَیں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے ٹپ ٹپ کر کے آنسو بہ رہے تھے۔

نماز کی پابندی کا آپ کو اتنا خیال تھا کہ سخت بیماری کی حالت میں جبکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے گھر میں

نماز پڑھ لینے اور لیٹ کر پڑھ لینے تک کی بھی اجازت ہوتی ہے آپ سہارا لیکر مسجد میں نماز پڑھانے کیلئے آتے ایک دن آپ نماز کے لیے نہ آسکے تو حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم فرمایا۔ لیکن اتنے میں طبیعت میں کچھ سہولت معلوم ہوئی تو فوراً دو آدمیوں کا سہارا لیکر مسجد کی طرف چل پڑے مگر کمزوری کا یہ حال تھا کہ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں آپ کے دونوں پاؤں زمین پر گھسٹتے چلے جاتے تھے۔ دنیا میں خوشنودی اور توجہ دلانے کے لیئے تالیاں پیٹی جاتی ہیں عربوں میں بھی یہی رواج تھا مگر آپ کو خدا تعالیٰ کی یاد اور اُس کا ذکر اتنا پسند تھا کہ اس غرض کے لیے بھی ذکر الٰہی ہی استعمال کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی کام میں مشغول تھے کہ نماز کا وقت آگیا۔ آپ نے فرمایا ابوبکر رضؓ نماز پڑھا دیں۔ اتنے میں آپ کام سے فارغ ہو گئے اور فوراً مسجد کی طرف چل پڑے۔ جب آپ مسجد میں پہنچے تو ابوبکر رضؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ مسجد میں آگئے ہیں تو بیتاب ہو کر نماز پڑھنے والوں نے تالیاں پیٹنی شروع کردیں جس سے ایک طرف تو یہ بتانا مقصود تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے سے ان کے دل بے انتہا خوش ہو گئے ہیں اور دوسری طرف ابوبکر رضؓ کو توجہ دلانا مطلوب تھا کہ اب آپکی امامت ختم ہوئی۔ اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پہنچ گئے ہیں۔ حضرت ابوبکر پیچھے ہٹ گئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے امام کی جگہ چھوڑ دی۔ نماز کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوبکر! جب مَیں نے تم کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا تو تم پیچھے کیوں ہٹ گئے۔ ابوبکر رضؓ نے کہا یا رسول اللہ، اللہ کے رسول کی موجودگی میں ابو قحافہ کا بیٹا کیا حیثیت رکھتا تھا کہ نماز پڑھائے۔ پھر آپ صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ تالیاں پیٹنے سے تمہاری کیا غرض تھی۔ خدا کے ذکر کے وقت میں تالیوں کا پیٹنا تو نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ جب نماز کے وقت کوئی ایسی بات ہو کہ اُس کی طرف توجہ پھرانی ضروری ہو، تو بجائے تالیاں پیٹنے کے خدا کا نام بلند آواز سے لیا کرو۔ جب تم ایسا کرو گے تو خود بخود دوسروں کی توجہ اُس واقعہ کی طرف پھر جائے گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپ تکلّف کی عبادت بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ گھر میں گئے تو آپ نے دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان ایک رسّی لٹکی ہوئی ہے۔ آپ نے پوچھا یہ رسّی کیوں بندھی ہوئی ہے؟ لوگوں نے کہا یہ حضرت زینب کی رسّی ہے جب وہ عبادت کرتے کرتے تھک جاتی ہیں تو اس رسّی کو پکڑ کر سہارا لے لیتی ہیں آپ نے فرمایا۔ ایسا نہیں کرنا چاہیئے یہ رسّی کھول دو۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ اتنی دیر عبادت کیا کرے جب تک اُس کے دل میں بشاشت رہے۔ جب وہ تھک جائے تو بیٹھ جائے۔ اِس قسم کی تکلّف والی عبادت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

شرک سے آپکو اس قدر نفرت تھی کہ وفات کے وقت جبکہ آپ جان کندن کی تکلیف میں مبتلا تھے آپ کبھی دائیں کروٹ لیٹتے اور کبھی بائیں کروٹ لیٹتے اور یہ فرماتے جاتے خدا اُن یہود اور نصارٰی پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنا لیا ہے۔ یعنی وہ نبیوں کی قبروں پر سجدے کرتے ہیں اور ان سے دعائیں کرتے ہیں آپ کا مطلب یہ تھا کہ میری قوم اگر میرے بعد ایسا ہی فعل کرے گی تو وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ میری دعاؤں کی مستحق ہو گی بلکہ میں اس سے کلّی طور پر بیزار ہونگا۔ خدا تعالیٰ کے لیے آپ کی غیرت کا ذکر آپ کی زندگی کے تاریخی واقعات میں آچکا ہے۔ جب مکّہ کے لوگوں نے آپ کے سامنے ہر قسم کی رشوتیں پیش کیں۔ تا آپ بتوں کی تردید کرنا چھوڑ دیں۔ اور آپ کے چچا ابو طالب نے بھی اس امر کی سفارش کی اور کہا کہ اگر تم نے اتنی بات بھی نہ مانی

تو میری قوم اگر میں نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا تو مجھے بھی چھوڑ دیگی۔ تو آپ نے فرمایا اے چچا! اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں لاکر کھڑا کر دیں تب بھی میں خدائے واحد کی توحید کو پھیلانے سے نہیں رُک سکتا۔ اسی طرح اُحد کے موقعہ پر جب مسلمان زخمی اور پراگندہ حالت میں ایک پہاڑی کے نیچے کھڑے تھے اور دشمن اپنے سارے سازو سامان کے ساتھ اس خوشی میں نعرے لگا رہا تھا کہ ہم نے مسلمانوں کی طاقت کو توڑ دیا ہے جب ابوسفیان نے کہا اُعْلُ ھُبَل۔ اُعْلُ ھُبَل۔ یعنی ہُبَل کی شان بلند ہو یعنی ہُبَل کی شان بلند ہو تو آپنے اپنے ساتھیوں کو جو دشمن کی نظروں سے چھُپے کھڑے تھے اور اس چھپنے ہی میں انکی خیر تھی حکم دیا کہ جواب دو اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلُّ۔ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلُّ اللہ ہی سب سے بلند اور جلال والا ہے۔ اللہ ہی غلبہ اور جلال رکھتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا تعالےٰ کے لیے جو غیرت تھی اُس کی ایک اور عظیم الشان مثال بھی آپ کی زندگی میں ملتی ہے۔ اسلام سے پہلے عام طور پر مختلف مذاہب میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ انبیاء کی خوشی اور غم پر زمین اور آسمان میں تغیر ظاہر ہوتے ہیں اور اجرام فلکی اُنکے قبضے میں ہوتے ہیں چنانچہ کسی نبی کے متعلق یہ آتا تھا کہ اُس نے سورج کو کہا ٹھہر جا اور وہ ٹھہر گیا۔ کسی کے متعلق یہ آتا تھا کہ اُس نے چاند کی گردش کو روک دیا۔ اور کسی کے متعلق آتا تھا کہ اس نے پانی کے بہاؤ کو بند کر دیا۔ مگر اسلام نے اس قسم کے خیالات کی غلطی کو ظاہر کیا اور یہ بتایا کہ درحقیقت یہ استعارے ہیں جن سے لوگ بجائے فائدہ اُٹھانے کے اُلٹا غلطیوں اور وہموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن باوجود ان تشریحات کے کچھ لوگوں کے دلوں میں اس قسم کے خیالات کا اثر باقی رہ گیا تھا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں آپ کے اکلوتے صاحبزادے ابراہیم اڑھائی سال کی عمر میں فوت ہوئے تو اتفاقاً اُس دن سورج کو بھی گرہن لگ گیا۔ اُس وقت چند ایسے ہی لوگوں نے مدینہ میں یہ مشہور کر دیا کہ دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کی وفات پر سورج تاریک ہو گیا ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ خوش نہ ہوئے آپ خاموش بھی نہ رہے۔ بلکہ بڑی سختی سے آپنے اس کی تردید کی اور فرمایا۔ چاند اور سورج تو خدا تعالےٰ کے مقرر کردہ قانون کو ظاہر کرنیوالی ہستیاں ہیں ان کا کسی بڑے یا چھوٹے انسان کی موت یا زندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے (بخاری کتاب الکسوف) جب کوئی شخص عرب کے محاورہ کے مطابق یہ کہہ دیتا کہ فلاں ستارہ کے فلاں بُرج میں ہونے کی وجہ سے ہم پر بارش نازل ہوئی ہے تو آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور آپ فرماتے۔ اے لوگو! خدا تعالےٰ کی نعمتوں کو دوسروں کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو۔ بارشیں وغیرہ سب خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتی ہیں کسی دیوی دیوتا کی یا کسی اور روحانی طاقت کی مہربانی اور بخشش کے ساتھ نازل نہیں ہوا کرتیں۔ (مسلم کتاب الایمان باب بیان کفر من قال مطرنا بنوء)

خدا پر توکل

خدا تعالیٰ پر توکل کا یہ حال تھا کہ جب ایک شخص نے اکیلے پاکر آپ پر تلوار اُٹھائی اور آپ سے پوچھا اب کون تم کو مجھ سے بچا سکتا ہے؟ اُس وقت باوجود اس کے کہ آپ بے ہتھیار تھے اور بوجہ لیٹے ہونے ہونے کے حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نہایت اطمینان اور سکون سے آپنے جواب دیا۔ "اللہ!" یہ لفظ اس یقین اور وثوق سے آپ کے مُنہ سے نکلا کہ اُس کافر کا دل بھی آپ کے ایمان کی بلندی اور آپ کے یقین کے کامل ہونے کو تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکا اور اُسکے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور وہ جو آپ کو قتل کرنیکے لیے آیا تھا آپ کے سامنے مجرموں کی طرح

کھڑا ہو گیا (مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل) خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں انکساری کی یہ حد تھی کہ جب آپ سے لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ تو اپنے عمل کے زور سے خدا تعالیٰ کے فضل کو حاصل کر لیں گے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں! نہیں!! میں بھی خدا کے احسان سے ہی بخشا جاؤنگا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں میں نے ایک دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔ آپ فرما رہے تھے کوئی شخص اپنے عملوں سے جنت میں داخل نہیں ہو گا میں نے کہا یا رسول! کیا آپ بھی اپنے اعمال سے جنت میں داخل نہیں ہونگے؟ آپ نے فرمایا میں بھی اپنے اعمال کے زور سے جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہاں خدا کا فضل اور اس کی رحمت مجھے ڈھانک لے تو یہی ایک صورت ہے (بخاری کتاب الرقاق) پھر آپ نے فرمایا۔ اپنے کاموں میں نیکی اختیار کرو اور خدا تعالیٰ کے قرب کی راہیں تلاش کرو اور تم میں سے کوئی شخص اپنی موت کی خواہش نہ کیا کرے۔ کیونکہ اگر وہ نیک ہے تو زندہ رہ کر اپنی نیکیوں میں اور بھی بڑھ جائیگا اور اگر بد ہے تو زندہ رہ کر اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی توفیق مل جائیگی (بخاری کتاب التمنی و کتاب الدعوات) خدا تعالےٰ کی محبت کی یہ حالت تھی کہ جب ایک واقعہ کے بعد بادل آتے تو آپ اپنی زبان پر بادل کا قطرہ لے لیتے اور فرماتے۔ دیکھو میرے رب کی تازہ نعمت! جب مجلس میں بیٹھتے تو استغفار کرتے رہتے اور یوں بھی اکثر استغفار کرتے تا کہ آپ کی اُمت اور آپ کے ساتھ تعلق رکھنے والے خدا تعالیٰ کے غضب سے بچے رہیں اور خدا تعالیٰ کی بخشش کے مستحق ہو جائیں (بخاری کتاب الدعوات و مسلم کتاب الذکر والدعاء) ہر وقت خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے کی یاد کو تازہ رکھتے چنانچہ جب آپ سوتے تو یہ کہتے ہوئے سوتے باسمك اللّٰھم اموتُ واحیٰ۔ اے خدا تیرا ہی نام لیتے ہوئے میں مروں اور تیرا ہی نام لیتے ہوئے میں اُٹھوں۔ اور جب آپ صبح اُٹھتے تو فرماتے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ۔ اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں جس نے مرنے کے بعد ہم کو زندگیا اور پھر ہم اپنے رب کے سامنے جانیوالے ہیں (بخاری کتاب الدعوات) خدا تعالےٰ کے قرب کی اتنی خواہش تھی کہ ہمیشہ آپ خدا تعالیٰ سے دعا کرتے رہتے تھے اللّٰھمّ اجعل فی قلبی نورًا وفی بصری نورًا وفی سمعی نورًا وعن یمینی نورًا وعن یساری نورًا وفوقی نورًا وتحتی نورًا وامامی نورًا وخلفی نورًا واجعل لی نورًا (بخاری کتاب الدعوات عن ابن عباس) یعنی اے میرے رب! میرے دل میں بھی اپنا نور بھر دے اور میری آنکھوں میں بھی اپنا نور بھر دے اور میرے کانوں میں بھی اپنا نور بھر دے اور میرے دائیں بھی تیرا نور ہو اور میرے بائیں بھی تیرا نور ہو۔ اور میرے اوپر بھی تیرا نور ہو اور میرے نیچے بھی تیرا نور ہو اور میرے آگے بھی تیرا نور ہو اور میرے پیچھے بھی تیرا نور ہو۔ اور اے میرے رب میرے سارے وجود کو نور ہی نور بنا دے۔

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ کی وفات کے قریب مسیلمہ کذاب آیا اور اس نے کہا اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے بعد مجھے حاکم مقرر کر دیں تو میں اُن کا متبع ہو جاؤں گا۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک بہت بڑی جمعیت تھی اور جس قوم سے وہ تعلق رکھتا تھا وہ قوم سارے عرب کی قوموں سے تعداد میں زیادہ تھی۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اُس کے مدینہ میں آنے کی خبر ملی، تو آپ اُس کی طرف گئے۔ ثابت بن قیس بن شماس آپ کے ساتھ تھے۔ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ تھی۔ آپ اُس

قافلہ تک آئے اور مسیلمہ کذّاب کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں اور صحابی بھی جمع ہو گئے اور آپ کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ آپ نے مسیلمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم یہ کہتے ہو کہ محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اگر اپنے بعد مجھے اپنا خلیفہ مقرر کر دیں تو مَیں اس کی اتباع کرنیکے لیے تیار ہوں، لیکن مَیں تو خدا کے حکم کے خلاف یہ کھجور کی شاخ بھی تم کو دینے کے لیے تیار نہیں۔ تمہارا وہی انجام ہو گا جو خدا نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے۔ اگر تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے پاؤں کاٹ دیگا۔ اور مَیں تو دیکھ رہا ہوں کہ خدا نے جو کچھ مجھے دکھایا تھا وہی تمہارے ساتھ ہونیوالا ہے۔ پھر فرمایا مَیں جاتا ہوں جو باتیں کرنی ہیں میری طرف سے ثابت بن قیس بن شماس کے ساتھ کرو۔ یہ کہہ کر آپ واپس تشریف لے آئے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بھی آپکے ساتھ تھے۔ راستہ میں کسی نے آپ سے پوچھا یا رسول اللہ! آپ نے یہ کیا فرمایا ہے کہ جو کچھ مجھے خدا نے دکھایا تھا مَیں تجھے ویسا ہی پاتا ہوں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَیں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میرے ہاتھ میں دو کڑے ہیں مَیں نے اُن کڑوں کو دیکھ کر ناپسند کیا۔ اُس وقت مجھے خواب میں ہی وحی نازل ہوئی کہ مَیں اُن پر پھونکوں۔ جب مَیں نے پھونکا تو وہ دونوں اُڑ گئے۔ مَیں نے اسکی یہ تعبیر کی کہ دو جھوٹے مدعی میرے بعد ظاہر ہونگے (بخاری کتاب المغازی باب قصۃ الاسود العنسی) رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر کا یہ آخری زمانہ تھا۔ عرب کی سب سے بڑی اور آخری قوم آپ کی فرمانبرداری کرنے کے لیے تیار تھی اور صرف اتنی شرط کرتی تھی کہ اُسکے سردار کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے بعد خلیفہ مقرر کر دیں۔ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں ذاتی بڑائی کا کوئی بھی خیال ہوتا تو ایسی حالت میں کہ آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی آپ کے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ آپ عرب کی سب سے بڑی قوم کے سب سے بڑے سردار کو اپنی جانشینی کی امید دلاتے اور سارے عرب کے اتحاد کا راستہ کھول دیتے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی اپنا نہیں سمجھتے تھے وہ اسلامی امارت کو اپنی ملکیت کب قرار دے سکتے تھے۔ آپ کے نزدیک اسلامی امارت خدا کی امانت تھی اور وہ امانت جوں کی توں خدا تعالیٰ ہی کے سپرد ہونی چاہیئے تھی۔ پھر وہ جس کو چاہے دوبارہ سونپ دے۔ پس آپ نے اس تجویز کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اور فرمایا بادشاہت تو الگ رہی خدا کے حکم کے بغیر مَیں کھجور کی ایک شاخ بھی تم کو دینے کے لیے تیار نہیں۔

جب بھی اللہ تعالیٰ کا آپ ذکر فرماتے۔ آپ کی طبیعت میں جوش پیدا ہو جاتا۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے جسم پر اندر کی طرف سے بھی اور باہر کی طرف سے بھی کُلّی طور پر خدا تعالیٰ کی محبّت نے قابو پالیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں آپ کو سادگی اس قدر پسند تھی کہ مسجد میں جس پر کوئی فرش نہیں تھا جس پر کوئی کپڑا نہیں تھا آپ نماز پڑھتے اور دوسروں کو پڑھواتے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ بارش کی وجہ سے چھت ٹپک پڑتی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا جسم گارے اور پانی سے لت پت ہو جاتا۔ مگر آپ برابر عبادت میں مشغول رہتے اور آپ کے دل میں ذرا بھی احساس پیدا نہ ہوتا کہ اپنے جسم اور کپڑوں کی حفاظت کی خاطر آپ اُس وقت کی نماز ملتوی کر دیں یا کسی دوسری جگہ پر جا کر نماز پڑھ لیں (بخاری کتاب الصوم باب فضل لیلۃ القدر) اپنے صحابہ کی عبادتوں کا بھی آپ خیال رکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے متعلق جو نہایت ہی نیک اور پاکیزہ خصائل کے آدمی تھے آپ نے فرمایا عبد اللہ بن عمرؓ کیسا اچھا آدمی ہوتا اگر

تہجد بھی باقاعدہ پڑھتا (مسلم کتاب فضائل الصحابہ رضؓ) جب حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے اُس دن سے تہجد کی نماز باقاعدہ شروع کردی۔ اسی طرح لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ رات اپنے داماد حضرت علی رضؓ اور اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضؓ کے گھر گئے اور فرمایا کیا تہجد پڑھا کرتے ہو؟ (یعنی وہ نماز جو آدھی رات کے قریب اُٹھ کر پڑھی جاتی ہے) حضرت علی رضؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! پڑھنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر جب خدا تعالیٰ کی منشاء کے ماتحت کسی وقت ہماری آنکھ بند رہتی ہے تو پھر تہجد رہ جاتی ہے آپ نے فرمایا تہجد پڑھا کرو۔ اور اُٹھکر اپنے گھر کی طرف چل پڑے اور راستہ میں باربار کہتے جاتے تھے وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (بخاری کتاب الکسوف باب التہجد فی اللیل) یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے جسکے معنے یہ ہیں کہ انسان اکثر اپنی غلطی تسلیم کرنے سے گھبراتا ہے اور مختلف قسم کی دلیلیں دیکر اپنے قصور پر پردہ ڈالتا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ بجائے اِس کے کہ حضرت علی رضؓ اور حضرت فاطمہ رضؓ یہ کہتے کہ ہم سے کبھی کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے انہوں نے یہ کیوں کہا کہ جب خدا تعالیٰ کا منشاء ہوتا ہے کہ ہم نہ جاگیں تو ہم سوئے رہتے ہیں اور اپنی غلطی کو اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کیا۔ لیکن باوجود اللہ تعالیٰ کی اس قدر محبت رکھنے کے آپ تصنع کی عبادت اور کہانت سے سخت نفرت کرتے تھے۔ آپؐ کا اصول یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے جو طاقتیں انسان کے اندر پیدا کی ہیں اُن کا صحیح طور پر استعمال کرنا ہی اصل عبادت ہے۔ آنکھوں کی موجودگی میں آنکھوں کو بند کر دینا یا اُن کو نکلوا دینا عبادت نہیں بلکہ گستاخی ہے ہاں اُن کا بد استعمال کرنا گناہ ہے۔ کانوں کو کسی اپریشن کے ذریعے سے شنوائی سے محروم کر دینا خدا تعالیٰ کی گستاخی ہے۔ ہاں لوگوں کی غیبتیں اور چغلیاں سُننا گناہ ہے۔ کھانے کو ترک کر دینا خودکشی اور خدا تعالیٰ کی گستاخی ہے ہاں کھانے پینے میں مشغول رہنا اور ناجائز اور ناپسندیدہ چیزوں کو کھانا گناہ ہے۔ یہ ایک عظیم الشان نکتہ تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور جسے آپ سے پہلے اور کسی نبی نے پیش نہیں کیا۔ اخلاق فاضلہ نام ہے طبعی قویٰ کے صحیح استعمال کا۔ طبعی قویٰ کو مار دینا حماقت ہے، ان کو ناجائز کاموں میں لگا دینا بدکاری ہے۔ ان کا صحیح استعمال اصل نیکی ہے۔ یہ خلاصہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا۔ اور یہ خلاصہ ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کا۔ اور آپکے اعمال کا حضرت عائشہ رضؓ آپ کی نسبت فرماتی ہیں مَا خُيِّرَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اخذ ایسرھما مالم یکن اثمًا کان ابعد الناس منہُ (مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل) رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کبھی ایسا موقعہ پیش نہیں آیا کہ آپکے سامنے دو راستے کھلے ہوں تو آپنے ان دونوں رستوں میں سے جو آسان رستہ ہو اُسے اختیار نہ کیا ہو۔ بشرطیکہ اس آسان راستہ کے اختیار کرنے میں کوئی گناہ کا شائبہ نہ پایا جائے۔ اگر گناہ کا کوئی شائبہ پایا جاتا تو آپ اس راستہ سے تمام انسانوں سے زیادہ دور بھاگتے تھے۔ یہ کیسا لطیف اور کیسا اعلیٰ درجہ کا چلن ہے، دنیا کو دھوکا دینے کے لیے لوگ کس طرح بلاوجہ اپنے آپ کو دکھوں اور تکلیفوں میں ڈالتے ہیں۔ ان کا اپنے آپ کو دکھوں اور تکلیفوں میں ڈالنا خدا تعالےٰ کے لیے نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کے لیے کوئی بے فائدہ کام نہیں کیا جاتا۔ اُن کا اپنے آپ کو دکھوں اور تکلیفوں میں ڈالنا لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ہوتا ہے۔ اُن کی اصل نیکی چونکہ بہت کم ہوتی ہے وہ جھوٹی نیکیوں سے لوگوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے عیبوں کو چھپانے کے لیے

لوگوں کی آنکھوں میں خاک ڈالتے ہیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مقصود تو خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور حقیقی نیکی کا حصول تھا۔ آپ کو ایسے تصنّع اور بناوٹی نیکیوں کی کیا ضرورت تھی۔ اگر دنیا آپ کو بد سمجھتی تو بھی اور اگر آپ کو نیک سمجھتی تو بھی آپ کے لیے ایک سی بات تھی۔ آپ تو صرف یہ دیکھتے تھے کہ میرا خدا مجھے کیا سمجھتا ہے اور میرا اپنا نفس مجھے کیسا پاتا ہے خدا اور اپنے نفس کی شہادت کے بعد اگر بنی نوع انسان بھی سچی شہادت دیتے تو ان کے شکرگزار ہوتے تھے اور اگر وہ کج آنکھوں سے دیکھتے تو آپ ان کی بینائی کی کمی پر افسوس کرتے، مگر اُن کی رائے کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا بنی نوع انسان سے معاملہ

بیویوں کے حق میں آپ کا معاملہ نہایت ہی مشفقانہ اور عادلانہ تھا بعض دفعہ آپ کی بیویاں آپ سے سختی بھی کر لیتی تھیں مگر آپ خاموشی سے ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ ایک دن آپ نے حضرت عائشہ رضؓ سے کہا اے عائشہ جب تم مجھ سے خفا ہوتی ہو تو مجھے پتہ لگ جاتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا آپکو کس طرح پتہ لگ جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور کوئی قسم کھانے کا معاملہ آجائے تو تم ہمیشہ یوں کہتی ہو "محمد کے رب کی قسم بات یوں ہے"۔ اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو اور تمہیں قسم کھانے کی ضرورت پیش آجائے تو تم کہا کرتی ہو "ابراہیم کے رب کی قسم بات یوں ہے"۔ حضرت عائشہ رضؓ یہ بات سُن کر ہنس پڑیں اور آپ کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے بات کو ٹھیک سمجھا ہے (بخاری کتاب النکاح باب غیرۃ النساء و وجدھن) حضرت خدیجہ رضؓ جو آپ کی بڑی بیوی تھیں اور جنہوں نے آپ کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کی تھیں، اُن کی وفات کے بعد آپ کی شادی میں جوان بیویاں آئیں لیکن اس کے باوجود آپ نے حضرت خدیجہ رضؓ کے تعلق کو نہ بھلایا۔ حضرت خدیجہ رضؓ کی سہیلیاں جب بھی آتیں آپ اُنکے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے (مسلم باب فضائل خدیجہ رضی اللہ عنہا) حضرت خدیجہ رضؓ کی بنی ہوئی کوئی چیز آپ کے سامنے آجاتی تو آپکی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ بدر کی جنگ میں جب آپ کے ایک داماد بھی قید ہو کر آئے، تو آزادی کا فدیہ ادا کرنے کے لیے کوئی مال اُن کے پاس نہیں تھا۔ اُن کی بیوی یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی نے جب دیکھا کہ میرے خاوند کے بچانے کے لیے اور کوئی مال نہیں تو اپنی والدہ کی آخری یادگار ایک ہار اُن کے پاس تھا، وہ انہوں نے اپنے خاوند کے فدیہ کے طور پر مدینہ بھجوا دیا۔ جب وہ ہار رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہُوا تو آپ نے اُسے پہچان لیا۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ نے صحابہ رضؓ سے فرمایا۔ مَیں آپ لوگوں کو حکم تو نہیں دیتا کیونکہ مجھے ایسا حکم دینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن مَیں جانتا ہوں کہ یہ ہار زینب کے پاس اُس کی ماں کی آخری یادگار ہے اگر آپ خوشی سے ایسا کر سکتے ہوں تو مَیں سفارش کرتا ہوں کہ بیٹی کو اُس کی ماں کی آخری یادگار سے محروم نہ کیا جائے۔ صحابہ رضؓ نے کہا یا رسول اللہ! ہمارے لیے اِس سے زیادہ خوشی کا کیا موجب ہو سکتا ہے۔ اور انہوں نے وہ ہار حضرت زینب رضؓ کو واپس کر دیا (السیرۃ الحلبیہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۵) حضرت خدیجہ رضؓ کی قربانی کا آپ کی طبیعت پر اتنا اثر تھا کہ آپ دوسری بیویوں کے سامنے اکثر اُن کی نیکی کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ ایک دن اِسی طرح آپ حضرت عائشہ رضؓ کے پاس حضرت خدیجہ رضؓ کی کوئی نیکی بیان کر رہے تھے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے چڑ کر کہا۔ یا رسول اللہ۔ اب اُس بڑھیا کا ذکر

جاتے بھی دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُس سے بہتر جوان اور خوبصورت عورتیں آپ کو دی ہیں۔ یہ بات سُن کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر رقت طاری ہوگئی اور آپ نے فرمایا۔ عائشہ تمہیں معلوم نہیں خدیجہ نے میری کس قدر خدمت کی ہے (بخاری کتاب بدالخلق باب تزویج النبی صلے اللہ علیہ وسلم خدیجہ و فضلہا رضی اللہ عنہا)

اخلاق فاضلہ

آپ کی طبیعت نہایت ہی سادہ تھی۔ کسی دُکھ پر گھبراتے نہیں تھے۔ اور کبھی کسی خواہش سے حد سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے تھے۔ سوانح میں بتایا جا چکا ہے کہ آپؐ کی پیدائش سے پہلے آپؐ کے والد اور بچپن میں ہی آپؐ کی والدہ فوت ہوگئی تھیں۔ ابتدائی آٹھ سال آپؐ نے اپنے دادا کی نگرانی میں گذارے۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کی ولایت میں پرورش پائی۔ چچا کا خونی رشتہ بھی تھا۔ اور ان کے والد نے بھی مرتے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں خاص طور پر وصیّت فرمائی تھی اس لیے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص طور پر محبّت بھی رکھتے تھے اور آپؐ کا خیال بھی رکھتے تھے لیکن چچی میں نہ وہ شفقت کا مادہ تھا نہ خاندانی ذمہ داریوں کا احساس۔ جب گھر میں کوئی چیز آتی تو بسا اوقات وہ اپنے بچوں کو پہلے دیتیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال نہ رکھتیں۔ ابو طالب گھر میں آتے تو بجائے اسکے کہ اپنے چھوٹے بھتیجے کو روتا ہوا یا گلا کرتا ہوا پاتے وہ دیکھتے کہ اُن کے بچے تو کوئی چیز کھا رہے ہیں لیکن اُن کا چھوٹا سا بھتیجا کوہِ وقار بنا ایک طرف بیٹھا ہے۔ چچا کی محبّت اور خاندانی ذمہ واریاں اُن کے سامنے آجاتیں وہ دوڑ کر اپنے بھتیجے کو بغل میں لے لیتے اور کہتے میرے بچے کا بھی تو خیال کرو، میرے بچے کا بھی تو خیال کرو۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا۔ مگر دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی شکوہ کیا نہ آپکے چہرہ پر کبھی ملال ظاہر ہوا۔ نہ اس وجہ سے کبھی چڑچڑا پن پیدا ہُوا۔ نہ اپنے چچیرے بھائیوں سے رقابت پیدا ہوئی۔ چنانچہ آپکی زندگی بتاتی ہے کہ کس طرح آپؐ نے بعد کے بدلے ہوئے حالات میں حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ کو اپنی تربیت میں لے لیا اور ہر طرح سے ان کی بہتری کی تدابیر کیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دنیوی طور پر بھی نہایت ہی تلخ طور پر گذری ہے۔ پیدائش سے پہلے ہی اپنے والد کی وفات پھر والدہ اور دادا کی یکے بعد دیگرے وفات۔ پھر جب شادی ہوئی تو آپ کے بچے متواتر فوت ہوتے چلے گئے اسکے بعد پے درپے آپؐ کی کئی بیویاں فوت ہوئیں جن میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جیسی باوفا اور خدمتگزار بیوی بھی تھیں۔ مگر آپ نے ان سب مصائب کو خوشی سے برداشت کیا اور ان غموں نے نہ آپؐ کی کمر توڑی نہ آپکی خوش مزاجی پر کوئی اثر ڈالا۔ دل کے زخم کبھی آنکھوں سے نہیں پھُوٹے۔ چہرہ ہر ایک کے لیے بشاش رہا اور شاذ و نادر ہی کسی موقع پر آپ نے اس درد کا اظہار کیا۔ ایک دفعہ ایک عورت جس کا لڑکا فوت ہوگیا تھا اپنے لڑکے کی قبر پر ماتم کر رہی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گذرے تو آپؐ نے فرمایا۔ اے عورت صبر کر۔ خدا کی مشیّت ہر ایک پر غالب ہے۔ وہ عورت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتی نہ تھی اس نے آگے سے جواب دیا جس طرح میرا بچہ مرا ہے تمہارا بچہ بھی مرتا تو تمہیں معلوم ہوتا کہ صبر کیا چیز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف یہ کہکر وہاں سے آگے چل پڑے۔ ایک نہیں میرے سات بچے فوت ہو چکے ہیں۔ پس اس قسم کے موقع پر اتنا اظہار تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گذشتہ مصائب پر کبھی کر دیتے تھے۔ ورنہ بنی نوع انسان کی خدمت

میں کوئی کوتاہی ہوئی۔ نہ آپ کی بشاشت میں کوئی فرق آیا۔

تحمّل

تحمّل آپؐ میں اِس قدر تھا کہ اس زمانہ میں بھی کہ آپ کو خدا تعالےٰ نے بادشاہت عطا فرما دی تھی۔ آپؐ ہر ایک کی بات سُنتے اگروہ سختی بھی کرتا تو آپ خاموش ہو جاتے اور کبھی سختی کرنے والے کا جواب سختی سے نہ دیتے۔ مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے نام کی بجائے آپؐ کے رُوحانی درجہ سے پکارتے تھے یعنی یا رسول اللہ کہہ کر بلاتے تھے اور غیر مذاہب کے لوگ ایشیائی دستور کے مطابق آپؐ کا ادب اور احترام اس طرح کرتے تھے کہ بجائے آپ کو محمدؐ کہہ کر بُلانے کے ابوالقاسم کہہ کر بلاتے تھے جو آپؐ کی کنیت تھی (ابوالقاسم کے معنے ہیں قاسم کا باپ۔ قاسم آپکے ایک بیٹے کا نام تھا) ایک دفعہ ایک یہودی مدینہ میں آیا اور اُس نے آپ سے آکر بحث شروع کردی بحث کے دوران میں وہ بار بار کہتا تھا۔ اے محمدؐ بات یوں ہے۔ اے محمدؐ بات یوں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی انقباض اس کی باتوں کا جواب دیتے تھے۔ مگر صحابہؓ اس کی گستاخی دیکھکر بیتاب ہو رہے تھے۔ آخر ایک صحابیؓ سے نہ رہا گیا اور اس نے یہودی سے کہا کہ خبردار آپؐ کا نام لیکر بات نہ کرو تم رسول اللہ نہیں کہہ سکتے تو کم سے کم ابوالقاسم کہو۔ یہودی نے کہا میں تو وہی نام لُونگا جو اُن کے ماں باپ نے اُن کا رکھا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور اپنے صحابہؓ سے کہا دیکھو یہ ٹھیک کہتا ہے، میرے ماں باپ نے میرا نام محمدؐ ہی رکھا تھا جو نام یہ لینا چاہتا ہے اسے لینے دو اور اس پر غصّہ کا اظہار نہ کرو۔

آپ جب باہر کام کے لیے نکلتے تو بعض لوگ آپؐ کا رستہ روک کر کھڑے ہو جاتے اور اپنی ضرورتیں بیان کرنی شروع کر دیتے۔ جب تک وہ لوگ اپنی ضرورتیں بیان نہ کر لیتے آپ کھڑے رہتے جب وہ بات ختم کر لیتے تو آپ آگے چل پڑتے۔ اسی طرح بعض لوگ مصافحہ کرتے وقت دیر تک آپ کا ہاتھ پکڑے رکھتے۔ گو یہ طریق ناپسندیدہ ہے اور کام میں روک پیدا کرنے کا موجب ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہ چھڑاتے بلکہ جب تک وہ مصافحہ کرنے والا آپؐ کے ہاتھ کو پکڑے رکھتا آپ بھی اپنا ہاتھ اُسکے ہاتھ میں رہنے دیتے۔ ہر قسم کے حاجتمند آپؐ کے پاس آتے اور اپنی حاجتیں پیش کرتے۔ بعض دفعہ آپؐ مانگنے والے کو اس کی ضرورت کے مطابق کچھ دیدیتے تو وہ اپنی حرص سے مجبور ہو کر اور زیادہ کا مطالبہ کرتا اور آپ پھر بھی اسکی خواہش کو پُورا کر دیتے۔ بعض دفعہ لوگ کئی دفعہ مانگتے چلے جاتے اور آپ اُن کو ہر دفعہ کچھ نہ کچھ دیتے چلے جاتے۔ جو شخص خاص طور پر مخلص نظر آتا اُسے اُس کے مانگنے کے مطابق دے دینے کے بعد صرف اتنا فرما دیتے کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم خدا پر توکّل کرتے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک مخلص صحابیؓ نے متواتر اصرار کر کے آپؐ سے کئی دفعہ اپنی ضرورتوں کے لیے روپیہ مانگا۔ آپ نے اس کی خواہش کو تو پورا کر دیا، مگر آخر میں فرمایا سب سے اچھا مقام تو یہی ہے کہ انسان خدا پر توکل کرے۔ اس صحابی کے اندر اخلاص تھا اور ادب بھی تھا جو کچھ وہ لے چکا ادب سے اُس نے واپس نہ کیا لیکن آئندہ کے متعلق اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ میری آخری بات ہے اب میں آئندہ کسی سے کسی صورت میں بھی سوال نہیں کرونگا۔ ایک دفعہ جنگ ہو رہی تھی غضب کا معرکہ پڑ رہا تھا۔ نیزے پھینکے جا رہے تھے۔ تلواریں کھٹا کھٹ گر رہی تھیں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ سپاہی پر سپاہی ٹوٹا پڑ رہا تھا کہ اُس صحابی کے

ہاتھ سے عین اُس وقت جبکہ وہ دشمن کے نرغہ میں گھرے ہوئے تھے کوڑا گر گیا۔ ایک ہمراہی پیدل سپاہی نے اس خیال سے کہ اگر افسر نیچے اُترا تو ایسا نہ ہو کہ کوئی نقصان پہنچ جائے جُھک کر کوڑا اُٹھانا چاہا، تا کہ اُن کے ہاتھ میں دیدے۔ اس صحابی کی نظر اُس سپاہی پر پڑ گئی اور انہوں نے کہا اے میرے بھائی تجھے خدا ہی کی قسم تو کوڑے کو ہاتھ نہ لگا یہ کہتے ہوئے وہ گھوڑے سے کود پڑے اور کوڑا اُٹھا لیا پھر اپنے ساتھی سے کہا میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرار کیا تھا کہ میں کسی سے کوئی سوال نہیں کرونگا۔ اگر میں کوڑا تمہیں اُٹھانے دیتا تو گو میں نے اس کے متعلق تم سے سوال نہیں کیا تھا۔ لیکن اس میں کیا شبہ تھا کہ زبانِ حال سے یہ سوال ہی بن جاتا اور ایسا کرنا مجھے وعدہ خلاف بنا دیتا گو یہ جنگ کا میدان ہے مگر میں اپنا کام خود ہی کرونگا۔

انصاف

انصاف اور عدل آپؐ کے اندر اتنا پایا جاتا تھا کہ جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ عربوں میں لحاظ داری اور سفارشوں کا قبول کرنا ایک عام مرض تھا۔ عرب کا کیا ذکر ہے اس زمانہ کے متمدّن ممالک میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ بڑے آدمیوں کو سزا دیتے وقت جھجکتے ہیں اور غریبوں کو سزا دیتے وقت نہیں گھبراتے۔ ایک دفعہ ایک مقدمہ آپؐ کے پاس آیا، ایک بہت بڑے خاندان کی کسی عورت نے کسی دوسرے کے مال کو ہتھیا لیا تھا۔ جب حقیقت کُھل گئی تو عربوں میں بڑا ہیجان پیدا ہو گیا کیونکہ ایک بہت بڑے معزّز خاندان کی ہتک ہوتی اُنہیں نظر آئی انہوں نے چاہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ درخواست پیش کریں کہ اس عورت کو معاف کر دیا جائے اور تو کسی شخص نے جرأت نہ کی لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عزیز اسامہؓ بن زید کو لوگوں نے چُنا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اس عورت کی سفارش کریں۔ اسامہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات شروع ہی کی تھی کہ آپؐ کے چہرہ پر غصّہ کے آثار ظاہر ہوئے اور آپؐ نے فرمایا۔ اسامہ یہ کیا کہہ رہے ہو، پہلی قومیں اسی طرح تباہ ہوئیں کہ وہ بڑوں کا لحاظ کرتی تھیں۔ اور چھوٹوں پر ظلم کرتی تھیں۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اور میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی اس قسم کا جرم کرتی تو میں اُسے سزا دیئے بغیر نہ رہتا۔ یہ واقعہ پہلے سوانح میں آچکا ہے کہ بدر کی جنگ میں جب حضرت عباسؓ قید ہوئے تو اُن کے کراہنے سے آپ کو تکلیف محسوس ہوئی لیکن جب صحابہؓ نے آپکی تکلیف دیکھ کر حضرت عباسؓ کے ہاتھوں کی رسّیاں کھولدیں اور رسول اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہو گئی تو آپؐ نے فرمایا جیسے میرے رشتہ دار ویسے ہی دوسرے لوگوں کے رشتہ دار یا تو میرے چچا عباسؓ کو بھی پھر رسیوں سے باندھ دو اور یا سارے قیدیوں کی رسّیاں کھول دو۔ صحابہ کو چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا احساس تھا۔ اُنہوں نے کہا یا رسول اللہ ہم پہرہ سختی سے دے لیں گے لیکن سب قیدیوں کی رسّیاں ہم کھول دیتے ہیں۔ چنانچہ سب قیدیوں کی رسّیاں اُنہوں نے کھول دیں۔

آپؐ انصاف کا خیال جنگ کے موقع پر بھی رکھتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ نے کچھ صحابہؓ کو باہر خبر رسانی کے لیے بھجوایا۔ دشمن کے کچھ آدمی ان کو حرم کی حد میں مل گئے اور انہوں نے سمجھا کہ اگر ہم نے ان کو زندہ چھوڑ دیا تو یہ مکّہ والوں کو جا کر خبر دیں گے اور ہم مارے جائیں گے انہوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ اور ان میں سے ایک لڑائی

میں مار اگیا۔ جب یہ خبریں دریافت کرنے والا قافلہ مدینہ واپس آیا، تو پیچھے پیچھے مکّہ والوں کی طرف سے بھی ایک وفد شکایت لیکر آیا کہ انہوں نے حرم کے اندر ہمارے دو آدمی مار دیے ہیں۔ جو لوگ حرم کے اندر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کرتے رہتے تھے اُن کو جواب تو یہ ملنا چاہیئے تھا کہ تم نے کب حرم کا احترام کیا کہ تم ہم سے حرم کے احترام کی امید رکھتے ہو۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب نہ دیا بلکہ فرمایا۔ ہاں بے انصافی ہوئی ہے کیونکہ ممکن ہے اس خیال سے کہ حرم میں وہ محفوظ ہیں، انہوں نے اپنے بچاؤ کی پوری کوشش نہ کی ہو۔ اس لیے آپ لوگوں کو اُن کا خون بہا دیا جائے گا۔ چنانچہ آپؐ نے قتل کا وہ فدیہ جس کا عربوں میں دستور تھا اُن کے ورثاء کو ادا کیا۔

جذبات کا احترام

اپنے تو اپنے غیروں کے جذبات کا احترام بھی آپؐ بہت زیادہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک یہودی آپؐ کے پاس آیا اور اُس نے آ کے شکایت کی کہ دیکھئے حضرت ابوبکرؓ نے میرا دل دکھایا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ مَیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کو خدا نے موسیٰ سے افضل بنایا ہے۔ اِس بات کو سُنکر میرے دل کو تکلیف پہنچی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو بلا کر اُن سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا، یا رسول اللہ اس شخص نے ابتداء کی تھی اور کہا تھا کہ مَیں موسیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کو خدا نے ساری دنیا پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ مَیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کو خدا نے موسیٰ سے افضل بنایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا چاہیئے مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دیا کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپؐ اپنے آپکو موسیٰ سے افضل نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ یہ فقرہ کہنے سے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے موسیٰ پر فضیلت عطا فرمائی ہے یہودیوں کے دلوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

غرباء کا خیال اور اُن کے جذبات کا احترام

آپ ہمیشہ غرباء کے حالات کو درست رکھنے کی کوشش رکھتے اور اُنکو سوسائٹی میں مناسب مقام دینے کی سعی فرماتے۔ ایک دفعہ آپ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک امیر آپکے سامنے سے گذرا آپؐ نے ایک ساتھی سے دریافت کیا کہ اس شخص کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا یہ معزّز اور امیر لوگوں میں سے ہے اگر یہ کسی لڑکی سے نکاح کی خواہش کرے تو اسکی درخواست قبول کی جائیگی۔ اور اگر یہ کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائیگی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سُنکر خاموش رہے۔ اس کے بعد ایک اور شخص گذرا جو غریب اور نادار معلوم ہوتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ساتھی سے پوچھا تمہاری اسکے بارہ میں کیا رائے ہے۔ اُس نے کہا یا رسول اللہ یہ غریب آدمی ہے اور اس لائق ہے کہ اگر یہ کسی کی لڑکی سے نکاح کی درخواست کرے تو اسکی درخواست قبول نہ کیجائے اور اگر سفارش کرے تو اسکی سفارش نہ مانی جائے اور اگر یہ باتیں سنانا چاہے تو اسکی باتوں کی طرف توجہ نہ کیجائے یہ سنکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس غریب آدمی کی قیمت اس سے بھی زیادہ ہے کہ ساری دنیا سونے سے بھر دی جائے۔ (بخاری کتاب الرقاق باب فضل الفقر)

ایک غریب عورت مسجد کی صفائی کیا کرتی تھی، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دن اُسکو نہ دیکھا، تو آپ نے پوچھا وہ عورت نظر نہیں آتی، لوگوں نے بتایا کہ وہ فوت ہو گئی ہے۔ آپ نے فرمایا جب وہ فوت ہو گئی تھی تو تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی کہ میں بھی اُسکے جنازہ میں شامل ہوتا پھر فرمایا شاید تم نے اس کو غریب سمجھکر حقیر جانا۔ ایسا کرنا درست نہیں تھا مجھے بتاؤ اسکی قبر کہاں ہے پھر آپ اس کی قبر پر گئے اور جا کر اُسکے لیے دُعا کی۔ (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب کنس المسجد)

آپ فرمایا کرتے تھے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے سر کے بال پراگندہ ہوتے ہیں اور اُن کے جسموں پر مٹی پڑی ہوتی ہے اگر وہ لوگوں سے ملنے جائیں تو لوگ اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں لیکن ایسے لوگ اگر اللہ تعالیٰ کی قسم کھا بیٹھیں تو خدا تعالیٰ کو اُن کا اتنا احترام ہوتا ہے کہ وہ ان کی قسم پوری کر کے چھوڑتا ہے۔ (مسلم جلد ۲ کتاب البر والصلۃ باب فضل الضعفاء)

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ غریب صحابہؓ جو کسی وقت غلام ہوتے تھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوسفیان اُن کے سامنے سے گذرے تو انہوں نے اس کے سامنے اسلام کی جیت کا کچھ ذکر کیا۔ حضرت ابوبکرؓ سُن رہے تھے اُنہیں یہ بات بُری معلوم ہوئی کہ قریش کے سردار کی ہتک کی گئی ہے اور اُنہوں نے اُن لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کیا تم قریش کے سردار اور اُن کے افسر کی اس طرح ہتک کرتے ہو پھر حضرت ابوبکرؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر یہی بات شکایتاً بیان کی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابوبکرؓ شاید تم نے اللہ تعالیٰ کے ان خاص بندوں کو ناراض کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یاد رکھو کہ تمہارا رب بھی تم سے ناراض ہو جائے گا۔ حضرت ابوبکرؓ اسی وقت اُٹھے اور اُٹھ کر اُن لوگوں کے پاس واپس آئے اور کہا اے میرے بھائیو کیا میری بات سے تم ناراض ہو گئے ہو؟ اس پر اُن غلاموں نے جواب دیا اے ہمارے بھائی ہم ناراض نہیں ہوئے خدا آپ کا قصور معاف کرے۔

(مسلم کتاب الفضائل باب من فضائل سلمان وصہیب بلال رضی اللہ عنہم)

مگر جہاں آپ غرباء کی عزت اور ان کے احترام کو قائم کرتے اور اُن کی ضرورتوں کو پورا فرماتے تھے۔ وہاں آپ اُن کو عزتِ نفس کا بھی سبق دیتے تھے اور سوال کرنے سے منع فرماتے تھے چنانچہ آپ ہمیشہ فرماتے تھے کہ مسکین وہ نہیں جس کو ایک کھجور یا دو کھجوریں یا ایک لقمہ یا دو لقمے تسلی دیدیں۔ مسکین وہ ہے کہ خواہ کتنی ہی تکلیفوں سے گزرے سوال نہ کرے (بخاری کتاب الکروب باب قول اللہ تعالیٰ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا) آپ اپنی جماعت کو یہ بھی نصیحت کرتے رہتے تھے کہ ہر وہ دعوت جس میں غرباء کو نہ بلایا جائے وہ بدترین دعوت ہے (بخاری کتاب النکاح باب من ترک الدعوۃ فقد عصی اللہ ورسولہ)

حضرت عائشہ رضؓ کہتی ہیں ایک دفعہ ایک غریب عورت میرے پاس آئی اور اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں اس وقت ہمارے گھر میں سوائے ایک کھجور کے کچھ نہ تھا میں نے وہی کھجور اس کو دے دی۔ اُس نے وہ کھجور آدھی آدھی کر کے دونوں لڑکیوں کو کھلا دی اور پھر اُٹھ کر چلی گئی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل ہوئے تو میں نے آپ کو یہ واقعہ سُنایا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس غریب کے گھر میں بیٹیاں ہوں اور وہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔ خدا تعالےٰ اُسے قیامت کے دن عذاب دوزخ سے بچائے گا۔ پھر

فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اس عورت کو اس فعل کی وجہ سے جنّت کا مستحق بنائے گا۔ (مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل باب فضل الاحسان الی البنات)

اسی طرح ایک دفعہ آپؐ کو معلوم ہوا کہ آپؐ کے ایک صحابی سعدؓ جو مالدار تھے وہ بعض دوسرے لوگوں پر اپنی فضیلت ظاہر کر رہے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سُنی تو فرمایا کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ قوت اور طاقت اور تمہارا یہ مال تمہیں اپنے زور بازو سے ملے ہیں ایسا ہرگز نہیں تمہاری قومی طاقت اور تمہارے مال سب غرباہی کے ذریعہ سے آتے ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ دُعا فرمایا کرتے تھے اللّٰھم احینی مسکینًا و امتنی مسکینًا و احشرنی فی زمرۃ المساکین یوم القیامۃ (ترمذی جلد ۲ ابواب الزھد) یعنی اے اللہ مجھے مسکین ہونے کی حالت میں زندہ رکھ۔ مسکین ہونے کی حالت میں وفات دے اور مساکین کے زمرہ میں ہی قیامت کے دن مجھے اُٹھا۔

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بازار میں تشریف لے جارہے تھے تو آپؐ کے ایک غریب صحابی جو اتفاقی طور پر نہایت بدصورت بھی تھے گرمی کے موسم میں بوجھ اُٹھا اُٹھا کر ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر رہے تھے ایک طرف اُن کا چہرہ بدصورت تھا تو دوسری طرف گرد وغبار اور پسینہ کی وجہ سے وہ اور بھی بدنما نظر آرہا تھا عین اُس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گذرے اور آپؐ نے اُن کے چہرہ پر افسردگی کی علامتیں دیکھیں۔ آپؐ خاموشی سے اُن کے پیچھے چلے گئے اور جیسے بچے آپس میں کھیلتے وقت چوری چھپے پیچھے کی طرف سے جا کر کسی دوست کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتے اور پھر یہ امید کرتے ہیں کہ وہ اندازہ لگا کر بتائے کہ کس شخص نے اس کی آنکھیں بند کی ہیں۔ اسی طرح آپؐ نے اُن کی آنکھوں پر جا کر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے آپؐ کے بازو اور جسم کو ٹٹولنا شروع کیا اور سمجھ لیا کہ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یوں بھی وہ سمجھتا تھا کہ اتنے غریب اتنے بدصورت اور اتنے بدحال آدمی کے ساتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اپنی محبت کا اظہار اور کون کر سکتا ہے۔ یہ معلوم کر کے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہی اس کے ساتھ اظہارِ محبّت کر رہے ہیں اُس نے اپنا مٹی آلودہ اور پسینہ سے بھرا ہُوا جسم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس کے ساتھ ملنا شروع کیا شاید وہ یہ دیکھتا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت اور آپؐ کا حوصلہ کتنا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے رہے اور اس کو اس حرکت سے منع نہ کیا۔ جب وہ پیٹ بھر کے آپؐ کے کپڑوں کو خراب کر چکا تو آپ نے مذاقاً فرمایا میرے پاس ایک غلام ہے کوئی اس کا خریدار ہے؟ آپؐ کے اس فقرہ نے اس کو عرش سے فرش پر لا کر پھینک دیا اور اس بات کی طرف اس کی توجہ پھرا دی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا کون مجھ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے اور مَیں کس قابل ہوں کہ غلام کر کے ہی کوئی مجھے خریدے۔ اس نے افسردگی سے کہا یا رسول اللہ میرا خریدار دنیا میں کوئی نہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں نہیں۔ ایسا مت کہو۔ تمہاری قیمت خدا کی نظر میں بہت زیادہ ہے۔

آپؐ نہ صرف خود غرباء کا خیال رکھتے تھے۔ بلکہ اپنی جماعت کو بھی غرباء کا خیال رکھنے کی ہمیشہ نصیحت فرماتے

رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی حاجتمند آتا، تو آپ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے فرماتے کہ آپ بھی اس کی سفارش کریں تاکہ نیک کام کی سفارش کے ثواب میں شامل ہو جائیں (بخاری و مسلم) اس طرح آپؐ ایک طرف تو اپنی جماعت کے لوگوں کے دلوں میں غرباء کی امداد کا احساس پیدا کرتے تھے اور دوسری طرف خود سوالی کے دل میں دوسرے مسلمانوں کی نسبت محبّت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

غرباء کے مالوں کی حفاظت

اسلام کی فتح کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سے اموال آتے اُنہیں آپؐ مستحقین میں تقسیم کر دیتے۔ ایک دفعہ بہت سا مال آیا تو آپکی لڑکی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا یا رسول اللہ یہ دیکھئے میرے ہاتھ چکّی پیس پیس کے زخمی ہو گئے ہیں اگر آپؐ مجھے ان اموال میں سے کوئی لونڈی یا غلام دیدیں تو وہ میرا ہاتھ بٹا دیا کریں۔ آپؐ نے فرمایا فاطمہ میری بیٹی میں تم کو لونڈی یا غلام رکھنے سے زیادہ قیمتی چیز بتاتا ہوں رجب تم سونے لگو تو تم تینتیس ۳۳ دفعہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تینتیس ۳۳ دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہِ اور چونتیس ۳۴ دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ لیا کرو۔ یہ تمہارے لیے لونڈی اور غلام سے زیادہ بہتر ہوگا۔ (بخاری کتاب الدعوات باب التکبیر والتسبیح عند المنام)

ایک دفعہ کچھ اموال آئے اور آپؐ نے اُن کو تقسیم کر دیا تقسیم کرتے وقت ایک دینار آپؐ کے ہاتھ سے گر گیا اور کسی چیز کی اوٹ میں آگیا۔ مال تقسیم کرتے کرتے آپ کے ذہن سے وہ بات اُتر گئی سب مال تقسیم کرنے کے بعد آپؐ مسجد میں آئے اور نماز پڑھائی۔ نماز پڑھانے کے بعد بجائے اس کے کہ ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے جیسا کہ آپ کی عادت تھی یا لوگوں کو اپنی ضروریات کے پیش کرنے یا مسائل پوچھنے کا موقعہ دیتے آپؐ تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے ایسی تیزی کے ساتھ کہ بعض صحابہ کہتے ہیں ہماری گردنوں پر کودتے ہوئے آپ اندر کی طرف چلے گئے اور دینار تلاش کیا پھر واپس تشریف لائے۔ اور باہر آکر وہ دینار کسی مستحق کو دیتے ہوئے فرمایا یہ دینار گر گیا تھا اور مجھے بھول گیا تھا مجھے نماز پڑھاتے ہوئے یاد آیا اور میرا دل اس خیال سے بے چین ہو گیا کہ اگر میری موت آگئی اور لوگوں کا یہ مال میرے گھر میں ہی پڑا رہا تو مَیں خدا کو کیا جواب دوں گا۔ اس لیے میں فوراً اندر گیا اور جا کر یہ مال نکال لایا (بخاری کتاب الکسوف باب من احبّ تعجیل الصدقۃ من یومہا)

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آپ نے صدقہ کو اپنی اولاد کے لیے حرام کر دیا تا ایسا نہ ہو کہ آپ کے اعزاز اور احترام کی وجہ سے صدقہ کے اموال لوگ آپؐ کی اولاد میں ہی تقسیم کر دیا کریں۔ اور دوسرے غریب محروم رہ جائیں۔ ایک دفعہ آپؐ کے سامنے صدقہ کی کچھ کھجوریں لائی گئیں۔ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آپؐ کے نواسے تھے اور جن کی عمر اُس وقت دو اڑھائی سال کی تھی اس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک کھجور اپنے منہ میں ڈال لی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فوراً انگلی ڈال کر اُن کے مُنہ سے کھجور نکالی اور فرمایا یہ ہمارا حق نہیں۔ یہ خدا کے

غریب بندوں کا حق ہے۔ (بخاری کتاب الکسوف باب اخذ صدقۃ التمر)

غلاموں سے حُسن سلوک

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا آپؐ ہمیشہ ہی وعظ فرماتے رہتے۔ آپؐ کا یہ ارشاد تھا کہ اگر کسی شخص کے پاس غلام ہو اور وہ اس کو آزاد کرنے کی توفیق نہ رکھتا ہو تو اگر وہ کسی وقت غصہ میں اس کو مار بیٹھے یا گالی دے تو اُس کا کفارہ یہی ہے کہ اس کو آزاد کر دے۔ (مسلم جلد ۲ کتاب الایمان)

اسی طرح آپؐ غلاموں کو آزاد کرنے کے متعلق اتنا زور دیتے تھے کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے جو شخص کسی غلام کو آزاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلہ میں اس کے ہر عضو پر دوزخ کی آگ کو حرام کر دیگا۔ پھر آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ غلام سے اتنا ہی کام لو جتنا وہ کر سکتا ہے اور جب اس سے کوئی کام لو تو اس کے ساتھ مل کر کام کیا کرو تا کہ ذلت محسوس نہ کرے۔ (مسلم جلد ۲ کتاب الایمان) اور جب سفر کرو تو یا تو اس کو سواری پر اپنے ساتھ بٹھاؤ یا اس کے ساتھ باری مقرر کر کے سواری پر چڑھو اس بارہ میں آپؐ اتنی تاکید فرماتے تھے کہ حضرت ابوہریرہؓ جو اسلام لانے کے بعد ہر وقت آپؐ کے ساتھ رہتے تھے اور آپ کی اس تعلیم کو اکثر سنتے رہتے تھے وہ کہا کرتے تھے اُس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں ابوہریرہؓ کی جان ہے اگر اللہ کے رستہ میں جہاد کا موقع مجھے نہ مل رہا ہوتا اور حج کی توفیق نہ مل رہی ہوتی اور میری بڑھیا ماں زندہ نہ ہوتی جس کی خدمت مجھ پر فرض ہے، تو میں خواہش کرتا کہ میں غلامی کی حالت میں مروں۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غلام کے حق میں نہایت ہی نیک باتیں فرمایا کرتے تھے (مسلم جلد ۲ کتاب الایمان)

معرور بن سویدؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کو دیکھا کہ جیسے اُن کے کپڑے تھے، ویسے ہی اُن کے غلام کے تھے اس کی وجہ پوچھی کہ آپ کے کپڑے اور آپ کے غلام کے کپڑے ایک جیسے کیوں ہیں تو اُنہوں نے بتایا کہ میں نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص کو اس کی ماں کا طعنہ دیا جو لونڈی تھی اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو تو ایسا شخص ہے جس میں ابھی تک کفر کی باتیں پائی جاتی ہیں غلام کیا ہیں تمہارے بھائی ہیں اور تمہاری طاقت کا ذریعہ ہیں خدا تعالیٰ کی کسی حکمت کے ماتحت وہ کچھ عرصہ کے لیے تمہارے قبضہ میں آ جاتے ہیں پس چاہیئے کہ جس کا بھائی اس کی خدمت تلے آ جائے وہ جو کچھ خود کھاتا ہے اُسے کھلائے اور جو کچھ خود پہنتا ہے اُسے پہنائے۔ اور تم میں سے کوئی شخص کسی غلام سے ایسا کام نہ لے جس کی اُسے طاقت نہ ہو اور جب تم انہیں کوئی کام بتاؤ تو خود بھی ان کے ساتھ مل کر کام کیا کرو۔ (مسلم جلد ۲ کتاب الایمان)

اسی طرح آپؐ فرمایا کرتے تھے جب تمہارا نوکر تمہارے لیے کھانا لائے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کم سے کم تھوڑا سا کھا ضرور کھلاؤ۔ کیونکہ اس نے کھانا پکا کر اپنا حق قائم کر لیا ہے۔ (مسلم جلد ۲ کتاب الایمان)

بنی نوع انسان کی خدمت کرنے والوں کا احترام

آپؐ اُن لوگوں کا خاص خیال رکھتے تھے جو بنی نوع انسان کی خدمت میں اپنا وقت خرچ کرتے تھے۔ جب طَی قبیلہ کے لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کی اور ان میں سے کچھ لوگ گرفتار ہو کر آئے تو اُن میں حاتم جو عرب کا مشہور سخی گزرا ہے اس کی بیٹی بھی تھی، جب اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ذکر کیا کہ وہ حاتم کی بیٹی ہے تو آپؐ نے نہایت ہی ادب اور احترام کا معاملہ اس سے کیا اور اس کی سفارش پر اُس کی قوم کی سزاؤں کو معاف کر دیا۔

(السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۲۲۷ سریۃ علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہ)

عورتوں سے حسنِ سلوک

عورتوں سے حسن سلوک کا آپؐ خاص خیال رکھتے تھے آپؐ نے سب سے پہلے دنیا میں عورت کے ورثہ کے حق کو قائم کیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں لڑکوں اور لڑکیوں کو باپ اور ماں کے ورثہ کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح ماؤں اور بیویوں کو بیٹیوں اور خاوندوں کے ورثہ میں حقدار قرار دیا گیا ہے۔ اور بعض صورتوں میں بہنوں کو بھی بھائیوں کے ورثہ کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کے کسی مذہب نے بھی اس طرح حقوق قائم نہیں کیے۔ اسی طرح آپؐ نے عورت کو اس کے مال کا مستقل مالک قرار دیا ہے خاوند کو حق نہیں کہ خاوند ہونیکی وجہ سے عورت کے مال میں دست اندازی کر سکے۔ عورت اپنے مال کے خرچ کرنے میں پوری مختار ہے۔ عورتوں سے حسن سلوک میں آپ ایسے بڑھے ہوئے تھے کہ عرب کے لوگ جو اس بات کے عادی نہ تھے ان کو یہ بات دیکھ کر ٹھوکر لگتی تھی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری بیوی بعض دفعہ میری باتوں میں دخل دیتی تو مَیں اُس کو ڈانٹا کرتا تھا اور کہا کرتا کہ عرب کے لوگوں نے کبھی عورتوں کا یہ حق تسلیم نہیں کیا کہ وہ مردوں کو اُن کے کاموں میں مشورہ دیں۔ اس پر میری بیوی کہا کرتی کہ جاؤ جاؤ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اُن کو مشورہ دیتی ہیں اور آپ اُن کو کبھی نہیں روکتے تو تم ایسا کیوں کہتے ہو، اس پر مَیں اُسے کہا کرتا تھا کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت لاڈلی ہے اس کا ذکر نہ کرو، باقی رہی تمہاری بیٹی سو اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اپنی گستاخی کی سزا کسی دن پائیگی۔ ایک دفعہ جب کسی بات سے ناراض ہو کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ دن آپؐ گھر سے باہر رہیں گے اور بیویوں کے پاس نہیں جائیں گے اور مجھے اس کی خبر ملی، تو مَیں نے کہا دیکھو جو مَیں کہتا تھا وہی ہو گیا۔ مَیں اپنی بیٹی حفصہ رضؓ کے گھر میں گیا تو وہ رو رہی تھیں۔ مَیں نے کہا حفصہؓ کیا ہُوا، کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تمہیں طلاق دے دی ہے۔ اُنہوں نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بات کی وجہ سے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے گھر میں نہیں آئیں گے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں، میں نے کہا حفصہؓ میں تجھے پہلے نہیں سمجھایا کرتا تھا کہ تو عائشہؓ کی نقلیں کرتی ہے، حالانکہ عائشہ رضؓ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر پیاری ہے۔ دیکھ آخر تو نے وہی مصیبت سہیڑ لی جس کا مجھے خوف تھا یہ کہکر مَیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس آیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کھُردری چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ آپؐ کے جسم پر کُرتہ نہ تھا اور آپؐ کے سینہ اور کمر پر چٹائی کے داغ لگے ہوئے تھے میں آپ کے پاس بیٹھ گیا اور کہا یا رسول اللہ یہ قیصر و کسریٰ کہاں مستحق ہیں اس بات کے کہ ان کو خدا تعالیٰ کی نعمتیں ملیں مگر وہ تو کس آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور خدا کے رسول کو یہ تکلیف ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عمرؓ یہ درست نہیں اس قسم کی زندگیاں خدا کے رسولوں کی نہیں ہوتیں یہ دنیاداروں بادشاہوں کا شغل ہے۔ پھر میں نے آپؐ کو سارا وہ واقعہ سنایا جو میری بیوی اور بیٹی کے ساتھ گزرا تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری باتیں سُنکر ہنس پڑے اور فرمایا عمرؓ یہ بات درست نہیں کہ میں نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے۔ میں نے تو صرف ایک مصلحت کی خاطر کچھ دنوں کیلئے اپنے گھر سے باہر رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ (بخاری کتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجھا)

عورتوں کے جذبات کا آپؐ کو اتنا خیال تھا کہ ایک دفعہ نماز میں آپؐ کو ایک بچّہ کے رونے کی آواز آئی تو آپ نے نماز جلدی جلدی پڑھا کر ختم کر دی پھر فرمایا ایک بچّہ کے رونے کی آواز آئی تھی، میں نے کہا اس کی ماں کو کتنی تکلیف ہو رہی ہو گی۔ چنانچہ میں نے نماز جلدی ختم کر دی تاکہ ماں اپنے بچہ کی خبر گیری کر سکے۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ باب من اخف الصلوٰۃ عند بکاء الصبی)

جب آپؐ ایسے سفر پر جاتے جس میں عورتیں بھی ساتھ ہوتیں تو ہمیشہ آہستگی سے چلنے کا حکم دیتے۔ ایک دفعہ ایسے ہی موقعہ پر جبکہ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں اور اونٹوں کی نکیلیں اُٹھالیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ رفقاً بالقواریر ارے کیا کرتے ہو عورتیں بھی ساتھ ہیں اگر تم اس طرح اونٹ دوڑاؤ گے تو شیشے چکنا چور ہو جائینگے (بخاری کتاب الادب)

ایک دفعہ جنگ کے میدان میں کسی گڑبڑ کی وجہ سے سواریاں بدک گئیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی گھوڑے سے گر گئے اور بعض مستورات بھی گر گئیں۔ ایک صحابی جن کا اونٹ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گرتے ہوئے دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور کُود کر یہ کہتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑے "یا رسول اللہ میں مر جاؤں اور آپ بچے رہیں"۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں رکاب میں اُلجھے ہوئے تھے آپؐ نے جلدی جلدی اپنے آپ کو آزاد کیا اور اس صحابی کی طرف متوجّہ ہو کر فرمایا "مجھے چھوڑو اور عورتوں کی طرف جاؤ" جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپؐ نے اس وقت سب مسلمانوں کو جمع کر کے جو وصیتیں کیں ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ میں تم کو اپنی آخری وصیّت یہ کرتا ہوں کہ عورتوں سے ہمیشہ حسن سلوک کرتے رہنا۔ آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے جس کے گھر میں لڑکیاں ہوں اور وہ ان کو تعلیم دلائے اور ان کی اچھی تربیت کرے۔ خدا تعالیٰ قیامت کے دن اس پر دوزخ حرام کر دے گا۔

(ترمذی جلد ۲ ابواب البرّ والصلۃ باب ما جاء فی النفقۃ علے البنات)

عربوں میں رواج تھا کہ اگر عورتوں سے کوئی غلطی ہو جاتی تو اُنہیں مار پیٹ لیا کرتے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

کو جب اس کی اطلاع ملی۔ تو آپؐ نے فرمایا عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں تمہاری لونڈیاں نہیں۔ ان کو مت مارا کرو۔ مگر عورتوں کی چونکہ ابھی تک پوری تربیت نہیں ہوئی تھی، انہوں نے اس دلیری میں آکر مردوں کا مقابلہ شروع کر دیا اور گھروں میں فساد ہونے لگا۔ آخر حضرت عمرؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ آپؐ نے ہمیں عورتوں کو مارنے سے روک دیا ہے اور وہ بڑی بڑی دلیریاں کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں تو ہمیں اجازت ملنی چاہیئے کہ ہم اُنہیں مار پیٹ لیا کریں۔ چونکہ ابھی تک عورتوں کے متعلق تفصیل سے احکام نہیں نازل ہوئے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ اگر کوئی عورت حد سے بڑھتی ہے، تو تم اپنے رواج کے مطابق اُسے مار لیا کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بجائے اس کے کہ کسی اشد استثنائی صورت میں مرد اپنی عورتوں کو سزا دیتے، اُنہوں نے وہی پُرانا عربی طریق جاری کر لیا۔ عورتوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے پاس آکر شکایت کی تو آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا، جو لوگ اپنی عورتوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے یا اُنہیں مارتے ہیں، مَیں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ وہ خدا کی نظر میں اچھے نہیں سمجھے جاتے۔ اس کے بعد عورتوں کے حق قائم ہوئے اور عورت نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہربانی سے پہلی دفعہ آزادی سے سانس لیا۔ (ابو داؤد کتاب النکاح)

معاویہ بن حیدہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ یا رسول اللہ بیوی کا حق ہم پر کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا جو خدا تمہیں کھانے کے لیے دے وہ اسے کھلاؤ۔ اور جو خدا تمہیں پہننے کے لیے دے وہ اُسے پہناؤ۔ اور اس کو تھپڑ نہ مارو اور گالیاں نہ دو اور اُسے گھر سے نہ نکالو۔ (ابو داؤد)

آپؐ عورتوں کے جذبات کا اسقدر احساس تھا کہ آپؐ ہمیشہ نصیحت فرماتے تھے کہ جو لوگ باہر سفر کے لیے جاتے ہیں اُنہیں جلدی گھر واپس آنا چاہیئے تاکہ ان کے بال بچوں کو تکلیف نہ ہو۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب کوئی شخص اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرے جس کے لیے اسے سفر کرنا پڑا تھا تو اسے چاہیئے اپنے رشتہ داروں کا خیال کرکے جلدی واپس آئے (بخاری و مسلم)

آپؐ کا اپنا طریق یہ تھا۔ کہ جب سفر سے واپس آتے تھے تو دن کے وقت شہر میں داخل ہوتے تھے۔ اگر رات آجاتی تھی، تو شہر کے باہر ہی ڈیرہ ڈال دیتے تھے اور صبح کے وقت شہر میں داخل ہوتے تھے اور ہمیشہ اپنے اصحابؓ کو منع فرماتے تھے۔ کہ اس طرح اچانک گھر میں آکر اپنے اہل عیال کو تنگ نہیں کرنا چاہیئے۔ (بخاری و مسلم) اس میں آپؐ کے مدِّ نظر یہ حکمت تھی کہ عورت اور مرد کے تعلقات جذباتی ہوتے ہیں مرد کی غیر حاضری میں اگر عورت نے اپنے لباس اور جسم کی صفائی کا پورا خیال نہ رکھا ہو اور خاوند اچانک گھر میں آداخل ہو تو ڈر ہوتا ہے کہ وہ محبت کے جذبات جو مرد عورت کے درمیان ہوتے ہیں ان کو کوئی ٹھیس نہ لگ جائے۔ پس آپؐ نے ہدایت فرما دی کہ انسان جب بھی سفر سے واپس آئے۔ دن کے وقت گھر میں داخل ہو۔ اور بیوی بچوں کو پہلے خبر دے کر داخل ہو تاکہ وہ اسکے استقبال کے لیے پوری طرح تیاری کرلیں۔

وفات یافتوں کے متعلق آپکا عمل

آپؐ ہمیشہ یہ بھی نصیحت فرماتے رہتے تھے کہ مرنے والے کو وصیّت کر دینی چاہیئے، تاکہ اس کے

رشتہ داروں کو بعد میں تکلیف نہ پہنچے۔

مرنے والوں کے لیے آپؐ کی یہ بھی ہدایت تھی کہ جب کوئی شخص شہر میں مرجائے تو لوگوں کو اس کی بُرائیاں کبھی بیان نہیں کرنی چاہئیں۔ بلکہ اس کی خیر کی باتیں بیان کرنی چاہئیں۔ کیونکہ اس کی بُرائی بیان کرنے میں کوئی فائدہ نہیں، لیکن اس کی نیکی بیان کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے دعا کی تحریک پیدا ہوگی۔ (بخاری)

آپؐ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ جو لوگ مرجائیں اُن کے قرض جلد سے جلد ادا کیے جاویں۔ چنانچہ جب کوئی شخص مرجاتا۔ اور اس پر قرض ہوتا تو آپؐ یا تو خود اس کا قرض ادا کر دیتے۔ اور اگر آپؐ میں اس کی توفیق نہ ہوتی تو اس کے رشتہ داروں میں تحریک کرتے اور اس کا جنازہ اسوقت تک نہیں پڑھتے تھے جب تک اس کا قرض ادا نہ کر دیا جاتا۔

ہمسایوں سے حسن سلوک

ہمسایوں کے ساتھ آپؐ کا سلوک نہایت ہی اچھا ہوتا تھا آپؐ فرمایا کرتے تھے جبریل مجھے بار بار ہمسایوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے یہاں تک کہ مجھے خیال آتا ہے کہ ہمسائے کو شاید وارث ہی قرار دے دیا جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے اے ابوذرؓ جب کبھی شوربا پکاؤ تو پانی زیادہ ڈال دیا کرو اور اپنے ہمسایوں کا بھی خیال رکھا کرو (مسلم) یہ مطلب نہیں کہ دوسری چیزیں دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ عرب بدوی تھے اور ان کا بہترین کھانا شوربہ ہوتا تھا آپؐ نے ہمسایہ کی امداد کے خیال سے اسی کھانے کی نسبت فرمایا کہ اپنے مزے کا خیال نہ کرو۔ اس کا خیال کرو کہ تمہارا ہمسایہ تمہارے کھانے میں شریک ہو سکے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ نے فرمایا۔ خدا کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں، خدا کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں، خدا کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں۔ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ کون مومن نہیں۔ آپؐ نے فرمایا وہ جس کا ہمسایہ اس کے ضرر اور اس کی بدسلوکی سے محفوظ نہیں (بخاری و مسلم) عورتوں کو بھی آپؐ نصیحت فرمایا کرتے کہ اپنی ہمسایوں کا خیال رکھا کرو۔

ایک دفعہ آپؐ عورتوں میں وعظ فرما رہے تھے کہ آپؐ نے فرمایا اگر بکری کا ایک پایہ بھی کسی کو ملے تو اس میں وہ اپنے ہمسایہ کا حق رکھے (بخاری و مسلم) آپؐ ہمیشہ صحابہؓ کو نصیحت کرتے تھے کہ اگر تمہارا ہمسایہ تمہاری دیوار میں میخ وغیرہ گاڑتا ہے یا تمہاری دیوار سے کوئی ایسا کام لیتا ہے جس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں، تو اُسے روکا نہ کرو۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے، جو کوئی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے وہ اپنے ہمسائے کو دُکھ نہ دے۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے وہ اپنے مہمان کو دُکھ نہ دے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے وہ یا تو نیک بات کہے یا خاموش

رہیے۔ (مسلم)

ماں باپ اور دُوسرے رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک

دنیا میں اکثر لوگ جب بالغ ہو جاتے ہیں اور بیوی بچوں کے فکر اُنہیں لگ جاتے ہیں تو ماں باپ سے حُسنِ سلوک میں کمزوری دکھانے لگ جاتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس نقص کو دُور کرنے کے لیے ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کی اہمیت کو بار بار واضح فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! میرے حُسنِ سلوک کا کون زیادہ مستحق ہے۔ آپؐ نے فرمایا تیری ماں۔ اس نے کہا۔ پھر۔ آپؐ نے فرمایا۔ پھر بھی تیری ماں۔ اس نے کہا یا رسول اللہ اس کے بعد۔ آپؐ نے فرمایا۔ اس کے بعد بھی تیری ماں۔ اُس نے چوتھی دفعہ کہا یا رسول اللہ اس کے بعد، تو آپؐ نے فرمایا۔ پھر تیرا باپ پھر جو اس کے رشتہ دار ہوں پھر جو ان کے بعد رشتہ دار ہوں (بخاری و مسلم)

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بزرگ تو آپؐ کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے، بیویوں کے بزرگ موجود تھے۔ اور آپؐ ہمیشہ اُن کا ادب کرتے تھے۔ جب فتح مکّہ کے موقعہ پر آپؐ ایک فاتح جرنیل کے طور پر مکّہ میں داخل ہُوئے، تو حضرت ابو بکرؓ اپنے باپ کو آپؐ کی ملاقات کے لیے لائے۔ اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا۔ آپ نے ان کو کیوں تکلیف دی۔ مَیں خود ان کے پاس حاضر ہوتا۔ (السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۹۹) آپؐ ہمیشہ اپنے صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنے بوڑھے ماں باپ کا زمانہ پائے۔ اور پھر بھی جنت کا مستحق نہ ہو سکے، تو وہ بڑا ہی بدبخت ہے۔ مطلب یہ کہ بوڑھے ماں باپ کی خدمت انسان کو اللہ تعالےٰ کے فضلوں کا اتنا وارث بنا دیتی ہے کہ جس کو اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کا موقعہ مل جائے وہ ضرور نیکی میں مستحکم اور اللہ تعالےٰ کے فضلوں کا مستحق ہو جاتا ہے (مسلم)

ایک شخص نے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ میرے رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں اُن سے نیک سلوک کرتا ہوں۔ اور وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ مَیں ان سے احسان کرتا ہوں اور وہ مجھ پر ظلم کرتے ہیں۔ مَیں اُن کے ساتھ محبت سے پیش آتا ہوں۔ وہ مجھ سے ترش روئی سے پیش آتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر یہ بات ہے تو پھر تو تمہاری خوش قسمتی ہے کیونکہ خدا تعالےٰ کی مدد تمہیں ہمیشہ حاصل رہے گی۔ (مسلم کتاب البر والصلۃ)

ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم صدقہ و خیرات کی نصیحت فرما رہے تھے تو آپؐ کے ایک صحابی ابو طلحہؓ انصاری آئے اور انہوں نے اپنا ایک باغ صدقہ کے طور پر وقف کر دیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا بہت عمدہ صدقہ ہے بہت اچھا صدقہ ہے۔ بہت اچھا صدقہ ہے۔ پھر فرمایا۔ لو اب تو تم اسے وقف کر چکے۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ تم اس کو اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دو۔ (بخاری کتاب التفسیر)

ایک دفعہ ایک شخص آپؐ کے پاس آیا اور اُس نے کہا۔ یارسول اللہ مَیں آپؐ سے ہجرت کی بیعت کرتا ہوں اور مَیں آپؐ سے خدا کے رستہ میں جہاد کرنے کی بیعت کرتا ہوں۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں، میرا خدا مجھ سے خوش ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اُس نے کہا دونوں زندہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم چاہتے ہو کہ خدا تم سے راضی ہو جائے! اس نے کہا ہاں یارسول اللہ آپؐ نے فرمایا پھر بہتر یہ ہے کہ واپس جاؤ اور اپنے والدین کی خدمت کرو اور خوب خدمت کرو۔ (بخاری و مسلم)

آپؐ ہمیشہ اس بات کی نصیحت کیا کرتے تھے کہ حُسنِ سلوک میں مذہب کی کوئی شرط نہیں۔ غریب رشتہ دار خواہ کسی مذہب کے ہوں۔ ان سے حُسنِ سلوک کرنا نیکی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی مشرکہ تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی اسماءؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ کیا میں اس سے حُسنِ سلوک کر سکتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ضرور وہ تیری ماں ہے، تو اس سے حُسنِ سلوک کر۔ (بخاری کتاب الادب)

رشتہ دار تو الگ رہے آپؐ اپنے رشتہ داروں کے رشتہ داروں اور اُن کے دوستوں تک کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ جب کبھی آپؐ قربانی کرتے تو آپؐ حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کی طرف ضرور گوشت بھجواتے اور ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ خدیجہؓ کی سہیلیوں کو نہ بھُولنا۔ اُن کی طرف گوشت ضرور بھجوانا۔ (بخاری و مسلم)

ایک دفعہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے کئی سال بعد آپؐ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہؓ آپؐ سے ملنے آئیں اور دروازہ پر کھڑے ہو کر کہا "کیا میں اندر آ سکتی ہوں"؟ ہالہؓ کی آواز میں اُس وقت اپنی مرحومہ بہن حضرت خدیجہؓ سے بے انتہا مشابہت پیدا ہو گئی۔ اس آواز کے کان میں پڑتے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر کپکپی آگئی پھر آپؐ سنبھل گئے اور فرمایا آہ میرے خدا یہ تو خدیجہؓ کی بہن ہالہؓ ہیں (بخاری و مسلم) درحقیقت سچی محبت کا اصول ہی یہی ہے کہ جس سے پیار ہو اور جس کا ادب ہو۔ اُس کے قریبیوں اور اس کے ساتھ تعلّق رکھنے والوں سے بھی محبت اور پیار پیدا ہو جاتا ہے۔

انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں ایکدفعہ سفر پر تھا جریرؓ بن عبداللہؓ ایک دوسرے صحابی بھی اس سفر میں ساتھ تھے وہ سفر میں نوکروں کی طرح میرے کام کیا کرتے تھے۔ جریرؓ بڑے تھے اور اُن کا ادب حضرت انسؓ اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ میں انہیں منع کرتا تھا کہ ایسا نہ کریں۔ میرے ایسا کہنے پر جریرؓ جواب میں کہتے تھے مَیں نے انصار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہا خدمت کرتے ہوئے دیکھا ہے مَیں نے اُن کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ محبت دیکھ کر اپنے دل سے عہد کیا تھا کہ جب کبھی مجھے کسی انصاری کے ساتھ سفر کرنے کا موقعہ ملیگا یا اس کے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا تو میں اُسکی خدمت کرونگا۔ اس لیے آپ مجھے نہ روکیں میں اپنی قسم پوری کر رہا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

اس واقعہ سے بالوضاحت یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اپنے محبوب کی خدمت کرنیوالا بھی انسان کا محبوب ہو جاتا ہے پس جن لوگوں کے دلوں میں اپنے ماں باپ کا سچا ادب اور احترام ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ کے علاوہ اُن کے رشتہ داروں اور دوستوں کا بھی ادب کرتے ہیں۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اقارب کی خدمت کا ذکر تھا تو آپؐ نے فرمایا بہترین نیکی یہ ہے کہ انسان اپنے باپ کی دوستیوں کا

بھی خیال رکھے۔ یہ بات آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہی تھی اور اس پر انہوں نے ایسا عمل کیا کہ ایک دفعہ وہ حج کے لیے جا رہے تھے کہ رستہ میں ایک شخص اُن کو نظر آیا۔ آپ نے اپنی سواری کا گدھا اس کو دے دیا اور اپنے سر کا خوبصورت عمامہ بھی اُس کو عطا کر دیا۔ اُن کے ساتھیوں نے اُنہیں کہا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا ہے یہ تو اعرابی لوگ ہیں۔ بہت تھوڑی سی چیز ان کو دے دی جائے تو خوش ہو جاتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا۔ اِس شخص کا باپ حضرت عمرؓ کا دوست تھا۔ اور مَیں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپؐ فرماتے تھے نیکی کا اعلیٰ درجے کا مظاہرہ یہ ہے کہ انسان اپنے باپ کے دوستوں کا بھی خیال رکھے۔ (مسلم)

نیک صحبت

آپ ہمیشہ اپنے اِردگرد نیک لوگوں کے رہنے کو پسند کرتے تھے اور اگر کسی میں کمزوری ہوتی تھی، تو اُسے عمدگی کے ساتھ اور پردہ پوشی کے ساتھ نصیحت فرماتے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ نیک دوست اور نیک مجلسی اور بد دوست اور بد مجلسی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص مشک اُٹھائے پھر رہا ہو، مشک اُٹھانے والا اُس کو کھائے گا۔ تب فائدہ اٹھائے گا اور رکھ چھوڑے گا تب بھی خوشبو حاصل کرے گا۔ اور جس کے ہم مجلس بد ہوں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بھٹی کی آگ میں پھونکیں مارتا ہے۔ وہ اتنی ہی امید رکھ سکتا ہے کہ کوئی چنگاری اُڑ کر اُس کے کپڑوں کو جلا دے یا کوئلوں کی بدبُو سے اُس کا دماغ خراب ہو جائے۔

آپؐ اپنے صحابہؓ کو بار بار فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے اخلاق ویسے ہی ہو جاتے ہیں جیسی مجلس میں وہ بیٹھتا ہے۔ اس لیے نیک صحبت اختیار کیا کرو۔ (بخاری و مسلم)

لوگوں کے ایمان کی حفاظت کا خیال

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے کہ کسی شخص کو ٹھوکر نہ لگے۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے کہ آپؐ کی ایک بیوی صفیہؓ بنت حیی آپؐ سے ملنے آئیں۔ باتیں کرتے کرتے دیر ہوگئی، تو آپؐ نے مناسب سمجھا کہ اُن کو گھر تک پہنچا آئیں۔ جب آپؐ اُن کو گھر چھوڑنے کے لیے جا رہے تھے تو راستہ میں دو شخص ملے، جن کے متعلق آپؐ کو شبہ تھا کہ شاید اُن کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی عورت کے ساتھ رات کے وقت کہاں جا رہے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو ٹھہرالیا اور فرمایا۔ دیکھو یہ میری بیوی صفیہؓ ہیں۔ اُنہوں نے کہا یا رسول اللہ ہمیں آپؐ پر بدظنی کا خیال پیدا ہی کس طرح ہو سکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ شیطان انسان کے خون میں پھرتا ہے میں ڈرا کہ تمہارے ایمان کو ضعف نہ پہنچ جائے۔ (بخاری ابواب الاعتکاف)

دوسروں کے عیوب چھپانا

آپؐ کی نظر میں اگر کسی کا عیب آجاتا تو آپ اُسے چھپاتے تھے اور اگر کوئی اپنا عیب ظاہر کرتا تھا تو اُس کو بھی عیب ظاہر کرنے سے منع فرماتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ جو بندہ کسی دوسرے بندے کا گناہ دنیا میں چھپاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ قیامت کے دن چھپائے گا۔ (مسلم)

آپؐ یہ بھی فرماتے تھے کہ میری اُمت میں سے ہر شخص کا گناہ مٹ سکتا ہے (یعنی توبہ سے) مگر جو اپنے گناہوں کا آپ اظہار کرتے پھریں ان کا کوئی علاج نہیں۔ پھر فرماتے کہ آپ اظہار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص رات کے وقت گناہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر پردہ ڈال دیتا ہے مگر صبح کے وقت وہ اپنے دوستوں سے ملتا ہے تو کہتا ہے اے فلانے میں نے رات کو یہ کام کیا تھا، اے فلانے مَیں نے رات کو یہ کام کیا تھا۔ رات کو خدا اُس کے گناہ پر پردہ ڈال رہا تھا صبح یہ اپنے گناہ کو آپ ننگا کرتا ہے (بخاری ومسلم)

بعض لوگ نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ کا اظہار توبہ پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گناہ کا اظہار توبہ پیدا نہیں کرتا، گناہ کا اظہار بے حیائی پیدا کرتا ہے۔ گناہ بہرحال بُرا ہے مگر جو لوگ گناہ کرتے ہیں اور اُن کے دل میں شرم اور ندامت محسوس ہوتی ہے اُن کیلئے توبہ کا راستہ کھُلا رہتا ہے اور تقویٰ اُن کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی نیک موقع ایسا آجاتا ہے کہ تقویٰ غالب آجاتا ہے اور گناہ بھاگ جاتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے گناہوں کو پھیلاتے اور ان پر فخر کرتے ہیں ان کے دل سے احساس گناہ بھی مٹ جاتا ہے اور جب احساسِ گناہ بھی مٹ جائے تو پھر توبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہُوا اور اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ میں نے زنا کیا ہے زنا اسلام میں تعزیری جرائم میں سے ہے یعنی اسلامی شریعت جہاں جاری ہو وہاں ایسے شخص کو جس کا زنا اسلامی اصول کے مطابق ثابت ہو جائے جسمانی سزا دیجاتی ہے۔ جب اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ مَیں نے زنا کیا ہے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور دوسری طرف باتوں میں مشغول ہو گئے۔ درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُسکو یہ بتا رہے تھے کہ جس گناہ پر خدا نے پردہ ڈالدیا ہے اس کا علاج توبہ ہے اُس کا علاج اعلان نہیں۔ مگر اُس نے اس بات کو نہ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ شاید رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے میری بات کو سُنا نہیں اور جس طرف آپؐ کا منہ تھا اُدھر کھڑا ہو گیا اور پھر اُس نے کہا یا رسول اللہ مَیں نے زنا کیا ہے۔ پھر آپؐ نے دوسری طرف منہ کر لیا۔ پھر بھی وہ نہیں سمجھا۔ اور دوسری طرف آکر اُس نے پھر اپنی بات کو دُہرایا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر اُسکی طرف توجہ نہ کی اور دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ پھر وہ شخص اُس طرف آکھڑا ہُوا جس طرف آپؐ کا منہ تھا اور پھر اُس نے چوتھی دفعہ اس بات کو دُہرایا۔ تب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَیں تو چاہتا تھا کہ یہ اپنے گناہ کی تشہیر نہ کرے جب تک خدا اس کی گرفت کا فیصلہ نہیں کرتا مگر اُس نے چار دفعہ اپنے نفس پر خود ہی گواہی دی ہے اس لیے اب میں مجبور ہوں (ترمذی ابواب الحدود) پھر فرمایا اس شخص نے اپنے آپ پر الزام لگایا ہے۔ اُس عورت نے الزام نہیں لگایا۔ جس عورت کے متعلق یہ زنا کا دعوٰے کرتا ہے اُس عورت سے پوچھو۔ اگر وہ انکار کرے تو اُسے کچھ مت کہو۔

اور صرف اِس کو اس کے اپنے اقرار کے مطابق سزا دو۔ لیکن اگر وہ عورت بھی اقرار کرے تو پھر اُسے بھی سزا دو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تھا کہ جن امور کے متعلق قرآنی تعلیم نازل نہ ہو چکی ہوتی تھی اُن میں آپ تورات کی تعلیم پر عمل کر لیتے تھے۔ تورات کے حکم کے مطابق زانی کے لیے سنگساری کا حکم ہے۔ چنانچہ آپؐ نے بھی اُس شخص کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا۔ جب لوگ اُس پر پتھر پھینکنے لگے تو اُس نے بھاگنا چاہا، لیکن لوگوں نے دوڑ کر اُس کا تعاقب کیا اور تورات کی تعلیم کے مطابق اُسے قتل کر دیا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہُوا تو آپؐ نے اس کو ناپسند فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا اُس کو سزا اُس کے اقرار کے مطابق دی گئی۔ جب وہ بھاگا تھا تو اُس نے اپنا اقرار واپس لے لیا تھا اس لیے تمہارا کوئی حق نہ تھا کہ اُس کے بعد اُس کو سنگسار کرتے اُس کو چھوڑ دینا چاہیئے تھا۔

آپؐ ہمیشہ حکم دیتے تھے کہ شریعت کا نفاذ ظاہر پر ہونا چاہیئے۔ ایک دفعہ ایک جنگ پر کچھ صحابہؓ گئے ہوئے تھے۔ راستہ میں ایک مشرک اُنہیں ایسا ملا جو اِدھر اُدھر جنگل میں چھپا پھرتا تھا۔ اور جب کبھی اُسے کوئی اکیلا مسلمان مل جاتا تو اس پر حملہ کر کے وہ اُسے مار ڈالتا۔ اسامہ بن زیدؓ نے اس کا تعاقب کیا۔ اور ایک موقعہ پر جا کر اُسے پکڑ لیا اور اسے مارنے کے لیے تلوار اٹھائی جب اُس نے دیکھا کہ اب مَیں قابو آگیا ہوں، تو اس نے کہا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ جس سے اُس کا مطلب یہ تھا کہ مَیں مسلمان ہوتا ہوں مگر اسامہؓ نے اُس کے اس قول کی پروا نہ کی اور اُسے مار ڈالا۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس لڑائی کی خبر دینے کے لیے ایک شخص مدینہ پہنچا تو اس نے لڑائی کے سب احوال بیان کرتے کرتے یہ واقعہ بھی بیان کیا۔ اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسامہؓ کو بلوایا اور اُن سے پوچھا کہ کیا تم نے اُس آدمی کو مار دیا تھا انہوں نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا قیامت کے دن کیا کرو گے جب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تمہارے خلاف گواہی دیگا۔ یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال کیا جائے گا کہ جب اُس شخص نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہا تھا تو پھر تم نے کیوں مارا؟ گو وہ قاتل تھا، مگر توبہ کر چکا تھا حضرت اسامہؓ نے کئی دفعہ جواب میں کہا کہ یا رسول اللہ وہ تو ڈر کے مارے ایمان ظاہر کر رہا تھا اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے اُس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؟ اور پھر بار بار یہی کہتے چلے گئے کہ تم قیامت کے دن کیا جواب دو گے جب اس کا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تمہارے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اسامہؓ کہتے ہیں اُس وقت میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں آج ہی اسلام لایا ہوتا اور یہ حرکت مجھ سے سرزد نہ ہوئی ہوتی۔ (مسلم)

گناہوں کی معافی کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اتنا احساس تھا کہ جب کچھ لوگوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت عائشہؓ پر اتہام لگایا اور اُن اتہام لگانے والوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جسکو حضرت ابوبکرؓ پال رہے تھے۔ جب یہ الزام جھوٹا ثابت ہُوا حضرت ابوبکرؓ نے غصّہ میں اُس شخص کی پرورش بند کر دی جس نے آپکی بیٹی پر الزام لگایا تھا۔ دنیا کا کونسا شخص اُسکے سوا کوئی اور فیصلہ کر سکتا تھا بہت سے لوگ تو ایسے آدمی کو قتل کر دیتے ہیں مگر حضرت ابوبکرؓ نے صرف اتنا کیا کہ اُس شخص کی آیندہ پرورش بند کر دی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہُوا۔ تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو سمجھایا۔ اور فرمایا کہ اس شخص

سے غلطی ہوئی اور اس نے گناہ کیا مگر آپ کی شان اس سے بالا ہے کہ ایک بندے کے گناہ کی وجہ سے اُس کو اس کے رزق سے محروم کردیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت پھر اُس کی پرورش کرنے لگ گئے (بخاری کتاب التفسیر)

صبر

آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ مومن کے لیے تو دنیا میں بھلائی ہی بھلائی ہے اور سوائے مومن کے یہ مقام کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اگر اُسے کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اللہ تعالےٰ کے انعام کا مستحق ہوجاتا ہے اور اگر اُسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور اس طرح بھی خدا تعالےٰ کے انعام کا مستحق ہوجاتا ہے (مسلم)

جب آپؐ کی وفات کا وقت آیا اور آپؐ بیماری کی تکلیف کی وجہ سے کراہ رہے تھے تو آپؐ کی بیٹی فاطمہؓ نے ایک دفعہ بیتاب ہوکر کہا۔ آہ! مجھ سے اپنے باپ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو فرمایا صبر کرو آج کے بعد تمہارے باپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ (بخاری) یعنی میری تکالیف اس دنیا کی زندگی تک محدود ہیں۔ آج میں اپنے رب کے پاس چلا جاؤں گا جس کے بعد میرے لیئے تکلیف کی کوئی گھڑی نہیں آئے گی۔

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ آپ ہمیشہ وبائی بیماریوں میں ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھاگ جانا ناپسند فرماتے تھے کیونکہ اس طرح ایک علاقہ کی بیماری دوسرے علاقہ میں پھیل جاتی ہے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے اگر ایسی بیماری کے علاقہ میں کوئی شخص صبر سے بیٹھا رہے اور دوسرے علاقوں میں وبا پھیلانے کا موجب نہ بنے تو اگر اُسے موت آئے گی تو وہ شہید ہوگا۔ (بخاری کتاب الطب)

تعاون باہمی

آپؐ ہمیشہ اپنے صحابہؓ کو اس بات کو نصیحت فرماتے تھے کہ آپس میں تعاون کے ساتھ کام کیا کرو۔ چنانچہ اپنی جماعت کے لوگوں کے لیے آپؐ نے یہ اصول مقرر کردیا تھا کہ اگر کسی شخص سے کوئی ایسا جُرم سرزد ہوجائے جس کے بدلہ میں اُسے کوئی رقم ادا کرنی پڑے اور وہ اس کی طاقت سے باہر ہو تو اُس کے محلہ والے یا شہر والے یا قوم والے مل کر اس کا بدلہ ادا کریں۔

بعض لوگ جو دین کی خدمت کیلئے آپؐ کے پاس آیا جایا کرتے تھے، آپؐ اُن کے رشتہ داروں کو نصیحت کرتے تھے کہ انکا بوجھ برداشت کریں اور ان کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو بھائی مسلمان ہوئے ایک بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے لگا اور دوسرا اپنے کام کاج میں مشغول رہا۔ کام کرنیوالے بھائی نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے بھائی کی شکایت کی کہ یہ نکمّا بیٹھا رہتا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ آپؐ نے فرمایا ایسا مت کہو۔ خدا تعالیٰ اسی کے ذریعہ سے تمہیں رزق دیتا ہے اس لیے اس کی خدمت کرو اور اسکو دین کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ (ترمذی)

ایک دفعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سفر پر جارہے تھے کہ رستہ میں ایک منزل پر پہنچ کر ڈیرے لگائے گئے اور صحابہؓ میدان میں پھیل گئے تاکہ خیمے لگائیں اور دوسرے کام جو کیمپ لگانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں

بجا لائیں۔ انہوں نے سب کام آپس میں تقسیم کر لیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کوئی کام نہ لگایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے میرے ذمہ کوئی کام نہیں لگایا میں لکڑیاں چنوں گا تاکہ ان سے کھانا پکایا جا سکے۔ صحابہؓ نے کہا، یا رسول اللہ ہم جو کام کرنے والے موجود ہیں آپ کو کیا ضرورت ہے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں نہیں میرا بھی فرض ہے کہ کام میں حصہ لوں۔ چنانچہ آپؐ نے جنگل میں سے لکڑیاں جمع کیں تاکہ صحابہ ان سے کھانا پکا سکیں۔ (زرقانی جلد ۴ صفحہ ۳۰۶)

چشم پوشی

آپؐ ہمیشہ اس بات کی نصیحت کرتے رہتے تھے کہ خواہ مخواہ دوسروں کے کاموں پر اعتراض نہ کیا کرو۔ اور ایسے معاملات میں دخل نہ دیا کرو جو تمہارے ساتھ تعلق نہیں رکھتے۔ کیونکہ اس طرح فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے اسلام کا بہترین نمونہ یہ ہے کہ جس معاملہ کا اس سے براہِ راست کوئی تعلق نہ ہو اُس میں خواہ مخواہ دخل اندازی نہ کیا کرے۔ آپکا یہ خلق ایسا ہے کہ جسکی نگہداشت کر کے دنیا میں امن قائم کیا جا سکتا ہے۔ ہزاروں ہزار خرابیاں دنیا میں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ مصیبت زدہ کی مدد کرنے کیلئے تو تیار نہیں ہوتے مگر خواہ مخواہ لوگوں کے معاملات پر اعتراض کرنیکے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

سچ

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذاتی مقام تو سچ کے متعلق اتنا بالا تھا کہ آپؐ کی قوم نے آپؐ کا نام ہی صدیق رکھ دیا تھا۔ آپؐ اپنی جماعت کو بھی سچ پر قائم رہنے کی ہمیشہ نصیحت فرماتے تھے اور ایسے درجہ کے سچ کے مقام پر کھڑا کرنے کی کوشش فرماتے تھے جو ہر قسم کے جھوٹ کے شائبوں سے پاک ہو۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ سچ ہی نیکی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور نیکی ہی انسان کو جنت دلاتی ہے اور سچ کا اصل مقام یہ ہے کہ انسان سچ بولتا چلا جاتے۔ یہاں تک کہ خدا کے حضور بھی وہ سچا سمجھا جائے۔ (بخاری و مسلم)

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص قید ہو کر آیا جو بہت سے مسلمانوں کے قتل کا موجب ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ سمجھتے تھے کہ یہ شخص واجب القتل ہے اور وہ بار بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کی طرف دیکھتے تھے کہ اگر آپؐ اشارہ کریں تو اُسے قتل کر دیں۔ جب وہ شخص اٹھ کر چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ یہ شخص تو واجب القتل تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ واجب القتل تھا تو تم نے اُسے قتل کیوں نہ کیا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ آپ اگر آنکھ سے اشارہ کر دیتے تو میں ایسا کر دیتا۔ آپ نے فرمایا نبی دھوکے باز نہیں ہوتا۔ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ میں منہ سے تو اس سے پیار کی باتیں کر رہا ہوتا اور آنکھ سے اُسے قتل کرنے کا اشارہ کرتا۔ (سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۱۷)

ایکدفعہ ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا یا رسول اللہ مجھ میں تین عیب ہیں۔ جھوٹ، شراب خوری اور زنا۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ یہ عیب کسی طرح مجھ سے دور ہو جائیں مگر میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ آپ کوئی علاج بتائیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک گناہ چھوڑنے کا تم مجھ سے وعدہ کرو۔ دو میں چھڑا دونگا۔ اُس نے کہا میں وعدہ کرتا ہوں

فرمائیے کونسا گناہ چھوڑ دوں۔ آپؐ نے فرمایا جھوٹ چھوڑ دو۔ کچھ دنوں کے بعد وہ آیا۔ اور اُس نے کہا آپکی ہدایت پر مَیں نے عمل کیا اور میرے سارے ہی گناہ چھُٹ گئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا بتاؤ کیا گذری؟ اُس نے کہا میرے دل میں ایک دن شراب کا خیال آیا مَیں شراب پینے کے اُٹھا تو مجھے خیال آیا کہ اگر میرے دوست مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے شراب پی ہے تو پہلے مَیں جھوٹ بول دیا کرتا تھا اور کہہ دیا کرتا تھا کہ نہیں پی۔ مگر اب مَیں نے سچ بولنے کا اقرار کیا ہے۔ اگر مَیں نے کہا کہ شراب پی ہے تو میرے دوست مجھ سے چھُٹ جائینگے۔ اور اگر کہوں گا کہ نہیں پی، تو جھوٹ کا ارتکاب کروں گا جس سے بچنے کا مَیں نے اقرار کیا ہے۔ چنانچہ مَیں نے دل میں کہا کہ اس وقت نہیں پیتے پھر پئیں گے۔ اسی طرح میرے دل میں زنا کا خیال پیدا ہُوا۔ اور اس کے متعلق بھی میری اپنے دل سے یہی باتیں ہوئیں کہ اگر میرے دوست مجھ سے پوچھیں گے تو مَیں کیا کہوں گا۔ اگر یہ کہوں گا کہ مَیں نے زنا کیا ہے تو میرے دوست مجھ سے چھُٹ جائیں گے اور اگر یہ کہونگا کہ نہیں کیا تو جھوٹ بولوں گا اور جھوٹ سے بچنے کا مَیں اقرار کر چکا ہوں۔ اسی طرح میرے اور میرے دل کے درمیان کئی دن تک یہ بحث ومباحثہ جاری رہا۔ آخر کچھ مدّت تک ان دونوں عیبوں سے بچنے کی وجہ سے میرے دل سے اِن کی رغبت بھی مٹ گئی۔ اور سچ کے قبول کرنے کی وجہ سے مَیں باقی عیبوں سے بھی محفوظ ہو گیا۔

تجسّس کی ممانعت اور نیک ظنی کا حکم

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تجسّس سے منع فرماتے تھے اور ایک دوسرے پر نیک ظنی کا حکم دیتے رہتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں آپؐ فرمایا کرتے تھے بدظنّی سے بچو۔ کیونکہ بدظنّی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور تجسّس نہ کرو اور لوگوں کے حقارت سے اور نام نہ رکھا کرو اور حسد نہ کیا کرو اور آپس میں بغض نہ رکھا کرو۔ اور سب کے سب اپنے آپکو خدا تعالیٰ کے بندے سمجھو اور اپنے آپکو بھائی بھائی سمجھو جس طرح خدا تعالیٰ کا حکم ہے۔ پھر فرماتے یاد رکھو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اُس پر ظلم کرتا ہے نہ مصیبت کے وقت اس کا ساتھ چھوڑتا ہے نہ مال یا علم یا کسی اور چیز کی کمی کی وجہ سے اسکو حقیر سمجھتا ہے۔ تقویٰ انسان کے دل سے پیدا ہوتا ہے اور انسان کو گندہ کر دینے کیلئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو حقیر سمجھے اور ہر مسلمان پر اسکے دوسرے مسلمان بھائی کے خون اور اسکی عزّت اور اُسکے مال پر حملہ کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ جسموں کو نہیں دیکھا کرتا نہ صورتوں کو دیکھتا ہے نہ تمہارے اعمال کی ظاہری حالت کو دیکھتا ہے بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ (مسلم کتاب البر والصلۃ)

سودا سلف کے متعلق دھوکا بازی اور فریب سے نفرت

آپؐ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ مسلمانوں میں دھوکا اور فریب کی کوئی بات نہ پائی جائے۔ ایک دفعہ آپؐ بازار میں سے گذر رہے تھے کہ آپؐ نے غلّہ کا ایک ڈھیر دیکھا جو نیلام ہو رہا تھا۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ غلّہ کے ڈھیر میں ڈالا تو معلوم ہوا کہ باہر کی طرف سے تو غلّہ سوکھا ہُوا ہے مگر اندر کی طرف سے گیلا ہے۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ نکال کر غلّہ والے سے کہا کہ یہ کیا بات ہے۔ اس نے کہا۔ یا رسول اللہ بارش کا چھینٹا آ گیا تھا۔

جس سے غلّہ گیلا ہوگیا۔ آپؐ نے فرمایا ٹھیک ہے مگر تم نے گیلا حصّہ باہر کیوں نہ رکھا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جاتا۔ پھر فرمایا جو شخص دوسرے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے وہ جماعت کا مفید وجود نہیں ہو سکتا۔ (مسلم) آپؐ بڑی تاکید سے فرماتے تھے کہ تجارت میں بالکل دھوکا نہیں ہونا چاہیئے اور بغیر دیکھے کے کوئی چیز نہیں لینی چاہیئے۔ اور سودے پر سودا نہیں کرنا چاہیئے اور سامان کو اس لیے روک نہیں رکھنا چاہیئے کہ جب اس کی قیمت بڑھ جائے گی تو اس کو فروخت کریں گے۔ بلکہ حاجتمندوں کو ساتھ کے ساتھ چیزیں دیتے رہنا چاہیئے۔

مایوسی

آپؐ مایوسی کی روح کے سخت خلاف تھے۔ فرماتے تھے جو شخص قوم میں مایوسی کی باتیں کرتا ہے وہ قوم کی ہلاکت کا ذمّہ دار ہوتا ہے کیونکہ بعض ایسی باتوں کے پھیلنے سے قوم کی ہمّت ٹوٹ جاتی ہے اور پستی کی طرف مائل ہونا شروع ہو جاتی ہے جس طرح فخر اور کبر سے آپؐ روکتے تھے کہ یہ چیزیں بھی درحقیقت قوم کو پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ آپؐ کا حکم تھا کہ ان دونوں کے درمیان رستہ ہونا چاہیئے نہ انسان فخر اور کبر کا رستہ اختیار کرے نہ مایوسی اور ناامیدی کا رستہ اختیار کرے۔ بلکہ کام کرے۔ مگر نتیجہ کی امید خدا تعالیٰ پر ہی رکھے۔ اپنی جماعت کی ترقی کی خواہش اُس کے دل میں ہو مگر فخر اور کبر پیدا نہ ہو۔

جانوروں سے حسنِ سلوک

آپؐ جانوروں تک پر ظلم کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے بنی اسرائیل میں ایک عورت کو اس لیے عذاب ملا کہ اس نے اپنی بلّی کو بھوکا مار دیا تھا۔ اسی طرح فرماتے تھے پہلی اُمّتوں میں سے ایک شخص اس لیے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسا کتا دیکھا پاس ایک گہرا گڑھا تھا جس میں سے کتّا پانی نہیں پی سکتا تھا۔ اُس آدمی نے اپنا بوٹ پاؤں سے کھولا اور گڑھے میں اُس بوٹ کو لٹکا کر اُسکے ذریعہ پانی نکالا اور کتّے کو پلا دیا۔ اس نیکی کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اُس کے تمام گزشتہ گناہوں کو بخش دیا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں ایکدفعہ ہم آپؐ کے ساتھ سفر پر تھے کہ ہم نے ایک فاختہ کے ۲ دو بچے دیکھے بچے ابھی چھوٹے تھے ہم نے وہ بچّے پکڑ لیے جب فاختہ واپس آئی تو وہ چاروں طرف گھبرا کر اڑنے لگی اتنے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس مجلس میں تشریف لے آئے اور آپؐ نے فرمایا۔ اس جانور کو اسکے بچّوں کی وجہ سے کس نے تکلیف دی ہے فوراً اسکے بچّوں کو چھوڑ دو تا کہ اس کی دلجوئی ہو جائے۔ (ابوداؤد) اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں ایک دفعہ ہم نے چیونٹیوں کا ایک غار دیکھا اور ہم نے پھونس ڈال کر اُسے جلا دیا۔ اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے ایسا کیوں کیا ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔

ایک دفعہ آپؐ نے دیکھا کہ ایک گدھے کے مُنہ پر نشان لگایا جا رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ایسا نشان کیوں لگا رہے ہو؟ لوگوں نے کہا کہ رُومی لوگوں میں اعلےٰ گدھوں کی پہچان کیلئے نشان لگایا جاتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ایسا مت کیا کرو مُنہ جسم کا نازک حصّہ ہے۔ اگر نشان لگانا ہی پڑے تو جانور کی پیٹھ پر نشان لگایا کرو (ابوداؤد و ترمذی)

چنانچہ اُسی وقت سے مسلمان جانور کی پیٹھ پر نشان لگاتے ہیں اور اب اُن کی دیکھا دیکھی یورپ والے

بھی پیٹھ پر ہی نشان لگاتے ہیں۔

مذہبی رواداری

آپ مذہبی رواداری پر نہایت زور دیتے تھے اور خود بھی اعلیٰ درجہ کا نمونہ اس بارہ میں دکھاتے تھے۔ یمن کا ایک عیسائی قبیلہ آپؐ سے مذہبی تبادلۂ خیال کرنے کے لیے آیا جس میں اُن کے بڑے بڑے پادری بھی تھے۔ مسجد میں بیٹھ کر گفتگو شروع ہوئی اور گفتگو لمبی ہو گئی۔ اس پر اس قافلہ کے پادری نے کہا، اب ہماری نماز کا وقت ہے ہم باہر جا کر اپنی نماز ادا کر آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا باہر جانے کی کیا ضرورت ہے ہماری مسجد میں ہی اپنی نماز ادا کر لیں۔ آخر ہماری مسجد خدا کے ذکر ہی کے لیے بنائی گئی ہے (زرقانی)

بہادری

آپؐ کی بہادری کے کئی واقعات آپکی سوانح میں بیان ہو چکے ہیں۔ ایک واقعہ اس جگہ بھی لکھ دیتا ہوں جب مدینہ میں یہ خبریں مشہور ہونی شروع ہوئیں کہ روما کی حکومت ایک بڑا لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے بھجوا رہی ہے تو مسلمان خاص طور پر راتوں کو احتیاط کرتے اور جاگتے رہتے ایک دفعہ باہر جنگل کی طرف سے شور کی آواز آئی صحابہ جلدی جلدی اپنے گھروں سے نکلے کچھ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اور کچھ مسجد میں آکر جمع ہو گئے اور اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلیں تو آپؐ کے حکم پر عمل کریں اور اگر خطرہ ہو تو اس کو دُور کریں۔ جب وہ لوگ اس انتظار میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے نکلیں تو انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اکیلے گھوڑے پر سوار باہر سے تشریف لا رہے ہیں معلوم ہوا کہ شور کی پہلی آواز پر ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل میں اس بات کے دیکھنے کے لیے چلے گئے تھے کہ کوئی خطرہ کی بات تو نہیں اور آپؐ نے اس بات کا انتظار نہ کیا کہ صحابہؓ جمع ہو جائیں تو ان کے ساتھ ملکر باہر جائیں بلکہ اکیلے ہی باہر گئے اور حقیقت حال سے آگاہ ہو کر واپس آئے اور صحابہ کو تسلی دی کہ خطرہ کی کوئی بات نہیں تم آرام سے اپنے گھروں میں جا کر سو رہو۔ (بخاری باب الشجاعت فی الحرب)

کم عقلوں کے ساتھ محبت کا سلوک

کم عقلوں کے ساتھ آپؐ نہایت ہی محبت اور شفقت کا سلوک کرتے تھے۔ ایکدفعہ ایک اعرابی نیا نیا اسلام لایا اور آپکی مسجد میں بیٹھے بیٹھے اسے پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی وہ اُٹھ کر مسجد کے ایک کونہ میں ہی پیشاب کرنے لگا صحابہؓ اسکو منع کرنے لگے تو آپؐ نے انہیں روک دیا اور فرمایا کہ اِس سے اسکو ضرر پہنچ جائیگا تم ایسا نہ کرو جب یہ پیشاب کر چکے تو یہاں پانی ڈال کر اس جگہ کو دھو دینا (بخاری)

وفائے عہد

وفائے عہد کا آپ کو اس قدر خیال تھا کہ ایک دفعہ ایک حکومت کا ایک ایلچی آپؐ کے پاس کوئی پیغام لے کر آیا اور آپؐ کی صحبت میں کچھ دن رہ کر اسلام کی سچائی کا قائل ہو گیا۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مَیں تو دل سے مسلمان ہو چکا ہوں۔ مَیں اپنے اسلام کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مناسب نہیں تم اپنی حکومت کی طرف سے ایک امتیازی عہدہ پر

مقرر ہو کر آئے ہو۔ اسی حالت میں واپس جاؤ اور وہاں جا کر اگر تمہارے دل میں اسلام کی محبت پھر بھی قائم رہے تو دوبارہ آکر اسلام قبول کرو۔ (ابوداؤد باب الوفاء بالعهد)

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مضمون کوئی ایسا مضمون نہیں جس کو صرف چند صفحوں میں ختم کیا جا سکے یا جس کا صرف چند پہلوؤں سے اندازہ لگایا جائے مگر چونکہ نہ یہ سیرت کی ایک مستقل کتاب ہے اور نہ اس دیباچہ میں لمبی بات کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں اتنے پر ہی اکتفاء کرتا ہوں۔

جمع القرآن

میں تمہید کے شروع میں بیان کر چکا ہوں کہ قرآن کریم سے پہلے کی کوئی الہامی کتاب اپنی اصل صورت میں محفوظ نہیں بلکہ پہلی تمام کتب میں اتنا تصرف ہو چکا ہے کہ یقین کے ساتھ اُن پر عمل کرنا ایک سچے طلبگار کے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم جُوں کا تُوں لفظاً لفظاً اُسی طرح محفوظ ہے جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا۔

قرآن کریم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کے ابتداء سے نازل ہونا شروع ہُوا۔ پہلا الہام قرآن کریم کی چند آیات کا غارِ حرا میں ہُوا اِس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قرآن کریم نازل ہوتا چلا گیا۔ گویا کل عرصۂ نزول ۲۳ سال ہے۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ شروع میں وحی تھوڑی تھوڑی کر کے نازل ہوتی تھی پھر نزول کی رفتار بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں پے در پے اور کثرت سے وحی نازل ہوئی۔ اسکے علاوہ اور حکمتوں کے یہ حکمت بھی تھی کہ اسلام جو مسائل دنیا میں پیش کر رہا تھا وہ بالکل نئے تھے۔ ابتداء میں اُنکا سمجھنا لوگوں کیلئے مشکل تھا اس لیے قرآن کریم ابتداء میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا جب لوگوں کے ذہن میں اسلام کے اصول رچ گئے اور قرآنی مضامین کا سمجھنا اُن کے لیے آسان ہو گیا تو پھر قرآن کریم کا نزول بھی تیز ہو گیا اور وحی جلدی جلدی نازل ہونے لگی اور یہ اس لیے کیا گیا تا سب کے سب مسلمان قرآن کریم کے مضامین کے پوری طرح حافظ ہو جائیں۔ دوسری وجہ اس کی یہ تھی کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا اس وقت آپؐ کے ماننے والے بہت تھوڑے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ قرآن کریم محفوظ رہے اور اس کے متعلق کسی قسم کا شبہ پیدا نہ ہو اس لیے شروع میں قرآن کریم تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہُوا۔ ایسی آہستگی کے ساتھ کہ بعض دفعہ چند آیات نازل ہونے کے بعد کئی مہینے گذر جاتے تھے اور پھر جا کر چند اور نئی آیات نازل ہوتی تھیں۔ اسی طرح اِن سے تھوڑے سے آدمیوں کو پورے طور پر قرآن کریم یاد کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ چند سال میں مسلمانوں کی جماعت بڑھنی شروع ہوئی اور قرآن کریم کی حفاظت زیادہ آسان ہو گئی۔ تب قرآن کریم کا نزول بھی پہلے کی نسبت زیادہ تیزی سے ہونے لگا۔ آخری زمانۂ اسلام میں تو مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی اوپر نکل گئی۔ اُس وقت قرآن کریم کا یاد کرنا بہت زیادہ آسان ہو گیا۔ تب قرآن کریم اور بھی زیادہ جلدی سے اُترنے لگا اس الٰہی تدبیر سے قرآن کریم کی حفاظت قطعی اور یقینی ہو گئی۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم کے بدترین دشمنوں میں سے بھی کوئی ایسا نہیں جو حضرت عثمان کے زمانہ سے لے کر

آج تک ساڑھے تیرہ سو سال کے متعلق یہ شبہ رکھتا ہو کہ اس عرصہ میں قرآن کریم میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں قرآن کریم کی سات کاپیاں کر کے سات ملکوں میں بھیج دی گئی تھیں اور ہر ملک کے لوگ اُن کاپیوں سے نقل کر کے اپنے لیے قرآن کریم کے نسخے تیار کرتے تھے اور لاکھوں آدمی قرآن کریم کو حفظ کرتے تھے۔ پس جو لوگ قرآن کریم کے محفوظ ہونے کے متعلق کسی قسم کا شبہ پیدا کرتے ہیں وہ صرف رسول اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لیکر حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک کے متعلق اعتراض کرتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر جو حصّہ قرآن کا نازل ہوتا تھا آپؐ اس کو حفظ کر لیتے تھے اور ہمیشہ قرآن کریم کو دہراتے رہتے تھے اس طرح آپؐ ساری وحی کے کامل حافظ تھے مگر اسکے علاوہ حفاظت قرآن کے مندرجہ ذیل ذرائع اختیار کیے گئے تھے۔

حفاظت قرآن کے ذرائع

(۱) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ اسی وقت لکھوا دی جاتی تھی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کاتبوں کو قرآن کریم لکھواتے تھے اُن میں سے مندرجہ ذیل پندرہ نام تاریخ سے ثابت ہیں:۔ زیدؓ بن ثابتؓ۔ ابی بن کعبؓ۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرحؓ۔ زبیرؓ بن العوامؓ۔ خالد بن سعید بن العاصؓ۔ اباَن بن سعید بن العاصؓ۔ حنظلہ بن الربیع الاسدیؓ۔ معیقیبؓ بن ابی فاطمہؓ۔ عبداللہ بن ارقم الزہریؓ۔ شرجیل بن حسنہؓ۔ عبداللہ بن رواحہؓ۔ حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۶ باب کاتب وحی رسول اللہ صلے علیہ وسلم) جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف نازل ہوتا تو آپ ان لوگوں میں سے کسی کو بلا کر وحی لکھوا دیتے تھے۔

(۲) کوئی مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ پانچ وقت نماز ادا نہ کرے۔ پانچ وقت کی نمازوں میں یہ فرض ہے کہ قرآن شریف کا کچھ حصّہ پڑھا جائے۔ اس لیے ہر مسلمان کو قرآن شریف کے کچھ ٹکڑے یاد کرنے پڑتے ہیں اگر صحابہؓ میں سے سو سو کو مل کر بھی ایک قرآن یاد ہوتا تب بھی سارے قرآن کے کئی ہزار حفّاظ اُن میں موجود تھے۔

(۳) اسلام کا سارا قانون قرآن میں ہے اُس کی فقہ بھی قرآن میں ہے، اُس کا علم الاخلاق بھی قرآن میں ہے، اُس کا علم العقائد بھی قرآن میں ہے اور اُس کا فلسفۂ تعلیم بھی قرآن میں ہے۔ قوم کی ترقی اور قوم بنانے کے لیے اِن سب چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان سارے امور کے لیے آدمی تیار کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ کے زمانہ میں ہی قاضی بھی مقرر تھے، علم الاحکام کے بیان کرنے والے لوگ بھی موجود تھے، مسائل اعتقادیہ کے بیان کرنے والے لوگ بھی موجود تھے، مفتیان شریعت بھی موجود تھے اور یہ لوگ اپنا کام نہیں کر سکتے تھے جب تک ان کو قرآن حفظ نہ ہو۔ اس لیے ایسے سب لوگوں کو قرآن کریم حفظ کرنا پڑتا تھا۔

(۴) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حفظ قرآن کی فضیلت پر بڑا زور دیتے تھے، یہاں تک کہ آپؐ فرماتے تھے جو شخص قرآن کریم کو حفظ کرے گا۔ قیامت کے دن قرآن اس کو دوزخ میں جانے سے بچائے گا۔ اور اس میں تو کوئی

بھی شبہ نہیں کہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے وہ صحابی دیئے تھے جو ہر ثواب کے لیے جان توڑ کوشش کرتے تھے اس لیے جب آپؐ نے یہ اعلان فرمایا تو کثرت کے ساتھ صحابہؓ نے قرآن شریف کو یاد کرنا شروع کیا حتیٰ کہ ایسے ایسے لوگ بھی قرآن شریف کو حفظ کر سکی کوشش کرتے تھے جن کی زبانیں صاف نہیں تھیں اور جن کے علم بہت کمزور تھے۔ چنانچہ امام احمدؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اُس نے کہا اِنّی اَقْرَاءُ الْقُرْاٰن فلا اجد قلبی یعقل علیہ یا رسول اللہ میں قرآن تو پڑھتا ہوں مگر میرا دل اس کو سمجھتا نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف علمی طبقہ ہی قرآن شریف کو یاد کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا بلکہ عوام الناس بھی قرآن کو حفظ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

اسی طرح مسند احمد حنبل میں ایک اور حدیث انہی راویوں کی روایت سے درج ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے بیٹے کو لے کر آیا اور اس نے کہا یا رسول اللہ میرا بیٹا دن کو قرآن پڑھتا رہتا ہے اور رات کو سوجاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تمہارے لیے ناراضگی کی کونسی وجہ ہے تیرا بیٹا دن کو خدا کا ذکر کرتا ہے۔ اور رات کو بجائے گناہوں میں مشغول ہونے کے آرام سے سو رہتا ہے۔ ان احادیث سے پتہ لگتا ہے کہ حفظِ قرآن کا دستور اتنا عام ہو چکا تھا کہ عامی اور دُور دُور کے علاقوں کے لوگ بھی قرآن شریف کو حفظ کرتے تھے۔

(۵) چونکہ لوگوں میں حفظِ قرآن کریم کا اشتیاق بہت تیز ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھانے والے استادوں کی ایک جماعت مقرر فرمائی تھی جو سارا قرآن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حفظ کر کے آگے لوگوں کو پڑھاتے تھے۔ یہ چار چوٹی کے استاد تھے جن کا کام یہ تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن شریف پڑھیں اور لوگوں کو قرآن پڑھائیں۔ پھر اُنکے ماتحت اور بہت سے صحابہؓ ایسے تھے جو لوگوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے ان چار بڑے استادوں کے نام یہ ہیں:۔ (۱) عبداللہ بن مسعودؓ (۲) سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ (۳) معاذ ابن جبلؓ (۴) ابی ابن کعبؓ (نجاری) ان میں سے پہلے دو مہاجر ہیں اور دوسرے دو انصاری۔ کاموں کے لحاظ سے عبداللہ بن مسعودؓ ایک مزدور تھے۔ سالم ایک آزاد شدہ غلام تھے۔ معاذ بن جبلؓ اور ابی ابن کعبؓ مدینہ کے رؤسا میں سے تھے۔ گویا ہر گروہ میں سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمام گروہوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قاری مقرر کر دیئے تھے۔ حدیث میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے خذوا القراٰن من اربعۃ عبداللہ بن مسعودؓ و سالمؓ و معاذ بن جبلؓ و ابی ابن کعبؓ۔ جن لوگوں نے قرآن پڑھنا ہو وہ ان چار سے قرآن پڑھیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ سالمؓ معاذ بن جبلؓ اور ابی ابن کعبؓ۔ یہ چار تو وہ تھے جنہوں نے سارا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ سے سیکھا یا آپ کو سُنا کر اس کی تصیح کرالی لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سے صحابہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست بھی کچھ نہ کچھ قرآن سیکھتے رہتے تھے چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک لفظ کو اور طرح پڑھا تو حضرت عمرؓ نے اُن کو روکا اور کہا کہ اس طرح نہیں اس طرح پڑھنا چاہیئے۔ اس پر عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا نہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح سکھایا ہے حضرت عمرؓ اُن کو پکڑ کر رسول اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

سے کہا کہ یہ قرآن غلط پڑھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عبداللہ بن مسعودؓ پڑھ کر سناؤ جب انہوں نے پڑھ کر سنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا یارسول اللہ مجھے تو آپ نے یہ لفظ اور رنگ میں سکھایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف یہی چار صحابہؓ رسول اللہ علیہ وسلم سے قرآن نہیں پڑھتے تھے بلکہ دوسرے لوگ بھی پڑھتے تھے چنانچہ حضرت عمرؓ کا یہ سوال کہ مجھے آپؐ نے اس طرح پڑھایا ہے بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پڑھتے تھے۔

قرآن مجید کی مختلف قراءتوں سے کیا مراد ہے

یہ جو اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر اعتراض کیا کہ انہوں نے اور طرح قرآن پڑھا ہے اس سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ قرآن کئی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو صرف عربی دان سمجھ سکتا ہے کیونکہ یہ بات صرف عربی میں ہی پائی جاتی ہے کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی۔ عربی زبان میں ماضی اور مضارع کے جو صیغے ہیں اُنکے زیر اور زبر کئی طرح جائز ہوتے ہیں لیکن معنی نہیں بدلتے۔ کسی حرف کے نیچے زیر لگالیں تب بھی جائز ہوتا ہے اور اگر اُس پر زبر پڑھیں تب بھی جائز ہوتا ہے اور معنی ایک ہی رہتے ہیں کبھی تو یہ عام قاعدہ کے طور پر فرق ہوتا ہے یعنی علمی زبان میں اس لفظ کو کئی طرح بولنا جائز ہوتا ہے اور بعض موقعوں میں یہ فرق قبائل کے لحاظ سے ہوتا ہے یعنی بعض قبائل یا بعض خاندان ایک لفظ زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں بعض لوگوں کے منہ پر زبر چڑھی ہوئی ہوتی ہے اور بعض لوگوں کے منہ پر زیر چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی اجازت سے زیر یا زبر پڑھنے کی اجازت دیدیتے تھے لیکن اس سے معنوں پر کوئی اثر بھی نہیں پڑتا تھا نہ لفظ میں کوئی تبدیلی ہوتی تھی۔ یہ فرق اور زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس لیے دوسری زبانوں کے آدمی جب یہ بات سنتے ہیں تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید کسی شخص کو کوئی آیت پڑھائی ہوئی ہوتی تھی اور کسی کو کوئی آیت پڑھائی ہوتی تھی حالانکہ آیت کا کوئی سوال ہی نہیں نہ لفظ کا کوئی سوال ہے سوال صرف لفظوں کے بعض حروف کی حرکت کا ہے ان حرکات کے تغیّر سے معنوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ صرف اتنا فرق پڑتا ہے کہ جس قوم کو جس حرکت سے پڑھنے میں آسانی ہوسکتی ہے وہ اُس حرکت سے پڑھ لیتی ہے۔

مہاجرین و انصار سے حفاظ قرآن

ان چار کے سوا مسلمانوں میں اور بھی بعض بڑے بڑے قراء تھے مثلاً زید بن ثابتؓ جنکو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آخری زمانہ میں اپنی وحی لکھوایا کرتے تھے۔ ابوزید تھے جن کا نام قیس ابن السکن تھا (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۴۹) یہ انصاری تھے اور بنو نجار قبیلہ میں سے تھے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ننہال میں سے تھے۔ اسی طرح ابو درداء انصاری بھی قراء میں سے تھے۔ (نجاری) پھر حضرت ابوبکرؓ بھی قاری تھے۔ چنانچہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع زمانہ سے ہی قرآن شریف حفظ کرتے چلے آرہے تھے۔ حضرت علی کی نسبت بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن شریف کے حافظ تھے بلکہ انہوں نے

قرآن شریف کے نزول کی ترتیب کے لحاظ سے قرآن لکھنے کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معًا بعد شروع کر دیا تھا۔ نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ (حضرت عمرؓ کے لڑکے) بھی قرآن شریف کے حافظ تھے اور وہ قرآن کریم کے اتنے مشتاق تھے کہ ساری رات میں ایک دفعہ قرآن کریم ختم کر لیتے تھے۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی تو آپؐ نے فرمایا اقرأہ فی شھرٍ مہینہ میں ایک دفعہ ختم کر لیا کرو۔ رات میں ایک دفعہ ختم نہ کیا کرو۔ اس سے طبیعت پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔ ابو عبیدہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مہاجر صحابہ میں سے مندرجہ ذیل کا حفظ ثابت ہے۔ ابوبکرؓ عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ طلحہؓ۔ سعدؓ۔ ابن مسعودؓ۔ حذیفہؓ۔ سالمؓ۔ ابوہریرہؓ۔ عبداللہ بن سائبؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ۔ عبداللہ بن عباسؓ اور عورتوں میں سے حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ۔ ان میں سے اکثر نے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی قرآن شریف حفظ کر لیا تھا اور بعض نے آپؐ کی وفات کے بعد حفظ کیا۔ اور ابن ابی داؤد کتاب الشریعۃ میں لکھتے ہیں کہ مہاجرین میں سے تمیم بن اوس الداریؓ اور عقبۃ بن عامرؓ کا حافظ ہونا بھی ثابت ہے۔ اسی طرح بعض مصنّفوں نے ثابت کیا ہے کہ مہاجرین میں سے عمرو بن العاصؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ بھی حافظِ قرآن تھے۔

انصار میں سے جو مشہور حفّاظ تھے اُن کے نام یہ ہیں :-

عبادہ بن صامتؓ۔ معاذؓ۔ مجمع بن حارثہؓ۔ فضالہ بن عبیدؓ۔ مسلمہ بن مخلدؓ۔ ابوالدرداءؓ۔ ابوزیدؓ۔ زید بن ثابتؓ۔ ابی بن کعبؓ۔ سعد بن عبادہؓ۔ ام ورقہؓ۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ صحابہؓ میں سے بہت سے قرآن کریم کے حافظ تھے جیسا کہ سوانح میں واقعہ بئر معونہ کے ماتحت ذکر آچکا ہے کہ ۴ھ ہجری میں بعض قبائل کی درخواست پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سَتّر آدمی لوگوں کو دین سکھانے کے لیے بھیجے تھے جو سب کے سب قرآن کریم کے حافظ تھے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ لوگ اپنی اپنی مجالس میں رات دن قرآن سناتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابویعلیٰ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اُس نے کہا یا رسول اللہ ابوموسیٰؓ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور بہت سے لوگ ان کے اردگرد جمع ہیں اور وہ اُن کو قرآن یاد کرا رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم مجھے وہاں کسی ایسی جگہ پر بٹھا سکتے ہو جہاں سے وہ لوگ مجھے نہ دیکھ سکیں اُس نے کہا ہاں۔ اس پر وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے گیا اور گھر کے کسی ایسے کونہ میں جا کر بٹھا دیا۔ جہاں لوگوں کو آپؐ نظر نہیں آتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوموسیٰ کی قرأت کو سُنا تو وہ بالکل درست تھی اور بہت ہی اچھی طرح وہ قرآن پڑھ رہے تھے اس پر آپ نے فرمایا انّہٗ لیقرأ علٰے مزمارٍ من مزامیر داؤد علیہ السلام وہ تو داؤد علیہ السلام کے خوبصورت طریق پر قرآن پڑھ رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علاوہ ان چار حافظوں کے جنکو آپؐ نے استاذ الاساتذہ مقرر کیا تھا باقی لوگوں کی قرأت کا بھی امتحان لیتے رہتے تھے اور ان کی نگرانی رکھتے تھے تاکہ وہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھیں۔

صرف ایک ہی جگہ پر نہیں صحابہ کی مختلف مجالس میں قرآن پڑھایا جاتا تھا۔ حضرت امام احمدؒ اپنی کتاب

میں جابر بن عبداللہ رضؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو لوگ بیٹھے ہوئے قرآن شریف پڑھ رہے تھے آپؐ نے فرمایا ہاں قرآن پڑھو اور خوب پڑھو اور اللہ کی رضا حاصل کرو۔ پیشتر اس کے کہ وہ قوم آئے جو قرآن کے لفظوں کو تو صحیح پڑھے گی، لیکن مزدوری اور دنیوی فائدہ کے لیے پڑھے گی۔ اپنے نفس کی اصلاح کے لیے نہیں۔ جابر بن عبداللہ رضؓ کہتے ہیں کہ ہماری اس مجلس میں نہ صرف مہاجر اور انصار تھے بلکہ عجمی اور اعرابی بھی اس میں شامل تھے یعنی جنگلوں کے رہنے والے اور غیر عربی لوگ بھی۔

قرّاء کی تعداد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ ہزاروں کی تعداد تک پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد جب مسیلمہ نے بغاوت کر کے ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ مدینہ پر حملہ کر دیا اور ان کے مقابلہ کے لیے حضرت ابوبکر رضؓ نے خالدؓ بن ولید کو تیرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ بھیجا تو اس وقت بعض نئے نئے مسلمان ہونے والے لوگوں کی کمزوری کی وجہ سے متواتر مسلمانوں کو ضمنی طور پر شکست پر شکست ہونے لگی یعنی یہ تو نہیں تھا کہ لشکرِ اسلامی بھاگ گیا ہو لیکن ان کو کئی مقام چھوڑنے پڑے تھے۔ اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے جو لوگ قرآن کریم کے حافظ تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ اس سارے لشکر سے مسیلمہ کا مقابلہ نہ کریں صرف ہم لوگ جو قرآن شریف کے جاننے والے ہیں، ہمیں ایک الگ لشکر کی صورت میں ترتیب دیکر اُس کے مقابلہ کے لیے آگے کریں کیونکہ ہم اسلام کی قیمت جانتے ہیں اور اس کے بچانے کے لیے اپنی جانیں دینے کی قدر ہمیں معلوم ہے۔ اُن کی اِس بات کو خالدؓ بن ولید نے مان لیا اور قرآن شریف کے حفاظ صحابہؓ کو الگ کر دیا اور وہ تین ہزار نکلے۔ ان تین ہزار آدمیوں نے اس شدّت سے مسیلمہ کے لشکر پر حملہ کیا کہ اس کو پیچھے ہٹ کر ایک محدود مقام میں محصور ہونا پڑا اور آخر اس کا لشکر تباہ ہو گیا۔ اُس وقت ان صحابہؓ نے شعارِ جنگ کے الفاظ یہ مقرر کئے تھے "اے سورۃ بقرہ کے حافظو"۔ یہ شعار انہوں نے اس لیے مقرر کیا کہ سورۂ بقرہ قرآن مجید کی سورتوں میں سے سب سے لمبی ہے۔ اِس لڑائی میں پانچسو قاری صحابی مارا گیا۔ اِن واقعات سے پتہ لگتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی قرآن کریم لکھا بھی جاتا تھا حفظ بھی کیا جاتا تھا اور ہزاروں آدمی قرآن شریف کو شروع سے لیکر آخر تک یاد رکھتے تھے۔

ایک جلد میں قرآن مجید کا جمع کرنا

جو بات اس وقت تک نہ ہوئی تھی، وہ صرف یہ تھی کہ ایک جلد میں قرآن شریف جمع نہیں ہوا تھا۔ جب یہ پانچ سو قرآن کا حافظ اس لڑائی میں مارا گیا، تو حضرت عمر رضؓ حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس گئے اور اُنہیں جا کے کہا کہ ایک لڑائی میں پانچ سو حافظِ قرآن مارا گیا ہے اور ابھی تو بہت سی لڑائیاں ہمارے سامنے ہیں۔ اگر اور حفّاظ بھی مارے گئے تو لوگوں کو قرآن کریم کے متعلق شبہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے قرآن کو ایک جلد میں جمع کر دینا چاہیئے۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے پہلے تو اس بات سے انکار کیا۔ لیکن آخر آپ کی بات مان لی حضرت

ابوبکرؓ نے زید بن ثابتؓ کو اس کام کے لیے مقرر کیا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قرآن کریم لکھا کرتے تھے اور کبار صحابہؓ اُن کی مدد کے لیے مقرر کیے۔ گو ہزاروں صحابہؓ قرآن شریف کے حافظ تھے، لیکن قرآن شریف کے لکھتے وقت ہزاروں صحابہؓ کو جمع کرنا تو ناممکن تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے حکم دیدیا کہ قرآن کریم کو تحریری نسخوں سے نقل کیا جائے اور ساتھ ہی یہ تقیناً کی جائے کہ کم سے کم دو حافظ قرآن کے اور بھی اسکی تصدیق کرنیوالے ہوں۔ چنانچہ متفرق چمڑوں اور ہڈیوں پر جو قرآن شریف لکھا ہُوا تھا اس کو ایک جگہ پر جمع کر دیا گیا اور قرآن شریف کے حافظوں نے اُسکی تصدیق کی۔ اگر قرآن شریف کے متعلق کوئی شبہ ہو سکتا ہے تو محض رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات اور اس وقت کے درمیانی عرصہ کے متعلق ہو سکتا ہے مگر کیا کوئی عقلمند یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ جو کتاب روزانہ پڑھی جاتی تھی اور جو کتاب ہر رمضان میں اونچی آواز سے پڑھ کر دوسرے مسلمانوں کو حفاظ سناتے تھے اور جس ساری کی ساری کتاب کو ہزاروں آدمیوں نے شروع سے لیکر آخر تک حفظ کیا ہوا تھا اور جو کتاب گو ایک جلد میں اکٹھی نہیں کی گئی تھی، لیکن بیسیوں صحابہؓ اس کو لکھا کرتے تھے اور ٹکڑوں کی صورت میں لکھی ہوئی وہ ساری کی ساری موجود تھی اُسے ایک جلد میں جمع کرنے میں کسی کو دِقت محسوس ہو سکتی تھی اور پھر کیا ایسے شخص کو دِقت ہو سکتی تھی جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کی کتابت پر مقرر تھا اور اُس کا حافظ تھا۔ اور جبکہ قرآن روزانہ پڑھا جاتا تھا کیا یہ ہو سکتا تھا کہ اِس جلد میں کوئی غلطی ہو جاتی اور باقی حافظ اس کو پکڑ نہ لیتے۔ اگر اس قسم کی شہادت پر شبہ کیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی دلیل باقی نہیں رہتی۔ حق یہ ہے کہ دنیا کی کوئی تحریر ایسے تواتر سے دنیا میں قائم نہیں جس تواتر سے قرآن شریف قائم ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں یہ شکایت آئی کہ مختلف کے لوگ مختلف قراتوں کے ساتھ قرآن کریم کو پڑھتے ہیں اور غیر مسلموں پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کے کئی نسخے ہیں اس قرأت کے متعلق میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ اس قرأت سے مراد یہ ہے کہ کوئی قبیلہ کسی حرف کو زبر سے پڑھتا ہے دوسرا زیر سے پڑھتا ہے۔ تیسرا پیش سے پڑھتا ہے اور یہ بات سوائے عربی کے اور کسی زبان میں نہیں پائی جاتی۔ اس لیے عربی نہ جاننے والا آدمی جب یہ سنے گا تو وہ سمجھے گا کہ یہ کچھ کہہ رہا ہے اور وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ حالانکہ وہ ایک ہی بات کہتے ہونگے۔ پس اس فتنہ سے بچانے کے لیے حضرت عثمانؓ نے یہ تجویز فرمائی کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جو نسخہ لکھا گیا تھا اس کی کاپیاں کروائی جائیں اور مختلف ملکوں میں بھیج دی جائیں اور حکم دے دیا جائے کہ بس اسی قرأت کے مطابق قرآن پڑھنا ہے اور کوئی قرأت نہیں پڑھنی۔ یہ بات جو حضرت عثمانؓ نے کی بالکل معیوب نہ تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب لوگ قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ یعنی ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے الگ رہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی اپنی بولی کے عادی تھے۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جمع ہو کر عرب لوگ متمدن ہو گئے اور ایک عامی زبان کی بجائے عربی زبان ایک علمی زبان بن گئی۔ کثرت سے عرب کے لوگ پڑھنے اور لکھنے کے علم سے واقف ہو گئے جس کی وجہ سے ہر آدمی خواہ کسی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اُسی سہولت سے وہ لفظ ادا

کر سکتا تھا جس طرح علمی زبان میں وہ لفظ بولا جاتا تھا جو درحقیقت ملک کی زبان تھی۔ پس کوئی وجہ نہ تھی کہ جب سارے لوگ ایک علمی زبان کے عادی ہو چکے تھے اُنہیں پھر بھی اجازت دی جاتی کہ وہ اپنے قبائلی تلفظ کے ساتھ ہی قرآن شریف کو پڑھتے چلے جائیں اور غیر قوموں کے لیے ٹھوکر کا موجب بنیں۔ اس لیے حضرت عثمانؓ نے اِن حرکات کے ساتھ قرآن شریف کو لکھکر جو مکّہ کی زبان کے مطابق تھیں سب ملکوں میں کاپیاں تقسیم کر دیں اور آئندہ کے متعلق حکم دیدیا کہ سوائے مکّی لہجہ کے اور کسی قبائلی لہجہ میں قرآن شریف نہ پڑھا جائے۔ اس امر کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یورپ کے مصنّف اور دوسری قوموں کے مصنّف ہمیشہ یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے کوئی نیا قرآن بنا دیا تھا یا عثمانؓ نے کوئی نئی تبدیلی قرآن کریم میں کر دی تھی لیکن حقیقت وہ ہے جو میں نے اوپر بیان کی۔ وہ مصنّف اپنے خیال میں قرآن شریف پر بڑا بھاری اعتراض کرتے ہیں اور وہ لوگ جو عربی زبان سے واقف ہیں اور قرآن کریم کی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ اُن کے اعتراض کو پڑھکر اُن کی جہالت پر ہنستے ہیں۔

یہ بات ثابت کر چکنے کے بعد کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک قرآن کریم اُسی شکل میں موجود تھا جس شکل میں وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ حضرت عثمانؓ کے بعد یہ تواتر اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے نسخے مختلف ممالک میں پھیلا دیئے تو اُن سے اتنی نقلیں کی گئیں اور اس کثرت سے قرآن کریم پھیلا کہ قریباً ہر تعلیم یافتہ آدمی کے پاس قرآن کریم موجود ہوتا تھا۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان لڑائی ہوئی تو اس کے متعلق تاریخوں میں آتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے تمام سپاہیوں نے قرآن شریف اپنے نیزوں پر لٹکا کر یہ نعرے لگائے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن فیصلہ کرے گا۔ (THE CALIPHATE) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں قریباً ہر فرد بشر کے پاس قرآن شریف کا نسخہ ہوتا تھا۔

قرآن شریف کو مسلمان حفظ کرتے رہے اور اس کے نسخے لکھتے رہے

چونکہ قرآن شریف کے پڑھنے اور لکھنے اور پھیلانے کو بہت بڑا ثواب قرار دیا گیا تھا اس لیے اسلامی حکومت میں بڑے بڑے علمأ اور بادشاہ تک قرآن کریم کی کاپیاں لکھا کرتے تھے۔ عرب اور اس کے اِردگرد کے بادشاہوں اور علماء کا تو ذکر چھوڑو ہندوستان جیسے ملک میں جو عرب سے بہت دُور پڑا ہُوا تھا اور جہاں ہندو رسم و رواج غالب آچکا تھا مغل بادشاہ اورنگ زیب اپنی فرصت کے اوقات میں قرآن شریف لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں سات نسخے قرآن کریم کے لکھے۔ پھر مسلمانوں میں حفظ قرآن کی شروع سے اتنی کثرت پائی جاتی ہے کہ ہر زمانہ میں ایک لاکھ سے دو لاکھ تک حافظ دنیا میں موجود رہا ہے بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ حافظ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ حافظ اس کو کہتے ہیں جو شروع سے لیکر آخر تک اس کے تمام حصوں کو یاد رکھتا ہے۔ عام طور پر یوروپین مصنّف اپنی ناواقفی کی وجہ سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ جبکہ دنیا میں بائبل کا کوئی حافظ نہیں ملتا تو قرآن شریف کا کوئی حافظ کہاں ہو سکتا ہے حالانکہ قرآن کریم کا یہ معجزہ ہے کہ وہ ایسی سُریلی زبان میں نازل ہُوا ہے کہ اُس کا حفظ کرنا نہایت ہی آسان ہے میر بڑا لڑکا ناصر احمد جو آکسفورڈ کا

بی۔ اے آنرز اور ایم اے ہے میں نے اُسے دنیوی تعلیم سے پہلے قرآن کریم کے حفظ پر لگایا اور وہ سارے قرآن کا حافظ ہے۔ قادیان میں دو ڈاکٹر حافظ ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے گریجوایٹ اور دوسرے لوگ حافظ ہیں جن ڈاکٹروں کا میں نے ذکر کیا ہے اُن میں سے ایک نے صرف چار پانچ مہینے میں قرآن شریف حفظ کیا تھا چوہدری سر ظفر اللہ صاحب جج فیڈرل کورٹ آف انڈیا (حال وزیر خارجہ پاکستان)، کے والد صاحب نے اپنی آخری عمر میں جبکہ وہ قریباً ساٹھ سال کے تھے، چند مہینوں میں سارا قرآن حفظ کر لیا تھا۔ حافظ غلام محمد صاحب سابق مبلغ ماریشس نے تین مہینہ میں قرآن شریف حفظ کیا تھا۔ نواب جمال الدین خاں صاحب جو ایک سابق والیۂ ریاست بھوپال کے خاوند تھے اُن کے ایک نواسے مجھے حج میں ملے تھے جنہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ انہوں نے ایک مہینہ میں سارا قرآن شریف حفظ کیا تھا۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی عبارت اس قسم کی ہے کہ اس کا حفظ کرنا دوبھر معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے بڑے بڑے بوڑھے لوگوں سے سُنا ہے کہ میرے جدّ امجد مرزا گل محمد صاحب جو عالمگیر ثانی کے وقت میں تھے باوجود اِس کے کہ کوئی بہت بڑے رئیس نہیں تھے اُن کی ریاست صرف اڑھائی سو مربع میل کے علاقہ پر حاوی تھی، ان کے دربار میں پانچسو حافظ موجود رہتا تھا۔ ہندوستان جیسے ملک میں جو عربی زبان سے بہت ہی ناواقف ہے، بعض حصے ایسے پائے جاتے ہیں جن میں صدیوں سے اکثر لوگ حافظ چلے آتے ہیں۔

ایک ترکیب مسلمانوں نے قرآن کریم کی حفاظت کی یہ بھی اختیار کی ہوئی ہے اور جس ترکیب پر صدیوں سے عمل ہوتا چلا آ رہا ہے کہ جو پیدائشی نابینا ہوتے ہیں ان کو قرآن شریف حفظ کرا دیتے ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نابینا کوئی دنیوی کام تو کر نہیں سکتا۔ کم سے کم وہ قرآن کی خدمت ہی کرے گا۔ یہ رواج اتنا غالب ہے کہ لاکھوں مسلمان نابینوں کو بغیر پوچھے اور بغیر دریافت کیے ایک ہندوستانی ملتے ہی حافظ صاحب کے نام سے یاد کریگا یعنی وہ جس نے سارا قرآن یاد کیا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نابینوں میں سے اتنے حافظ قرآن ہوتے ہیں کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی نابینا ہو اور قرآن کا حافظ نہ ہو۔ ہر رمضان میں ساری دنیا کی ہر بڑی مسجد میں سارا قرآن کریم حافظ لوگ حفظ سے بلند آواز کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ ایک حافظ امامت کرتا ہے اور دوسرا حافظ اسکے پیچھے کھڑا ہوتا ہے تا اگر کسی جگہ پر وہ بھول جائے تو اُسکو یاد کرائے۔ اس طرح ساری دنیا میں لاکھوں جگہ پر قرآن کریم صرف حافظہ سے دہرایا جاتا ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے یورپ کے دشمنوں کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ قرآن کریم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے لیکر آج تک بالکل محفوظ چلا آتا ہے اور یہ کہ یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس شکل میں قرآن کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دیا تھا اُسی شکل میں آج موجود ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم بعض یورپین مصنفین کی گواہی پیش کرتے ہیں:—

(۱) سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد صـ۲۸ میں بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> **"What we have though possibility created by himself, is still his own"**

ترجمہ:۔ گو یہ ممکن ہے کہ محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) نے قرآن خود ہی بنایا تھا مگر کہ جو قرآن ہمارے

پاس آج موجود ہے یہ وہی ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

(۲) پھر لکھتے ہیں :۔

"We may upon the strongest persumption affirm that every verse in the Quran is genuine and unaltered composition of Mohammad himself."

ترجمہ:۔ہم نہایت مضبوط قیاسات کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایک آیت جو قرآن میں ہے وہ اصلی ہے اور محمّد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی غیر محرّف تصنیف ہے۔

(۳) پھر یہ بحث کرنے کے بعد کہ قرآن کی ترتیب ہمیں سمجھ نہیں آتی لکھتے ہیں کہ :۔

"There is otherwise every security internal and external that we possess the text which Mohammad himself gave forth and used."

ترجمہ: اس کے علاوہ ہمارے پاس ہر ایک قسم کی ضمانت موجود ہے اندرونی شہادت کی بھی اور بیرونی کی بھی کہ یہ کتاب جو ہمارے پاس ہے وہی ہے جو خود محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی اور اسے استعمال کیا کرتے تھے۔

(۴) پھر لکھتے ہیں :۔

"And conclude with at least a close approximation to the verdict of Van Hammer that we hold the Quran to be as suerly Mohammad's world's as the Mohammadans held it to be the word of God."

ترجمہ:۔ہم وان ہمیر کے مندرجہ ذیل فیصلہ کے بالکل مطابق نہ سہی کم سے کم اُس کے خیال کے بہت موافق فیصلہ تک پہنچتے ہیں وہ وان ہمیر کا فیصلہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو قرآن موجود ہے اس کے متعلق ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا بنایا ہُوا غیر محرّف کلام ہے جس یقین سے مسلمان کہتے ہیں کہ وہ خدا کا غیر مبدل کلام ہے۔

(۵) نولڈکے کا قول ہے :۔

"Slight clerical errors there may have been but the Quran of Othman contains none but genuine elements, though sometimes in very strange order. Efforts of European scholors to prove the existence of later interpations in the Quran have failed."

ترجمہ:ممکن ہے کہ تحریر کی کوئی معمولی غلطیاں (طرز تحریر کی) ہوں تو ہوں، لیکن جو قرآن عثمانؓ نے

دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اُس کا مضمون وہی ہے جو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے پیش کیا تھا۔ گو اس کی ترتیب عجیب ہے۔

یورو پین علما کی یہ کوششیں کہ وہ ثابت کریں کہ قرآن میں بعد کے زمانہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی ہے بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن)

ترتیب سُور و آیات

قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت عثمانؓ کی قائم کردہ ہے لیکن یہ بالکل غلط بات ہے۔ حدیثوں سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں سارا قرآن شریف نمازمیں پڑھتے تھے اور بعض دفعہ دوسرے صحابہؓ بھی آپؐ کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ اسی طرح حدیثوں میں آتا ہے کہ رمضان میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سارا قرآن جبرئیل کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے (بخاری جمع القرآن) اب ایک غیر مسلم چاہے یہ نہ مانے کہ آپؐ جبرئیل کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے، مگر اتنا اُسے ماننا پڑیگا کہ آپ اُسے کسی ترتیب سے پڑھتے تھے اگر کوئی ترتیب نہیں تھی تو آپؐ اسے پڑھتے کس طرح تھے؟

اسی طرح حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علیؓ ایک عرصہ تک حضرت ابوبکرؓ سے ملنے نہ گئے حضرت ابوبکرؓ نے انکو بلوایا اور پوچھا کہ علیؓ! کیا آپ میری خلافت پر ناراض ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا نہیں مَیں ناراض نہیں۔ مَیں ناراض نہیں، مَیں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ قسم کھائی تھی کہ مَیں قرآن کریم کو اس ترتیب کے ساتھ لکھ دوں گا جس ترتیب کے ساتھ وہ نازل ہوا تھا اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن شریف کسی ترتیب سے پڑھا جاتا تھا مگر وہ ترتیب نزول والی ترتیب نہیں تھی۔ تبھی حضرت علی رضؓ نے خیال کیا کہ وہ قرآن کریم کو اُس کے نزول کی ترتیب کے لحاظ سے بھی لکھ دیں تاکہ تاریخی طور پر یہ حقیقت بھی لوگوں کے لیے محفوظ ہو جائے۔ اسی طرح حدیثوں میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپؐ لکھنے والے کو بلا کر فرماتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں داخل کر دو۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو الہامی طور پر بتایا جاتا تھا کہ فلاں آیت کو فلاں جگہ رکھا جائے اور فلاں آیت کو فلاں جگہ۔ مگر سب سے بڑی شہادت واقعاتی شہادت ہے قرآن شریف ہمارے پاس موجود ہے اُس کی سورتوں پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمام سورتوں کے مضامین آپس میں ترتیب رکھتے ہیں۔ اگر قرآن کی سورتیں بغیر ترتیب کے نازل ہوئی تھیں اور حضرت عثمانؓ نے اُن کو صرف ان کی لمبائی چھوٹائی کے لحاظ سے انہیں آگے پیچھے رکھ دیا تو سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں کس طرح ممکن تھا کہ ان سورتوں کے مضامین بھی آپس میں ملنے لگ جاتے۔ سورۃ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی تھی موجودہ قرآن میں وہ سب سے پہلے رکھی ہوئی ہے۔ سورۃ بقرہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی درمیان میں نازل ہونے والی بہت سی سورتوں کو چھوڑ کر سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ بقرہ رکھ دی گئی ہے۔ یوروپین مصنّف کہتے ہیں کہ سورۃ بقرہ چونکہ سب سے لمبی سورۃ ہے اس لیے وہ قرآن میں اور سورتوں سے پہلے رکھ دی گئی ہے۔ اوّل تو اس پر یہ اعتراض ہے کہ سورۃ بقرہ پہلی سورۃ نہیں۔ پہلی سورۃ سورۃ فاتحہ ہے۔ سورۃ فاتحہ تو صرف

سات آیتوں پر مشتمل ہے اُس کو پہلے کیوں رکھا گیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر اتفاقی طور پر صرف لمبا ہونے کی وجہ سے سورۂ بقرہ کو سورۂ فاتحہ کے بعد رکھا گیا ہے تو اِس کا کیا جواب ہے کہ سورۂ فاتحہ میں یہ دُعا آتی ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ الٰہی تو مجھے سچا راستہ دکھا اور سورۂ بقرہ ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ یہی وہ کامل کتاب ہے اِس میں کوئی شبہ نہیں جو متقیوں کے لیے ہدایت کے طور پر بھیجی گئی ہے۔ آخر یہ کس طرح ہُوا کہ اِس اتفاقی حادثہ کے ساتھ دونوں کے مضامین بھی آپس میں مِل گئے۔ ایک کے آخر میں ہدایت کے لیے دعا ہے اور دوسری کے شروع میں اُس دعا کی قبولیت میں ہدایت دینے کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ صرف ایک مثال نہیں، سورۃ فاتحہ سے لے کر قرآن کریم کے آخر تک تمام سورتوں کے مضامین آپس میں ملتے چلے جاتے ہیں حالانکہ کبھی پہلی سورۃ مدنی ہوتی ہے اور دوسری مکّی۔ اور کبھی دوسری مدنی ہوتی ہے اور پہلی مکّی پس قرآن شریف کے مضامین کی ترتیب صاف بتا رہی ہے کہ قرآن کریم کی موجودہ ترتیب الٰہی منشاء کے ماتحت ہے۔ رہا یہ سوال کہ نزول کی ترتیب بدل کر ایک دوسری ترتیب کیوں دی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب قرآن شریف نازل ہُوا، اس وقت لوگ اسلامی مسائل سے بالکل ناواقف تھے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز اُن کو بتانی ضروری تھی تاکہ اسلامی تعلیم پسِ پردہ اُن کے دماغوں میں قائم ہوجائے۔ اس کے بعد پھر اسلامی شریعت کی تفصیلات بیان ہوسکتی تھیں۔ پس پہلے چھوٹی چھوٹی سورتیں ایسے مضامین کے متعلق نازل کی گئیں، جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی زمانہ کے ساتھ تعلّق رکھتی تھیں جن میں اوّل تو چند اصولی باتیں بیان کی گئی تھیں۔ کہ خدا ایک ہے۔ غریبوں سے رحم کا سلوک کرنا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کی عبادت میں اپنی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیئے اور ساتھ ہی یہ باتیں بھی بتائی گئی تھیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کس کس رنگ میں مخالفت ہوگی۔ مخالفوں کا کیا انجام ہوگا، مومنوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ اور کس طرح اسلام ترقی کرے گا مگر جُوں جُوں اسلام بڑھتا چلا گیا اور مسلمانوں کو ترقیات حاصل ہونی شروع ہوئیں تفصیلاتِ شریعت بھی نازل ہونے لگیں پس یہ نزول کی ترتیب اُس زمانہ کے لحاظ سے نہایت ضروری تھی۔ مگر جب قرآن شریف سارا نازل ہوگیا۔ لاکھوں آدمی دنیا میں مسلمان ہوگیا۔ اور غیر قومیں بھی اسلام کے پسِ پردہ سے ایک حد تک واقف ہوگئیں، تو اب اُن کے سامنے مسائل کو ایک نئے رنگ اور نئے زاویہ سے پیش کرنا ضروری تھا پس اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئی ترتیب سے قرآن شریف کو آئندہ زمانہ کے لیے مرتب کردیا۔ یہ قرآن کریم کا عظیم الشان معجزہ ہے کہ نزول کے زمانہ کے لحاظ سے نزولِ قرآن والی ترتیب بالکل مناسب حال تھی۔ لیکن اسلام کے پھیل جانے اور قرآن کریم کے مکمل ہوجانے کے بعد آئندہ زمانہ کے لیے اُس کی وہی ترتیب مناسب حال تھی جو اِس وقت پائی جاتی ہے۔ ایک کتاب جو مختلف ٹکڑوں میں نازل ہوئی۔ مختلف زمانوں میں نازل ہوئی اُس کو دو ترتیبوں سے دنیا کے سامنے پیش کرنا اور ایسی صورت میں پیش کرنا کہ دونوں کی دونوں کامیاب اور اعلےٰ درجہ کی ہوں، یہ سوائے خدا تعالےٰ کے اور کسی کا کام نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب اِس تفسیر کے پڑھنے والے کو

ہر سورۃ کے ابتدائی نوٹوں سے خوب اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

قرآن شریف میں پیشگوئیاں

میں دیباچہ کے شروع میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ قرآن شریف کے متعلق پہلے انبیاء نے پیشگوئیاں کی ہیں۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خود قرآن کریم میں بھی پیشگوئیاں موجود ہیں اور یورپین مصنفین کا یہ خیال کہ قرآن کریم میں پیشگوئیاں نہیں، بالکل غلط ہے۔ قرآن کریم تو شروع ہی پیشگوئی سے ہُوا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی پہلی چند آیتیں جو غارِ حراء میں نازل ہوئی تھیں اُنہی میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ قرآن کریم کے ذریعہ وہ علوم بیان کیے جائینگے جو اس سے پہلے انسان کو معلوم نہیں تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے پہلی کتابوں تک کی غلطیاں نکالی ہیں اور اس زمانہ میں اُن کی تصدیق ہورہی ہے مثلاً (۱) قرآن کریم نے یہ بتایا تھا کہ فرعون کی لاش کو اُس کے ڈوبنے کے وقت ہی بچا لیا گیا تھا اور اُسے محفوظ کر دیا گیا تھا تاکہ وہ آئندہ زمانہ کے لوگوں کے لیے نشان کے طور پر کام آئے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝ (یونس ع ۹) ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار سلامتی سے اُتار دیا۔ اور اُن کے بعد فرعون اور اس کا لشکر سرکشی اور دشمنی سے ان کے پیچھے آیا اور پیچھا کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے غرق کرنے کے ہم نے سامان کر دیئے اس وقت فرعون نے کہا میں ایمان لاتا ہوں کہ بنو اسرائیل جس خدا پر ایمان لائے ہیں اُس کے سوا اور کوئی خدا نہیں۔ تب ہم نے کہا تو اب ایمان لاتا ہے اور اس سے پہلے تُو نے خوب فساد مچا رکھا تھا۔ پس اب تیرے اِس ناقص ایمان کے بدلہ میں ہم صرف تیرے جسم کو نجات دیں گے تا (تیرا جسم) ہمیشہ کے لیے بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے عبرت کا موجب ثابت ہو اور لوگوں میں سے اکثر ہمارے نشانوں سے غافل رہتے ہیں۔

یہ مضمون نہ بائبل میں مذکور ہے نہ یہودیوں کی تاریخ میں مذکور ہے نہ کسی اور معروف تاریخ میں مذکور ہے۔ تیرہ سو سال پہلے قرآن نے یہ خبر دی اور اس خبر دینے کے تیرہ سو سال کے بعد فرعونِ موسیٰ کی ممی مل گئی جس سے معلوم ہُوا کہ ڈوبنے کے بعد اس کی لاش ضائع نہیں ہوگئی تھی بلکہ بچالی گئی تھی اُسے حنوط کیا گیا تھا اور وہ محفوظ کر دی گئی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ حنوط کرنے کے باوجود اُن بہت سے تغیرات میں جو مصر میں ہوئے فرعونِ موسیٰ کی لاش ضائع ہوجاتی۔ مگر فرعون موسیٰ کی لاش محفوظ رہی اور اس وقت دنیا کے سامنے عبرت کا نمونہ پیش کر رہی ہے اور قرآن کریم کی سچائی پر گواہی دے رہی ہے۔

(۲) پھر قرآن کریم کے شروع نزول میں ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی (سورۃ الیل ع۱) ہم رات کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ڈھانپ لے گی یعنی اسلام پر نہایت ہی شدید مصائب نازل

ہوں گے۔ یہ پیشگوئی ایسے وقت میں کی گئی تھی جبکہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ میری قوم میری دشمنی کرے گی کیونکہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی بیوی کی طرف سے رشتہ دار ورقہ بن نوفل نے یہ کہا کہ تم پر وہی فرشتہ الہام لیکر نازل ہُوا ہے جو موسیٰ کی طرف نازل ہُوا تھا اور یہ کہ تمہاری قوم تمہیں دُکھ دیگی اور تمہیں اپنے وطن سے نکال دیگی۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت حیرت سے اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میری قوم مجھے کس طرح نکال دیگی (بخاری باب کیف کان بدء الوحی) یعنی جو اچھے تعلقات میرے اپنی قوم سے ہیں ان کے نتیجہ میں وہ میری مخالف نہیں ہو سکتی۔ مگر اُس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتادیا کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک سخت تاریک رات آنے والی ہے چنانچہ وہ رات آئی اور قریباً دس سال تک چلی گئی۔ اِن دس سالوں کی خبر بھی قرآن کریم نے دوسری جگہ بتادی تھی۔

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ [پ۳۰ سورۃ الفجر] ہم صبح کے طلوع کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اُن دس راتوں کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اس طلوع فجر سے پہلے آئیں گی۔ میور اور دوسرے یورپین مصنف تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سورۃ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے تیسرے سال کے قریباً آخر میں نازل ہوئی ہے اُس وقت تک ابھی مکہ کے لوگوں کی مخالفتیں تیز نہیں ہوئی تھیں اُس وقت قرآن کریم نے یہ خبر دی کہ تم پر تاریکی کی دس راتیں آئینگی اور جیسا کہ الہامی کلام کے محاورہ سے ثابت ہے دس راتوں سے مراد دس سال ہوتے ہیں۔ اور بائبل میں یہ محاورہ بڑی کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ بائبل میں بالعموم دن کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم میں مصیبت کی گھڑیوں کو رات کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس لیے کہ تاریکی کے زمانہ پر رات ہی اچھی طرح دلالت کرتی ہے بہرحال اس جگہ یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ دس سال متواتر سخت ظلموں کے گذریں گے چنانچہ دیکھ لو اس پیشگوئی کے بعد متواتر دس سال مسلمانوں پر ظلم ہوتے رہے۔ مکہ والوں کی بدلی ہوئی نگاہوں سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ تو معلوم کر سکتے تھے کہ مکہ والے مجھ پر ظلم کرینگے مگر کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ آپ اُن کی شکلوں سے یہ بھی معلوم کر سکتے تھے کہ ظلموں کا زمانہ دس سال تک لمبا چلا جائے گا؟

کیوں نہ آپ نے پانچ سال کہا، کیوں نہ آپ نے آٹھ سال کہا، کیوں نہ آپ نے بارہ سال کہا۔ کیوں نہ آپ نے تیرہ سال کہا؟ آپ کے الہام میں دس سال کے الفاظ آئے اور اس الہام کے بعد آپ دس سال ہی مکہ میں رہے اور تکلیفیں اُٹھاتے رہے۔ دس سال کے بعد طلوع آفتاب ہُوا۔ اور اس مصیبت کے علاقہ سے آپ کو ہجرت کرنی پڑی اور مدینہ میں خدا نے آپ کی ترقی کے سامان پیدا کر دیئے اور خدا کی مدد کا سورج چڑھ پڑا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ دس سال کی میعاد بھی یُونہی اپنے طور پر بات بنا کر پیش کر دی گئی تھی۔ مگر کیا یہ بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں تھا کہ دس سال کے بعد ایک شہر کے لوگوں کو مسلمان بنالیں اور پھر ہجرت کر کے اُس میں چلے جائیں؟ کیا مدینہ کے لوگوں کو مسلمان بنانا آپ کے اختیار میں تھا؟ پھر کیا یہ بات آپ کے اختیار میں تھی کہ آپ مکہ سے نکل کر مدینہ سلامتی سے

پہنچ جائیں؟ مگر یہ سورۃ یہی نہیں بتاتی بلکہ اِس میں آگے چل کر یہ بھی بتایا گیا ہے وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ دس سال کی تکلیف کے بعد ایک طلوعِ فجر ہوگا، مگر اس کے بعد بھی ظلمت پوری طرح دُور نہ ہوگی بلکہ اس کے بعد بھی ایک رات آئیگی۔ مگر وہ ایک ہی رات آکر گذر جائیگی۔ پھر اس کے بعد کوئی رات نہیں آئیگی۔ چنانچہ دیکھ لو ایسا ہی ہُوا۔ ہجرت کے ایک سال بعد بدر کی جنگ ہوئی اور بدر کی جنگ نے جیسا کہ خود بائبل نے بھی تسلیم کیا ہے اور جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں قیدار کی ساری شوکت تباہ کرکے رکھ دی۔ بیشک بعد میں بھی لڑائیاں ہوئیں اور بڑی بڑی ہوئیں مگر بدر کی جنگ نے مسلمانوں کی ایک آزاد اور بااختیار حکومت قائم کردی اور دشمن کے چوٹی کے آدمی تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیئے گئے۔

(۴) پھر مکہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دی گئی تھی کہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (پ۲۰ سورۃ القصص ع۹/۱۲) یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا اور اس کی اطاعت فرض کی ہے وہ تجھے اپنی ذات ہی کی قسم کھا کر بتاتا ہے کہ وہ تجھ کو دوبارہ مکہ میں لوٹا کر لائیگا۔ اس خبر میں نہ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کرنی پڑیگی بلکہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ہجرت کے بعد آپ فاتح کی صورت میں داخل ہونگے کیا ان حالات میں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آرہے تھے آپ اپنے پاس سے ایسی خبر بنا سکتے تھے؟

(۵) اِس مفہوم کی قرآن کریم میں ایک اور پیشگوئی بھی ہے اور وہ بھی مکّی سورتوں میں نازل ہوئی، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (پ۱۵ سورہ بنی اسرائیل ع۹) یعنی کہہ اے میرے رب مجھے اس شہر میں جہاں تو بھیج رہا ہے کامیابی کے ساتھ داخل کر اور پھر مجھے کچھ عرصہ کے بعد اس شہر سے کامیابی کے ساتھ حملہ آور ہونیکا موقع عطا فرما اور اس حملہ میں میرا مددگار اور ناصر بن۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آپ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے جائیں گے اور پھر مدینہ سے مکّہ پر حملہ کریں گے اور خدا کی مدد سے مکّہ فتح کریں گے۔

(۶) اِسی طرح آپ مکّہ میں ہی تھے کہ آپ کو الہام ہُوا۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (پ۲۷ سورۃ القمر) اسلام کی ترقی کا وقت آگیا ہے اور عرب کی حکومت تباہ کردی گئی۔ چاند عرب کا نشان تھا چنانچہ جب کوئی شخص خواب میں چاند دیکھے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُسے عرب کی حکومت کے حالات بتائے گئے ہیں پس چاند کے پھٹنے کے یہ معنے تھے کہ عرب کی حکومت تباہ ہو جائے گی۔ اُس وقت جب آپ کے صحابہؓ چاروں طرف دنیا میں جان بچائے دوڑے پھرتے تھے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گلا گھونٹا جاتا اور آپ کی گردن میں پٹکے ڈالے جاتے تھے۔ جب خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے کی بھی آپ کو اجازت نہیں تھی اور جب سارا مکّہ آپ کی مخالفت کی آوازوں سے گونج رہا تھا اُس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ والوں کو یہ خبر دی کہ عرب کی حکومت کی تباہی کا خدا نے فیصلہ کر دیا ہے اور اسلام کے غلبہ کا وقت آگیا ہے۔ پھر کس طرح چند سال کے بعد ہی یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ قیدار کی ساری حشمت توڑ دی گئی۔ اسلام کا جھنڈا بلند کر دیا گیا۔ چاند پھٹ گیا۔ قیامت آگئی اور ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین بنا دی گئی۔

(۷) آپ ابھی مکّہ میں ہی تھے کہ عرب میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ایرانیوں نے رومیوں کو شکست دیدی ہے اس پر مکّہ والے بہت خوش ہوئے کہ ہم بھی مشرک ہیں اور ایرانی بھی مشرک۔ ایرانیوں کا رومیوں کو شکست دے دینا ایک نیک شگون ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ مکّہ والے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غالب آجائیں گے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا نے بتایا کہ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ؕ (پ۲۱ سورہ روم) رومی حکومت کو شام کے علاقہ میں بے شک شکست ہوئی ہے لیکن اس شکست کو تم قطعی نہ سمجھو مغلوب ہونے کے بعد رومی پھر ۹ سال کے اندر غالب آجائینگے۔ اِس پیشگوئی کے شائع ہونے پر مکّہ والوں نے بڑے بڑے قہقہے لگائے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بعض کفار نے سوسو اونٹ کی شرط باندھی کہ اگر اتنی شکست کھانے کے بعد بھی روم ترقی کرجائے تو ہم تمہیں سَو اونٹ دیں گے۔ اور اگر ایسا نہ ہُوا تو تم ہمیں سو اونٹ دینا۔ بظاہر اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا امکان دُور سے دُور تر ہوتا چلا جارہا تھا۔ شام کی شکست کے بعد رومی لشکر متواتر کئی شکستیں کھا کر پیچھے ہٹتا گیا یہاں تک کہ بحیرہ مارمورا کے کناروں تک ایرانی فوجیں پہنچ گئیں قسطنطنیہ اپنی ایشیائی حکومتوں سے بالکل منقطع ہوگیا اور روم کی زبردست حکومت ایک ریاست بن کر رہ گئی، مگر خدا کا کلام پورا ہونا تھا اور پورا ہوا۔ انتہائی مایوسی کی حالت میں روم کے بادشاہ نے اپنے سپاہیوں سمیت آخری حملہ کے لیے قسطنطنیہ سے خروج کیا اور ایشیائی ساحل پر اُتر کر ایرانیوں سے ایک فیصلہ کُن جنگ کی طرح ڈالی۔ رومی سپاہی باوجود تعداد میں کم ہونے کے اور باوجود سامان کم ہونے کے قرآن کریم کی پیشگوئی کے مطابق ایرانیوں پر غالب آئے ایرانی لشکر ایسا بھاگا کہ ایران کی سرحدوں سے ورے اُس کا قدم کہیں بھی نہ ٹھہرا۔ اور پھر دوبارہ رومی حکومت کے افریقی اور ایشیائی مفتوحہ ممالک اس کے قبضہ میں آگئے۔

(۸) یہ تو پُرانی باتیں ہیں۔ اسلام نے اس زمانہ کے متعلق بھی بہت سی خبریں دی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں نہر سویز اور نہر پانامہ کے متعلق خبر دی گئی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ یَلۡتَقِیٰنِ ۙ بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخٌ لَّا یَبۡغِیٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۚ یَخۡرُجُ مِنۡہُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَ الۡمَرۡجَانُ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۚ وَ لَہُ الۡجَوَارِ الۡمُنۡشَـٰٔتُ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۚ (پ۲۷ سورہ رحمٰن ع۲)

اِن آیات میں یہ خبر دی گئی ہے کہ دنیا میں دو سمندر ہیں جو ایک دوسرے سے جُدا جُدا ہیں، لیکن ایک دن آئے گا جب وہ آپس میں ملا دیئے جائینگے ان میں بڑے بڑے اونچے جہاز سفر کرینگے اور ان سمندروں کی علامت یہ ہے کہ موتی اور مونگا اُن میں سے نکالا جاتا ہے یہ پیشگوئی بعینہٖ نہر سویز اور نہر پانامہ پر پوری ہوئی۔ موتی اور مونگا بھی وہاں ہوتا ہے بڑے بڑے جہاز بھی اُن میں چلتے ہیں اور دو دو سمندر ان نہروں کے ذریعہ سے ملا دیئے گئے ہیں اسی طرح اور بیسیوں پیشگوئیاں ہیں جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں جو اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں جیساکہ سورہ کہف کے پڑھنے سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم میں آخری زمانہ میں

عیسائیوں کے غلبہ کی بھی خبر دی گئی ہے۔ دنیا میں اُن کے پھیل جانے کی بھی خبر دی گئی ہے۔ اُن کی سمندری طاقت کی بھی خبر دی گئی ہے۔ اُن کی باہمی لڑائیوں کی بھی خبر دی گئی ہے اور آخر میں اسلام کی فتح اور کامیابی کی بھی خبر دی گئی ہے۔ باقی سب پیشگوئیاں پوری ہو چکی ہیں اب اسلام کی فتح کی پیشگوئی پوری ہونی باقی ہے۔ یورپ کا عیسائی یا یورپ کا دہریہ اسلام کی کمزور حالت کو دیکھ کر ہنستا ہے تو بیشک ہنستا رہے مگر جس خدا نے وہ پیشگوئیاں پوری کی ہیں وہی خدا یہ آخری پیشگوئی بھی ضرور پوری کر کے چھوڑیگا۔ اسلام کی فتح کے دن آرہے ہیں تمام تاریکیوں اور تمام ظلمتوں میں سے مَیں اسلام کے سورج کو جھانکتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کی فوجیں آسمان سے اُتر رہی ہیں بیشک شیطانی فوجوں کا اس وقت دنیا پر غلبہ ہے لیکن وہ دن قریب سے قریب تر آرہے ہیں جب خدا کی فوجیں شیطان کی فوجوں کو شکست دے دینگی۔ جب خدا کی توحید دنیا میں پھر قائم ہو گی۔ جب پھر دنیا یہ تسلیم کرے گی کہ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو خدا اور بندے میں صلح کراتی ہے۔ اور خدا کی بادشاہت کو اس دنیا میں قائم کرتی ہے اور بنی نوع انسان میں انصاف اور عدل کو قائم کرتی ہے۔

معجزات

عیسائی مورّخ بالعموم اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ قرآن کریم اپنی نسبت معجزات کا مدّعی نہیں۔ سوائے اس کے کہ قرآن کریم کی نسبت یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ وہ ایک بے مثل کلام ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس سوال پر بھی تمہید میں روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم دنیا کے سامنے دو اصل پیش کرتا ہے ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی بعض سنّتیں ایسی ہیں جن کو وہ کبھی تبدیل نہیں کرتا۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مُردے زندہ ہو کر دوبارہ اس دنیا میں نہیں آتے۔ یا اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ کوئی انسان خدا تعالےٰ کے سوا حقیقی مخلوق پیدا کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ دنیا میں صنّاع بھی ہو سکتے ہیں موجد بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقی خالقیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے ان دونوں دعووں میں سے دعویٰ اوّل یعنی مُردوں کے زندہ ہونیکا ذکر سورۃ مومنون میں کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (آیت ۱۰۰-۱۰۱) یعنے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوتے وقت بعض روحیں یہ استدعا کرینگی۔ کہ ان کو واپس کیا جائے تاکہ وہ دوبارہ نیک اعمال کریں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ دعاء ایسی نہیں جسکو قبول کیا جائے کیونکہ قیامت تک روحوں اور اس دنیا کے درمیان ایک حد فاصل مقرر کر دی گئی ہے اور کوئی رُوح اس دنیا کی طرف واپس نہیں لَوٹ سکتی۔

اسی طرح سورۂ انبیاء میں آتا ہے۔ وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۝ حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ۝ (آیت ۹۶-۹۷) یعنے وہ تمام قومیں جو ہلاک ہو چکی ہیں، اُن کے متعلق ہم یہ قطعی فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ دوبارہ اس دنیا میں واپس نہیں آئینگی یہاں تک کہ یاجوج و ماجوج کے

لیے دروازہ کھول دیا جائیگا اور وہ ہر پہاڑی اور ہر سمندری لہر پر سے دوڑتے ہوئے دنیا میں پھیل جائیں گے۔
اس آیت سے بھی ثابت ہے کہ مردے دوبارہ دُنیا میں زندہ نہیں ہُوا کرتے یہ جو کہا گیا ہے کہ یاجوج وماجوج کے زمانہ تک ایسا نہیں ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں مُردے زندہ ہونے لگ جائینگے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ قیامت کے قرب کا زمانہ ہے اور اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قیامت کے زمانہ تک ایسا کام نہیں ہوگا۔ بعض نحویوں نے اسکے یہ بھی معنے کیے ہیں کہ یاجوج وماجوج کے زمانہ میں مردوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی جائیگی (لیکن اس زمانہ میں بھی باوجود سائنس کی پوری ترقی کے) اس بات میں کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ بہرحال قرآن کریم اس بات کا بھی منکر ہے کہ مردے دوبارہ اسی دنیا میں زندہ ہو کر آئیں۔ اسی طرح وہ اس بات کا بھی منکر ہے کہ کوئی ہستی خدا تعالیٰ کے سوا حقیقی مخلوق پیدا کرسکے۔ چنانچہ اسکے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ (النحل ع۲ آیت ۲۱-۲۲) یعنی وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا لوگ امداد کے لیے پکارتے ہیں۔ وہ ذرا سی چیز بھی پیدا نہیں کرسکتے بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں، وہ مُردے ہیں زندہ نہیں اور ان کو تو یہ بھی علم نہیں کہ وہ کب اُٹھا کر خدا تعالےٰ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ اسی طرح قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی احمقانہ بات خدا تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ حکیم ہے یعنی اُسکے سارے کام حکمت کے ساتھ ہوتے ہیں چنانچہ قرآن کریم میں علاوہ اس کے کہ خدا تعالیٰ کا نام حکیم رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (نوح ع۱) اے اسلام کے دشمنو تمہیں کیا ہوگیا کہ تم اپنے متعلق تو یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہارے کام حکمت کے مطابق ہیں مگر خدا تعالیٰ کے متعلق یہ بات تسلیم نہیں کرتے اور اس کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہو جو حکمت کے خلاف ہوتی ہیں یہ تین باتیں یا اسی قسم کی اور باتیں اگر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کی جائیں تو خواہ اُن کا نام معجزہ رکھا جائے خواہ ان کا نام کرامت رکھا جائے۔ خواہ ان کا نام جادو رکھا جائے۔ قرآن کریم اس کا مخالف ہے اور اس قسم کے معجزات نہ پہلے انبیاء کی طرف منسوب کرنا جائز سمجھتا ہے اور نہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسے معجزات منسوب کرتا ہے اس سے زیادہ احمقانہ بات کیا ہوگی کہ خدا تعالےٰ ایک قانون دنیا میں جاری کرتا ہے اور پھر اس قانون کو خود ہی توڑ کر رکھ دیتا ہے کوئی معقول انسان بھی تو ایسے افعال نہیں کرتا۔ اس قسم کی باتیں خدا تعالیٰ کے نبیوں کی طرف منسوب کرنا ان کی عزت کو نہیں بڑھاتا۔ بلکہ انکو نعوذ باللہ من ذالک بیوقوفوں کے زمرہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور ہر عقلمند انسان کا کام ہے کہ اس بات کا مقابلہ کرے۔ اور اس چیز کو خوبی نہیں بلکہ الزام سمجھے اور اسکا ردّ کرے۔ باقی رہا یہ کہ خدا تعالیٰ بعض ایسے افعال اپنے انبیاء کے ذریعہ سے صادر کرادیتا ہے جو خدا تعالےٰ کے قانون قدرت میں کوئی رخنہ نہیں ڈالتے اور عقل کے خلاف نہیں ہوتے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور قرآن کریم اس بات کا مدعی ہے کیا غیب کا علم معجزہ نہیں۔ کیا غیر معمولی حالات میں کسی کمزور انسان کو دنیا پر غالب کردینا یہ معجزہ نہیں۔ پھر جبکہ علاوہ قرآن کریم کے معجزہ کے قرآن کریم اس بات کا بھی مدعی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر علم غیب ظاہر

کیا جاتا تھا۔ اور اس بات کا بھی مدعی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے خدا تعالیٰ اپنی قدرتیں اور اپنی تائیدیں ظاہر کیا کرتا تھا تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت معجزات کا انکار کرتا ہے۔

قرآن کریم تو بار بار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف معجزات منسوب کرتا ہے۔ کیا جب ایسے حالات میں مکہ والوں کی مخالفت کی خبر دی گئی تھی جبکہ اُن کی مخالفت کا کوئی امکان نہیں تھا، یا جب ہجرت کی خبر دی گئی اور اس کا سنہ تک بتا دیا گیا یا جب قرآن کریم میں بدر کی جنگ کے واقعہ ہونے سے سالہا سال پہلے بدر کی جنگ کی خبر دی گئی اور اس کے سال تک بھی خبر دی گئی اور اس میں مسلمانوں کے جیتنے اور کفار کے ہارنے کی خبر دی گئی۔ یا جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہجرت کرنے کی خبر دی گئی اور پھر ایک غالب اور فاتح شخص کی حیثیت میں مکہ میں واپس لوٹنے کی خبر دی گئی یا جب قرآن کریم میں رومیوں کی خطرناک شکست کے بعد انکے دوبارہ کامیاب ہو جانے اور ایرانیوں کے شکست کھانے کی خبر دی گئی یا جب قرآن کریم نے اسلام کے تمام عرب میں پھیل جانے کی خبر دی اور پھر دنیا کے دوسرے تمام ادیان پر غالب آجانے کی خبر دی اور آئندہ واقعات نے ان تمام باتوں کی تصدیق کر دی تو کیا یہ معجزہ نہ تھا۔ اور کیا ان باتوں کے بیان کرنے کے بعد قرآن کریم یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔

قرآن کریم کی جن آیتوں سے معترضین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ درحقیقت اس کا باعث ان کی عربی سے ناواقفیت اور قرآن کریم کے اسلوب سے لاعلمی ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں جہاں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ ہمیں معجزہ کے بھیجنے سے کسی بات نے نہیں روکا سوائے اسکے کہ پہلے لوگ معجزات کا انکار کرتے چلے آئے ہیں۔ وہاں آیت کے یہ معنے نہیں جیسا کہ عیسائی مصنّفین نے سمجھا کہ اس وجہ سے ہم معجزہ دکھانے سے رُک گئے ہیں بلکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ معجزہ دکھانے میں روک ہی کونسی ہے۔ صرف اتنی ہی روک ہو سکتی ہے کہ پہلے لوگوں نے معجزوں کا انکار کیا۔ تو یہ کوئی روک نہیں، باوجود اس کے کہ ابتدائی انبیاء کے دشمنوں نے ان کے معجزوں کو ردّ کیا۔ ان کے بعد آنیوالے انبیاء کو بھی معجزات ملتے رہے۔ پھر وجہ کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو معجزات نہ ملیں۔

یا جب کفار کے مطالبہ پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہا جاتا ہے کہ میں تو تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ تو اس میں یہ نہیں بتایا جاتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر معجزات ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ اس جگہ صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ معجزہ دکھانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام نہیں خدا تعالیٰ کا کام ہے کیا اس زبردست حقیقت کا اظہار قرآن کریم کی شان بڑھاتا ہے یا گھٹاتا ہے وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے خدائی کے اختیار بندوں کو دیدیئے ہیں وہ سچائی کے پیرو کہلا سکتے ہیں یا وہ جو اپنی بشریت کا اظہار کرتے ہوئے اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ اپنے پیارے بندوں کے واسطہ سے معجزہ دکھاتا ہے۔

علاوہ پیشگوئیوں کے قرآن کریم میں دوسری قسم کے معجزات کا بھی ذکر آتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ کا ذکر آتا ہے کہ غارِ ثور میں جب آپ پناہ گزین تھے، تو مکہ والے کھوجیوں کو

لے کر آپؐ کا کھوج نکالتے ہوئے غار ثور تک پہنچ گئے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس وقت حضرت ابوبکرؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر گھبرائے مگر آپؐ نے فرمایا۔ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (توبہ ع آیت ۴۱) گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے۔ دشمن ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیا یہ معجزہ نہیں جس کو قرآن کریم بیان کرتا ہے کیا دنیا اس کی مثال پیش کر سکتی ہے۔ دو آدمی بے سروسامان ایک غار میں بیٹھے ہیں۔ دشمن اُن کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا ہے اور یونہی رسمی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی کے بھاگنے کو اپنی شکست تصوّر کرتا ہے اور اسے اتنا اہم معاملہ سمجھتا ہے کہ وہ آپؐ کے پکڑے جانے پر سَو اونٹ کا انعام مقرر کرتا ہے، لیکن باوجود اسکے کہ کھوجی کہتا ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کھوج یہاں تک آتا ہے، آگے نہیں جاتا۔ مکّہ کے لوگوں کی آنکھوں اور اُن کے دلوں پر خدا تعالیٰ ایسا قبضہ کر لیتا ہے کہ تین میل تعاقب کرنے کے بعد اور اتنا انعام شائع کر دینے کے بعد اُن میں سے کسی شخص کو توفیق نہیں ملتی کہ وہ غار کے اندر جھانک سکے اور وہیں سے سب مکّہ والے لوٹ جاتے ہیں۔ اس سے بڑا معجزہ دنیا میں اور کیا ہوگا۔ پھر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ جنگ بدر کے متعلق فرماتا ہے کہ اس موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کی ایک مٹھی پھینکی اور اُس کے ساتھ دشمن تہ وبالا ہوگیا (انفال آیت ۱۸) حدیثوں سے اس واقعہ کی تفصیل یُوں معلوم ہوتی ہے کہ جب بدر کی جنگ شدّت اختیار کر رہی تھی اور کفّار کا زور بڑھ رہا تھا، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کنکروں کی ایک مٹھی اٹھا کر دشمنوں کی طرف پھینکی اور فرمایا شَاھَتِ الوُجُوہ (طبری و زرقانی) دشمنوں کے مُنہ بگڑ جائیں۔ تب خدا تعالیٰ نے آپؐ کے اس فعل کے ساتھ ہی ایک تیز آندھی چلا دی جسکی وجہ سے اس میدان سے کہ جس میں مسلمان کھڑے تھے۔ ریت کے تودے اُڑ اُڑ کر کفار کی آنکھوں میں پڑنے شروع ہوئے اور وہ دیکھنے سے معذور ہوگئے اور اُن کے تیر مخالف ہوا کی شدّت کی وجہ سے آدھے راستے میں ہی گرنے لگ گئے اور مسلمانوں کو ایک غیر معمولی طاقت اور قوت حاصل ہوگئی۔ کیا یہ معجزہ نہیں اور کیا اس واقعہ کو بیان کرکے قرآن کریم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف معجزہ منسوب نہیں کیا۔ ہاں قرآن کریم اس قسم کی جاہلانہ باتیں نہیں کہتا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حقیقی مُردے زندہ کیا کرتے تھے۔ یا سورج اور چاند کی رفتار کو ٹھہرا دیا کرتے تھے۔ یا دریاؤں کو کھڑا کر دیتے تھے یا پہاڑوں کو چلایا کرتے تھے۔ یہ تو پنگھوڑے میں کھیلنے والے بچّوں کی کہانیاں ہیں۔ ان باتوں کو قرآن کریم نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتا ہے نہ کسی اور نبی کی طرف منسوب کرتا ہے بلکہ اگر پہلی کتب میں اس قسم کی باتیں بیان بھی ہوئی ہیں، تو قرآن کریم ان کی تشریح کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ باتیں محض استعارۃً ہیں لوگوں نے ان کو حقیقی رنگ دینے میں غلطی کی ہے۔

قرآنی تعلیم کے اصول

قرآن کریم کو دوسری تمام کتب پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ مذہب کے متعلق سب کے سب سوالات کو حل کرتا ہے اور مذہب کے اصول کو نمایاں طور پر پیش کرکے لوگوں کی توجہ اس طرف پھراتا ہے کہ مذہب کا کیا دائرہ ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے۔ تورات کو پڑھ جاؤ، انجیل کو پڑھ جاؤ۔ ویدوں کو پڑھ جاؤ، ژندواوستا کو

پڑھ جاؤ یا اور کسی کتاب کو پڑھ جاؤ، یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک لمبے مظاہرۂ قدرت کے درمیان کسی وقت کوئی شخص آ پہنچا ہے اور اس نے اس مظاہرہ کو اس وقت سے بیان کرنا شروع کر دیا ہے جب سے اس کی نظر اُس پر پڑی ہے، لیکن قرآن کریم مذہب کو اس رنگ میں پیش نہیں کرتا۔ وہ خلق کی حکمت اور اس کی پیدائش کے ساتھ تعلق رکھنے والے سب امور کو بیان کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے دنیا کو کیوں پیدا کیا ہے انسان کے پیدا کرنے کی اسکی غرض کیا ہے۔ اس غرض کے پورا کرنے کے لیے کونسے ذرائع کو اختیار کرنا ضروری ہے خود اللہ تعالیٰ کا وجود کیا ہے اور کیسا ہے، اس کی کیا کیا صفات ہیں اور وہ صفات کس طرح دنیا میں جاری ہوتی ہیں۔ بنی نوع انسان کی پیدائش کا مقصد بتاتے ہوئے اس نے اس نظام کی تشریح کی ہے جو اس دنیا کو چلانے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ وہ ایک طرف تو یہ بتاتا ہے کہ جسم انسانی کے ارتقاء اور نشوونما کے لیے خدا تعالیٰ نے دنیا میں ایک قانونِ قدرت جاری کیا ہے جو انسان کے جسم اور اس کے دماغ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور یہ تمام قانون قدرت خدا تعالیٰ کے ملائکہ میں سے ایک قسم کے ملائکہ کے سُپرد ہے۔ دوسری طرف انسانی رُوح کی ترقی کے لیے اور اس کی بصیرت کو جلا بخشنے کے لیے اُس نے قانونِ شریعت کو قائم کیا ہے۔ یہ قانونِ شریعت ملائکہ کی ایک دوسری قسم کے ذریعہ سے دنیا میں نازل ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کے انبیاء پر نازل ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ شریعت ایک مکمّل قانون کی صورت میں نازل ہوتی ہے۔ کبھی ایک جزوی اصلاح کی صورت میں نازل ہوتی ہے اور کبھی انسانی تشریحات سے بگاڑی ہوئی شکل کو دوبارہ بحال کرنے کی صورت میں نازل ہوتی ہے۔ یعنی کبھی اللہ تعالیٰ کے نبی اس لیے آتے ہیں کہ اُن کے ذریعہ سے ایک نئی شریعت قائم کی جائے۔ کبھی اس لیے آتے ہیں کہ پُرانی شرائع کی بعض غلطیوں کی اصلاح کی جائے۔ کبھی اس لیے آتے ہیں کہ شریعت کے معنے کرنے میں جو لوگ غلطی کرنے لگ جاتے ہیں۔ اُن کی اصلاح کریں۔ پھر وہ شریعت کی حکمتیں بیان کرتا ہے کہ کیوں خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت کا آنا ضروری ہے اس کے کیا فوائد ہیں۔ اور شریعت انسان کی ترقی میں کیا مدد دیتی ہے۔ وہ صفات اور ذات کا فرق بیان کرتا ہے اور اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا کہ:

"ابتداء میں کلام تھا۔ اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا۔" (یوحنا باب آیت ۱)

وہ سخت غلطی خوردہ ہیں۔ صفت ذات کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ صفت صفت ہی ہے اور ذات ذات ہی ہے۔

قرآن کریم انسان کے مختار اور مجبور ہونے کے متعلق بھی روشنی ڈالتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس حد تک انسان مجبور ہے اور کس حد تک مختار ہے اور پھر وہ اس پر روشنی ڈالتا ہے کہ انسان اس حد تک مجبور نہیں ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جوابدہی سے بری ہو جائے۔ یا اس کی اصلاح نہ ہو سکے۔ ہاں وہ اس حد تک مجبور ضرور ہے کہ اس دائرۂ عمل سے باہر نہیں جا سکتا جو خدا تعالیٰ نے اس کے لیے تجویز کیا ہے۔ انسان اپنی ساری کوششوں کے بعد انسان ہی رہے گا نہ اُسے جمادات کی طرح بنایا جا سکتا ہے نہ اُسے فرشتوں کی طرح بنایا جا سکتا ہے لیکن اسے اپنے دائرہ کے اندر اندر بہت کچھ طاقتیں حاصل ہیں اور بحیثیت انسان وہ کسی صورت میں بھی اصلاح اور نصیحت کے دائرہ سے باہر نہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ پر ایمان کیسا

لانا چاہیئے۔ اس کی ہستی کے ثبوت کیا ہیں۔ اور وہ اس امر پر زور دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہی تاریکی کے وقتوں میں اپنا کلام نازل کرکے اور اپنی غیر معمولی قدرتوں کو ظاہر کرکے اپنی ہستی کو ثابت کرتا رہتا ہے اور یہی اُسکے وجود کا حقیقی ثبوت ہے پس انبیاء اور اُن کے کامل اتباع کا وجود خدا تعالیٰ کی ہستی کے ثابت کرنے کے لیے دنیا میں نہایت ضروری ہے اگر خدا تعالیٰ انبیاءؑ اور اُن کے اتباع کے آئینہ میں اپنی شکل نہ دکھاتا رہے تو دنیا شکوک وشبہات کے گڑھے میں گر جائے اور خدا تعالیٰ کا وجود دنیا سے مٹ جائے پس جب تک دنیا قائم ہے خدا تعالیٰ سے کلام پانیوالے اور اس کے مکالمہ مخاطبہ سے مشرف ہونے والے آدمی دنیا میں آتے رہیں گے اور یہ سلسلہ کبھی بھی ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایمان کا قیام اس ذریعہ سے ہے کہ خدا تعالیٰ ابتدائے عالم سے لیکر مسیحؑ تک اور مسیحؑ سے لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کلام کرتا چلا آیا ہے۔ اُسی طرح کہ جس طرح کہ وہ پیدا کرتا چلا آیا ہے جس طرح وہ سنتا چلا آیا ہے جس طرح وہ دیکھتا چلا آیا ہے وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی مخلوق کی انتہاء تک اپنے خاص خاص بندوں سے کلام کرتا چلا جائیگا اور اپنی ذات کو دنیا پر ظاہر کرتا رہے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ مسیحؑ یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تو وہ گویا ہو اور اسکے بعد وہ گونگا ہو گیا ہو۔ جس طرح یہ نہیں ہوسکتا کہ مسیح اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تو وہ بینا تھا مگر اس کے بعد اندھا ہو گیا۔ یا مسیح اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تو وہ خالق تھا مگر اسکے بعد اس سے صفت خلق جاتی رہی۔ یا مسیحؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تو وہ طاقتور تھا مگر اس کے بعد اسکی طاقت سلب ہو گئی۔ کون عقلمند اس بات کو تسلیم کرسکتا ہے کہ خدا پہلے طاقتور تھا اب کمزور ہو گیا ہے یا خدا پہلے بینا تھا اب اندھا ہو گیا ہے یا مسیحؑ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے وہ خالق تھا اس کے بعد پیدائش کی طاقت اسکے ہاتھوں سے نکل گئی۔ یا مسیحؑ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک تو وہ علیم تھا اس کے بعد اس کا علم جاتا رہا تعجب کی بات ہے کہ باوجود اسکے کہ حقیقت اتنی واضح ہے۔ عیسائی، یہودی، زرتشتی اور آجکل کے غلطی خوردہ مسلمان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا کلام زرتشت، پرانے اسرائیلی نبیوں، مسیحؑ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آکر ختم ہو گیا ہے۔ قرآن اسکو رد کرتا ہے قرآن خدا تعالیٰ کے زندہ ہونے کا ثبوت ہی اسبات کو قرار دیتا ہے کہ خدا اپنے نیک بندوں سے ہمیشہ کلام کرتا رہیگا جس طرح وہ پہلے کلام کیا کرتا تھا۔ اور اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ظہور نے ایکدفعہ پھر اس قرانی صداقت پر مہر لگادی ایک دفعہ پھر خدا تعالیٰ کا کلام آپ پر اور آپکے سچے اتباع پر نازل ہوکر دنیا کے اُن لوگوں کو چیلنج دے رہا ہے جو لفظاً نہیں تو عقیدۃً ضرور خدا تعالیٰ کو گونگا بنا رہے تھے۔

قرآن اس بحث کو بھی اُٹھاتا ہے کہ خدا تعالےٰ کا کلام کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام اقوام میں خدا تعالےٰ کے نبی آتے رہے ہیں۔ اور وہ اس سوال کو بھی اُٹھاتا ہے کہ یکے بعد دیگرے خدا تعالیٰ کے نبی کیوں آتے رہے اور کیوں نہ ایک کامل کتاب ابتدائی زمانہ میں ہی نازل ہوگئی۔ پھر قرآن کریم توحید کے مسئلہ پر ایک سیر کن بحث کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ خدا تعالےٰ کے ایک ہونے کے کیا ثبوت ہیں۔ کیوں ایک سے زیادہ خدا تسلیم کرنا عقل کے خلاف ہے، اور واقعہ کے بھی خلاف ہے اور یہ کہ دنیا کو توحید کے عقیدہ سے کیا کچھ

روحانی فائدہ پہنچتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی ذات کے بعد نبوّت کا مقام ایک ایسا مقام ہے جو دنیا کیلئے ہمیشہ زیر بحث چلا آیا ہے۔ نبی یا اس کے ہم معنے الفاظ کا استعمال تو تمام کتابوں میں پایا جاتا ہے، لیکن کوئی ایک کتاب بھی نہیں جو یہ بتاتی ہو کہ اس لفظ کی تشریح کیا ہے ہم کس شخص کو نبی کہہ سکتے ہیں اور کس شخص کو نبی نہیں کہہ سکتے اور نبوّت کی کیا کیا اقسام ہیں قرآن ہی ہے جو بتاتا ہے کہ نبی کی تعریف کیا ہے نبیوں کی کتنی قسمیں ہیں نبی اور غیر نبی میں کیا فرق ہے۔ نبی کے فرائض کیا ہیں۔ نبی اور خدا میں کیا فرق ہے۔ نبی کی بعثت کی غرض کیا ہے۔ نبی اور اُسکی امت کے درمیان کیسا تعلق ہونا چاہیئے۔ نبی کے حقوق کیا ہیں نبی اور اُسکے منکروں کے تعلقات کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے کیا نبی خدا اور بندوں کے درمیان ایک دیوار حائل کی حیثیت رکھتا ہے یا وہ محض ایک ممدّ اور مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم ملائکہ کے متعلق تفصیلی بحث کرتا ہے۔ ملائکہ کے کیا کام ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ملائکہ کو کیوں بنایا ہے۔ اسی طرح وہ یہ بحث بھی کرتا ہے کہ شیطان کیا ہے۔ اس کا وجود بنی نوع انسان کے لیے کیوں ضروری ہے۔ شیطان کے وساوس سے انسان کس طرح بچ سکتا ہے۔ شیطان اور انسان کا کیا تعلق ہے۔ کیا شیطان انسان کو مجبور کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا۔ اور وہ بتاتا ہے کہ جس طرح ملائکہ انسان کے دل میں نیک تحریکیں پیدا کرتے ہیں اسی طرح شیاطین بد تحریکیں پیدا کرتے ہیں لیکن انسان کے اندر دونوں طاقتیں موجود ہیں۔ وہ ملائکہ کی نیک تحریکوں کو قبول بھی کر سکتا ہے اور اُن کا مقابلہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ شیطان کی بد تحریکوں کو قبول بھی کر سکتا ہے اور اُن کا مقابلہ بھی کر سکتا ہے یہ دونوں وجود انسان کو کامل کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور اُس کے وجود کو ایک حقیقت عطا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ملکی اور شیطانی تحریکوں کے بغیر وہ کسی انعام کا مستحق نہیں بن سکتا اور نہ وہ کسی سزا کا مستحق بن سکتا ہے اگر شیطان انسان پر اثر ڈالنے والا نہ ہو، تو وہ کسی انعام کا بھی مستحق نہیں اور اگر ملکی تحریکیں دنیا میں موجود نہ ہوں تو انسان کسی سزا کا بھی مستحق نہیں بدی ہی کا مقابلہ انسان کو انعام کا مستحق بناتا ہے اور نیکی سے مُنہ موڑنا ہی انسان کو سزا کا مستحق بناتا ہے۔ قرآن کریم اس سوال پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ دُعا کیا ہے۔ دُعا کرنے کے طریق کیا ہیں دعائیں کن حالات میں قبول ہوتی ہیں اور کن حالات میں قبول نہیں ہوتیں۔ دعاؤں کی قبولیّت کا دائرہ کیا ہے۔ وہ نیکی اور بدی پر بھی بحث کرتا ہے کہ نیکی کیا چیز ہے اور بدی کیا چیز ہے ان کی حدیں کہاں ملتی ہیں حقیقی نیکیاں کیا ہیں اور حقیقی بدیاں کیا ہیں نسبتی نیکیاں کیا ہیں اور نسبتی بدیاں کیا ہیں۔ وہ نیکی اور اخلاق فاضلہ پیدا کرنے کے طریق بتاتا ہے وہ بدیوں سے بچنے کے طریق بتاتا ہے وہ نیکیوں اور بدیوں کے منبع پر روشنی ڈالتا ہے اور بدیوں کے منبع کو بند کرنیکی تعلیم دیتا ہے۔ وہ توبہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ توبہ کی حقیقت بتاتا ہے توبہ کے فوائد بتاتا ہے توبہ کے مواقع بتاتا ہے اور توبہ کی شرائط بیان کرتا ہے۔ اسی طرح وہ جزا اور سزا کے متعلق بھی پوری روشنی ڈالتا ہے جزا کن حالات میں دیجاتی ہے، سزا کن حالات میں دی جاتی ہے اور جرم اور سزا کی نسبت کیا ہونی چاہیئے۔ پھر وہ اسی سلسلہ میں نجات کی تفصیلیں بیان کرتا ہے۔ نجات کیا ہے اور کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ کیا ہر ایک بدی انسان کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ نجات تین قسم کی ہے، کامل، ناقص اور ملتوی۔ کامل نجات انسان اسی دنیا سے حاصل کرتا ہے۔ ناقص نجات والا انسان مرنے کے بعد تدریجی طور پر اپنی

نجات کے سامانوں کو مکمل کرتا ہے۔ اور ملتوی نجات وہ ہے جو سزائے جہنّم لے لینے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس آخری قسم کی نجات کے بارہ میں اسلام اور عیسائیت میں ایک رنگ میں اتحاد بھی ہے اور ایک رنگ میں اختلاف بھی ہے۔ عیسائیت صرف کمزور عیسائیوں کو جو اپنے عقیدہ میں پکے ہوں اس دوزخ کا مستحق قرار دیتی ہے کہ جس میں سے نکل کر انسان جنت میں پہنچ جاتا ہے لیکن اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر انسان نجات ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور خواہ کوئی کیسا ہی کافر ہو مختلف قسم کے علاجوں کے بعد جن میں سے ایک علاج جہنم بھی ہے وہ آخر جنّت کو پالیگا۔ قرآن نجات کے بارہ میں وزنِ اعمال پر زور دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ نیک اعمال کا بڑھ جانا انسان کی نجات کیلئے اس کی سچی کوشش پر دلالت کرتا ہے اور جو شخص سچی کوشش کرتا ہوا مر جاتا ہے وہ اس سپاہی کی طرح ہے جو فتح سے پہلے مارا جاتا ہے۔ موت جس طرح سپاہی کے اختیار میں نہیں، اسی طرح نیکی کی راہ اختیار کرنیوالے کی موت بھی اس کے اختیار میں نہیں۔ موت خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اگر نیکی کے لیے جد وجہد کرتے ہوئے ایک شخص مرجاتا ہے تو یقیناً وہ شخص خدا کے فضل کا مستحق ہے سزا کا مستحق نہیں۔ کوئی قوم اپنے سپاہیوں کو اس بات پر ملامت نہیں کرتی کہ وہ فتح پانے سے پہلے کیوں مارے گئے بلکہ فتح کے لیے سچی کوشش کرنیوالا سپاہی عزّت پاتا ہے اسی طرح وہ شخص جو شیطان کو زیر کرنے کیلئے پورا زور لگاتا ہے کبھی شیطان اُس پر غالب آجاتا ہے اور کبھی وہ اُس پر غالب آجاتا ہے مگر وہ دل نہیں ہارتا، وہ ہمّت نہیں ہارتا وہ ہتھیار نہیں پھینکتا وہ خدا تعالیٰ کی بادشاہت کے قیام کے لیے شیطان سے لڑتا چلا جاتا ہے ایسا انسان قرآن کے نزدیک یقیناً نجات کا مستحق ہے اُسکی کمزوری اُس کے لیے ایک زیور ہے کیونکہ وہ باوجود کمزور ہونے کے خدا کے سپاہیوں میں شامل ہونے سے ڈرا نہیں اور اپنی قربانی پیش کرنے سے ہچکچاتا نہیں۔ قرآن کریم روحانی ارتقاء کی منازل بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ روحانی مدارج کیا ہیں کتنے ہیں اور مختلف اخلاق کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے وہ روحانی مدارج کی تفصیل بیان کرتا ہے وہ بتاتا ہے کہ عفت کتنی اقسام کی ہے وہ بتاتا ہے کہ سخاوت کتنی اقسام کی ہے وہ سچائی کی اقسام بیان کرتا ہے وہ رحم اور حُسنِ سلوک کے مدارج بیان کرتا ہے تاکہ ہر طاقت و قوت کا انسان اپنے لیے ایک قریب کی منزل مقرر کر سکے اور اس طرح جہاں اُسکی حوصلہ افزائی ہو وہاں چھوٹی ترقی پر خوش ہونے کی غلطی میں وہ مبتلا نہ ہو جائے وہ ہر شخص کے قریب کی منزل اُسے بتاتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ اس سے اوپر ایک اور منزل بھی ہے۔ جب تم پہلی منزل طے کر لو تو تمہیں اوپر کی منزل کی طرف اپنا قدم بڑھانا چاہیئے اس طرح وہ قدم بقدم اور درجہ بدرجہ انسان کو اوپر لیے چلا جاتا ہے۔ قرآن انسان کے دماغی ارتقاء پر بھی روشنی ڈالتا ہے وہ بتاتا ہے کہ کس طرح انسان کا دماغی نشو ونما ہوتا ہے اور کس طرح خدا تعالیٰ کے نزدیک اُس کے دماغی نشو ونما کا بھی اس کے متعلق فیصلہ کرنے کے وقت لحاظ رکھا جاتا ہے وہ شخص جو ایک اچھے ماحول میں پلا ہے اور جس کے لیے نیکی کا رستہ آسان ہو گیا ہے وہ محض اپنے اعمال کی وجہ سے دوسرے پر فضیلت نہیں پائیگا، بلکہ دوسرا شخص جس کا دماغی نشو ونما اس کے برابر نہیں اور جس کا ماحول اس جیسا اچھا نہیں اُس کے رستہ کی روکوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا اور فیصلہ کے وقت اُنہیں بھی مدّ نظر رکھا جائیگا۔ قرآن ایمان پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایمان کیا چیز ہے۔ ایمان کی علامتیں کیا ہیں۔ ایمان کے حصول کے ذرائع کیا ہیں وہ قانونِ شریعت اور اُسکی ضرورت کے متعلق بھی

روشنی ڈالتا ہے اور بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا قانون بھی بغیر حکمت کے نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ اپنے بندے کو کوئی حکم اس لیے نہیں دیتا کہ وہ اسے سزا دے اور اس پر بوجھ ڈالے بلکہ وہ ہر حکم اس لیے دیتا ہے کہ وہ انسان کی ترقی کی منزل میں مدد اور معاون ہوتا ہے اور اسکی تمدّنی حالت کو سدھارنے والا ہوتا ہے قرآن جبری حکموں کا قائل نہیں وہ اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا بھی جس شخص کو سزا دے اس شخص کو اپنی ذات سے الزام کو دُور کرنے کا پورا موقع ملنا چاہیئے اور اس کے اوپر پوری طرح حجّت تمام ہونی چاہیئے خواہ کوئی کتنا بڑا مجرم ہو مگر اُس پر حجّت تمام نہ ہو تو قرآن اُس کی سزا کا قائل نہیں۔

عبادت کی چار اصولی قسمیں

قرآن عبادت الٰہی کے متعلق بھی تفصیلی روشنی ڈالتا ہے وہ عبادات کو چار اصولی حصوں میں تقسیم کرتا ہے (۱) وہ عبادت جس کی غرض خدا تعالیٰ کے ساتھ محبّت اور اس کے ساتھ تعلّق بڑھانا ہے (۲) وہ عبادت جو انسان کے جسم کی اصلاح کے لیے اور اُسے خدا تعالیٰ کیلئے قربانیاں کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے ہوتی ہے (۳) وہ عبادت جو انسانوں کے اندر مرکزیت کی طرح پیدا کرنے کے لیے اور اتحاد و یگانگت کا احساس پیدا کرنے کے لیے مقرر کی جاتی ہے (۴) وہ عبادت جو بنی نوع انسان کی اقتصادی حالتوں میں یکسوئی اور یکرنگی پیدا کرنے کے لیے مقرر کی جاتی ہے۔ یہ چار اصول عبادت کے اسلام مقرر کرتا ہے اور ان چار اصول کے مطابق اس نے مختلف قسم کی عبادتیں مقرر کی ہیں۔ ان اصول کو تجویز کرکے اسلام نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ عبادت صرف اسی بات کا نام نہیں کہ انسان خدا تعالیٰ کی طرف دھیان دے بلکہ بنی نوع انسان کی طرف توجہ کرنے سے بھی خدا تعالیٰ کی عبادت کا فرض ادا ہوتا ہے اسی طرح اسلام نے یہ نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ عبادات صرف انفرادی نہیں بلکہ وہ اجتماعی بھی ہوتی ہیں۔ انسان کا صرف یہی فرض نہیں کہ وہ خدا کے سامنے آپ پیش ہو جائے، بلکہ انسان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کو بھی خدا کے سامنے پیش ہونیکے لیے تیار کرے۔ اس لیے قرآن کے جتنے احکام عبادات کے متعلق ہیں وہ انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی ہیں۔

اسلامی نماز اور مسجدیں

خدا تعالیٰ کی محبّت پیدا کرنے اور براہِ راست خدا تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسلام میں نماز مقرر کی گئی ہے یہ نماز دنیا کے اور تمام مذاہب کی عبادتوں سے مختلف ہے اس نماز میں انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور رسم و نمائش کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ عبادتوں کے لیے جس قسم کے گرجے اور مندر پہلے زمانہ میں بنا کرتے تھے اور جو جو تکلفات ان کے متعلق کیے جاتے تھے قرآن نے اُن سب کو منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن خدا تعالیٰ کی عبادت کے لیے زمین کے ہر ٹکڑہ کو مستحق عبادت سمجھتا ہے۔ کوئی ٹکڑہ اس بارہ میں دوسرے سے فضیلت نہیں رکھتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس قرآنی حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے جعلت لی الارض مسجداً۔ خدا تعالیٰ نے ساری زمین کو ہی میرے لیے مسجد بنا دیا ہے۔ آپؐ کے اِس فقرہ کے کئی معنے ہیں۔ مگر ایک معنی یہ بھی ہیں کہ دنیا کے ہر حصّہ میں اور ہر جگہ پر مسلمان نماز پڑھ سکتا ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی گرجا میں جائے یا مندر میں جائے۔ اس کے لیے ضروری نہیں

کہ ضرور کوئی پادری اُس کو نماز پڑھانے والا ہو۔ اسلام پادریوں اور پنڈتوں کا قائل نہیں۔ وہ ہر نیک انسان کو خدا تعالیٰ کا نمائندہ سمجھتا ہے اور ہر نیک انسان کو نماز میں راہنمائی کرنے کا حق دیتا ہے۔ بیشک اسلام میں مساجد بھی ہیں لیکن وہ مساجد اس لیے نہیں کہ وہ جگہیں نماز کے لیے زیادہ مناسب تھیں بلکہ مساجد صرف اس لیے ہیں کہ کسی نہ کسی جگہ پر لوگوں کو جمع ہو کر اجتماعی نماز بھی ادا کرنی چاہیئے۔ مساجد اجتماع کی سہولت کا ذریعہ ہیں کوئی خاص رسوم اختیار نہیں کی جاتیں جس سے ان جگہوں کو متبرک کیا جاتا ہو جیسا کہ مندروں اور گرجوں کو کیا جاتا ہے۔ ہر چار دیواری جس میں مسلمان جمع ہو کر اجتماعی طور پر خدا تعالیٰ کی عبادت کریں وہ مسجد کہلاتی ہے اس کے لیے کسی شکل کی ضرورت نہیں نہ وہاں کوئی آلٹر ہے نہ مقدسوں کی کوئی نشانیاں ہیں سادگی سے مسلمان ایک جگہ پر جمع ہوتے ہیں انکی عبادت تمام دنیوی آلائشوں سے منزّہ اور پاک ہوتی ہے۔ کوئی باجا نہیں ہوتا کوئی گانا نہیں ہوتا۔ کوئی ناچ نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے چغے پہن کر پادری نہیں آتے۔ شمعیں جلائی نہیں جاتیں۔ سریلے ارغنونوں اور خوشبودار دھونیوں سے لوگوں کے دماغوں کو مسحور کرنیکی کوشش نہیں کی جاتی۔ کھڑکیوں کے آگے لٹکے ہوئے پردے انسان کو ایک تاریک ماحول پیش کر کے ڈرانے کی کوشش نہیں کرتے۔ بزرگوں کی تصویریں انہیں خدا تعالیٰ کی جگہ اپنی طرف بلا نہیں رہی ہوتیں۔ سب مسلمان وقت مقررہ پر ایک جگہ پر جمع ہوتے ہیں اور صفیں باندھ کر یہ بتانے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جہاں ہم اپنے گھروں میں انفرادی نمازیں پڑھ کر آئے ہیں وہاں ہم قومی طور پر بھی خدا تعالیٰ کی عبادت قائم کرنے کیلئے حاضر ہیں بغیر کسی باجے گاجے کے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور اُس کی ثنا کرتے ہیں اور اُس کے حضور میں دعائیں کرتے ہیں اور اپنی اصلاح اور روحانی اور جسمانی ترقی اور اپنے دوستوں اور عزیزوں اور باقی سب دنیا کی جسمانی اور روحانی ترقی کے لیے اس کے سامنے درخواستیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی اس سادہ نماز کی شان یہ ہوتی ہے کہ نماز کے وقت میں کوئی مومن اِدھر اُدھر نہیں دیکھ سکتا نہ نماز میں کسی اور سے بات کر سکتا ہے۔ غریب اور امیر ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ اس کا خادم کھڑا ہونے کا حق رکھتا ہے اُس کا کناس بھی اُس کے ساتھ کھڑا ہونے کا حق رکھتا ہے۔ نماز کے وقت میں ایک جج اور ایک مجرم۔ ایک جرنیل اور ایک سپاہی پہلو بہ پہلو کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کی طرف انگلی نہیں اُٹھا سکتا کوئی کسی کو اس کی جگہ سے پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ تمام کے تمام خاموشی سے خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور امام کے اشارے پر رکوع اور سجود اور قیام کے احکام کو پورا کرتے ہیں بعض وقت امام قرآن شریف کی آیتیں بلند آواز سے پڑھتا ہے تاکہ ساری جماعت ایک خاص نصیحت کو اپنے سامنے لے آئے اور نماز کے بعض حصوں میں ہر شخص اپنے اپنے طور پر مقررہ دعائیں یا وہ دعائیں جن کو وہ چاہتا ہے ادا کرتا ہے۔ مساجد مسلمانوں کے اجتماع کی جگہ بھی ہیں۔ اور مساجد مسلمانوں کے تمام قسم کے مذہبی اور علمی کاموں کو سر انجام دینے کی جگہ بھی ہیں۔ مساجد اُن کے مدارس بھی ہیں اور مساجد اُن کے نکاح خانے بھی ہیں اور مساجد اُن کی قضا اور فیصلہ کے مقام بھی ہیں جہاں اُن کے مقدمات کے فیصلے کیے جاتے ہیں اور مساجد جنگی اور اقتصادی تدابیر کے فیصلہ کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ نماز کے علاوہ ایک قسم کی عبادت جس میں ذکر الٰہی کیا جاتا ہے وہ بھی ہے جبکہ انسان خاموشی سے بیٹھ کر اُس کو یاد کرتا ہے اور اس کی صفات کو اپنے دل میں جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسلامی روزہ

دوسری قسم کی عبادت جس میں نفس کی اصلاح مدِّنظر ہوتی ہے، روزہ ہے۔ اسلامی روزہ بھی دوسرے لوگوں کے روزوں سے مختلف ہے۔ ہندو اپنے روزوں میں کئی چیزیں کھا بھی لیتے ہیں، پھر بھی اُن کا روزہ قائم رہتا ہے۔ عیسائیوں کے روزے بھی اسی قسم کے ہیں کسی روزے میں گوشت نہیں کھانا، کسی میں خمیری روٹی نہیں کھانی۔ اسلامی روزہ بھی نماز کی طرح انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ چنانچہ تمام مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ سال کے مختلف اوقات میں نفلی روزے رکھا کریں مگر رمضان کے مہینہ میں دنیا کے تمام مسلمانوں کو خواہ وہ کسی گوشہ میں رہتے ہوں ایک ہی وقت میں روزے رکھنے کا حکم ہے وہ صبح کو پَو پھٹنے سے پہلے کھانا کھاتے ہیں اور پھر سارا دن سورج کے ڈوبنے تک نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ سورج ڈوبنے کے بعد صبح تک ان کو کھانے پینے کی اجازت ہوتی ہے اُن سے امید کی جاتی ہے کہ وہ ان دِنوں میں جہاں کھانے وغیرہ سے پرہیز کریں وہاں اپنے نفس کو زیادہ سے زیادہ نیکی پر قائم کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ روزہ اُنہیں یہ سبق دیتا ہے کہ جب تم خدا کے لیے حلال چیزوں کو چھوڑ دیتے ہو تو حرام چیزوں کو چھوڑنا تمہارے لیے بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے یہ روزے تمام ایسے ممالک میں جہاں دن چوبیس گھنٹے سے کم ہے اور جہاں رات اور دن چوبیس گھنٹے کے اندر الگ الگ وقتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اس شکل میں ہیں جو اوپر بیان کی گئی ہے لیکن جن ملکوں میں رات اور دن چوبیس گھنٹوں سے لمبے ہو جاتے ہیں ان علاقوں میں رہنے والوں کے لیے صرف وقت کا اندازہ کرنے کا حکم ہے۔

حج بیت اللہ

تیسری قسم کی عبادت کی مثال حج کی ہے۔ حج مسلمانوں میں ایک مرکزیت کی رُوح پیدا کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے دنیا کے تمام صاحب استطاعت مسلمان ایک خاص وقت میں مکّہ مکرّمہ میں جمع ہوتے ہیں۔ اور اس طرح ہر سال عالم اسلام کو ایک جگہ پر جمع ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور اپنی اور باقی دنیا کی ضرورتوں کے متعلق غور کرنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر حج کے علاوہ ایک عمرہ کی عبادت بھی ہے جس میں کسی وقت کی شرط نہیں وہ انفرادی عبادت ہے۔ مختلف وقتوں میں جب بھی کسی کو توفیق حاصل ہوتی ہے وہ مکّہ میں جاتا اور اس فریضہ کو ادا کرتا ہے اس حکم سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مرکز کے قیام کے لیے مسلمانوں کو اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کی قربانیاں کرنی چاہئیں۔

زکوٰۃ وصدقہ خیرات

چوتھی قسم کی عبادت کی مثال صدقہ وخیرات ہے۔ یہ عبادت بھی اسلام نے انفرادی اور اجتماعی مقرر کی ہے اور فرضی اور نفلی مقرر کی ہے۔ ہر عید کے موقعہ پر رمضان کے بعد عید کی نماز سے پہلے ہر مومن کے لیے فرض ہے کہ وہ کم سے کم ڈیڑھ سیر گندم یا اور مناسب غلّہ خدا کے لیے غرباء کی امداد کی خاطر دے خواہ غریب ہو یا امیر۔ غریب اس میں سے دے جو اس کو اُس دن ملا ہو۔ اور امیر اس میں سے دے جو اس نے پہلے سے کما چھوڑا ہو۔ اس حکم کے سلسلہ میں ایک زکوٰۃ کا بھی حکم ہے جو ہر امیر پر واجب ہے ہر شخص جو کوئی روپیہ

اپنے پاس جمع کرتا ہے یا جانور تجارت کے لیے پالتا ہے اسپر ایک رقم مقرر ہے اسی طرح ہر کھیتی کی پیداوار پر ایک رقم مقرر ہے کھیتی کی پیداوار پر دسواں حصّہ اور تجارتی اموال پر اندازاً اڑھائی فیصدی (اس کے احکام تفصیلی مقرر ہیں مگر اس مضمون میں تفصیلات کی گنجائش نہیں) یہ اڑھائی فیصدی صرف نفع پر نہیں دیا جاتا بلکہ راس المال اور نفع سب پر دیا جاتا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ اسلام اس ذریعہ سے روپیہ جمع کرنے کو روکنا چاہتا ہے۔ زمین کے لیے دسواں حصّہ اور تجارتی مال کے اوپر اڑھائی فیصدی میں جو فرق ہے یہ بظاہر غیر معقول نظر آتا ہے مگر در حقیقت اس میں بڑی بھاری حکمت ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ زمین کی پیداوار پر ٹیکس دیا جاتا ہے اور تجارتی مال میں راس المال پر بھی ٹیکس ہوتا ہے چونکہ زمین کے رأس المال پر ٹیکس نہیں لگا۔ اس لیے پیداوار پر دسواں حصّہ لیا گیا۔ اور تجارتی مال میں چونکہ رأس المال پر بھی ٹیکس لگ گیا اس لیے صرف اڑھائی فیصدی نسبت رکھی گئی۔

دیگر امور ضروریہ کا ذکر قرآن مجید میں

قرآن شریف بنی نوع انسان کے باہمی معاملات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالتا ہے وہ تعاون باہمی کی ضرورت کو پیش کرتا ہے۔ انفرادیت اور اجتماعیت کی حُدود کو قائم کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ انفرادیت کے کیا حقوق ہیں اور اجتماعیت کے کیا حقوق ہیں وہ حکومت کی حقیقت اور اُسکے فرائض بیان کرتا ہے وہ حکومت کی ذمہ داریاں بیان کرتا ہے وہ رعایا اور حکومت کے تعلق پر روشنی ڈالتا ہے وہ مالک اور مزدور کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے اور بین الاقوامی تعلقات کے اصول بیان کرتا ہے۔ قرآن صراحتاً اور وضاحتاً حکم دیتا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہونی چاہیئے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اسی حکمت کے ماتحت وہ ایک طرف تو سود کو منع کرتا ہے جس کے ذریعہ سے بعض ہوشیار لوگ دنیا کی دولت اپنے پاس جمع کر لیتے ہیں اور دوسری طرف وہ ورثہ کے تقسیم کرنیکا حکم دیتا ہے اور اسبات کو جائز نہیں رکھتا کہ کوئی باپ یا ماں اپنی جائداد صرف ایک بیٹے کو دیدے تیسرے وہ زکوٰۃ کے ذریعہ اور صدقہ و خیرات کے ذریعہ مال و دولت امراء کے ہاتھ سے لیکر غریبوں تک پہنچاتا ہے چوتھے وہ گورنمنٹ کے روپیہ میں غرباء کا حق مقدم قرار دیتا ہے ان چار ستونوں پر وہ دنیا کی اقتصادی حالت کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ قرآن تعلیم پر اور دماغی نشوونما پر خاص زور دیتا ہے۔ وہ فکر اور غور کرنے کو مذہبی فرائض میں سے قرار دیتا ہے وہ لڑائیوں اور جھگڑوں سے روکتا ہے اور کسی حالت میں بھی حملہ میں ابتداء کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن کریم بین المذاہب تعلقات کے اوپر بھی بڑی تفصیلی روشنی ڈالتا ہے مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے بزرگوں کی ہتک کرنے سے روکتا ہے اور ایسے اعتراضوں سے منع کرتا ہے جو اعتراض خود معترض کے مذہب پر بھی پڑتے ہوں وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ سب مذاہب کا منبع خدا تعالیٰ ہی ہے صرف بعد کی تبدیلیوں کی وجہ سے مذاہب خراب ہوئے ہیں پس انکے نیک منبع کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کسی مذہب کو کلّی طور پر خراب نہیں کہنا چاہیئے۔ قرآن کریم میں عورتوں کے حقوق کی پوری طرح حفاظت کی گئی ہے قرآن کریم دنیا میں وہ پہلی کتاب ہے جس نے علی الاعلان اس بات کو صاف الفاظ میں واضح طور پر بیان کیا ہے کہ جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں

اسی طرح عورتوں کے مردوں پر حقوق ہیں وہ ماں باپ کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے وہ بھائی بہنوں کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے وہ بیوی اور خاوند کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے وہ بیٹوں اور بیٹیوں کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے وہ ہمسائیوں کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے وہ غرباء کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے وہ یتامیٰ کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے وہ بیواؤں کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے وہ دوستوں کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے وہ اجنبیوں کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے اُس اجنبی کے حقوق بھی جو میرا ہم ملک اور میرا ہموطن ہے اور اس اجنبی کے حقوق بھی جو کسی غیر ملک سے میرے پاس پناہ لینے کے لیے آتا ہے یا میرے ملک کی سیر کرنے کے لیے آتا ہے۔

قرآن دنیا سے ایک علیحدہ سیاست بھی پیش کرتا ہے قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے سب سے پہلے اس بات کا حکم دیا ہے کہ کسی شخص کو نسلی طور پر بادشاہت کرنے کا حق نہیں بلکہ حکومت ملک کی امانت ہے جو ملک کے تجویز کردہ حکام کے ہاتھوں میں جانی چاہیئے ڈیماکریسی جس کے اوپر آج یورپ فخر کرتا ہے اس کی بنیاد سب سے پہلے قرآن نے رکھی ہے۔ قرآن ایک طرف تنظیم اور اطاعت پر زور دیتا ہے اور دوسری طرف حکام کو دیانتداری سے اپنے فرائض ادا کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ قرآن سب سے پہلی کتاب ہے جو حکام کے اقتدار پر تبر رکھتی ہے قرآن اسے تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی ایک انسان بنی نوع انسان کی قسمتوں کا مالک بنے اور اگر وہ ان سے اچھا سلوک کرے تو اسکے متعلق یہ سمجھا جائے کہ وہ احسان کرتا ہے قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ حقوق عامۃ الناس کے ہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ امانتاً حکام کے سپرد کیے گئے ہیں۔ اور جب وہ اس امانت کو صحیح موقعوں پر اور صحیح طریق پر امانت رکھنے والوں کے سپرد کرتے ہیں تو وہ کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ صرف امانت والے کی امانت واپس کرتے ہیں وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ حکام کے انتخاب کے وقت جنبہ داری یا رعایت کا خیال بالکل نہ رکھا جائے بلکہ جس طرح حاکم کا فرض ہے کہ وہ عامۃ الناس کے حقوق کو صحیح طور پر ادا کرے اسی طرح عامۃ الناس کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسے شخص کو منتخب کریں جو اُن کے حقوق کو ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو جو شخص پارٹی بازی یا جنبہ داری کی روح کے ماتحت ایک غیر مستحق شخص کو آگے لاتا ہے وہ اُسکے افعال کی خرابیوں میں شریک ہے وہ یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ ظلم حاکم نے کیا ہے کیونکہ اس حاکم کے مقرر کرنے میں اس کا ہاتھ تھا پس یہ بھی اس کے ظلم میں شریک ہے۔

قرآن ہر حال میں اخلاقِ فاضلہ کے اظہار پر زور دیتا ہے

قرآن سیاست میں اخلاق فاضلہ پر زور دیتا ہے وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ اخلاق فاضلہ افراد کے لیے ہوتے ہیں حکومتوں کے لیے نہیں ہوتے بلکہ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ جس طرح افراد پر اخلاق فاضلہ کی ذمہ داریاں ہیں اسی طرح حکومتوں پر بھی اخلاق فاضلہ کی ذمہ داریاں ہیں سچ صرف ایک عام شہری ہی کے لیے قیمتی چیز نہیں بلکہ ایک سیاست دان کے لیے بھی ضروری ہے۔ ظلم ایک عامی آدمی کے لیے بُرا نہیں بلکہ ایک حکومت کے لیے بھی بُرا ہے حکومت کا یہی کام نہیں کہ وہ اپنے افراد کے ساتھ انصاف کا سلوک کرے بلکہ حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ جس طرح ہمسایہ ہمسائے سے عمدہ سلوک کرتا ہے وہ بھی اپنی ہمسایہ حکومتوں سے عمدہ سلوک کرے۔ اسلام مومن کو ہوشیار اور چوکس رہنے کا حکم دیتا ہے وہ جفاکشی کی تعلیم دیتا ہے وہ بزدلی سے منع کرتا ہے مگر تہور اور جاہلانہ جوش سے روکتا ہے۔ وہ عقل اور تدبیر سے کام لینے کا حکم دیتا ہے وہ خودکشی کو

ناجائز قرار دیتا ہے اور ایسے تمام افعال جو خودکشی کے مترادف ہوں اُن سے بھی منع کرتا ہے وہ مسلمان حکومتوں کو سرحدوں کی حفاظت رکھنے کا خاص طور پر حکم دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ جنگ میں کبھی ابتداء نہ کی جائے، لیکن اگر دشمن جنگ شروع کر دے تو پھر پیچھے کبھی نہ ہٹا جائے۔ وہ شب خون مارنے سے منع کرتا ہے معاہدے کی پابندی کا سختی سے حکم دیتا ہے اور صلح کے تمام مواقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن کریم اپنے ملک کے یا غیر ملک کے افراد کو آزادی سے محروم کرنے کی اجازت نہیں دیتا، وہ صرف جنگی قیدیوں کے پکڑنے کی اجازت دیتا ہے مگر اسکے لیے بھی وہ یہ شرط مقرر کرتا ہے کہ ہر قیدی اپنے حصّے کا جرمانہ ادا کرکے آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے۔ کسی شخص کو اجازت نہیں کہ وہ باوجود اسکے کہ کوئی قیدی اپنے جرمانہ کی رقم ادا کر دے پھر بھی اس کو قید رکھ سکے، لیکن اگر کوئی شخص جو ایک ظالمانہ جنگ میں شریک ہو جائے، اپنے حِصّہ کا جرمانہ ادا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ تو پھر قرآن کریم اس کے لیے یہ حکم دیتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس کو اجازت دیجائے کہ وہ کمائی کرکے اپنا جرمانہ ادا کر دے اور جو ایسا کرنے کی بھی قابلیت نہیں رکھتا اس کے لیے اسلام مومنوں کو حکم دیتا ہے کہ اسکی مدد کریں اور اس کو قید سے جلد آزاد کرانے کی صورت پیدا کریں۔ لیکن اگر کوئی ایسا قیدی خود ہی اپنے لیے آزادی کو پسند نہیں کرتا۔ اور ایک مسلمان کے گھر میں رہنے کو اپنے ملک میں واپس جانے سے زیادہ پسند کرتا ہے تو قرآن کریم حکم دیتا ہے کہ اسکے ساتھ انصاف کا سلوک کیا جائے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسکی یہ تشریح فرماتے ہیں کہ جیسا کھانا تم خود کھاتے ہو ویسا ہی کھانا اسے کھلاؤ اور جیسے کپڑے تم خود پہنتے ہو ویسے ہی کپڑے اُسے پہناؤ۔ اور جس سواری پر تم خود چڑھتے ہو اُس سواری پر اُسے چڑھاؤ۔ قرآن کریم قوموں میں مساوات پر خاص زور دیتا ہے قرآن پہلی کتاب ہے جو بنی نوع انسان کو بحیثیت بنی نوع انسان کے ایک گروہ قرار دیتا ہے قرآن کہتا ہے بیشک مختلف قومیں ہیں اور مختلف ملک ہیں مگر یہ امتیاز صرف پہچاننے کے لیے ہیں حقیقتاً تمام انسان ایک درجہ کے ہیں اور ان کو ایک درجہ دینا چاہیئے اور فرماتا ہے کہ کوئی قوم اپنے نسلی امتیاز کی وجہ سے دوسری قوم پر اپنے آپ کو فوقیت نہ دے۔ کوئی گروہ اپنی اقتصادی ترقی یا کسی اور وجہ سے دوسرے سے اپنے آپ کو ممتاز نہ سمجھے ورنہ ایسے لوگ یاد رکھیں کہ خدا تعالیٰ کا قانون ایک دن انکو ضرور نیچا کر دیگا اور جن کو وہ ادنیٰ سمجھتے ہیں انکو وہ ان پر فوقیت عطا کر دیگا۔ کیسی اعلیٰ درجہ کی یہ تعلیم ہے اور دنیا میں امن کے قیام کا کیسا بہترین ذریعہ ہے۔ قرآن کریم اُن تمام لہو و لعب کی چیزوں سے روکتا ہے جو انسان کے سنجیدگی سے کام کرنے کے رستہ میں حائل ہوتی ہیں وہ جُوا اور شراب اور ہر قسم کی لہو و لعب کی باتوں سے منع کرتا ہے وہ مردوں کو زیورات اور ریشم پہننے سے روکتا ہے اور عورتوں کو نہایت ہی محدود طور پر اس کی اجازت دیتا ہے۔

پیدائش روح کے متعلق قرآنی تعلیم

قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جو انسان کی رُوح اور اُسکی پیدائش کے متعلق مکمل بحث فرماتی ہے اس بارہ میں دوسری کتب یا تو خاموش ہیں یا قیاس آرائیوں پر اکتفا کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اسکے متعلق ایک مکمل بحث فرمائی ہے چنانچہ فرماتا ہے وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل آیت ۸۶) لوگ تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں تو انہیں جواب میں کہہ کہ روح اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا کی گئی ہے اور روح کے متعلق تمہارا علم بہت تھوڑا ہے۔

اِس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ارواح ایک ازلی ابدی چیز ہیں اور کسی علیحدہ دنیا میں پڑی رہتی ہیں پھر وہاں سے وقتاً فوقتاً وہ انسانی اجسام میں آکر داخل ہو جاتی ہیں یہ غلط ہے بلکہ جیسے اور چیزیں خدا تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوتی اور خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ترقی کرتی ہیں اسی طرح روح بھی ہے رُوح کی پیدائش جسمانی پیدائش سے کوئی علیحدہ قسم کی چیز نہیں بلکہ اس قسم کا تغیر اور تبدل جو جسمانیات کے ارتقاء کے لیے ہوتا ہے روحانی پیدائش کا موجب ہو جاتا ہے اور پھر روح کی ترقی اور بلندی کا موجب ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کو تشریح کے ساتھ قرآن کریم نے دوسری جگہ سورۂ مومنون میں بیان فرمایا ہے وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (ع) ہم نے انسان کو مٹی سے نکلے ہوئے خلاصہ سے بنایا ہے پھر گیلی مٹی میں سے نکلے ہوئے ایک خلاصہ سے بنایا ہے پھر ہم نے اُسے نطفہ کی شکل میں تبدیل کر دیا جو نطفہ ایک مقررہ جگہ پر رہتا ہے تو ہم اس نطفہ کو ایک گاڑھی چیز بنا دیتے ہیں جو چمٹ جاتی ہے پھر وہ چمٹی ہوئی چیز ایک لچکدار چیز بن جاتی ہے پھر اس لچکدار چیز میں ہڈیاں پیدا ہونے لگ جاتی ہیں پھر ان ہڈیوں پر تازہ گوشت چڑھنے لگ جاتا ہے پھر اسی چیز میں سے ایک بالکل ہی غیر نظر آنے والی چیز (یعنی روح) بن جاتی ہے پس کیا ہی برکت والا وہ خدا ہے جس نے ایسے اعلیٰ رنگ میں انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی پیدائش درحقیقت انہیں چیزوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے جو کہ انسان کھاتا اور پیتا ہے۔ انہی چیزوں سے انسان کے جسم میں کچھ ایسا مادہ تیار ہوتا ہے جو انسان اور دوسرے حیوانات کے پیدا کرنیکا موجب ہوتا ہے جب یہ مادہ رحم مادر میں جاتا ہے تو جس مادہ میں تکمیل کی طاقت پائی جاتی ہے وہ ماں کے رحم کے ایک حصّہ سے چمٹ جاتا ہے اور وہاں سے اس کے اندر غذا آنی شروع ہو جاتی ہے کچھ دنوں میں اس کے اندر غلظت اور گاڑھا پن پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وہ ایک لچکدار چیز بن جاتی ہے پھر اس کے اندر ہڈی کا مادہ نشو و نما پانے لگتا ہے جس کے بعد گوشت پورے طور پر جسم پر نشو و نما پا کے ظاہری تخلیق مکمل ہو جاتی ہے اس سلسلہ کے ساتھ ساتھ جسم میں سے ایسے مواد پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں جو اس نباتی قسم کے نشو و نما کو حیوانیت میں تبدیل کر دیتے ہیں اور آخر ایک سوچنے اور سمجھنے والا انسان پیدا ہو جاتا ہے اس آیت میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ روحیں کہیں باہر سے نہیں آتیں بلکہ اسی جسم میں جو رحم مادر میں نشو و نما پاتا ہے ایک نیا مادہ پیدا ہوتا ہے جو دوسری نباتی چیزوں سے انسان کو علیحدہ کر کے اسے حیوان کا نام دیتا ہے اور حیوانی حالت سے ترقی کر کے ایک اعلےٰ انسان پیدا ہوتا ہے جس میں عقل اور سمجھ ہوتی ہے اور ترقی کا مادہ اس میں پایا جاتا ہے ہم دنیا کی چیزوں میں سے موٹی مثال کے طور پر ان کیمیاوی تغیرات کو پیش کر سکتے ہیں جو باہم اختلاط کے بعد ایک بالکل نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں جیسے چقندر یا گندم یا مکّی یا گڑ سے شراب تیار ہو جاتی ہے۔ شراب ایک ایسی چیز بن جاتی ہے جو اپنی پہلی شکل سے بالکل مختلف ہوتی ہے جبکہ اس کے منبع میں سڑنے کی طاقت ہے اس میں قائم

رہنے اور قائم رکھنے کی طاقت ہوتی ہے اور جبکہ اس کے منبع کا اثر دماغ پر کسی قسم کا بھی نہیں پڑتا۔ یہ دماغ کے اوپر خصوصیت کے ساتھ اثر کرنیوالی چیز ہوتی ہے۔ غرض اس مضمون میں قرآن کریم پہلی تمام کتب سے جداگانہ تعلیم پیش کرتا ہے قرآن کریم سے پہلے مختلف مذاہب میں روحوں کے متعلق دو خیال تھے ایک خیال تو یہ تھا کہ رُوحیں خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نہیں، بلکہ خدا تعالیٰ کی طرح انادی ہیں۔ خدا تعالیٰ ان انادی روحوں کو مناسب موقع پر مختلف جسموں میں داخل کرتا جاتا ہے۔ مذاہب میں سے ایک دوسرے حصّہ کا یہ خیال تھا کہ روحیں انادی تو نہیں ہیں تو خدا تعالیٰ کی مخلوق لیکن جب اُس نے دنیا کو پیدا کیا تبھی اُس نے آئندہ پیدا ہونیوالی روحوں کو بھی پیدا کر دیا، اور اسی پیدا کیے ہوئے خزانہ میں سے وقتاً فوقتاً وہ کچھ ارواح انسانی جسم میں ڈال کر بھیجتا رہتا ہے۔ بعض مذاہب ایسے بھی تھے جو روح کے متعلق بالکل خاموش تھے۔ وہ موجودہ انسان کے ظاہر کے متعلق بحث کو کافی سمجھتے تھے اور اس کی پیدائش یا اُسکی روح کے متعلق کسی قسم کا خیال ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ اسلام وہ پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے اس مسئلہ کو صحیح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ رُوح درحقیقت انسانی جسم کے ارتقاء کا ایک انتہائی نقطہ ہے اور وہ کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ انسانی جسم کے تغیرات کے نتیجہ میں ہی وہ پیدا ہوئی ہے ہاں اس نے ایک علیحدہ وجود اختیار کر لیا ہے انسانی جسم کے محض عمل کا نام روح نہیں بلکہ روح انسانی مادہ ہی سے نکلی ہوئی ایک چیز ہے جس نے ایک مستقل وجود اختیار کر لیا ہے جس طرح شراب اور سرکہ دانوں اور پھلوں ہی میں سے نکلتے ہیں لیکن وہ ایک علیحدہ وجود اختیار کر لیتے ہیں بظاہر تو یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ہم غور کر کے دیکھیں تو اس حقیقت کے اظہار سے اسلام نے مذہب کا نقطۂ نگاہ بالکل بدل دیا ہے روحوں کو انادی ماننے یا کسی قدیم زمانہ میں ان کو پیدا کر کے اس دنیا میں بھیجتے رہنے کے عقیدہ نے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ جسم کی صفائی اور جسم کے ارتقاء کا روح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن اسلام نے اس حقیقت کو بیان کر کے اس طرف توجہ دلا دی کہ جسم کی صفائی اور جسم کے ارتقاء کا تعلق روح کے ساتھ بہت گہرا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جسم انسانی کے نشوونما سے کوئی نہ کوئی روح تو ضرور پیدا ہو جائے گی لیکن اگر جسم انسانی کا خیال اچھی طرح رکھا جائیگا۔ اگر حفظانِ صحت کے اصول کو مدِّنظر رکھا جائیگا تو یقیناً ایک زیادہ فعال اور سمجھدار انسان پیدا ہوگا۔ پس اس حقیقت کو بیان کر کے اسلام نے انسان کی روحانی اور دماغی ترقی کے لیے ایک نیا رستہ کھول دیا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ روح تو اپنی ذات میں کوئی طاقت نہیں رکھتی اس لیے جسم کے تغیرات کا روح پر کیا اثر پڑ سکتا ہے یہ درحقیقت ایک غلط خیال ہے روح کا طاقت نہ رکھنا ایک بے معنی بات ہے اگر روح کوئی طاقت نہیں رکھتی تو وہ ایک بے حقیقت چیز ہے اصل بات یہ ہے کہ روح کے اندر طاقتیں تو ہیں لیکن روح بغیر جسم کے اپنی طاقتوں کو استعمال نہیں کر سکتی اور بہت سی مادی چیزیں دنیا میں ایسی ہیں جو بغیر کسی کے واسطہ کے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر سکتیں جیسے بجلی ہے کہ وہ اپنا ظہور دوسری چیزوں کے ذریعہ سے کرتی ہے پس یہ درست نہیں کہ رُوح کے اندر کوئی طاقتیں نہیں ہوتیں۔ روح کے اندر طاقتیں اور صفات ضرور ہیں، مگر وہ صفات کسی نہ کسی جسم کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ تمام مضامین اور ایسے ہی بہت سے مضامین قرآن کریم

میں بیان ہوئے ہیں، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ان تمام باتوں کو دیباچہ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ صرف ان کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اوپر میں نے ان امور کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اس بات کا مدعی ہے کہ تمام وہ باتیں جن کی دین اور اخلاقی ترقی اور جسم اور روح کی پاکیزگی کے لیے ضرورت ہے وہ قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور اس دعویٰ کو ہم نے ہر زمانہ میں سچا پایا ہے اس بیسویں صدی میں بھی کہ اس زمانہ کے باشندے اپنے آپکو علوم میں سب سے بڑھکر سمجھتے ہیں ہم قرآن شریف کو انسان کی تمام سچی ضرورتوں کو پورا کرنیوالا پاتے ہیں اور کوئی ایسی ضرورت جو دین یا اخلاق یا روحانی یا دماغی صفائی اور پاکیزگی کے متعلق ہو ہمیں ایسی نہیں ملتی جس کے متعلق قرآن کریم میں مکمل تعلیم نہ دی گئی ہو، لیکن ایک دیباچہ ان کی تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پس مختصر اشاروں پر ہی میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ہاں تشریحی نوٹوں میں مختلف آیات کی تشریح میں ان امور پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔ گو جس قسم کے مختصر نوٹ اس قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں اُن کو مدِّنظر رکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ پورا علم قرآن کے مطالب کا ان نوٹوں سے بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے میری اُردو کی تفسیر ایک حد تک ممد ہو سکتی ہے وہ ان انگریزی نوٹوں سے بہت زیادہ مفصّل ہے۔

روحانی دنیا کا نقشہ

قرآن کریم کی تعلیم کے اصول کا ایک مختصر خلاصہ بیان کرنے کے بعد میں وہ مختصر نقشہ پیش کرتا ہوں جو قرآن کریم نے روحانی دنیا کا پیش کیا ہے جس طرح یہ مادی دنیا ہمیں ایک خاص نظام کے ماتحت چلتی ہوئی نظر آتی ہے ہم جس زمین پر رہتے ہیں وہ ایک نظام شمسی کے تابع ہے، ایک سورج اپنے ماتحت کچھ ستارے رکھتا ہے اور وہ ستارے اس سورج کے گرد گھومتے ہیں اور سورج آگے ایک غیر معلوم منزل کیطرف جاتا ہے جسکی نسبت آجکل کے حساب دان کہتے ہیں کہ وہ ایک بڑا مرکز ہے جو تمام نظام ہائے شمسی کو ایک بڑے نظام کے ماتحت جکڑ رہا ہے ان کی تفصیلات ٹھیک ہوں یا نہ ہوں بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ یہ ساری دنیا کسی ایک نظام کے ماتحت ہے ورنہ یہ اس طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی پھر اس ظاہری نظام کے ماتحت کچھ قوانین قدرت ہیں جنکے ماتحت مادہ دنیا میں کام کر رہا ہے اور مختلف قسم کے تغیرات میں سے گذرتے ہوئے مادی دنیا کو انواع و اقسام کی اشیاء سے بھر رہا ہے جن اشیاء کے استعمال سے ہی اس دنیا کی ترقی اور اسکی کامیابی کا راز وابستہ ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی ایک روحانی نظام بھی ہے جس طرح اس مادی عالم کے تمام نظام ہائے شمسی کا ایک مرکز فرض کیا جاتا ہے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوحانی دنیا کا واقعہ میں ایک مرکز محیط ہے یعنی کوئی ایسی چیز نہیں جو اُس مرکز کے تصرف اور اسکے اختیار اور اسکے قبضہ سے باہر ہو۔ وہ ہستی آپ ہی آپ موجود ہے کوئی اس کا پیدا کرنے والا نہیں وہ اپنے کاموں میں کسی اور کا محتاج نہیں نہ اس کا کوئی باپ ہے نہ اُس کا کوئی بیٹا ہے نہ اُسکی طاقتوں میں کوئی اور شریک ہے چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (پ۳۰ سورۂ اخلاص) اے محمد رسول اللہ تو دنیا کو سنا دے کہ حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام طاقتوں میں منفرد ہے گو دوسری چیزوں کی صفات اور اسکی بعض صفات میں ظاہری تشابہ نظر آتا ہے لیکن وہ تشابہ صرف لفظی اور ظاہری ہے حقیقتاً خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو مشابہت نہیں مثلاً ظاہر میں خدا تعالیٰ بھی موجود ہے

اور انسان بھی موجود ہے مگر انسان اور حیوان اور دوسری چیزوں کا وجود باوجود اس کے کہ لفظاً خدا تعالیٰ کے وجود کے ساتھ اشتراک رکھتا ہے حقیقتاً دونوں ایک چیز نہیں۔ خدا تعالیٰ کے متعلق جب ہم کہتے ہیں کہ وہ موجود ہے تو اسکے معنی یہ ہُوا کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں کامل وجود ہے۔ اور جب ہم انسان یا حیوان یا دوسری چیزوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ موجود ہیں تو ہمارا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ اسباب اور وہ علّتیں موجود ہیں جن کے تغیّرات کے نتیجہ میں انسان یا حیوان یا دوسری اشیاء پیدا ہوئی ہیں اس وقت تک اُس انسان یا حیوان یا موجودات کا وجود قائم رہے گا اگر وہ اسباب اور علّتیں پیچھے ہٹالی جائیں تو اُس کا وجود بھی فنا ہو جائے یا جتنا جتنا اُن اسباب اور علل کو ہٹالیا جائے گا اتنا اتنا ہی وہ فنا ہوتا جائے گا۔ مثلاً ایک زندہ انسان کی زندگی کا موجب اُس کی روح کا جسم سے تعلق ہے انسان کا زندہ ہونا ایک عارضی تعلق کی وجہ سے ہے جب وہ عارضی تعلق قطع ہو جاتا ہے تو انسان تو رہتا ہے مگر زندہ نہیں رہتا۔ انسانی جسم موجود تو ہوتا ہے مگر انسانی جسم نام ہے چند عارضی اسباب کی وجہ سے چند ذرات کے ایک خاص شکل میں جمع ہو جانے کا۔ اُن ذرّات کو جب الگ کر دیا جائے تو انسانی جسم باقی نہیں رہتا۔ جب انسان مر جاتا ہے اور اُس کو مٹی میں دفن کرتے ہیں تو مٹی کی رطوبت اور دوسرے کیمیاوی اثرات اُس کے جسم کو خاک بنا کر رکھ دیتے ہیں وہ ذرّے جن سے انسانی جسم بنا تھا وہ اب بھی موجود ہوتے ہیں، مگر علّت کے بدل جانے کی وجہ سے انسانی جسم باقی نہیں رہتا۔ جب اُسی انسانی جسم کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے یا پانی میں گلا دیا جاتا ہے یا بجلی سے راکھ کر دیا جاتا ہے تو جن چیزوں سے انسان بنا تھا وہ تو پھر بھی موجود رہتی ہیں مگر آگ یا بجلی یا پانی کے اثرات سے وہ شکل بدل جاتی ہے اور انسانی جسم کو اس کی موجودہ شکل میں قائم رکھنے کی جو علّت تھی اُسے مٹتے ہی انسانی جسم بھی مٹ جاتا ہے مگر خدا کے لیے یہ بات نہیں، اُسے کوئی خارجی سبب وجود نہیں دے رہا یا اُس کے وجود کو قائم نہیں رکھ رہا بلکہ وہ خود کامل ہستی ہونے کی وجہ سے موجود ہے اور وقت کی قید سے آزاد ہے۔ گو انسانی دماغ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیوں کر وقت کی قید سے آزاد ہے جبکہ سب مادہ وقت کی قید میں مبتلا ہے اس کا جواب درحقیقت یہی ہے کہ خدا کا وجود اور طرح کا ہے اور انسان کا وجود اور طرح کا ہے انسان کے وجود یا مادی وجود پر خدا تعالیٰ کا قیاس نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ هُوَ اَحَدٌ وہ ہر چیز میں منفرد ہے۔ اسی مضمون کو قرآن کریم ایک دوسری جگہ اِن الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (شوریٰ ع۲) وہ آسمان اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے اس نے ہر چیز کی جنس میں سے اس کا جوڑا بنایا ہے۔ چارپایوں کی جنس میں سے بھی اُن کا جوڑا بنایا ہے اور وہ ان جوڑوں کے ذریعہ سے مادی دنیا کو ترقی دیتا چلا جاتا ہے یعنی تمام دنیا میں خواہ وہ حیوان ہوں یا نباتات یا جمادات جوڑوں کا سلسلہ چل رہا ہے خواہ اس کو نر و مادہ کہہ لو خواہ اسے مثبت و منفی کہہ لو۔ خواہ اس کا کوئی اور نام رکھ لو۔ بہرحال یہ ساری دنیا جوڑوں کے اصول پر چل رہی ہے دوسری جگہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (الذاریات ع۳) اور ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے بنایا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ یعنی تا یہ تم سمجھ سکو کہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ

کے سوا خدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ ایک جوڑے کی محتاج ہے اور اس کا قیام اور اسکی زندگی دوسری چیزوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ بغرض قرآن کریم ایک ایسی ہستی کو تمام موجودات کا مرکز قرار دیتا ہے جو اپنی ذات میں منفرد ہے اور جس کے ساتھ کسی اور چیز کو مشابہت نہیں دی جا سکتی۔ اس کے سوا جتنی موجودات ہیں وہ سب اپنی ذات کے قیام کیلئے دوسروں کی محتاج ہیں مگر وہ ہستی جو تمام کائنات کا نقطۂ مرکزی ہے وہ اپنے کاموں کیلئے کسی کی محتاج نہیں۔ پھر فرماتا ہے نہ اُس ہستی سے آگے کوئی اولاد پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد میں سے ہے۔ اِس آیت کے ذریعہ سے قرآن کریم نے اپنے عقیدہ کو عیسائیت سے بالکل مختلف ثابت کیا ہے عیسائیت بھی اور بہت سے دیگر آرین مذاہب بھی خدا تعالیٰ کی کسی نہ کسی شکل میں اولاد تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ اولاد کی ضرورت ایسی ہستیوں کو ہوتی ہے جو محتاج ہوتی ہیں یا جن پر فنا آنے والی ہوتی ہے مگر خدا میں یہ باتیں نہیں پائی جاتیں پس اس کو کسی اولاد کی ضرورت نہیں اور جس طرح اُسے اولاد کی ضرورت نہیں۔ اِسی طرح وہ اس بات کا بھی محتاج نہیں کہ اس کا کوئی اور سبب اور پیدا کرنے والا ہو۔ اور جس طرح وہ باپ اور بیٹے سے آزاد ہے اسی طرح وہ اس بات میں بھی منفرد ہے کہ کوئی اور ہستی اس جیسی طاقتوں والی موجود نہیں یعنی نہ تو خدا تعالیٰ کے پیدا کرنے کا کوئی سبب ہے نہ خدا تعالیٰ اولاد کا محتاج ہے۔ اور نہ خدا تعالیٰ کی قسم کا کوئی اور وجود موجود ہے۔ اس آخری اعلان کے ساتھ قرآن کریم نے ان مذاہب کا رد کیا ہے جو تعددِ اُلوہیت کے قائل ہیں جیسے زرتشتی مذہب ہے غرض ان مختصر الفاظ میں اس عقیدہ کو پیش کیا گیا ہے کہ تمام عالم کا مرکز ایک خدا ہے جو منفرد حیثیت رکھتا ہے تمام دیگر ہستیوں سے۔ اور وہ واحد منبع ہے تمام موجودات کا۔ اور وہ اپنے کاموں کے کرنے میں کسی کی مدد کا محتاج نہیں نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ اس کا کوئی باپ تھا اور نہ کوئی متوازی طاقت اُسکے ساتھ موجود ہے اور نہ اسکے بالمقابل کوئی اور طاقت موجود ہے دیکھو ان چند الفاظ میں سارے کے سارے مذاہب کو رد کر کے ایک خالص توحید کو قائم کر دیا گیا ہے دنیا کے جتنے مذاہب ہیں وہ سارے کے سارے مندرجہ ذیل غلطیوں میں مبتلا ہیں بعض لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کسی خاص قوم کا خدا ہے یعنی خواہ اس نے پیدا تو ساری دنیا کو کیا ہو مگر وہ مخصوص ہو گیا ہے بنی اسرائیل سے یا مخصوص ہو گیا ہے ہنود سے یا مخصوص ہو گیا ہے ایرانیوں سے۔ قرآن مجید اس عقیدہ کو رد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف اپنی ذات میں منفرد ہے بلکہ وہ منبع ہے تمام کائنات کا، اَحَد کا لفظ جو یہاں استعمال کیا گیا ہے، اسکے معنے منفرد کے بھی ہوتے ہیں اور اکائی کے بھی ہوتے ہیں یعنی وہ منبع جو خود تعدد سے باہر ہوتا ہے لیکن تعدد اس کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ اس آیت کے ذریعہ سے قرآن کریم نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تمام بنی نوع انسان کا خدا ایسی ہادی اور رہنما ہے اُسے کسی قوم کے ساتھ خاص لگاؤ نہیں تمام بنی نوع انسان جو اسکے قرب کی راہیں تلاش کریں خدا اُن کیلئے اپنے قرب کی راہیں کھولتا ہے۔ عرب، بنی اسرائیل، ایرانی، ہندی، چینی، یونانی، افریقی یہ سارے اسکی نظر میں ایک ہیں۔ کیونکہ وہ ان سب کو وجود دینے کا باعث ہے تمام دنیا کے تعدد کی وہ اکیلی اکائی ہے پھر یہ کہکر کہ وہ کسی کا بیٹا نہیں اس نے عیسائیت کے مرکزی عقیدہ کو رد کیا ہے اسی طرح مختلف ہندو فرقوں کے مرکزی عقیدہ کو اُس نے رد کیا ہے اور یہ کہہ کر کہ وہ کسی کا بیٹا نہیں اس نے اس عقیدہ کو رد کیا ہے کہ کوئی بیٹا خدا ہو سکتا ہو کیونکہ جو اپنے وجود کیلئے دوسرے کا محتاج ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا اور یہ کہکر کہ اسکے بالمقابل کوئی اور

طاقتیں نہیں۔ اس نے اُن مذاہب کے عقائد کو رد کر دیا ہے جو نور اور تاریکی کو علیحدہ علیحدہ وجود قرار دیکر دنیا کے دو متوازی خدا منوانا چاہتے ہیں۔ پھر قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ خدا تمام اشیاء کی علّت العلل بھی ہے یعنی تمام کی تمام مفردات اسی سے نکلی ہیں اور سب کی سب مخلوق اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (الحدید ع ۱) خدا ہی اول ہے اور خدا ہی آخر ہے۔ اسکے یہی معنے ہیں کہ ہر چیز کا وجود خدا سے آتا ہے اور ہر چیز کی فنا بھی خدا کے قانون کے ماتحت چلتی ہے اگر خدا تعالیٰ دنیا کی موجودات کو وجود نہ بخشتا تو وہ کبھی وجود نہ پا سکتی تھیں۔ اور اگر خدا تعالیٰ نے ہی اُنکی فنا کے سامان پیدا نہ کیے ہوتے تو وہ فنا نہیں ہو سکتی تھیں مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کی پیدائش اور فنا خاص قوانین کے ماتحت چلتی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک بالا رادہ ہستی نے اس دنیا کے نظام کو قائم کیا ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہُوا ہے فرماتا ہے:۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۝ آسمان اور زمین کو پیدا کرنے والا خدا ہی ہے اس کے بیٹا ہو کس طرح سکتا ہے جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ (انعام آیت ۱۰۳ و ۱۰۴) یہ ہے اللہ تمہیں ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف لیجانے والا۔ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں وہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے پس اسی کی عبادت کرو اور ہر چیز کا انتظام اسی کے قبضہ میں ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان کی پیدائش کا موجب اللہ تعالیٰ ہی ہے پھر اُسے کسی بیٹے کی ضرورت کیا تھی کیونکہ بیٹے کا وجود یا تو اتفاقی حادثہ کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے یا ضرورت کے لیے۔ اتفاقی حادثہ اس طرح ہوتا ہے کہ نر مادہ سے ملتے ہیں اور طبعی طور پر اس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہو جاتی ہے اس کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی تو کوئی بیوی نہیں بیٹا کہاں سے آجائیگا اور اگر کہو کہ خدا تعالیٰ نے ایک نیا وجود بنایا اور اس کو بیٹے کا مقام دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیٹے کی غرض تو یہی ہوا کرتی ہے کہ انسان کے کاموں میں مدد دے اور اس کے بعد اس کے نام کو قائم رکھے مگر وہ خدا جو ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے کیا وہ بھی اسی قسم کی احتیاج رکھتا ہے پھر اُس نے بیٹا بنانا ہی کیوں تھا وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ پھر فرماتا ہے وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ یعنی بعض دفعہ انسان احتیاطاً ایک سامان پیدا کر لیتا ہے کہ نہ معلوم آئندہ کیا ہو جائے لیکن خدا تعالیٰ کے لیے تو یہ خوف بھی نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط ہے وہ ان تمام باتوں کو جانتا ہے جو گذشتہ زمانہ میں ہو چکیں اور ان تمام باتوں کو جانتا ہے جو آئندہ زمانوں میں ہونیوالی ہیں اس لیے خدا تعالیٰ کو کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ پھر فرماتا ہے یہ وہ خدا ہے جس نے تم کو ادنیٰ حالت سے پیدا کر کے اعلیٰ درجہ کی ترقی تک پہنچایا اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں تمام موجودات کو پیدا کرنے والا وہی ہے۔ ایرانی اور اسرائیلی اور عرب اور ہندو ہونا خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی امتیازی چیز نہیں۔ خدا تعالیٰ کے لیے یہ سب برابر ہیں، خدا تعالیٰ نے ان سب کو پیدا کیا۔ اور خدا تعالیٰ نے ان سب کو آہستہ آہستہ ترقی بخشی۔ پس ان سب کے لیے ضروری ہے کہ اس واحد خدا کی پرستش کریں اور یاد رکھیں کہ تمام کی تمام مخلوقات کی نگرانی

اور ذمہ واری اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی ہے اُس کے ساتھ تعلّق قائم رکھ کر ہی انسان تباہیوں اور بربادیوں سے بچ سکتا ہے اور اُس سے دور رہ کر اُسے کبھی امن حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس ہستی کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ تمام موجودات کا تفصیلی علم رکھتا ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے علم سے باہر ہو۔ فرماتا ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (بقرۃ آیت ۲۵۶) اُس کا علم آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (یونس آیت ۶۲) یعنی تو کسی حالت میں نہیں ہوتا اور تو کچھ نہیں پڑھ رہا ہوتا یا کوئی عمل نہیں کر رہا ہوتا مگر ہم تمام حالتوں میں تجھ پر نگران ہوتے ہیں جبکہ تو اُن کاموں میں مشغول ہوتا ہے اور تیرے رب سے ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرّہ کے برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی۔ مگر خدا کی کتاب میں جو ان اعمال پر روشنی ڈالتی رہتی ہے لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ دل کی حالتیں، زبان کی کہی ہوئی باتیں اور اعضا کے کیے ہوئے عمل تمام کے تمام خدا تعالیٰ پر روشن ہیں اور بے جان چیزیں بھی خواہ وہ ایک ایٹم ہوں یا ایٹم کا بھی چھوٹا سا حصّہ خدا تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں اسکی نظر باریک سے باریک چیز پر پڑتی ہے اور بڑی سے بڑی چیز کا بھی احاطہ کر رہی ہے اور اس کو ان چیزوں کا صرف علم ہی نہیں بلکہ وہ ہر چیز کے اعمال کو ایسے طور پر محفوظ رکھ رہا ہے کہ بعد میں اس کا نتیجہ نکلے گا۔ اِس کے لیے قرآن کریم نے کِتٰبٍ مُّبِيْنٍ کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی دنیا کے ریکارڈ تو ایسے ہوتے ہیں کہ وہ لوگوں کی نگاہ سے مخفی رہتے ہیں اور بعض دفعہ خود ریکارڈ کیپرز کی آنکھوں سے بھی مخفی ہو جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا طریق رکھا ہُوا ہے کہ وہ ریکارڈ آپ ہی آپ بولتا چلا جاتا ہے یعنی ہر فعل کا نتیجہ خدا تعالیٰ کے قانون اور اسکے منشاء کے مطابق نکل آتا ہے۔ پھر فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (انعام آیت ۱۰۲) خدا تعالیٰ کی ذات ایسی وراء الوراء ہے کہ اس کی حقیقت کو کوئی پا نہیں سکتا۔ یعنی وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے تمام دنیا کی اشیاء سے جدا ہے اس لیے مادی ذرائع سے اُسے دیکھنے کی کوشش کرنا بالکل عبث ہے۔ پھر قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ وہ ہستی اپنے تمام ارادوں کے پورا کرنے پر قادر ہے فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (بقرۃ آیت ۱۱۱) اللہ تعالیٰ ہر ایک چاہی ہوئی بات پر قادر ہے۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ہر چیز پر قادر ہے کیونکہ ایسے الفاظ کے استعمال سے بہت سے لوگ نادانی سے غلط اعتراض شروع کر دیتے ہیں مثلاً بعض لوگ کہتے ہیں کہ کیا خدا مرنے پر قادر ہے؟ یا کیا خدا اپنے جیسا خدا بنانے پر قادر ہے؟ حالانکہ یہ چیزیں تو گھناؤنی اور ناپسندیدہ ہیں۔ اعلیٰ اور کامل ہستی گھناؤنے اور ناپسندیدہ کام نہیں کیا کرتی۔ بہرحال ایسے لوگوں کے اعتراضوں کو حل کرنے کے لیے قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر فعل پر قادر ہے بلکہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مراس بات پر خدا تعالیٰ قادر ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ کیونکہ خدا بوجہ کامل ہونے کے کامل باتوں ہی کا ارادہ کرتا ہے اس قسم کا بیوقوفانہ ارادہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے آپ کو فنا کر دے یا اپنے جیسا کوئی خدا بنالے

خدا تعالیٰ کی چار صفات

قرآن کریم کی پہلی سورۃ سورۃ فاتحہ ہے۔ اس میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات کس طرح عمل کرتی ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں چار صفات کے ارد گرد گھومتی ہیں اور وہ چار صفات یہ ہیں (۱) وہ رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہے۔ یعنی ہر ایک چیز کو پیدا کرتا ہے اور پیدا کرکے ادنیٰ حالت سے ترقی دیکر اُسے اعلیٰ حالت تک پہنچاتا ہے (۲) وہ رَحْمٰن ہے یعنی تمام ایسے ذرائع بغیر کوشش اور بغیر استحقاق کے مہیا کرکے دیتا ہے جن کے بغیر اس چیز کی ترقی ناممکن ہوتی ہے (۳) وہ رَحِیْم ہے یعنی وہ تمام مخلوق جو عقل اور ارادہ رکھتی ہے جب اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے ایک نیک رستہ کو پسند کر لیتی ہے اور بُرائی کا مقابلہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے فعل کا نہایت اعلیٰ درجہ کا بدلہ دیتا ہے اور نیکیوں کا بدلہ متواتر دیتا چلا جاتا ہے (۴) وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْن ہے یعنی ہر چیز کا آخری فیصلہ اُس نے اپنے اختیار میں رکھا ہوا ہے جس طرح ابتداء اس نے کی تھی اسی طرح انتہا بھی اُس نے اپنے قبضہ میں رکھی ہوئی ہے بنی نوع انسان اور دوسری مخلوق ہر چیز میں عارضی اور وقتی تبدیلیاں پیدا کر سکتے ہیں لیکن حقیقی اور مستقل تغیر پیدا نہیں کر سکتے۔ مثلاً مادہ اور روح ہے جس طرح اُن کے پیدا کرنے پر انسان قادر نہیں۔ ان کے فنا کرنے پر بھی انسان قادر نہیں وہ اُس کے اندر عارضی تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے وہ شکلیں بدل سکتا ہے لیکن وہ ان چیزوں کو فنا نہیں کر سکتا جس طرح خلق کی صفت اپنی تمام صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ میں ہی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح افناء کی صفت بھی اپنی تمام صفات کے ساتھ کلّی طور پر اُسی میں پائی جاتی ہے کوئی چیز کلی طور پر فنا نہیں ہو سکتی جب تک خدا تعالیٰ اس کے فنا کرنے کا فیصلہ نہ کرے اور یہ دونوں حقیقتیں ایسی ظاہر و باہر ہیں کہ کسی انسان کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا پس فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کے وقت کا مالک ہے۔ یعنی تمام تغیرات کا آخری فیصلہ اس کے اختیار میں ہے اور وہ یہ فیصلہ اپنے مالک ہونیکی حیثیت سے کرتا ہے یعنی جس طرح ایک جج اس لیے اپنے فیصلہ میں مجبور ہوتا ہے کہ وہ زید اور بکر کے حقوق کا فیصلہ کر رہا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ مجبور نہیں کیونکہ جہاں تک انسان کے حقوق کا سوال ہے وہ اسکے سارے حق پورے کرنیکے لیے تیار ہے لیکن دوسری طرف جہاں تک خدا تعالیٰ کے حقوق کا سوال ہے اللہ تعالیٰ مشہور روایتی "پونڈ آف فلیش" پر اصرار نہیں کرتا بلکہ جیسے مالک رعایت اور حسن سلوک اور رحم سے کام لیتا ہے اور لے سکتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے قصور پر عفو اور درگذر سے کام لیتا ہے۔ اس صفت کے نہ سمجھنے کی وجہ سے عیسائیت میں کفارے جیسا غلط عقیدہ پیدا ہو گیا۔ عیسائی مذہب اس بات پر زور دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کا گناہ معاف نہیں کر سکتا اور اس کا قیاس وہ انسانی ججوں پر کرتے ہیں۔ حالانکہ جج دو جھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کر رہا ہوتا ہے اور خود وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اور بندے کا معاملہ ایسا ہے کہ ایک طرف خدا کا حق ہے اور ایک طرف بندے کا حق ہے۔ خالی جج کی حیثیت اس کو حاصل نہیں۔ بلکہ مطالبہ کرنیوالے اور حق مانگنے والے کی حیثیت اس کو حاصل ہے جو حیثیت کہ جج کو حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ خود مطالبہ کرنیوالا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ مطالبہ کرنیوالے اور مدعا علیہ کے درمیان فیصلہ کر رہا ہوتا ہے لیکن بندے اور خدا تعالیٰ کے معاملہ میں خدا جج کے علاوہ مدعی بھی ہوتا ہے۔ اور بندہ مدعا علیہ

ہوتا ہے اور بوجہ مدعی ہونے کے خدا تعالیٰ حق رکھتا ہے کہ اپنے حق میں سے چھوڑ دے اس کا حق چھوڑ نا رحم کہلائیگا بے انصافی نہیں کہلائیگا، کیونکہ وہ اپنا حق چھوڑتا ہے کسی کا حق نہیں مارتا۔ کفّارہ کا عقیدہ ایسا عقل کے خلاف ہے کہ کوئی شخص اسے تسلیم نہیں کرسکتا۔ اگر مسیح کی صلیبی موت پر ایمان لانے کی وجہ سے لوگوں کے گناہ معاف ہو سکتے ہیں تو مسیح سے پہلے آنے والے انبیاء کے گناہ کس طرح معاف ہوئے۔ اس صورت میں تو چاہیئے تھا کہ مسیح کو ابتدائے عالم میں ہی صلیب پر لٹکا دیا جاتا، تاکہ تمام بنی نوع انسان نجات پا جاتے۔ نیز اگر مسیح کی صلیبی موت پر ایمان لانے سے انسان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو پھر توبہ سے کیوں معاف نہیں ہوتے جو ایک طبعی ذریعہ ہے دل کی پاکیزگی کا۔ ایک زائد چیز کو مان لینا تو دل کی پاکیزگی کا طبعی ذریعہ نہیں لیکن گناہ پر دل میں ندامت اور شرمندگی کا پیدا ہونا اور انسان کا حسرت کے ساتھ اپنے دل پر ایک موت وارد کر لینا یہ تو دل کی صفائی کا ایک طبعی اور یقینی ذریعہ ہے۔ تعجب ہے کہ عیسائی دنیا یہ تو مانتی ہے کہ مسیح کی صلیبی موت پر ایمان لانے سے ایک شخص کا دل صاف ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے لیکن وہ یہ نہیں مانتی کہ ایک شخص جب اپنی غلطی پر اظہار افسوس اور ندامت کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اسکو معاف کرسکتا ہے۔ دنیا کے معاملات میں ہم روزانہ دیکھتے ہیں خود عیسائی بھی اس طریق پر عامل ہیں کہ بسا اوقات ایک غلطی کرنے والا جب اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہے اور سچی ندامت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے تو اُسے معاف کر دیا جاتا ہے۔ مغربی تعلیم نے سکولوں کے متعلق اس قانون کو بڑے زور شور سے جاری کیا ہوا ہے حالانکہ اگر کفارے کا عقیدہ درست ہوتا تو یُوں چاہیئے تھا کہ بجائے اس کے کہ سبق نہ یاد کرنے پر اگر لڑکے کے دل میں ندامت پیدا ہو تو اُسے معاف کر دیا جائے لڑکا کھڑے ہو کر یہ کہہ دے کہ صاحب مَیں نے سبق یاد نہیں کیا لیکن میں مسیح کے کفارہ پر ایمان لے آیا ہوں۔ اس لیے میرے اس قصور کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لیکن کوئی عیسائی اس پر عمل نہیں کرتا۔ استاد اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ سبق نہ یاد کرنے پر اگر تم اپنے دل میں ندامت محسوس کرو اور آیندہ کے لیے اپنی اصلاح کا وعدہ کرو تو مَیں تمہیں معاف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ اس بات کا کبھی مطالبہ نہیں کرتا کہ تم مسیح کے کفارہ پر ایمان لاؤ تو تمہیں معاف کر دیا جائیگا۔ لیکن اگر مسیح کی صلیبی موت پر ایمان لانے سے دل کی پاکیزگی مراد ہے تو عیسائی دنیا کا عمل اس امر کی تردید کر رہا ہے کہ کفارہ پر ایمان لانے سے دل کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ جتنی خرابی اور جتنا فسق و فجور اس زمانہ میں عیسائی دنیا میں ہو رہا ہے باقی دنیا میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ آخر وہ کیا چیز ہے جو مسیح کے کفارہ نے عیسائیوں کو دی۔ اگر نجات دی ہے تو مَیں بتا چکا ہوں کہ نجات کا صحیح طریق تو سچی توبہ ہے اور اسی ذریعہ سے مسیح سے پہلے انبیاء کی اُمتوں نے نجات پائی۔ اور اگر اس سے مراد دل کی پاکیزگی ہے تو دل کی پاکیزگی باوجود کفارہ کے عیسائیوں کو حاصل نہیں ہوئی۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ کسی عیسائی کے دل میں صفائی نہیں مگر مَیں یہ ضرور کہتا ہوں کہ کسی عیسائی کے دل کی پاکیزگی کفارہ پر ایمان لانیکا نتیجہ نہیں بلکہ اسکا دل بھی اسی طرح صاف ہُوا ہے جس طرح باقی دنیا کا توبہ اور ندامت سے صاف ہوا کرتا ہے یا عبادات سے ہُوا کرتا ہے جیسے خود حضرت مسیح نے کہا کہ "یہ قسم دُعا کے سوا کسی اور طرح نہیں نکل سکتی" (مرقس باب ۹ آیت ۲۹)

صفاتِ الٰہیہ جو قرآن مجید میں مذکور ہیں

مذکورہ بالا چاروں صفات کی تشریح میں خدا تعالیٰ کی مختلف صفتیں جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں۔ ہم انکی تفصیل اس جگہ بیان نہیں کرسکتے۔ صرف اختصار کے ساتھ ان صفات کا ذکر کر دیتے ہیں جو یہ ہیں :۔

(۱) اَلْمَلِكُ وہ بادشاہ ہے۔
(۲) اَلْقُدُّوْسُ نہایت پاک ذات ہے
(۳) اَلسَّلَامُ سلامتی والا۔
(۴) اَلْمُؤْمِنُ امن دینے والا۔
(۵) اَلْمُهَيْمِنُ پناہ دینے والا
(۶) اَلْعَزِيْزُ غالب ہے
(۷) اَلْجَبَّارُ صاحب جبروت ہے
(۸) اَلْمُتَكَبِّرُ کبریائی والا ہے
(۹) اَلْخَالِقُ پیدا کرنے والا
(۱۰) اَلْبَارِئُ بنانے والا ہے
(۱۱) اَلْمُصَوِّرُ صورت گر ہے۔
(۱۲) اَلْغَفَّارُ قصور بخشنے والا ہے
(۱۳) اَلْقَهَّارُ دبدبہ والا ہے
(۱۴) اَلْوَهَّابُ بہت عطا کرنیوالا ہے
(۱۵) اَلرَّزَّاقُ رزق دینے والا ہے
(۱۶) اَلْفَتَّاحُ کھولنے والا ہے
(۱۷) اَلْعَلِيْمُ نہایت درجہ علم رکھنے والا ہے
(۱۸) اَلْقَابِضُ ہر چیز کو حد لبت کے اندر رکھنے والا
(۱۹) اَلْبَاسِطُ کشائش پیدا کرنیوالا ہے
(۲۰) اَلْخَافِضُ پست کرنیوالا ہے
(۲۱) اَلرَّافِعُ بلند کرنے والا ہے
(۲۲) اَلْمُعِزُّ عزت دینے والا ہے
(۲۳) اَلْمُذِلُّ ذلت دینے والا ہے
(۲۴) اَلسَّمِيْعُ ہر آواز سننے والا ہے
(۲۵) اَلْبَصِيْرُ ہر چیز دیکھنے والا ہے
(۲۶) اَلْحَكَمُ صحیح فیصلہ کرنیوالا ہے
(۲۷) اَلْعَدْلُ انصاف کرنیوالا
(۲۸) اَللَّطِيْفُ نہایت باریک بین ہے
(۲۹) اَلْخَبِيْرُ خبر رکھنے والا
(۳۰) اَلْحَلِيْمُ تحمل والا ہے
(۳۱) اَلْعَظِيْمُ بہت عظمت والا ہے
(۳۲) اَلْغَفُوْرُ گناہ بخشنے والا
(۳۳) اَلشَّكُوْرُ نہایت قدردان ہے
(۳۴) اَلْعَلِيُّ صاحب مرتبت ہے۔
(۳۵) اَلْكَبِيْرُ بڑائی والا ہے
(۳۶) اَلْحَفِيْظُ حفاظت کرنیوالا ہے
(۳۷) اَلْمُقِيْتُ ہر چیز کی قوتوں کو بحال رکھنے والا ہے
(۳۸) اَلْحَسِيْبُ حساب کرنیوالا ہے
(۳۹) اَلْجَلِيْلُ بزرگی والا ہے
(۴۰) اَلْكَرِيْمُ عزت والا ہے
(۴۱) اَلرَّقِيْبُ نگہبان ہے
(۴۲) اَلْمُجِيْبُ دعا قبول کرنیوالا ہے
(۴۳) اَلْوَاسِعُ فراخی دینے والا ہے
(۴۴) اَلْحَكِيْمُ ہر کام حکمت سے کرنیوالا ہے
(۴۵) اَلْوَدُوْدُ محبت کرنیوالا ہے
(۴۶) اَلْمَجِيْدُ عالیشان رکھنے والا ہے
(۴۷) اَلْبَاعِثُ مُردوں کو اٹھانیوالا ہے
(۴۸) اَلشَّهِيْدُ ہر جگہ حاضر ہے
(۴۹) اَلْحَقُّ اس کا وجود خود اسکی ذات پر شاہد اور سب سچائیوں کا منبع ہے
(۵۰) اَلْوَكِيْلُ حقیقی کارساز ہے۔
(۵۱) اَلْقَوِيُّ نہایت زور آور ہے۔
(۵۲) اَلْمَتِيْنُ بہت بڑی قوت رکھنے والا ہے
(۵۳) اَلْوَلِيُّ حمایت کرنے والا ہے۔
(۵۴) اَلْحَمِيْدُ سب تعریفوں کا مالک ہے
(۵۵) اَلْمُحْصِي ہر چیز کو گننے والا ہے
(۵۶) اَلْمُبْدِئُ پہلی بار پیدا کرنیوالا ہے
(۵۷) اَلْمُعِيْدُ دوسری پیدائش دینیوالا ہے
(۵۸) اَلْمُحْيِي۔ جلانے والا۔
(۵۹) اَلْمُمِيْتُ مارنے والا ہے۔
(۶۰) اَلْحَيُّ زندہ ہے
(۶۱) اَلْقَيُّوْمُ سب کا سہارا ہے
(۶۲) اَلْوَاجِدُ ہر چیز کو پانیوالا ہے
(۶۳) اَلْمَاجِدُ نہایت بزرگ ہستی ہے
(۶۴) اَلْقَادِرُ۔ قدرت و اختیار رکھنے والا ہے
(۶۵) اَلْمُقْتَدِرُ سب قدرتیں اسکے قبضہ میں ہیں
(۶۶) اَلْمُقَدِّمُ آگے بڑھانیوالا ہے
(۶۷) اَلْمُؤَخِّرُ پیچھے ہٹانیوالا ہے
(۶۸) اَلْاَوَّلُ سب سے پہلا ہے
(۶۹) اَلْاٰخِرُ سب سے پچھلا ہے
(۷۰) اَلظَّاهِرُ ہر چیز اپنی انتہا میں اسکے وجود کو ظاہر کرتی ہے
(۷۱) اَلْبَاطِنُ ہر چیز کی کنہ اسکے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے
(۷۲) اَلْوَالِي۔ حکمران ہے۔
(۷۳) اَلْمُتَعَالِي۔ پاک صفات والا ہے۔
(۷۴) اَلْبَرُّ اعلیٰ درجہ کا نیک سلوک کرنیوالا ہے
(۷۵) اَلتَّوَّابُ توبہ قبول کرنیوالا ہے۔
(۷۶) اَلْمُنْعِمُ انعام دینے والا ہے
(۷۷) اَلْمُنْتَقِمُ ہر عمل کی مناسب سزا دینیوالا ہے
(۷۸) اَلْعَفُوُّ درگذر کرنیوالا ہے۔
(۷۹) اَلرَّءُوْفُ نرمی کرنیوالا ہے
(۸۰) مَالِكُ الْمُلْكِ سلطنت کا مالک ہے
(۸۱) ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَام صاحب عزت و بخشش ہے۔
(۸۲) اَلْمُقْسِطُ صحیح فیصلہ کرنیوالا ہے
(۸۳) اَلْجَامِعُ۔ اکٹھا کرنیوالا ہے۔
(۸۴) اَلْغَنِيُّ۔ تمام حوائج سے مستغنی ہے
(۸۵) اَلْمُغْنِي۔ غنی کرنے والا ہے۔
(۸۶) اَلْمَانِعُ۔ روکنے والا ہے۔
(۸۷) اَلضَّارُّ شریر کو اسکے کام کی سزا دیتا ہے
(۸۸) اَلنَّافِعُ۔ فائدہ پہنچانے والا ہے۔
(۸۹) اَلنُّوْرُ۔ روشنی بخشنے والا ہے۔
(۹۰) اَلْهَادِي۔ ہدایت دینے والا ہے
(۹۱) اَلْبَدِيْعُ۔ ایجاد کرنے والا ہے۔
(۹۲) اَلْبَاقِي۔ باقی رہنے والا ہے۔
(۹۳) اَلْوَارِثُ۔ سب کا وارث ہے۔
(۹۴) اَلرَّشِيْدُ۔ نیک راہ بتانے والا ہے
(۹۵) اَلصَّبُوْرُ بہت صبر کرنیوالا ہے
(۹۶) ذُوالْعَرْش
(۹۷) ذُوالْوَقَار ہر بات کو دلیل اور غرض کے مطابق کرنیوالا۔
(۹۸) اَلْمُتَكَلِّمُ کلام کرنے والا۔
(۹۹) اَلشَّافِي۔ شفا دینے والا ہے
(۱۰۰) اَلْكَافِي۔ سب حاجتوں کو پورا کرنیوالا۔

یہ ایک سو چار؎ موٹے موٹے نام ہیں جو قرآن شریف سے اخذ کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر تو انہی الفاظ میں قرآن کریم میں بیان ہیں لیکن بعض ایسے ہیں جو قرآن کریم کی آیتوں سے اخذ کر کے لکھے گئے ہیں ان ناموں پر غور کر کے اس روحانی نظام کا ڈھانچہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ یہ صفات موٹے طور پر تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ اوّل وہ صفات جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ مخلوق کا اُن کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ مثلاً الحیّ زندہ رہنے والا ہے۔ القادر قدرت اور اختیار رکھنے والا ہے۔ الماجد بزرگی رکھنے والا وغیرہ وغیرہ۔ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جو مخلوق کی پیدائش کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور خدا تعالیٰ کے سلوک اور اس کے نسبتی تعلق پر دلالت کرتی ہیں مثلاً الخالق۔ المالک وغیرہ وغیرہ۔ تیسری قسم کی صفات وہ ہیں جو بالارادہ ہستیوں کے اچھے اور بُرے اعمال کے متعلق خدا تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً رحیم ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ہے عفوٌّ ہے رءُوف ہے وغیرہ وغیرہ۔

بعض صفات بظاہر مکرّر نظر آتی ہیں، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایک لطیف فرق ہے مثلاً پیدائش کے متعلق اللہ تعالیٰ کی کئی صفات بیان ہوئی ہیں۔ جیسے خالق کلّ شیءٍ، البدیع۔ الفاطر۔ الخالق۔ البارئ۔ المعید۔ المصوّر۔ الرّب۔ یہ صفات بظاہر ملتی جلتی نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت یہ مختلف ممتاز معنوں پر دلالت کرتی ہیں۔ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ روح اور مادہ کا بھی پیدا کرنے والا ہے کیونکہ بعض قومیں خدا تعالیٰ کو صرف جوڑنے جاڑنے کا موجب سمجھتی ہیں۔ بسیط مادے کا خالق نہیں سمجھتیں۔ ان کا خیال ہے کہ مادہ اور روح بھی خدا تعالیٰ کی طرح ازلی اور انادی ہیں، اگر خالی لفظ خالق ہوتا تو لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم بھی خدا تعالیٰ کو خالق مانتے ہیں، مگر ہمارے نزدیک خالق کے یہ معنے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو جوڑ جاڑ کر ایک نئی شکل دے دیتا ہے۔ ان لوگوں کو اس تاویل کی وجہ سے قرآن کریم کا حقیقی منشا واضح اور روشن طور پر ثابت نہ ہو سکتا۔ پس خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ کی صفت نے محض خلق کی صفت سے ایک زائد مضمون بیان کیا ہے۔ بدیع کا مفہوم یہ ہے کہ نظام عالم کا ڈیزائن اور نقشہ خدا تعالیٰ نے بنایا ہے۔ گویا یہ اتفاقی نہیں یا موجودات میں سے کسی کی نقل نہیں۔ فطر کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو پھاڑ کر اس میں سے مادہ کو نکالنا۔ پس فاطر کی صفت سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو مادہ پیدا کیا اس کے اندر اس نے مخفی ارتقاء کی طاقتیں رکھیں اور اپنے وقت پر وہ پردے جو اُن طاقتوں کو دبائے ہوئے تھے اُن کو اس نے پھاڑ دیا جیسے بیج کے اندر درخت یا پودہ بننے کی خاصیّت ہوتی ہے مگر وہ ایک خاص حالات کا منتظر رہتا ہے، اس وقت اور اس موسم میں وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے غرض فاطر کے لفظ نے بتا دیا کہ خدا تعالیٰ نے سب کچھ یکدم نہیں کر دیا بلکہ دنیا کو ایک قانون کے مطابق پیدا کیا ہے۔ ہر ایک درجہ کے متعلق ایک قانون کام کر رہا ہے ایک اندرونی تیاری دنیا میں ہوتی رہتی ہے اور ایک خاص وقت پر جا کر بعض مخفی طاقتیں اپنے آپ کو ظاہر کر دیتی ہیں اور ایک نئی چیز بننے لگ جاتی ہیں خالق کے معنے وہ بھی ہیں جو خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ میں بیان ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے

؎ یعنی مع ان چار ناموں کے جو سورہ فاتحہ میں مذکور ہیں اور ام الصفات کہلاتی ہیں۔ ۱۲ عبد اللطیف بہاولپوری۔

علاوہ ایک اور معنے بھی خالق کے ہیں، اور وہ تجویز کرنے والے کے ہیں۔ پس خالق کے معنے یہ ہیں کہ مختلف چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا۔ یہ بھی خدا تعالےٰ کا ہی کام ہے۔ اس دنیا کو ایک خاص نظام کے ماتحت خدا تعالیٰ نے رکھا ہے اور اس پر خالق کا لفظ دلالت کرتا ہے۔ بادی کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے مختلف ظہور شروع کرتا ہے اور پھر وہ ایک ایسا قانون مقرر کر دیتا ہے کہ وہ چیز اپنی نسل کا تکرار کرتی چلی جاتی ہے اور اس پر خدا تعالیٰ کا نام المعید دلالت کرتا ہے۔ المصوّر کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہر چیز کو ایک خاص شکل خدا تعالیٰ نے دی ہے جو اس کے مناسب حال ہے۔ صرف کسی چیز کے اندر کسی خاصیت کا پیدا کر دینا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اسے مناسب حال شکل دینا بھی ضروری ہوتا ہے اسکے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اسی طرح کسی چیز کا محض پیدا ہو جانا کافی نہیں بلکہ اس کا ایسی شکل میں پیدا ہونا کہ وہ اپنے کام کو سر انجام دے سکے یہ بھی ضروری ہوتا ہے پس اس صفت کے اظہار کے لیے خدا تعالیٰ کا ایک نام المصوّر ہے۔ الرّب کی صفت ان معنوں پر دلالت کرتی ہے کہ پیدا کرنے کے بعد اس کی طاقتوں کو تدریجی طور پر بڑھاتے چلے جانا اور کمال تک پہنچانا۔ ظاہر ہے کہ پہلی صفات اس مضمون کو ادا نہیں کرتیں۔ اسی طرح اور کئی صفات ہیں جو بظاہر مکرّر نظر آتی ہیں مگر درحقیقت ان کے اندر باریک فرق ہے اور اس فرق کے سمجھ لینے کے بعد وہ روحانی نظام جس کو قرآن کریم پیش کرتا ہے نہایت ہی شاندار اور خوبصورت طور پر انسان کی آنکھوں کے آگے آجاتا ہے۔ یہ صفات جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں اور جن کا ایک حصّہ میں نے اوپر درج کیا ہے انجیل میں تو ان کا بہت ہی کم ذکر ہے تورات اور دوسرے انبیاء کے صحف میں بھی فرداً فرداً یہ ساری صفات بیان نہیں ہوئیں ہاں بنی اسرائیل کے تمام انبیاء کی کتابوں کو جمع کیا جائے تو پھر ان میں سے بہت سی صفات کا ذکر ان میں آجاتا ہے مگر ساری کا پھر بھی ذکر نہیں۔ درحقیقت مسلمانوں میں یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ نام ہیں یہ عقیدہ ان یہودی روایات سے ہی وابستہ ہے جو انہوں نے تورات سے صفات الٰہیہ اخذ کر کے بنائی ہیں ورنہ قرآن کریم میں ننانوے ۹۹ سے بہت زیادہ نام مذکور ہیں جن میں سے ایک سو چار ۱۰۴ نام تو میں نے اوپر بیان کر دیئے ہیں اور ابھی بہت سے باقی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی وہ صفات جن کا انسان کے ساتھ تعلق ہی نہیں ان کے قرآن کریم میں بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا اور یقیناً وہ قرآن کریم میں بیان نہیں ہوئیں پس کسی خاص تعداد میں خدا تعالیٰ کے ناموں کو محدود کرنا درست نہیں۔ اور اگر اسلامی لٹریچر میں اس قسم کا کوئی ذکر پایا جاتا ہے تو وہ صرف یہودی دعوے کے تقابل کے لیے ہے حقیقت محض کے اظہار کے لیے نہیں۔ ویدوں کو بھی میں نے دیکھا ہے ان میں بھی بہت کم صفات خدا تعالیٰ کی بیان ہوئی ہیں۔ اور یہی حال ژند اور اوستا کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ چونکہ قرآن کریم کامل کتاب ہے اور روحانیت کی تکمیل کے لیے آخری زینہ ہے اس لیے اس میں وہ صفات بھی آگئی ہیں جو پہلی کتابوں نے بیان کیں اور ان کے علاوہ کئی زائد صفات بھی اس میں بیان کی گئی ہیں۔

بعض لوگوں کو ان صفات کے دیکھنے سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض متضاد صفات بھی ہیں۔ مثلاً خدا تعالےٰ رحم کرنے والا بھی ہے اور خدا تعالےٰ سزا دینے والا بھی ہے۔ خدا تعالیٰ غنی بھی ہے اور پھر وہ پیدا بھی

کرتا ہے اور بنی نوع انسان کی طرف ہدایت بھیجتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسے ان چیزوں کے وجود میں آنے کی خواہش ہے۔ عام طور پر ایسے دماغوں میں یہ سوالات پیدا ہوا کرتے ہیں جنہوں نے فلسفہ پر ادھورا غور کیا ہوتا ہے وہ اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ دنیا کا سارا حسن تو اس کے بظاہر نظر آنیوالے اختلاف میں ہی پایا جاتا ہے یہ لوگ اس امر پر غور نہیں کرتے کہ مختلف چیزیں اپنا الگ الگ دائرہ رکھتی ہیں یا زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک کڑی کے ختم ہونے پر دوسری کڑی شروع ہوتی ہے۔ بیشک خدا تعالیٰ سزا بھی دیتا ہے لیکن سزا دینے کے لیے اس نے کچھ قوانین مقرر کیے ہیں۔ جب وہ قوانین چاہتے ہیں تو وہ سزا دیتا ہے اور جب اس کے برخلاف اپنے عفو کی صفت کو جاری رکھنے کے جو قوانین مقرر کیے ہیں ان کا تقاضا بڑھ جاتا ہے تو وہ عفو کرتا ہے اور ایک ہی وقت میں کسی انسان کے لیے اسکی سزا کی صفت جاری ہو رہی ہوتی ہے اور کسی انسان کے لیے اس کی بخشش کی صفت جاری ہو رہی ہوتی ہے۔ کسی انسان کے لیے اسکی پیدا کرنے کی صفت جاری ہو رہی ہوتی ہے اور کسی انسان کے لیے اس کے مارنے کی صفت جاری ہو رہی ہوتی ہے۔ میں ابھی چھوٹا تھا کہ آریہ سماج کے ایک لیڈر نے مجھ سے سوال کیا کہ خدا تعالیٰ کو قرآن کریم میں رَبُّ الْعَالَمِیْن کہا گیا ہے پھر وہ مارتا کیوں ہے حالانکہ ربّ العالمین کے تو معنے ہیں پیدا کر کے تکمیل تک پہنچانا۔ یہ اعتراض محض سطحی تھا۔ ربّ العالمین کے یہ تو معنی نہیں کہ اسکو مارے نہیں قرآن کریم میں ربّ العالم نہیں کہا گیا بلکہ ربّ العالمین کہا گیا ہے اور جب ایک چیز ایک طرف سے دوسری طرف کو منتقل ہو جاتی ہے تو ربوبیت کی صفت بھی ایک دوسری شکل میں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے غرض جو چیز موجود ہے وہ خدا تعالیٰ کی ربوبیت سے فائدہ اُٹھا رہی ہے اور جو چیز موجود نہیں وہ عالم ہے ہی نہیں۔ اس کے متعلق سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

صفاتِ الٰہیہ دو قانونوں کے ماتحت کام کرتی ہیں

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات دو قانونوں کے ماتحت چلتی ہیں۔ وہ صفات جو بنی نوع انسان سے تعلق رکھتی ہیں ان کے باہمی تعاون کیلئے خدا تعالیٰ نے دو قانون قرآن شریف میں پیش کیے ہیں ایک قانون کا ذکر رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (اعراف ع ۱۹ آیت ۱۵۷) کی آیت میں آتا ہے یعنی میری رحمت ہر چیز پر غالب ہے دوسری صفت قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے، مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ (نوح ع ۱ آیت ۱۴) تمہیں کیا ہو گیا کہ تم خدا تعالیٰ کے متعلق یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ اپنے کاموں میں حکمت کو مدِ نظر رکھتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے جو قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں ایک نام حکیم بھی ہے جو اس مفہوم کے ساتھ ملتے جلتے مفہوم پر دلالت کرتا ہے ان دو صفات سے ظاہر ہے کہ ہر صفت جو خدا تعالیٰ کی ظاہر ہو گی وہ کسی غرض اور غایت کو پورا کرنے کے لیے ہو گی، بلا وجہ نہیں ہو گی۔ دوسرے یہ کہ جہاں بھی سزا اور رحم کے مطالبے ٹکرا جائینگے رحم کے پہلو کو ہمیشہ ترجیح دیجائیگی اور سزا کے پہلو کو ہمیشہ اسکے ماتحت رکھا جائے گا۔ درحقیقت قرآن کریم کی یہی وہ خوبی ہے جو ایک مومن کے دل کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھر دیتی ہے اور یہی وہ اصول ہے جو بندے اور خدا میں محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہو جاتا ہے ایک مسلمان کو خدا تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کے لیے کسی عقل میں نہ آنے والے کفارہ کے مسئلہ

کی ضرورت نہیں نہ اس کو کسی شخص کے صلیب پر لٹک کر مر جانے کے مسئلہ پر ایمان لانے کی حاجت ہے۔ جب وہ قرآن کریم کے بتائے ہوئے اس گُر کو دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت کے ماتحت ہوتا ہے۔ ہر کام کسی غرض اور غایت کے لیے ہوتا ہے اور ہر کام کسی جائز اور معقول سبب کے لیے ہوتا ہے اور یہ کہ باوجود اس کے جب ایک کمزور انسان کمزوری دکھا جاتا ہے اور اسکے دل میں ندامت اور شرم پیدا ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ کی محبت اور خدا تعالیٰ کا غُفران اسکو ڈھانک لیتا ہے تو اس کا دل بیتاب ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف جھک جاتا ہے اور جب ایک مسلمان اس بات کو دیکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ باوجود خالق اور مالک ہونے کے بندے کے قصوروں کو معاف کرتا اور اسکی غلطیوں سے درگذر کرتا اور اس کی ترقی کے سامان پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی سزا دُکھ دینے اور ذلیل کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ بندے کی اصلاح اور ترقی کے لیے ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کا خدا اُس کی توبہ کے قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے وہ اس کے گناہوں پر پردہ ڈالتا ہے اور توبہ اور ندامت کے بعد گناہوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ باوجود عظیم الشان ہونے کے اور نہایت ہی بالا ہستی ہونیکے وہ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور انسان کے دل میں اس سے ملنے کا جتنا شوق ہے اس سے کہیں بڑھ کر خدا تعالےٰ کو اس سے ملنے کا شوق ہے تو انسان کا دل محبّت اور پیار سے بھر جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف جھکتا ہے اس سے بھی زیادہ شوق سے جس شوق سے ایک بچہ اپنی ماں کی طرف جھکتا ہے اور خدا تعالیٰ بھی ایسے انسان کی طرف محبت سے جھکتا ہے اس ماں کی محبّت کی نسبت سے بھی زیادہ شدید محبت سے جو اپنے روتے ہوئے بچے کی طرف بھاگتی ہے۔

پیدائش عالم اور انسان کا نقطۂ مرکزی ہونا

قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس نقطۂ مرکزی یعنی خدا تعالیٰ نے چاہا کہ ایک نیا عالم پیدا کرے جو اس کے نُور اور اس کے جلال کا مظہر ہو۔ تب اس نے یہ مادی عالم پیدا کیا۔ اس عالم کی پیدائش کے متعلق قرآن کریم نے جو روشنی ڈالی ہے وہ مختصراً یہ ہے۔ فرماتا ہے۔ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (ھود ع آیت ۸) خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ وقتوں میں پیدا کیا ہے (یعنی چھ اہم تبدیلیوں والے زمانوں میں) وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ اور اس سے پہلے خدا تعالےٰ کا حکم پانی پر چلتا تھا۔ اس پانی کی حالت سے زمین و آسمان کے پیدا کرنے کی غرض یہ تھی کہ وہ ایک ایسا انسان پیدا کرے جو نیکی اور بدی پر اختیار رکھتا ہو اور ہر قسم کے امتحانوں میں سے گذرتے ہوئے یہ ثابت کرے کہ ان میں سے کون دوسروں سے فائق ہو گیا ہے اور اعلیٰ درجہ کی نیکی کا نمونہ بن گیا ہے اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے یعنی مادہ کی موجودہ شکل سے پہلے دنیا میں ایک پانی کی خاصیّت کا مادہ پیدا کیا گیا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یُوں کہہ لو کہ ہائیڈروجن کا بسیط ترین ذرّہ پیدا کیا گیا تھا پھر اس کو ترقی دیتے دیتے یہ عالم پیدا ہؤا۔ زمین اور آسمان کی موجودہ شکل کے اختیار کرنے سے پہلے کی حالت کے متعلق بھی قرآن شریف روشنی ڈالتا

ہے اور فرماتا ہے اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (انبیاء ع آیت ۳۱) کیا اسلام کے منکر اس بات کو سمجھتے نہیں کہ آسمان اور زمین شروع میں ایک گولہ کی طرح تھے پھر ہم نے اُن کو پھاڑ کر ایک نظام شمسی قائم کردیا اور شروع سے ہی ہمارا یہ طریق چلا آرہا ہے کہ ہم پانی سے ہر چیز زندہ کیا کرتے ہیں کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے یعنی مادی عالم نے جس طرح ترقی کی ہے اسی طرح روحانی عالم بھی ترقی کریگا جس طرح دنیا میں پھیلا ہوا ایک گول سا مادہ تھا جس کو خدا تعالیٰ نے اپنے مقررہ قانون کے ماتحت پھاڑا اور دُور دُور اس کے ٹکڑے جا کر گرے اور نظام شمسی بن گیا اسی طرح روحانی دنیا میں بھی ایک تغیر عظیم پیدا ہوتا ہے دنیا کی روحانی حالت خراب ہوجاتی ہے اور فضا گھُٹی گھُٹی سی معلوم ہوتی ہے تب اللہ تعالیٰ اسی تاریکی سے ایک نور ظاہر کرتا ہے اور جس طرح زمین کی تاریکی سے پودہ پھوٹتا ہے اسی طرح اس تاریکی میں جنبش پیدا ہو کر ایک زلزلہ سا آتا ہے اور اس مردہ مادہ میں ایک دائمی حرکت کرنے والا روحانی نظام شمسی پیدا ہوجاتا ہے جو اپنے مرکزی نقطہ سے پھیل کر ملک یا دنیا کو اپنی وسعت کے مطابق گھیر لیتا ہے۔ اور جس طرح مادی عالم کی پیدائش کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے اسی طرح یہ تغیر جو دنیا میں ہوتا ہے یہ بھی آسمانی پانی یعنی الہام سے ہوتا ہے۔ بغیر آسمانی پانی کے ایسا تغیر نہیں ہوتا۔ الغرض قرآنی تعلیم کے رو سے دنیا مختلف تغیرات میں سے گذرتی چلی گئی اور آخر وہ وقت آیا جب زمین کے پردہ پر انسان پیدا کیا جاسکتا تھا اور وہی انسان کم سے کم اس نظام شمسی کا مقصود تھا جب وہ وقت آگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس مادی عالم میں انسان کو پیدا کیا تاکہ وہ خدا تعالیٰ کی صفات کو ظاہر کرے اور اللہ تعالیٰ کے حسین چہرہ کے لیے ایک آئینہ کی طرح ثابت ہو اور اس طرح ایک روحانی بادشاہت کی بنیاد رکھی جائے۔ بے شک خدا تعالیٰ کی مخلوق لاکھوں اور کروڑوں قسم کی ہے قرآن کریم فرماتا ہے وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (مدثر آیت ۳۲) اللہ تعالیٰ کے لشکروں سے خدا ہی واقف ہے دوسرا کوئی واقف نہیں لیکن انسان کو ایک عزت اور رتبہ کا مقام حاصل ہے اس لیے کہ انسان خدا تعالیٰ کے لیے بمنزلہ آئینہ ہے اسی لیے مسلمان صوفیاء اس کو عالم صغیر کہتے ہیں یعنی تمام مخلوقات کی صفات انسان کے اندر جمع ہوگئی ہیں اور انسان کو ہم ساری دنیا کا قائمقام کہہ سکتے ہیں جس طرح ایک نقشہ چھوٹے سے کاغذ پر ہوتا ہے لیکن وہ ملک کی تمام کیفیات کو ظاہر کردیتا ہے اسی طرح انسان گو ایک چھوٹا سا جسم رکھتا ہے مگر وہ تمام عالم کی مختلف حقیقتیں اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے پس خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ دنیا کا محور اور مرکز انسان ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے جو کچھ پیدا کیا ہے انسان کے فائدہ کے لیے پیدا کیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ انسان دنیا کی ہر مخلوق پر حکومت کررہا ہے اور کوئی مخلوق اس پر حکومت نہیں کررہی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آب و ہوا کی تبدیلیاں۔ ستاروں کی روشنیاں۔ بجلیاں اور بیماریاں اسی طرح طوفان اور بارشیں انسان پر ضرور اثر کرتی ہیں۔ مگر اثر اور حکومت میں فرق ہوتا ہے، حاکم بھی اپنے محکوم سے متاثر ہوتے ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا حاکم ہمیں نظر نہیں آتا جو اپنے محکوم سے متاثر نہ ہو، مگر باوجود اس کے حاکم اور محکوم کے پہچاننے میں کوئی مشکل

پیش نہیں آتی۔ اسی طرح گو انسان دوسری چیزوں سے متاثر ہوتا ہے، لیکن حکومت اور قبضہ انسان ہی کا دوسری چیزوں پر ہوتا ہے۔ دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں، ہواؤں، دواؤں، بارشوں اور بجلیوں وغیرہ پر حاکمانہ اقتدار انسان کا ہی ہے اور اس طرح وہ تمام مخلوق کا نقطۂ مرکزی ہے، یا یوں کہہ لو کہ اس مخلوق کا جو ہماری دنیا کے ساتھ تعلّق رکھتی ہے کیونکہ عالم کی وسعت اتنی بڑی ہے کہ ہم اس کے متعلق کوئی عام فتویٰ لگانے کا حق نہیں رکھتے۔

انسان کی پیدائش اور اس کی دماغی ترقی تدریجی طور پر ہوئی

انسان کی پیدائش کے متعلق قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ تورات و انجیل کے دعووں کے برخلاف انسان کی پیدائش تدریجی طور پر ہوئی ہے۔ ایک آیت تو میں پہلے "قرآنی تعلیم کے اصول" کے زیر عنوان لکھ چکا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسان کی پیدائش کو تدریجی قرار دیتا ہے۔ اس جگہ ایک اور آیت بیان کرتا ہوں جس سے پتہ لگتا ہے کہ انسان کی پیدائش اس طرح نہیں ہوئی کہ خدا تعالیٰ نے مٹّی سے ایک صورت بنائی اور پھر اس میں روح پھونک دی بلکہ جیسا کہ خدا تعالےٰ کی اور سنتیں ظاہر ہوئی ہیں وہ بھی تدریجی تغیرات کے بعد ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ نوح میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۵ (آیت ۱۵) تمہیں خدا تعالیٰ نے ایک درجہ کے بعد دوسرے درجہ اور ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت میں تبدیل کرتے ہوئے آہستہ آہستہ پیدا کیا ہے۔ پس انسان کی پیدائش قرآنی تعلیم کے مطابق یکدم نہیں ہوئی بلکہ آہستہ آہستہ ہوئی ہے بلکہ انسان کا دماغی ارتقا بھی یکدم نہیں ہوا، بلکہ آہستہ آہستہ ہوا ہے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم سے پہلے انسانی مخلوق موجود تھی، مگر ظاہری شکل میں ابھی وہ خدا تعالیٰ کی شریعت کی حامل نہ ہو سکتی تھی، وہ مخلوق غاروں اور پہاڑوں کی کھوہوں میں رہتی تھی۔ اس لیے قرآن کریم نے ان کا نام جنّ رکھا ہے۔ جنّ کے معنے عربی زبان میں پوشیدہ رہنے والے کے ہیں بعض لوگوں نے اس لفظ کو روایتی جنّ پر محمول کیا ہے، حالانکہ قرآن کریم کی تشریح ان روایتی جنوں پر صادق نہیں آتی۔ قرآن کریم میں صاف لکھا ہے کہ بنو آدم کو آدم کے جنّت سے نکلنے پر (جنت بھی ارضی تھی وہ جنت نہ تھی جس میں مرنے کے بعد انسان جائے گا) اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ابلیس (جو جنّوں میں سے تھا) اور اس کے ساتھیوں سے ہوشیار رہنا۔ اور ان کے دھوکوں میں نہ آنا، کیونکہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ مِل جُل کر رہنا ہوگا۔ اسی دنیا میں تم دونوں گروہ رہو گے اور اسی میں مرو گے پس ان سے ہوشیار رہنا (اعراف ۲ع آیت ۲۶ تا ۲۸) اور پھر آدم کے ساتھیوں اور ابلیس کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ جب تم میں نبی آئیں تو تم اُن پر ایمان لانا (بقرہ ۴ع آیت ۲۹) ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ آدم کے وقت جنّ اور ان کا سردار ابلیس درحقیقت بشری نسل میں سے تھے۔ ورنہ جنّ نہ تو انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور نہ بنی نوع انسان سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ پس قصّوں والے جنّ اور ہیں اور ان کا ذمہ وار قصّہ نویس ہے۔ قرآن کریم نے جن کو جنّ کہا ہے، وہ بشری نسل سے ہی ہیں اور یہ ان لوگوں کا نام ہے جو شروع زمانہ میں اس دنیا پر پائے جاتے تھے۔ جن کے دماغ پورے طور پر نشو ونما کو نہ پہنچے تھے۔ جب

دماغ کے پورے نشوونما کا وقت آیا تو سب سے کامل انسان آدم پر اللہ تعالیٰ کا الہام نازل ہُوا اور بعض تمدنی قواعد مثلاً مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کی غذا کی ذمہ واری لینے کی قسم کے موٹے موٹے احکام حضرت آدم پر نازل ہوئے وہ لوگ جنکی تمدنی رُوح ابھی کامل نہ تھی انہوں نے ان قیود کا انکار کیا اور آدم کا مقابلہ کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی اور آدم کو غالب کر دیا اور آئندہ کے لیے حکم دیا کہ جب کوئی دوسرا نبی آیا تو نبوت کا سلسلہ اسی شکل میں ظاہر ہوتا رہیگا۔ یعنی کچھ لوگ مومن ہونگے اور کچھ کافر۔ مومن انسانوں کے قائمقام ہونگے اور کفار اُن جنّوں کے قائمقام ہونگے کیونکہ ہر نبی ارتقائے دماغی یا روحانی کے لیے آتا ہے اور جو لوگ اس منزل ارتقاء کے مخالف ہوتے ہیں اور اس زمانہ کی قیود کی پابندی نہیں کر سکتے جو نبی کے ذریعہ سے سوسائٹی کی اصلاح کے لیے تجویز کی جاتی ہیں وہ اس کے منکر ہو جاتے ہیں۔

غرض قرآنی تعلیم کی رُو سے انسان کی پیدائش ارتقاء سے ہوئی ہے بلکہ اس کے دماغ کی ترقی بھی درجہ بدرجہ ارتقاء سے ہوئی ہے۔ آدم پہلا بشر نہ تھا بلکہ وہ بشروں میں سے پہلا مکمل بشر تھا جس کا دماغ الٰہی کلام کا حامل ہونے کے قابل ہُوا۔ اس لیے قرآن کریم نے آدم کے ذکر میں کہیں یہ نہیں کہا کہ آؤ ہم پہلا انسان پیدا کریں۔ بلکہ قرآن کریم میں جہاں آدم کا ذکر آتا ہے یُوں آتا ہے کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کروں۔ جس سے ظاہر ہے کہ بشر تو پہلے موجود تھے مگر وہ الہام الٰہی سے ابھی تک مشرف نہ ہوئے تھے کیونکہ ان کے دماغوں نے پوری نشوونما نہ کی تھی۔ جب آہستہ آہستہ بشری دماغ نے نشوونما حاصل کی اور وہ ایک نظام اور تمدّن کو قبول کرنیکے قابل ہوگیا تو اس وقت کے سب سے مکمل دماغ والے بشر آدم پر اللہ تعالیٰ نے الہام نازل کیا اور وہ پہلا نبی ہُوا پس وہ پہلا انسان نہ تھا پہلا نبی تھا اور اُسے اس زمانہ کی دماغی ترقی کے مطابق ایک بسیط اور سادہ تعلیم دی گئی جو صرف چند موٹے موٹے قوانین تمدّن پر مشتمل تھی اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بھی ایک سادہ سی تفصیل تھی۔ اس امر کے متعلق قرآن کریم کی ایک اور آیت بھی شاہد ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (اعراف ع آیت ۱۲) یعنی ہم نے تم انسانوں کو پیدا کیا پھر ہم نے تم کو ایک اچھی صورت بخشی پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کی اطاعت کرو۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ آدم سے پہلے کئی انسان پیدا ہو چکے تھے اور صَوَّرْنٰكُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک لمبی ارتقائی منزل میں سے بھی گذر چکے تھے کیونکہ پیدائش کے بعد صورت دینے سے جسمانی صورت تو مراد نہیں ہو سکتی، اس سے مراد ذہنی ارتقا ہی ہو سکتا ہے پس اس آیت کا مفہوم یہی ہے کہ پہلے انسان پیدا کیا گیا پھر آہستہ آہستہ ترقی دیتے ہوئے اس کے قویٰ کو ایک نئی شکل دے دی گئی اور وہ دوسرے حیوانوں سے ممتاز نظر آنے لگا یعنی اس کی سمجھ اور عقل مکمل ہو گئی تب آدم پیدا کیا گیا اور خدا تعالےٰ نے اس پر الہام نازل کیا۔

انسانی پیدائش کا مقصد

انسانی پیدائش کے متعلق قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے، تا وہ خدا تعالیٰ کی صفات کو ظاہر کرے اور اس کا نمونہ بنے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ

وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۃ ذاریات ع ۳ آیت ۵۷) میں نے جنّ و انس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے تا وہ خدا تعالیٰ کی صفات کا نقش اپنے دل پر پیدا کریں (جنّ سے اس جگہ انسان ہی کی بعض اقسام مراد ہیں نہ کہ غیر مرئی جنّ) اسی طرح قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ (فاطر ع آیت ۴۰) اے انسانو اللہ ہی ہے جس نے تم کو اس دنیا میں اپنا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا ہے پس اگر کوئی شخص تم میں سے اِس مقام کا انکار کرتا ہے تو اس کے انکار کا نتیجہ اُسی کو پہنچے گا یعنی اس عزّت کے مقام کو چھوڑ کر انسان خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا تعالیٰ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کو دنیا میں ظاہر کرنے کے لیے پیدا ہُوا ہے اور وہ اس دنیا میں خدا تعالیٰ کا قائم مقام ہے۔ پس انسان نقطۂ مرکزی ہے تمام عالم مادی کے لیے۔ اور چونکہ انبیاء انسانوں کی اصلاح کے لیے اور اُن کو اپنا فرض یاد دلانے کے لیے اور اسی میں کامیابی کے لیے صحیح طریق کار بتانے کے لیے آتے ہیں۔ اس لیے وہ نقطۂ مرکزی ہیں تمام انسانوں کے لیے۔ یا یُوں کہو کہ انسان ایک سورج کی طرح ہے جس کے گرد تمام مادی دنیا گھومتی ہے اور پھر اپنے اپنے دائرہ میں انبیاء ایک سورج ہیں جن کے گرد اُن کے حلقہ کے انسان گھومتے ہیں۔

قانون قدرت اور قانون شریعت

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے فرائض کی طرف توجّہ دلانے کے لیے اور ترقی کے راستہ پر اسے گامزن کرنے کے لیے خدا تعالیٰ نے دو قسم کے قانون جاری کیے ہیں۔ ایک قانونِ قدرت۔ اِس کا تعلّق انسان کی مادی ترقی کے ساتھ ہے چونکہ اس کا تعلّق رُوح کے ساتھ براہِ راست نہیں۔ اِس لیے اس قانون کے توڑنے پر اس کا نتیجہ نقصان کی صورت میں تو نکلتا ہے لیکن خدا تعالےٰ کی ناراضگی اور خفگی اس پر نہیں ہوتی۔ یہ قانون خدا تعالیٰ نے خود مادہ کے اندر ودیعت کر دیا ہے اس لیے کوئی بیرونی علم اس بارہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں آتا۔ دوسرا قانون، قانونِ شریعت ہے اس کا تعلّق روحانی اصلاح کے ساتھ ہے اس قانون کے توڑنے پر خدا تعالےٰ کی ناراضگی ہوتی ہے کیونکہ اس قانون کے پورا کرنے سے ہی انسان اُس مقصد کو پورا کر سکتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے اور اس قانون کو توڑنے کی وجہ سے وہ اس مقصد سے محروم رہ جاتا ہے جس کے لیے خدا نے اُسے پیدا کیا ہے۔ پس جب کوئی شخص اس قانون کو توڑتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کو ناراض کر دیتا ہے لیکن ہر قانون شریعت کے توڑنے کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا کہ انسان کلّی طور پر اپنے مقصد میں ناکام ہو جائے بلکہ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ یہ تمام قانون مجموعی طور پر انسان کی رُوح کی پاکیزگی اور بلندی کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح قانون قدرت کے توڑنے سے ضروری نہیں کہ ہر قانون شکنی کی وجہ سے تباہی اور بربادی آجائے یا ہر بدپرہیزی کی وجہ سے ضرور بیماری پیدا ہو۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ قانون شریعت کا ہر حکم ٹوٹ جانے کی وجہ سے انسان اپنے مقصد سے بالکل محروم رہ جائے یا خدا تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہو جائے

کیونکہ شریعت کے تمام احکام اصولی طور پر انسان کی درستی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں اور شریعت کا تمام نظام اسی مقصد کے لیے ہے۔ ایک وسیع نظام جو مختلف طریقوں سے ایک ہی غرض کے لیے اپنا اثر ڈال رہا ہے اگر اُس کا کوئی حصہ اپنا کام کرنے سے عاری رہ جائے تو ضروری نہیں ہوتا کہ مقصود نتیجہ پیدا نہ ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس حصہ نے اپنے کام میں کوتاہی کی ہے دوسرے حصوں کا اثر اسکی کمزوری پر غالب آجائے اور مقصود نتیجہ پھر بھی پیدا ہو جائے انسان کا وجود ہی ایک مرکب وجود ہے۔ انسان کی زندگی ہَوا، پانی، غذا اور مختلف چیزوں پر انحصار رکھتی ہے بعض دفعہ ان ذرائع میں سے کسی میں کچھ نقص بھی ہو جاتا ہے۔ مگر دوسری چیزوں کے اثر کی وجہ سے وہ بیمار نہیں ہوتا۔ اسی طرح شریعت ہے کہ وہ ان احکام پر مشتمل ہے جو انسانی رُوح کی ترقی کے لیے ضروری ہیں اور اِن کا مجموعی اثر انسان کی روحانی ترقی پر پڑتا ہے۔ پس جب تک خدا تعالیٰ کی حکومت یا اُس کے انبیاء کی حکومت کے انکار کی رُوح نہ پیدا ہو جائے صرف غلطی یا کمزوری کی وجہ سے انسانی عمل میں اگر کوئی خامی رہ جائے تو ضروری نہیں کہ ایسی خامی انسان کو اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں ناکام کردے۔ ہاں اگر خامی بہت بھی ہو تو سچی توبہ اور دُعا بھی اس کا ازالہ کر سکتے ہیں اوپر کے دو قانونوں کے علاوہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ دو اور قانون بھی ہیں ایک قانونِ تمدن اور دوسرا قانونِ اخلاق۔ یہ دونوں قانون درحقیقت قانونِ قدرت اور قانونِ شریعت کی سرحدیں ہیں۔ قانونِ اخلاق قانونِ شریعت کی طرف کی سرحد ہے اور قانونِ تمدن قانونِ قدرت کی طرف سرحد ہے اِس لیے یہ دونوں قانون بہت کچھ آپس میں ملتے جُلتے ہیں۔ بہت سے تمدنی قانونوں کی بنیاد قانونِ اخلاق پر ہوتی ہے اور بہت سے اخلاقی قانونوں کی بنیاد قانونِ تمدن پر ہوتی ہے انسان چونکہ مدنی الطبع پیدا ہُوا ہے، اِس لیے وہ اِن دو قانونوں کا محتاج تھا۔ چونکہ قانونِ تمدن قانونِ قدرت سے ملتا ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے اس کا اختیار زیادہ تر بنی نوع انسان کو دیا ہے اور چونکہ قانونِ اخلاق قانونِ شریعت سے ملتا ہے اس لیے قانونِ اخلاق کو قانونِ شریعت کے اندر داخل کیا گیا ہے گو اس کی بعض شقوں کو بنی نوع انسان کے سپرد بھی کر دیا گیا ہے۔

تمام دنیا کا نظام اِن چاروں قانونوں سے چل رہا ہے۔ قانونِ قدرت میں بھی کسی کا دخل نہیں خدا ہی کی طرف سے وہ آتا ہے اور قانونِ شریعت میں بھی کسی انسان کا دخل نہیں وہ بھی خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتا ہے لیکن قانونِ تمدن اور قانونِ اخلاق میں خدا تعالیٰ اور انسانی نظام شریک ہو جاتے ہیں کچھ راہنمائی خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور کچھ اختیار انسان کو دیا جاتا ہے اور اس طرح خدا اور بندے کے تعاون سے اِس دنیا کے نظام کو بہتر سے بہتر بنایا جاتا ہے جب تک یہ دو دریا متوازی چلتے رہتے ہیں اُس وقت تک دنیا میں امن قائم رہتا ہے اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت کے ساتھ مل کر انسان بھی دنیا میں ایک مفید اور بابرکت حکومت قائم کر لیتا ہے اور جب یہ دو دریا مختلف جہات کو چلنے شروع ہو جاتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ انسانی عقل کی ندی اپنی کمزوری کی وجہ سے اپنے رستہ سے بدل جاتی ہے اور خدائی راہنمائی کی ندی کے ساتھ ساتھ چلنے کی برکت سے محروم ہو جاتی ہے تو دنیا میں فساد اور جھگڑا اور لڑائی پیدا ہو جاتی ہے اور دنیا پر نہ خدا کی بادشاہت

رہتی ہے نہ انسان کی بلکہ شیطان کی بادشاہت قائم ہوجاتی ہے کیونکہ انسان خدا تعالیٰ کی ہدایت کے ساتھ ہی انسان بنتا ہے ورنہ وہ وحشی جانوروں میں سے ایک جانور کی طرح ہوتا ہے۔

انسان کو خدا تعالیٰ کا مقرب بنانے کیلئے ضروری تھا کہ اُسے صاحبِ اختیار بنایا جاتا۔ اس وجہ سے قرآن کریم بتاتا ہے کہ انسان اِس دنیا کے ایک حصّہ میں مختار ہے اور ایک حصّہ میں مقید ہے۔ وہ مقیّد ہے قانونِ قدرت کے معاملہ میں لیکن مختار ہے قانونِ شریعت کے معاملہ میں۔ قانونِ قدرت کے معاملہ میں وہ مقیّد ہے اس لیے کہ قانونِ قدرت پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ کوئی روحانی ترقی حاصل نہیں کرتا اور قانونِ شریعت میں اُسے عمل کی آزادی دی گئی ہے اس لیے کہ قانونِ شریعت پر عمل کرنے سے، وہ انعام کا مستحق ہوتا ہے اور انعام اسی صورت میں ملا کرتا ہے جبکہ آزادئ عمل حاصل ہو، جبری طور پر کرائے ہوئے کام کے بدلہ میں انعام نہیں ملا کرتا۔

قرآن شریف اِس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ انسان کی روحانی ترقی بھی اس کے جسمانی حالات سے متاثر ہوتی ہے اور جس حد تک وہ اِس سے متاثر ہوتی ہے اُس کے اعمال یقیناً محدود ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم اس کا جواب یہ بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ انسانی اعمال کی قیمت اُس کے ماحول کو مدِّنظر رکھتے ہوئے لگائے گا۔ مثلاً اگر ایک شخص لاکھوں روپے کا مالک ہو کر دنیا کی بہتری اور بھلائی کے لیے سَو روپیہ خرچ کرتا ہے اور ایک دوسرا شخص صرف چند روپوں کا مالک ہو کر دنیا کی بھلائی کے لیے اپنا سارا مال خرچ کر دیتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے دونوں کو ایک سا ثواب نہیں ملیگا۔ جس نے چند روپے خرچ کئے تھے گو اس کے روپے تھوڑے تھے مگر اُسے ثواب زیادہ ملے گا کیونکہ اس کے ماحول کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جائیگا کہ اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن جس نے لاکھوں اور کروڑوں روپیہ کے ہوتے ہوئے ایک سو روپیہ کی مدد کی اس کے ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اُس نے اپنی طاقت کا ہزارواں یا لاکھواں حصّہ خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا۔ پس خدا تعالیٰ عمل کی مقدار کو نہیں دیکھتا بلکہ اُس ماحول کو دیکھ کر عمل کی قیمت لگاتا ہے جس ماحول میں کوئی انسان کام کرتا ہے اور وہ اُن مجبوریوں یا ان سہولتوں کو نظر انداز نہیں کرتا جن کے ماتحت کام کرنے والے کے عمل میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی یا جن کی مدد سے کام کرنے والے کو کام میں سہولت حاصل ہوئی۔

قرآن کریم سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح جسمانی دنیا نے آہستہ آہستہ ترقی کی ہے اسی طرح روحانی دنیا کے لیے بھی آہستہ آہستہ ترقی مقدر رکھی اسی لیے خدا تعالیٰ کا کامل کلام دنیا کے شروع میں نہیں آیا۔ جُوں جُوں انسان ترقی کرتا گیا اُسے اس کی ترقی کے درجہ کے مطابق شریعت دی گئی آخر ہوتے ہوتے انسان اس مقام پر پہنچ گیا جبکہ وہ کامل ترین شریعت کا حامل ہوسکتا تھا اس وقت خدا تعالےٰ کی حکمت کے ماتحت دنیا کا کامل ترین وجود ظاہر ہُوا اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے پس آپؐ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی شریعتوں میں سے کامل ترین شریعت اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کتابوں میں سے کامل ترین کتاب نازل کی گئی۔ وہ کامل کتاب قرآن کریم ہے اور کامل شریعت اسلام ہے۔ آپؐ کے وجود سے روحانی نظام کی تکمیل ہوئی، جس طرح مادی عالم کا نقطۂ مرکزی انسان ہے جس طرح مختلف زمانوں اور قوموں

کے لیے اُن کا نقطۂ مرکزی اُن کے انبیاء ہیں۔ اِسی طرح تمام بنی نوع انسان کے لیے نقطۂ مرکزی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پس قرآنی نقشۂ عالم اس طرح ہے کہ تمام مادی عالم کا پہلا نقطہ مرکزی انسان ہے یہ انسان مختلف دائروں میں اپنے اپنے زمانہ کے نبیوں کے گرد گھومتے ہیں۔ تمام نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد گھومتے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے گرد گھومتے ہیں اور اس طرح روحانی دنیا مکمّل ہو جاتی ہے۔

قانونِ شریعت، قانونِ اخلاق، قانونِ تمدّن

مَیں اوپر بتا چکا ہوں کہ انبیاء کے ذریعہ سے دنیا میں جو تکمیل ہوئی ہے وہ کم و بیش تین طرح ظاہر ہوتی ہے ایک قانونِ شریعت کے ذریعہ سے، دوسرے قانونِ اخلاق کے ذریعہ سے، تیسرے قانونِ تمدّن کے ذریعہ سے۔ قرآن کریم چونکہ اعلیٰ اور اکمل کتاب ہے اُس نے ان تینوں شقّوں کو بیان کیا ہے۔ قانونِ شریعت اور قانونِ اخلاق کو مکمّل طور پر اور قانونِ تمدّن کو اصولی طور پر۔ کیونکہ قانونِ تمدّن میں انسان کو بہت سے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ قانونِ اخلاق کے متعلق قرآن شریف نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ اخلاقِ فاضلہ درحقیقت نام ہے طبعی جذبات کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا۔ پس طبعی جذبات کو مار دینا یا حد سے زیادہ اُن میں منہمک ہو جانا یہ اخلاقی گناہ ہوتا ہے جو طبعی جذبات کو مارنا چاہتا ہے وہ قانونِ قدرت کا مقابلہ کرتا ہے جو طبعی جذبات کے پورا کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے وہ اپنی رُوح کو بھول جاتا ہے اور مذہب کو نظر انداز کر دیتا ہے اور یہ دونوں باتیں خطرناک ہیں۔ تم قانونِ قدرت کو بھی نہیں کُچل سکتے اور تم قانونِ شریعت کو بھی نہیں کُچل سکتے۔ اسی اصل کے ماتحت قرآن کریم فرماتا ہے کہ دنیا میں تمام چیزیں حلال ہیں کیونکہ وہ انسان کے فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ہاں صرف اُس صورت اور اُس شکل میں اُن کے استعمال پر حد بندی لگائی جاتی ہے جس صورت اور جس شکل میں وہ انسان کے لیے مضر ہو جاتی ہیں۔ اس قانون کے ماتحت اسلام کے رُو سے شادی نہ کرنا نیکی نہیں گناہ ہے کھانے پینے اور پہننے کے متعلق طیّب چیزوں کا استعمال نہ کرنا نیکی نہیں گناہ ہے، کیونکہ اِس میں قانونِ قدرت کی ہتک اور اس کا مقابلہ ہے اور خدا تعالیٰ کے فضلوں کی ناشکری ہے۔ لیکن انہی چیزوں میں پڑ جانا اور اِن کے استعمال میں غلوّ اور اسراف سے کام لینا یہ بھی گناہ ہے۔ کیونکہ اس طرح انسان اپنی روح کو بھول جاتا ہے اور اصل مقصد انسانی زندگی کا رُوح کو کامل کرنا ہی ہے۔ جس طرح وہ شخص گنہگار ہے جو کام ہی کرتا رہتا ہے اور کھانا نہیں کھاتا کیونکہ وہ مر جائے گا اور اس کا کام مکمل نہیں ہوگا۔ اسی طرح وہ شخص بھی گنہ گار ہے جو کھانا ہی کھاتا رہتا ہے اور کام نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ شخص ذرائع کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور مقصود کو بھول جاتا ہے۔ بغیر ذرائع کے مہیا کرنے کے مقصد حاصل نہیں ہوتا اور بغیر صحیح مقصد کو پیش نظر رکھنے کے صحیح ذرائع مہیا نہیں کیے جا سکتے ہیں۔

قانون تمدّن میں تنظیم اور یکجہتی پیدا کرنے کے لیے اصول

قانونِ تمدّن میں تنظیم اور یک جہتی پیدا کرنے کے لیے قرآن کریم نے مندرجہ ذیل اصول بیان کیے ہیں :-

اوّل :- اصل مالک خدا تعالیٰ ہے اور سب چیزیں اس کی ہیں (۲) اس نے یہ سب چیزیں بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کے فائدہ کے لیے انسان کے اختیار میں دی ہیں (۳) انسان چونکہ روحانی ترقی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس لیے ایک حد تک اُس کو اپنے عمل میں آزادی ملنی چاہیئے اور اسے ترقی کے لیے کچھ نہ کچھ میدان ملنا چاہیئے (۴) چونکہ انسان جن ذرائع سے کام لیکر ترقی کریگا وہ ذرائع درحقیقت کُل بنی نوع انسان کی مشترک ملکیّت ہیں اس لیے انسانی عمل کے محاصل کو ایسے اصول پر تقسیم کرنا چاہیئے کہ فرد کو بھی اُس کا حق مل جائے اور قوم کو بھی اس کا حق مل جائے (۵) انسانی نظامِ تمدّن کے چلانے کے لیے ایک حاکم ہونا ضروری ہے اور اس حاکم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے مشورہ سے منتخب کیا جائے اس حاکم کا کام قانون بنانا نہیں بلکہ الٰہی قانون کو نافذ کرنا ہے (۶) لیکن چونکہ ضروری نہیں کہ ایک وقت میں ساری دنیا میں ایک ہی نظام ہو اس لیے قرآن کریم نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ (ا) اگر ایک وقت میں دنیا میں کئی حکومتیں ہوں اور اُن میں سے بعض میں اختلاف پیدا ہو جائے تو دوسری حکومتیں مل کر اُن دونوں کے اندر صلح کرائیں (ب) اگر صلح ہو جائے تو فبہا اور اگر صلح نہ ہو سکے تو دُنیا کی باقی حکومتیں مل کر ایک عادلانہ فیصلہ دیں جس کو ماننے کے لیے دونوں حکومتوں کو مجبور کیا جائے (ج) اگر ایسے فیصلہ کو کوئی فریق نہ مانے یا ماننے کے بعد اس پر عمل کرنے سے انکار کر دے تو ساری طاقتیں مل کر اس سے لڑیں اور اُسے مجبور کریں کہ وہ دنیا کے امن کی خاطر حکومتوں کی پنچائت کے فیصلہ کو تسلیم کرے (د) جب اس پنچائتی دباؤ یا لڑائی سے وہ حکومت صلح کی طرف مائل ہو جائے تو یہ حکومتوں کی پنچایت بغیر کوئی ذاتی فائدہ اُٹھانے کے صرف اتنا فیصلہ نافذ کر دے جس پر جھگڑے کی ابتداء ہوئی تھی اور مغلوب ہونے والی حکومت سے کوئی زائد فائدے اپنے لیے حاصل نہ کرے کیونکہ اس سے نئے فسادات کی بنیادیں پڑتی ہیں - یہ وہ تعلیم ہے جو قرآن کریم نے آج سے پونے چودہ سو سال پہلے دی تھی آج یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن UNITED NATIONS ORGANISATION انہی اصول کی نقل کر رہی ہے لیکن پوری طرح نہ کر سکنے کی وجہ سے ناکامیاب ہو رہی ہے۔ پہلی لیگ آف نیشنز اس لیے ناکام ہوئی کہ وہ قرآنی اصول میں سے اس اصل کی خلاف ورزی کر رہی تھی کہ متخاصمین میں سے جو حکومت پنچائتی فیصلہ کو تسلیم نہ کرے اُسے زور اور طاقت کے ساتھ منوایا جائے اور اب نئی لیگ اس اصول کی خلاف ورزی کر رہی ہے کہ مغلوبین سے پنچائتی حکومتیں زائد فوائد حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ ابتدائی جھگڑے تک ہی اپنے فیصلوں کو محدود رکھیں پس یہ لیگ بھی اسی نتیجہ کو دیکھے گی جو پہلی لیگ نے دیکھا تھا۔ کیونکہ امن کے قیام کا صرف وہی ذریعہ ہے جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔

روحانی نظام کی تکمیل کے لیے قرآنی اصول

روحانی نظام کی تکمیل کے لیے قرآن کریم نے یہ اصول مقرر فرمایا ہے کہ چونکہ شریعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

پرختم ہوگئی ہے اس لیے آئندہ کوئی شریعت لانے والا نبی نہیں آئے گا۔ قرآن کریم آخری کتاب ہے اِس کو جزواً یا کُلاً کوئی اور کتاب منسوخ نہیں کرسکتی۔ قرآن اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حکومت روحانی عالم میں رہتی دنیا تک رہے گی، لیکن انسان بُھول بھی جاتا ہے، غلطی بھی کرتا ہے اور بغاوت بھی کرتا ہے ان تینوں مرضوں کا علاج کیے بغیر قرآنی حکومت قیامت تک صحیح طور پر نہیں چل سکتی۔

پیشگوئی دربارۂ ظہور مسیح موعودؑ

بھولنے والے کو یاد کرانے والا، غلطی کرنے والے کی اصلاح کرنے والا، اور باغی کو زیرنگین لانے والا آدمی ضرور چاہیئے۔ قرآن کریم اس کا یہ علاج بتاتا ہے کہ جس طرح سورج کی عدم موجودگی میں چاند دنیا کو روشن کرتا ہے، اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خدا تعالےٰ کی طرف سے ایسے انسان کھڑے کیے جائیں گے، جو چاند کی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نور کا اکتساب کرکے دنیا کو روشن کرتے رہیں گے۔ یہ لوگ زمانہ کی ضرورت کے مطابق عام حالتوں میں تو مجدّد کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور دُنیا کی وسیع خرابی اور تباہی کے وقت میں تابع نبی یا اُمتی نبی کی صورت میں ظاہر ہونگے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی وجود کے متعلق قرآن شریف میں متعدد جگہ پر خبر دی گئی ہے۔ (دیکھو سورۂ جمعہ عٓ۔ سورۂ صف عٓ۔ سورۂ آل عمران) اور اسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بروزِ ثانی قرار دیا گیا ہے حدیثوں میں اس بروزِ ثانی کا نام مسیحؑ بھی رکھا گیا ہے اور قرآن کریم میں بھی مسیح کے نام کی طرف ضمناً اشارہ کیا گیا ہے (ذکر ابن مریم والی آیت سورۂ زخرف) دوسرا نام حدیثوں میں اس کا مھدی رکھا گیا ہے مگر یہ وجود ایک ہی ہے مختلف جہات سے اس کے مختلف نام ہیں۔ انجیل میں بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس بعثتِ ثانیہ کا ذکر مسیحؑ کے دوبارہ نزول کے وعدہ میں کیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ کے حالات بتا رہے ہیں کہ یہ وہی زمانہ ہے جس کی پیشگوئی پُرانی کتب میں اور قرآن کریم میں کی گئی ہے۔

ظہور مسیح موعود علیہ السّلام

اور قرآن کریم کی صداقت کا یہ ایک زبردست ثبوت ہے کہ اُس کی پیشگوئیوں کے عین مطابق اس زمانہ میں ایک شخص نے دعوےٰ کیا ہے کہ وہ قرآن شریف اور دوسری کتب سماوی کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کامل بروز ہے اور آپؐ کے دین کو قائم کرنے اور قرآن شریف کی تعلیم کو روشن کرنے کے لیے خدا تعالیٰ نے اُسے مبعوث فرمایا ہے (ان پیشگوئیوں کا ذکر قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں اپنے اپنے مقام پر کیا گیا ہے۔ خصوصاً قرآن کریم کی آخری سورتوں میں) یہ مدّعی حضرت مرزا غلام احمد

علیہ الصلوٰۃ والسلام بانیٔ سلسلہ احمدیہ ہیں۔ آج سے قریباً ساٹھ سال پہلے خدا تعالیٰ کی طرف سے آپؑ پر وحی نازل ہوئی اور خدا تعالیٰ نے آپؑ کو بتایا کہ تجھے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی خدمت کے لیے اور خدا تعالیٰ کے نام کو دوبارہ اس دنیا میں روشن کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور تجھے وہی رتبہ دیا گیا ہے جو پہلے انبیاء کو دیا گیا تھا، سوائے اس فرق کے کہ تُو قرآن اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کامل متبع ہے اور کوئی نئی شریعت تجھے نہیں دی گئی۔ چنانچہ آپ کو الہام ہُوا کہ كل بركة من محمد صلى الله عليه وسلم فتبارك من علّم وتعلّم (حقیقۃ الوحی ص۹۵) تمام برکتیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوتی ہیں۔ پس بہت برکت والا ہے وہ بھی جس نے سکھایا یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور بہت برکت والا ہے وہ بھی جس نے سیکھا۔ یعنی احمد قادیانی علیہ السلام۔

پھر آپ کو کہا گیا :-

"دنیا میں ایک نذیر آیا، پر دنیا نے اُس کو قبول نہ کیا، لیکن خدا اسے قبول کرے گا، اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔"

(براہین احمدیہ حاشیہ ص۵۵۷)

قرآن کریم میں نذیر نبیوں کا نام آتا ہے اور بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے ایک الہام میں نذیر کی بجائے نبی کا لفظ بھی آتا ہے (ایک غلطی کا ازالہ) آپ کا کام یہ تھا کہ آپ اس تاریکی کے زمانہ میں پھر دنیا کو خدا تعالیٰ سے روشناس کرائیں اور تازہ الہاموں اور معجزات سے اِس مادی دنیا کے دل میں روحانیت کا بیج دوبارہ بو دیں۔ جس وقت آپنے دعویٰ کیا اُس وقت آپ اکیلے تھے، دنیا میں آپ کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ آپ ریل سے دُور، تارگھر سے محروم۔ ڈاک کی تمام سہولتوں سے محروم! ایک چھوٹے سے گاؤں میں جس کی آبادی چودہ پندرہ سو تھی ظاہر ہوئے اور اس وقت آپ نے دنیا میں یہ اعلان فرمایا کہ خدا تعالیٰ میری سچائی کو دنیا پر ثابت کریگا۔ اور دنیا کے دُور دراز کناروں تک میری تبلیغ پہنچے گی اور آپ نے یہ اعلان کیا کہ نہ صرف یہ کہ خدا مجھے دنیا کے کناروں تک شہرت دیگا بلکہ میرے سلسلہ کو قائم رکھے گا اور مجھ پر ایمان لانیوالے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرینگے۔

اور نو سال کے اندر میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا، جو خصوصیّت سے میری پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا ہوگا اور دنیا کے کناروں تک اُس کا نام پہنچے گا۔ وہ جلد جلد ترقی کرے گا اور روح القدس سے برکت دیا جائے گا۔ اِن الہامات کے شائع ہونے کے بعد آپ کی مخالفت بڑے زور شور سے ہوئی اور کیا ہندو اور کیا مسلمان اور کیا عیسائی اور کیا سکھ سب کے سب آپ کے پیچھے پڑ گئے اور ہر ایک نے آپ کے تباہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ مخالفت ہی اپنی ذات میں اس بات کی علامت تھی کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی عالمگیر

مخالفت بالعموم سچے نبیوں ہی کی ہوا کرتی ہے، مگر باوجود اس کے کہ آپ اکیلے تھے اور آپ کے مقابلہ میں ساری دنیا جمع تھی پھر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کی آواز کو بلند کرنا شروع کیا اور ایک ایک دو دو کر کے لوگ آپ پر ایمان لانے شروع ہوئے اور بڑھتے بڑھتے یہ جماعت پنجاب اور ہندوستان میں پھیلتے ہوئے دوسرے ممالک کی طرف نکل گئی۔ جب بانی سلسلہ احمدیہ ۱۹۰۸ء میں فوت ہوئے تو اس وقت آپ کے مخالفوں نے یہ شور مچایا کہ اب یہ سلسلہ تباہ ہو جائیگا، لیکن خدا تعالیٰ نے آپؑ کی جماعت کو حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ کے ہاتھ پر جمع ہونیکا موقع دیدیا اور وہ اس جماعت کے اسلامی اصول کے مطابق پہلے خلیفہ منتخب ہوئے۔ آپکی خلافت کے دوران میں مغربی تعلیم سے متاثر لوگوں نے اصولِ خلافت پر اعتراضات کرنے شروع کیے اور یہ فتنہ بڑھنا شروع ہُوا حتّٰی کہ جب ۱۹۱۴ء میں آپ فوت ہوئے تو ان لوگوں نے جو کہ خلافت کے مسئلہ کے خلاف تھے نظامِ سلسلہ کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ راقم الحروف جو بانی سلسلہ احمدیہ حضرت احمد علیہ السلام کا لڑکا ہے، اس وقت صرف پچیس ۲۵ سال کی عمر کا تھا اور تمام مادی ذرائع سے محروم تھا۔ جماعت کی باگ ڈور کلّی طور پر ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے خلافت کے اصول کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کیا تھا، لیکن قادیان میں موجود جماعت کی کثرت جنہیں یہ باغی لوگ جاہلوں کی کثرت کہتے ہیں اس بات پر مُصر تھی کہ ہم خلافت کے طریق کو قرآنی احکام کے مطابق جاری رکھیں گے۔ چنانچہ ان لوگوں کے اصرار پر میں نے جماعت احمدیہ سے بیعت لے لی اور خلیفۂ ثانی کے طور پر جماعت کی، اسلام کی، اور دنیا کی خدمت کا کام کرنا شروع کیا۔ چونکہ جماعت کے سربرآوردہ اور بڑے لوگ مخالف ہو گئے تھے اس لیے جماعت کی حالت اس وقت بہت خطرناک نظر آتی تھی اور بیرونی دنیا کی نظریں بھی اب اس امید سے اُٹھ رہی تھیں کہ چند دن میں اس سلسلہ کی عمارت پاش پاش ہو جائے گی مگر اس وقت خدا تعالیٰ نے مجھے بتایا کہ وہ میری مدد کرے گا اور مجھے غلبہ دے گا اور میرے مخالفوں کو جو طاقتور ہیں کمزور کرے گا اور اُن میں تفرقہ پیدا کر کے اُنہیں پاش پاش کر دیگا احمدیہ جماعت میں سے زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ تجربہ کار آدمی نکل گئے۔ احمدیہ جماعت میں سے زیادہ مالدار اور زیادہ رسوخ والے آدمی الگ ہو گئے۔ وہ لوگ جو سلسلہ کا دماغ سمجھے جاتے تھے وہ اس سے کٹ گئے۔ میری عمر کے لحاظ سے خلافت سے بغاوت کرنے والا گروہ یہ آوازیں بلند کرتا تھا کہ سلسلہ کی باگ ڈور ایک بچّہ کے ہاتھ میں چلی گئی ہے اب یہ سلسلہ تباہ ہو کر رہے گا۔ لیکن وہ خدا کہ جس نے قرآن شریف نازل کیا ہے۔ وہ خدا کہ جس نے اس دنیا کے لیے ایک روحانی نظام بنایا ہے جس کے ماتحت یہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔

حضرت مسیح موعود کی پیشگوئی کے مطابق مصلح موعود کا ظہور

وہ خدا جس نے احمد علیہ السلام مسیح موعود مہدی معہود کو بتایا تھا کہ وہ ان کی ذریت سے ۱۸۸۴ء سے لے کر نو سال کے اندر ایک لڑکا پیدا کرے گا جو خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم سے جلد جلد ترقی کرے گا اور دنیا کے کناروں تک شہرت پائے گا اور اسلام کو دنیا میں پھیلا کر اسیروں کی رُستگاری اور مُردوں کے

احیاء کا موجب ہوگا۔ اس کی بات پوری ہوئی اور اُس کا کلمہ اُونچا رہا۔ ہر روز جو طلوع ہوتا تھا وہ میری کامیابی کے سامانوں کو ساتھ لاتا تھا، ہر روز جو غروب ہوتا تھا وہ میرے دشمنوں کے تنزّل کے اسباب چھوڑ جاتا تھا، یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے جماعت احمدیہ کو میرے ذریعہ سے دنیا بھر میں پھیلا دیا اور قدم قدم پر خدا تعالیٰ نے میری رہنمائی کی اور بیسیوں موقعوں پر اپنے تازہ کلام سے مجھے مشرّف فرمایا، یہاں تک کہ ایک دن اُس نے مجھ پر یہ ظاہر کر دیا کہ میں ہی وہ موعود فرزند ہوں جسکی خبر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۱۸۸۴ء میں میری پیدائش سے پانچ سال پہلے دی تھی۔ اُس وقت سے خدا تعالیٰ کی نصرت اور مدد اور بھی زیادہ زور پکڑ گئی اور آج دنیا کے ہر برّ اعظم پر احمدی مشنری اسلام کی لڑائیاں لڑ رہے ہیں۔ قرآن جو ایک بند کتاب کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت اور مسیح موعود علیہ السلام کے فیض سے ہمارے لیے یہ کتاب کھول دی ہے اور اس میں سے نئے سے نئے علوم ہم پر کھولے جاتے ہیں دنیا کا کوئی علم نہیں جو اسلام کے خلاف آواز اُٹھاتا ہو اور اس کا جواب خدا تعالےٰ مجھے قرآن کریم سے ہی نہ سمجھا دیتا ہو۔ ہمارے ذریعہ سے پھر قرآنی حکومت کا جھنڈا اُونچا کیا جا رہا ہے اور خدا تعالیٰ کے کلاموں اور الہاموں سے یقین اور ایمان حاصل کرتے ہوئے ہم دنیا کے سامنے پھر قرآنی فضیلت کو پیش کر رہے ہیں دنیا خواہ کتنا ہی زور لگائے، مخالفت میں کتنی ہی بڑھ جائے، گو دنیا کے ذرائع ہماری نسبت کروڑوں کروڑ گنے زیادہ ہیں لیکن یہ ایک قطعی اور یقینی بات ہے کہ سورج ٹل سکتا ہے ستارے اپنی جگہ چھوڑ سکتے ہیں۔ زمین اپنی حرکت سے رُک سکتی ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی فتح میں اب کوئی شخص روک نہیں بن سکتا۔ قرآن کی حکومت دوبارہ قائم کی جائیگی پھر دنیا اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں یا انسانوں کی پُوجا کو چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کرنے لگے گی اور باوجود اس کے کہ دنیا کی حالت اس قرآنی تعلیم کو قبول کرنے کے خلاف ہے اسلام کی حکومت پھر قائم کر دی جائے گی ایسی طرح کہ پھر اُس کی جڑوں کا ہلانا انسان کے لیے ناممکن ہو جائے گا۔ اس شیطان کے برباد کردہ دنیا کے جنگل میں خدا نے پھر ایک بیج بویا ہے میں ایک ہوشیار کرنے والے کی صورت میں دنیا کو ہوشیار کرتا ہوں کہ یہ بیج بڑھے گا، ترقی کرے گا، پھیلے گا اور پھلے گا اور وہ روحیں جو بلند پروازی کا اشتیاق رکھتی ہیں، جن کے دلوں کے مخفی گوشوں میں خدا تعالےٰ کے ساتھ ملنے کی تڑپ ہے وہ ایک دن اپنی مادی خوابوں سے بیدار ہوں گی اور بیتاب ہو کر اس درخت کی ٹہنیوں پر بیٹھنے کے لیے دوڑیں گی تب اِس دُنیا کے فساد دُور ہو جائیں گے۔ اس کی تکلیفیں مٹا دی جائیں گی۔ خدا تعالیٰ کی بادشاہت پھر اس دنیا میں قائم کر دی جائے گی اور پھر اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کے لیے سب سے قیمتی متاع قرار پائے گی اور دنیا کی یہ تبدیلی فساد اور بدامنی کے دور کرنے کا ذریعہ ثابت ہو گی۔ اور یہی ایک ذریعہ ہے جس سے دنیا کا فساد اور بدامنی دُور کی جا سکتی ہے اس کے سوا سب کوششیں بیکار ہو جائیں گی۔

مابعد الموت

قرآنی تعلیم کے رُو سے دُنیا کا یہ نظام، جس کا مَیں پہلے نقشہ کھینچ چکا ہوں۔ آخر انسان موت کے ذریعہ سے ایک نئی شکل بدل لیتا ہے۔ انسانی ارواح ایک نئے عالم میں جاتی ہیں اور رُوح ایک نیا جسم اختیار کرتی ہے، مگر وہ اِس قسم کا جسم نہیں ہوگا جس قسم کا جسم ہمیں اس دنیا میں حاصل ہے وہ ایک نئی قسم کا رُوحانی جسم ہوگا، جو انسان کی رُوح کو خدا تعالیٰ کے حُسن کو دیکھنے کے لیے نئی طاقتیں بخشے گا۔ کامل روحیں معاً اُس مقام پر رکھ دی جائیں گی جسے جنّت کہتے ہیں اور ناقص روحیں اس جگہ پر ڈال دی جائیں گی، جسے دوزخ کہتے ہیں اور جو درحقیقت رُوحانی بیماریوں کا شفاخانہ ہے۔ جُوں جُوں ارواح کی اصلاح ہوتی چلی جائے گی اُنہیں جنّت میں بھیجا جاتا رہے گا۔ یہاں تک کہ دوزخ بالکل خالی ہوجائیگی اور تمام کے تمام انسان جنت میں داخل ہوجائیں گے جس طرح وہ خدا کی طرف سے آئے تھے وہ سب کے سب خدا ہی کی طرف چلے جائیں گے۔ اُن کی خوشیاں اور اُن کی لذّتیں اور اُنکی راحتیں سب روحانی ہونگی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی محبّت اُن کی سب سے بڑی غذا ہوگی۔ اور اُس کی رؤیت اُن کا سب سے بڑا انعام ہوگا۔ قرآن کریم اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا (النازعات ع آیت ۲۵) اس عالم کے دونوں سرے خدا ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کی پیدائش کا سرا بھی خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے خاتمہ کا سرا بھی خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو خدا سے آیا ہے وہ خدا ہی کی طرف جائے گا جیسے مسیح بھی کہتا ہے کہ آسمان پر کوئی نہیں جاتا، مگر وہی جو آسمان سے آتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا (الفرقان ع) اے محمد رسول اللہ تیری سب سے بڑی تلوار قرآن کریم ہے تو اسے لیکر دُنیا سے سب سے بڑا جہاد کر۔ اس حکم کے ماتحت انگریزی ترجمہ کی پہلی جلد شائع کی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ اور زبانوں میں قرآن کریم کا ترجمہ تیار رہے (۱) فرانسیسی (۲) جرمن۔ (۳) سپینش (۴) اطالین (۵) روسی (۶) اور ڈچ۔ یہ تراجم جنگ کے اثرات ختم ہونے پر چھپوائے جائیں گے۔ اور ان ملکوں میں شائع کیے جائیں گے اور ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اور زبانوں میں تراجم یکے بعد دیگرے شائع ہوتے رہیں گے چنانچہ افریقہ کی سواحلی زبان میں بھی ترجمہ[۱] ہورہا ہے۔

اسلام کی تبلیغ اور قرآن کریم کی تعلیم کی اشاعت کے لیے ہمارے مبلّغ بھی مختلف ملکوں میں کام کررہے ہیں۔ اس وقت یورپ میں انگلستان کے علاوہ فرانس، سپین، اطالیہ اور سوئٹزرلینڈ میں مشن قائم ہیں اور امریکہ میں یونائیٹڈ اسٹیٹس امریکہ اور ارجن ٹائن میں مشن کھُل چکے ہیں۔ برازیل اور کینیڈا زیر تجویز ہیں۔ وسط افریقہ کے قریباً تمام ممالک میں ہمارے مشن ہیں۔ اور ایسٹ افریقہ میں بھی دس مشنری جا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں فلسطین، شام، ایران میں

[۱] اب یہ ترجمہ چھپ کر شائع ہوچکا ہے۔ ۱۲۔ عبداللطیف بہاولپوری۔

بھی مشن ہیں اور ملایا۔ جاوا۔ سماٹرا۔ بورنیو میں بھی مشن قائم ہو چکے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ روحانی جہاز ان تراجم اور ان مبلغوں اور ان کے بعد آنے والے تراجم اور مبلغوں کے ذریعہ سے اسلام کی فتح کا راستہ کھولنے کے لیے نہایت کامیاب رہے گا۔ کیونکہ ہماری کوششیں نہ صرف خدا تعالیٰ کے فیصلہ سے مل گئی ہیں بلکہ ہم یہ کام خدا تعالیٰ کے براہِ راست حکم کے ماتحت کر رہے ہیں۔

اِس علمی تحفہ کے پیش کرنے کے لیے میں دنیا کے تمام مذاہب کے راستی پسند لوگوں سے کہتا ہوں کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ قرآن کریم بھی ہر زمانہ میں پھل دیتا ہے اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں پر اللہ تعالیٰ اپنا تازہ کلام نازل کرتا رہتا ہے اور ان کے ہاتھ پر اپنی قدرتوں کا اظہار کرتا ہے پس کیوں نہ علمی غور اور فکر کے علاوہ اس مشاہدہ کے ذریعہ سے صداقت کو معلوم کیا جائے اگر مسیحی پوپ یا اپنے آرچ بشپوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ میرے مقابل پر اپنے پر نازل ہونے والا تازہ کلام پیش کریں، جو خدا تعالیٰ کی قدرت اور علم غیب پر مشتمل ہو تو دنیا کو سچائی کے معلوم کرنے میں کس قدر سہولت ہو جائے گی۔ وہ پوپ اور پادری جو مسیح کی صلح کل پالیسی کو ترک کر کے عیسائی فضا کو صلیبی جنگوں پر اُکساتے رہے ہیں کیا وہ آج اس روحانی جنگ کے لیے اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکتے۔ کاش وہ اس کے لیے تیار ہوں یا اُن کے اتباع اُنہیں اس کے لیے آمادہ کر دیں تو دنیا ایک لمبے روحانی مرض سے جلد نجات حاصل کر سکے اور خدا تعالیٰ کا جلال اور اس کی قدرت خارق عادت طور پر ظاہر ہو کر لوگوں کے ایمان اور روحانیت کی اصلاح کا موجب ہوں +

شکریہ و اعتراف

مَیں اِس دیباچہ کے آخر میں مولوی شیر علی صاحب کی اُن بے نظیر خدمات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے باوجود صحت کی خرابی کے قرآن کریم کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کے متعلق کی ہیں۔ اسی طرح مولوی شیر علی صاحب اور ملک غلام فرید صاحب، خان بہادر چوہدری ابوالہاشم خان صاحب مرحوم اور مرزا بشیر احمد صاحب بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ترجمہ پر تفسیری نوٹ میری مختلف تقریروں اور کتابوں اور درسوں کا خلاصہ نکال کر درج کیے ہیں۔ مجھے ان انگریزی نوٹوں کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، مگر ان لوگوں کے تجربہ اور اخلاص پر یقین کرتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ انہوں نے صحیح طور پر ان مضامین کی ترجمانی کی ہوگی جو مَیں نے براہِ راست خدا تعالیٰ کے افضال کے ماتحت قرآن کریم سے حاصل کیے ہیں یا مَیں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام بانی سلسلہ احمدیہ کے افاضات سے حاصل کیے ہیں۔

مَیں اس موقعہ پر قاضی محمد اسلم صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج اور سر محمد ظفر اللہ خان صاحب جج فیڈرل کورٹ آف انڈیا (حال وزیر خارجہ پاکستان) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جن دونوں نے اس دیباچہ کو انگریزی زبان کا جامہ پہنایا ہے اللہ تعالیٰ ان سب دوستوں کو اپنی برکات کے عطر سے ممسوح کرے اور دین و دنیا میں ان کا حافظ و ناصر رہے۔

مَیں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کا شاگرد ہونے کی وجہ سے کئی مضامین میری تفسیر میں لازماً ایسے آئے ہیں جو مَیں نے اُن سے سیکھے اس لیے اس تفسیر میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی تفسیر بھی۔ حضرت خلیفہ اوّل رضؓ کی تفسیر بھی اور میری تفسیر بھی آ جائے گی اور چونکہ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی روح سے ممسوح کر کے اُن علوم سے سرفراز فرمایا تھا جو اس زمانہ کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے مَیں اُمید کرتا ہوں کہ یہ تفسیر بہت سے بیماروں کو شفا دینے کا موجب ہوگی۔ بہت سے اندھے اس کے ذریعہ سے آنکھیں پائیں گے، بہرے سُننے لگ جائیں گے، گونگے بولنے لگ جائیں گے، لنگڑے اور اپاہج چلنے لگ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے مضامین کو برکت دیں گے اور یہ اس غرض کو پُورا کرے گی، جس غرض کے لیے یہ شائع کی جا رہی ہے۔

اَللّٰھُمَّ آمِین

(غلام جیلانی کاتب ننکانہ صاحب)